عالم اسلام کے مشہور محدث ڈاکٹر محمود طحان حفظہ اللہ کی مشہور و متداول کتاب

تیسیر مصطلح الحدیث

کا عام فہم سلیس ترجمہ، تخریج و تعلیق

قواعدُ علوم الحدیث

مفتی ارشاد الرحمٰن المعتصم

قواعدِ علومِ الحدیث

تالیف

ڈاکٹر ابو حفص محمود بن احمد بن محمود طحان نعیمی حفظہ اللہ

ترجمہ، تعلیق و تخریج

مفتی ارشاد الرحمن المعتصم

ناشر: مکتبہ پیر ماجوڑ

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تیسیر مصطلح الحدیث

تالیف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر محمود طحان حفظہ اللہ

ترجمہ، تعلیق و تخریج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مفتی ارشاد الرحمن المعتصم

طبع اول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رمضان المبارک ۱۴۴۳ھ

ناشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مکتبہ پیر باجوڑ

فہرست

پیشِ لفظ

امت مسلمہ کی ترقی و عروج اور شریعتِ اسلامی کے استحکام میں کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ ﷺ نے غیر معمولی کردار ادا کیا، اسلافِ امت نے اپنے نبی ﷺ کی سیرت وحیاتِ طیبہ کے ایک ایک خدوخال کو محفوظ کر کے ملتِ اسلامیہ کو ایک ایسا منشور و دستور فراہم کیا، جس کے اعتقاد واتباع میں دنیا وآخرت کے فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے اور انہوں نے اس عظیم فریضہ کی تحفظ و تبلیغ کے خاطر اپنا سب کچھ قربان کیا، تکالیف و مصائب برداشت کیے، دور دراز کے طویل اسفار کیے، جان ومال کی بازی لگائی، دنیوی آرائشوں اور آسائشوں کو پسِ پشت ڈالا، وقت کے فراعنہ اور جبابرہ کے ساتھ نبرد آزما ہوئے، تاہم اپنے مقاصد و اغراض میں کسی قوت کو مانع وحاجب ہونے نہیں دیا اور یہ کوئی معمولی کام نہ تھا کہ ہر روایت کی سند میں جتنے بھی نام آئیں ان میں سے ہر ایک کے حالات کو یکجا کیا جائے اور حالات میں بھی صرف یہ نہیں کہ کیا نام تھا؟ کہاں پیدا ہوئے وغیرہ۔ بلکہ یہ معلومات کہ وہ کس قسم کے انسان تھے؟ کیا کرتے تھے؟ رہن سہن کیسا تھا؟ سمجھ بوجھ کیسی تھی؟ معاشرے اور سماج میں ان کا کیا مرتبہ تھا؟ تعلیم وتربیت کس ماحول میں اور کیسی ہوئی تھی؟ ذہن اور حافظہ کیسا تھا؟ کس قبیلے اور خاندان سے تعلق تھا؟ تحصیل علم کے لیے کہاں کہاں کی خاک چھانی؟ اساتذہ اور شیوخ کون کون تھے؟ یقیناً یہ کام بہت ہی مشکل تھا، لیکن انہوں نے یہ سب کچھ محض اس لیے کیا، تاکہ سنتِ نبوی خواہ قولی ہو، یا فعلی ہو، یا تقریری ہو، اپنی پوری صحت کیساتھ منظرِ عام پر آجائے، اور اس میں ہر ممکن خطاء وضعف کا احتمال نہ رہے، اور انہی اہداف کے فروغ وترویج کے خاطر متنوع علوم مدون ہوئے، جیسے علم الجرح والتعدیل، معرفۃ الرجال، تاریخ الرواۃ، معرفۃ الاسماء والکنی والالقاب، معرفۃ علل الحدیث، علم تاویل مشکل الحدیث، معرفۃ الناسخ والمنسوخ، معرفۃ غریب الحدیث، معرفۃ الموضوعات وکشف حال الوضاعین، معرفۃ الانساب اور علم مصطلح الحدیث وغیرہ علوم معرض وجود میں آئے۔

علوم حدیث کی اقسام وانواع بہت زیادہ ہیں، امام حاکم نیشاپوریؒ (م ۴۰۵ھ) نے "معرفۃ علوم الحدیث" میں ۵۲، امام ابو عمرو تقی الدین ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "مقدمہ ابن الصلاح"، امام شرف الدین نوویؒ (م ۶۷۶ھ) نے "التقریب والتیسیر" اور

علامہ ابو حفص سراج الدین ابن الملقن مصریؒ(م۸۰۴ھ) نے "المقنع فی علوم الحدیث" میں ۶۵ انواع ذکر کیے ہیں اور علامہ عبد الرحمن سیوطیؒ(م۹۱۱ھ) نے ۹۳ علوم ذکر کیے ہیں۔

چھٹی صدی ہجری کے مشہور محدث وفقیہ امام ابو بکر زین الدین حازمیؒ(۵۸۴ھ) رقم طراز ہیں۔

"عِلْمُ الْحَدِيثِ يَشْتَمِلُ عَلَى أَنْوَاعٍ كَثِيرَةٍ تَبْلُغُ مِائَةً، كُلُّ نَوْعٍ مِنْهَا عِلْمٌ مُسْتَقِلٌّ لَوْ أَنْفَقَ الطَّالِبُ فِيهِ عُمُرَهُ لَمَا أَدْرَكَ نِهَايَتَهُ."[1]

"علم حدیث کی سو کے لگ بھگ انواع ہیں اور ہر نوع مستقل علم کی حیثیت رکھتی ہے، بعض انواع ایسی ہیں کہ اگر طالب علم پوری حیات مستعارا نہیں میں صرف کرڈالے تب بھی انتہا کو نہ پا سکے گا۔"

تاریخ، سیر اور کتبِ رجال پر طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ علوم حدیث کی ترویج وارتقاء کے لیے سلف صالحین اوراکابرین ملت اسلامیہ نے غیر معمولی خدمات سرانجام دیئے، متنوع کتابیں لکھیں، مختلف مناہج واسالیب کی داغ بیل ڈالی، قواعدواصول کی تدوین و تشکیل کی اور تشریح و تطبیق کی ہر ممکنہ کوشش کی۔اوریوں ہی یہ علم مختلف ارتقائی مراحل اور ادوار سے گزرتا گیا۔علم مصطلح الحدیث پر درج ذیل مختلف تین ارتقائی ادوار گزرے ہیں:

۱۔تاسیسی دور ۲۔ تصنیفی دور ۳۔ تنقیحی و تشریحی دور۔

۱۔ تاسیسی دور: اہل علم کی تصریحات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس علم کی بنیاد و اساس رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں پڑگئی تھی اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں اسے فروغ دیا گیا اور شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اسناداور رواۃ کی نقدو تحقیق پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ راویوں سے حدیث اخذ کرنے میں احتیاط سے کام لیں اور صرف ان افراد سے حدیث لیں جن کے دین اور قوت حفظ پر اعتماد ہو۔ اور پھر تابعینؒ نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا۔

---

[1] العجالۃ:۷، تدریب الراوی:۱/۴۵-۴۶۔

۲۔ تصنیفی دور: اس دور میں دو طرح کی تصانیف معرض وجود میں آئیں:

(الف)۔ جزوی تصانیف (ب)۔ فنی تصانیف

(الف)۔ جزوی تصانیف: تابعینؒ کے دور کے بعد یہ علم حدیث رسول ﷺ کے فروغ کیساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا یہاں تک کہ اس علم کے جزئیات کو ضمنی طور پر کتابوں میں قلم بند کیا جانے لگا۔ امام ابو حنیفہؒ (م۱۵۰ھ) نے اصول روایت ودرایت پر مختلف زاویہ نگاہ سے گفتگو کی، ان کے اقوال کتبِ جرح وتعدیل میں موجود ہیں، امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیمؒ (م۱۸۲ھ) نے "الرد علی سیر الاوزاعی"، "کتاب الخراج" اور "امالی" میں خبر واحد کی حجیت، حدیث شاذ اور حدیث کے قبول و رد کے بعض فنی قواعد پر گفتگو کی، امام محمد بن حسن شیبانیؒ (م۱۸۹ھ) نے "کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ" میں خبر واحد کی حجیت اور اختلاف حدیث وغیرہ اصولی مباحث پر بحث کی ہے، امام محمد بن ادریس شافعیؒ (م۲۰۴ھ) نے ناسخ و منسوخ، اختلاف حدیث، حجیت خبر واحد، مرسل وغیرہ مباحث کو اپنی شہرہ آفاق کتاب "الرسالۃ" اور "الام" میں ذکر کی ہیں۔ امام عیسی بن ابان حنفیؒ (م۲۲۱ھ) نے "الحجج الصغیر" میں متواتر، مشہور، خبر واحد، حجیت خبر واحد، حدیث مرسل، مختلف الحدیث اور بعض فنی قواعد پر بسط و تفصیل کیساتھ گفتگو کی۔

امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ (م۲۵۶ھ) نے صحیح بخاری کے "کتاب العلم" اور "کتاب اخبارالآحاد" وغیرہ میں مختلف اقسام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امام مسلمؒ (م۲۶۱ھ) نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں، امام ابو داؤد سجستانیؒ (م۲۷۵ھ) نے "رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکۃ" میں، امام ابو عیسی ترمذیؒ (م۲۷۹ھ) نے اپنی "سنن" اور "علل صغیر" میں اس فن کی جزئیات کو قلم بند کیا۔ بلکہ اس دور میں علوم حدیث کے بعض فروعات پر مستقل کتابیں تصنیف ہوئیں، چنانچہ علل الحدیث میں امام علی بن مدینیؒ (م۲۳۴ھ)، اامام احمد بن حنبلؒ (م۲۴۱ھ)، امام ترمذیؒ (م۲۷۹ھ)، امام ابن ابی حاتم رازیؒ (م۳۲۷ھ) وغیرہ نے مستقل کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اسی طرح امام ابو داؤدؒ (م۲۷۵ھ) اور امام اابن ابی حاتم رازیؒ (م۳۲۷ھ) نے مراسیل پر کتابیں لکھیں۔

امام یحییٰ بن معینؒ (م۲۳۳ھ) نے رجالِ حدیث پر "التاریخ"، امام بخاریؒ (م۲۵۶ھ) نے "التاریخ الکبیر"، اامام ابن ابی حاتم رازیؒ (م۳۲۷ھ) نے "الجرح والتعدیل" تصنیف

فرمائی۔اسی طرح امام بخاریؒ (م۲۵۶ھ)نے "کتاب الوحدان"اورامام مسلمؒ(م۲۶۱ھ)نے "المنفردات والوحدان" تحریر فرمائی۔

امام ابوجعفراحمدبن محمد طحاویؒ(م۳۲۱ھ)نے اپنی شہرہ آفاق کتاب"شرح مشکل الآثار" اور"شرح معانی الآثار"میں قبول ورد حدیث کے اصولی مباحث پر جابجا گفتگو کی اور بعض فنی قواعد بھی بیان کیے۔پھران کے بعد فقہائے حنفیہؒ میں امام ابو بکراحمدبن علی جصاص رازیؒ (م۳۷۰ھ)نے"الفصول فی الاصول"میں،امام ابوزیدعبداللہ بن عمردبوسیؒ (م۴۳۰ھ) نے "تقویم الادلۃ"میں،فخر الاسلام ابوالعسرعلی بن محمد بزدویؒ(م۴۸۲ھ)نے "کنزالوصول الی معرفۃ الاصول"میں اور شمس الائمہ محمدبن احمد سرخسیؒ(م۴۸۳ھ)نے "اصول السرخسی"میں مبحث السنہ میں اصول حدیث کے مصطلحات،حدیث کے قبول ورد کے معیارات وموازین اور فنی قواعدو ضوابط پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

(ب)۔ فنی تصانیف:چوتھی صدی ہجری میں امام ابومحمد حسن بن عبدالرحمن بن خلاد رامہرمزیؒ(م۳۶۰ھ)نے اس علم کے منتشر جزئیات کو تصنیفی شکل دے دی اوراصول الحدیث کے معماراول ہونے کاشرف حاصل کیااوراپنی کتاب کواصول حدیث کی سب سے پہلی کتاب ہونے کااعزاز بخشا۔پھراس کے بعداس علم پر متنوع تصانیف لکھی گئیں۔

۳۔ تنقیحی وتشریحی دور:خطیب بغدادیؒ(م۴۶۳ھ)اوربعض دیگرحضرات نے اس فن پرمختلف کتابیں تصنیف کیں یہاں تک معروف محدث وفقیہ علامہ ابوعمروعثمان بن عبدالرحمن بن صلاحؒ(۶۴۳ھ)کادورآیا۔آپ نے اس فن کے قواعدوضوابط کی تہذیب وتنقیح کی اوراصولی مصطلحات کوجامع ومانع بنانے کی سعی مشکور کی۔اوریوں ہی یہ اس فن کی بنیادی کتاب قرارپائی۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس علم کی بنیادرسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں پڑگئی تھی اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں اسے فروغ دیا گیااور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اسناد اور رواۃ کی نقدو تحقیق پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی،تاہم اتنی بات ضرورہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک لوگوں میں امانت،دیانت اور تقوی کاغلبہ تھا،ضعفاء اور مجروحین کاوجود

ناپید تھا۔ دوسری صدی ہجری میں ضعفاء اور مجروحین کا ظہور ہونے لگا اوران کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا، حافظ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) نے اس حقیقت کا اظہار یوں کیا ہے۔

”وَلَا يَكَادُ يُوجَدُ فِي الْقَرْنِ الْأَوَّلِ الَّذِي انْقَرَضَ فِيهِ الصَّحَابَةُ وَكِبَارُ التَّابِعِينَ ضَعِيفٌ إِلَّا الْوَاحِدَ بَعْدَ الْوَاحِدِ كَالْحَارِثِ الْأَعْوَرِ وَالْمُخْتَارِ الْكَذَّابِ . فَلَمَّا مَضَى الْقَرْنُ الْأَوَّلُ وَدَخَلَ الثَّانِي كَانَ فِي أَوَائِلِهِ مِنْ أَوْسَاطِ التَّابِعِينَ جَمَاعَةٌ مِنَ الضُّعَفَاءِ الَّذِينَ ضُعِّفُوا غَالِبًا مِنْ قِبَلِ تَحَمُّلِهِمْ وَضَبْطِهِمْ لِلْحَدِيثِ فَتَرَاهُمْ يَرْفَعُونَ الْمَوْقُوفَ وَيُرْسِلُونَ كَثِيرًا وَلَهُمْ غَلَطٌ كَأَبِي هَارُونَ الْعَبْدِيِّ، فَلَمَّا كَانَ عِنْدَ آخِرِ عَصْرِ التَّابِعِينَ وَهُوَ حُدُود الْخَمِيس ومئة تَكَلَّمَ فِي التَّوْثِيقِ وَالتَّرْجِيح طَائِفَةٌ مِنْ الْأَئِمَّةِ. فَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ مَا رَأَيْتُ أَكْذَبَ مِنْ جَابِرٍ الْجُعْفِيِّ. وَضَعَّفَ الْأَعْمَشُ جَمَاعَةً وَوَثَّقَ آخَرِينَ، وَنَظَرَ فِي الرِّجَالِ شُعْبَةُ وَكَانَ مثبتا لَا يَكَادُ يَرْوِي إِلَّا عَنْ ثِقَةٍ وَكَذَا كَانَ مَالِكٌ.“[1]

”پہلی صدی ہجری جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور کبار تابعینؒ کے دور کا خاتمہ ہوا، اس میں حارث اعور اور مختار ثقفی کذاب جیسے کے شاذونادر افراد کے علاوہ کسی ضعیف راوی کا تقریباً وجود نہ تھا، پہلی صدی ہجری گزرنے کے بعد جب دوسری صدی ہجری کا آغاز ہوا تو اس کے اوائل میں اوساط تابعین میں ضعفاء کی ایک جماعت پیدا ہوئی جو زیادہ تر حدیث کو زبانی یاد رکھنے اور محفوظ کرنے میں کمزور اور کوتاہ تھی، چنانچہ آپ انہیں دیکھیں گے کہ موقوف کو مرفوع نقل کر جاتے ہیں اور کثرت سے ارسال کرتے ہیں اور ان سے روایت کرنے میں غلطی بھی ہوتی ہے، جیسے ابو ہارون عبدی وغیرہ۔ پھر جب تابعین کا آخری دور تھا، یعنی ۱۵۰ ہجری تو ائمہ کرامؒ کی ایک جماعت نے رواۃِ حدیث کی توثیق وتضعیف پر گفتگو کی، چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے کہا کہ میں نے جابر جعفی سے زیادہ کسی کو جھوٹا نہیں دیکھا، امام اعمشؒ نے بھی ایک جماعت کی تضعیف اور دوسری کی توثیق کی، امام شعبہؒ نے بڑی احتیاط سے رجال پر گفتگو کی، امام مالکؒ کا بھی یہی حال تھا۔“

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ: ۳۲۰۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اس سلسلے نے وسعت اختیار کی اور مختلف اہل علم کے رجحانات و نظریات منصہ شہود پر آنے لگے اور یوں ہی حدیث کے ردو قبول کے دو مکاتب فکر (محدثین کرامؒ اور فقہائے حنفیہؒ) معرضِ وجود میں آئے، محدثانہ مکتبِ فکر کے ترجمان امام مالک بن انسؒ (م ۱۷۹ھ) تھے اور جب کہ فقیہانہ مکتب فکر کے سرخیل امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) تھے۔ حدیث کے رد و قبول کے کے بارے میں دونوں مکاتبِ فکر کے رجحانات میں بعض اعتبارات سے اختلاف تھا۔ عراقی فقہاء بالخصوص امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے تلامذہ کے نصوص شرعیہ سے منہج استدلال پر امام مالکؒ نے نقد و تبصرہ کیا۔ تو اس کے جواب میں امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے "کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ" میں اپنی تنقیحات پیش کیں اور اپنی منہج کی وضاحت کی۔

نیز امام محمدؒ نے "کتاب الاصل"، "المؤطا" اور "کتاب الآثار" میں اور امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج"، "کتاب الرد علی سیر الاوزاعی" اور "کتاب الآثار" جیسی علمی تصانیف میں بعض بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد جب حنفی اصولیین نے اصولی مباحث پر کتابیں لکھیں تو ان میں "مبحث السنۃ" کے ضمن میں اصول حدیث پر گفتگو کی، جیسے امام ابو بکر جصاصؒ (م ۳۷۰ھ) نے "الفصول فی الاصول" میں، قاضی ابو زید دبوسیؒ (م ۴۳۰ھ) نے "تقویم الادلۃ" میں، امام شمس الائمہ سرخسیؒ (م ۴۹۰ھ) نے "اصول السرخسی" میں اور امام بزدویؒ (م ۴۸۲ھ) نے "کنز الاصول" میں حدیث کے رد و قبول کے بنیادی اصول بیان کیے ہیں۔

محدثین کرام نے اس فن پر بے شمار کتابیں لکھیں، علامہ حسن بن عبد الرحمن بن خلاد رامہرمزیؒ (م ۳۶۰ھ) سے لے کے حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) تک اس فن پر کئی کتابیں لکھی گئیں اور حافظ ابن الصلاحؒ کے بعد حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ)، علامہ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) اور علامہ عبد الرحمن سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) کے ادوار تک اس فن پر سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اصول روایت کے قواعد و ضوابط کی تشریح و تنقیح پر خوب توجہ دی گئی اور بعض نئے اصول و قواعد وضع کیے گئے، متبوع مناہج اور اسالیب متعارف ہوئے، تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ محدثین کرامؒ کی توجہ کا مرکز اصول روایت ہی رہا اور انہوں نے زیادہ تر اصولِ روایت

سے گفتگو کی۔ اور جب کہ فقہائے حنفیہ نے اصول روایت کیساتھ اصول درایت کا بھی بڑا خیال رکھا اور روایات کو روایتی اصول و قواعد کیساتھ درایتی قواعد وضوابط پر پرکھا، فقہائے حنفیہؒ اصطلاحِ محدثین کے مطابق کسی حدیث کے صحیح یا مقبول ثابت ہو جانے کے بعد یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ حدیث کو دیگر ادلہ شرعیہ بالخصوص اس باب میں وارد دیگر احادیث جو پایہ ثبوت کو پہنچ رہی ہوں ان سے موازنہ اور مقارنہ کر کے یہ معلوم کر لیا جائے کہ یہ حدیث معارضہ، نسخ یا کسی باطنی علت کا شکار تو نہیں ہے، کیونکہ یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ حدیث پر عمل کرنے کے لیے صرف سنداً ثابت ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات ایسے امور در پیش ہوتے ہیں جو حدیث کے سنداً ثابت ہونے کے باوجود عمل سے مانع ہوتے ہیں، مثلاً: حدیث کا منسوخ ہونا، یا کسی اقوی دلیل سے معارض ہونا وغیرہ جن کا فیصلہ محدثین کرامؒ نے خود نہ کر کے فقہاء کرامؒ کے سپرد کر دیا ہے، وہ مختلف پہلوؤں سے غور کر کے حدیث کے قابلِ عمل ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، جس کے اپنے اصول و قواعد ہیں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔

یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ فقہائے حنفیہ کا محدثین کرام کیساتھ اختلاف جملہ مباحث اصولیہ میں نہیں، بلکہ بعض مصطلحات کی حدود و شروط اور جرح و تعدیل کے بعض قواعد و ضوابط میں ہے جن کی نشاندہی ہم نے موقع بہ موقع کی ہے اور ان کے علاوہ دیگر مباحث (جیسے تحمل طرق اداء، لطائف اسناد وغیرہ) میں کوئی اختلاف نہیں، ان کی تعریفات اور شرائط تقریباً ایک جیسی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب تیسیر مصطلح الحدیث شام کے مشہور عالم معاصر عالم شیخ ابو حفص محمود بن احمد بن محمود طحان نعیمی حفظہ اللہ کی معروف و متداول کتاب ہے جو انہوں جامعۃ الامام ریاض میں تدریس کے دوران لکھی، اس کتاب میں انہوں نے مقدمہ ابن الصلاح، تقریب اور تدریب الراوی کے مباحث نہایت سہل، آسان اور عام فہم اسلوب میں بیان کیے ہیں، جس کی وجہ سے اس کتاب کو بے حد مقبولیت ملی اور اسے عالم اسلام کے مختلف جامعات اور مدارس و معاہد میں بطور نصاب شامل کیا گیا اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کیے گئے، صرف اُردو میں اس کتاب کے متعدد ترجمے ہوئے۔ جن میں بعض تراجم غیر معیاری ہونے کیساتھ ساتھ ترجمہ نگاری کے

اسلوب سے عاری تھیں، جس کی وجہ سے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اس کتاب کا ایسا ترجمہ کیا جائے جس میں ترجمانی اور تفہیم پر زیادہ توجہ دی گئی ہو اور اس ساتھ مفید تعلیقات اور تخریجات کا بھی اضافہ کیا جائے، محدثین کے منہج کیساتھ ساتھ فقیہانہ اسلوب کو بھی بیان کیا جائے اور فقہائے احناف کے بیان کردہ فنی قواعد واصول کی نشاندہی موقع و محل کے مطابق کی جائے، تاکہ ایک طالب علم کو دونوں مکاتبِ فکر کے بنیادی قواعد وضوابط معلوم ہو سکیں۔

اللہ تعالی کا نام لے کر اس کام کا آغاز کیا اور بحمد اللہ یہ کام دو سال کے عرصے میں دیگر تدریسی اور تصنیفی مشغولیت کیساتھ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اس ترجمہ اور تعلیق میں درج ذیل امور کا التزام کیا گیا ہے۔

۱۔ ترجمہ حتی الامکان سلیس اور عام فہم انداز میں کیا گیا ہے۔

۲۔ مشکل اور مغلق مقامات کو حواشی وتعلیقات میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ متن میں مذکور رواۃ واعلام اور فرق وملل کا مختصر تعارف کیا گیا ہے۔

۴۔ کتاب میں مذکورہ احادیث وآثار کی تحقیق وتخریج کی گئی ہے۔

۵۔ متن میں مذکورہ مصطلحات ومباحث پر محدثین کرامؒ کے منہج کے مطابق سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

٦۔ فنی مباحث ومسائل پر محدثین کرامؒ کے مختلف آراء کو نقل کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔

۷۔ محدثین کے آراء کیساتھ فقہائے حنفیہؒ کے نظریات اور ترجیحات نشاندہی کی گئی ہے۔

۸۔ فقہائے حنفیہ کے اصولی رجحانات اور ترجیحات جا بجا بیان کی گئی ہیں تاکہ ان دونوں مکاتب فکر کے موقف سے آگاہی رہے۔

۹۔ محدثین کرام کے بعض آراء پر ناقدانہ اور محققانہ مدلل تبصرے کیے گئے۔

۱۰۔ جن فنی اصطلاحات کی تعریفات اور قیودات میں محدثین کرامؒ اور فقہائے حنفیہؒ کا اختلاف ہے ان کی جا بجا نشاندہی کی گئی ہے۔

۱۱۔ فنی اصطلاحات کی مراجعت کے لیے علوم الحدیث کی متعدد کتابوں کے حوالجات دینے کا التزام کیا گیا ہے۔

۱۲۔ ہر ایک اصطلاح کی تعریف کرتے وقت متعدد کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں تاکہ بوقت مراجعت آسانی رہے۔

۱۳۔ مصنف کتاب کی تخریجات وتعلیقات کیساتھ "ط" (طحان) کا رمز لگایا گیا ہے اور ہم نے اپنی تخریجات وتعلیقات کیساتھ "م" (معتصم) کا رمز لگایا ہے تاکہ دونوں میں نمایاں فرق رہے۔

۱۴۔ کتاب پر تحقیق وتعلیق کا کام مختلف مراحل میں ہوا ہے، بسااوقات ایک کتاب کے مختلف طبعات سے استفادہ کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے بعض حوالہ جات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

آخر میں بندہ اپنے ان تمام دوستوں کا بے حد ممنون ہے جنہوں نے اس سلسلے میں ہمارا عملی تعاون کیا، جن میں مولانا اسرار احمد ذہبی اور مولانا احسان اللہ صارم خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ان کے علاوہ ان احباب کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے بہت ہی قیمتی تجاویز اور مفید مشورے دیے اور اس کام کی تکمیل میں حوصلہ افزائی فرمائی، بالخصوص میرے انتہائی مشفق استاذ حضرت مولانا مفتی عبد المتین حفظہ اللہ (استاذ جامعہ انوار العلوم مہران ٹاون کراچی) اور ہمارے نہایت ہی قابل قدر اور مشفق دوست حضرت مولانا عبد الکریم صاحب حفظہ اللہ (آلہ آباد) جنہوں نے اہم علمی نکات اور بعض اصولی مباحث کی طرف رہنمائی فرمائی۔

اللہ تعالی سے دُعا ہے کہ ہماری اس ادنی کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اس کو میرے لیے، میرے والدین، اساتذہ کرام اور تمام محسنین کے لیے توشہ آخرت اور ذریعہ نجات بنائے۔ آمین!

"رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ."

ارشاد الرحمن المعتصم
دار الافتاء جامعہ اشاعت الاسلام اٹک شہر
۲۴ ذی القعدہ ۱۴۴۱ھ

مصنفِ کتاب کا مختصر ترجمہ

نام ونسب:

آپ کا نام ابو حفص محمود بن احمد حلبی نعیمی ہے، آپ کی پیدائش ۱۹۳۵ء میں شام کے مشہور شہر حلب کے مضافات میں واقع ایک بستی قضاء الباب میں ہوئی اور یہیں آپ نے نشو ونما پایا، اس کے بعد آپ قریبی علاقہ "منبج" تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے چل کر حلب میں سکونت اختیار کی۔ آپ کی پرورش وتربیت ایک علمی گھرانے میں ہوئی، آپ کے والد گرامی ایک نیک، دیندار اور علم دوست انسان تھے۔

تعلیم وتکمیل:

شیخ نے اپنی تعلیم کی ابتداء آبائی علاقہ "قضاء الباب" میں کی، پھر کچھ عرصہ "منبج" میں زیرِ تعلیم رہے اور اس کے بعد سیکنڈری تعلیم کے لیے "حلب" کا سفر کیا، آپ نے سیکنڈری تعلیم کے دوران شیخ محمد نجیب خیاطہ کے پاس مدرسہ حفاظ میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں جامعہ دمشق کے کلیۃ الشریعہ میں داخلہ لیا اور چار سال کے عرصہ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں نمایاں نمبرات کیساتھ سند فراغت حاصل کی اور مزید سال کلیۃ الشریعہ میں گزارا۔

عملی زندگی:

آپ فراغت کے بعد "منبج" کی جامعۃ الزیارۃ میں امام وخطیب مقرر ہوئے اور اس کیساتھ ساتھ حلب کے مختلف مساجد میں خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے اور ایک عرصے تک حلب کے مختلف کالجوں میں بحیثیت استاذ رہے، اس کے بعد آپ نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا رخ کیا اور وہاں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کیساتھ ساتھ حدیث اور اصول حدیث کا درس تقریبا دس سال تک دیتے رہے، اسی دوران آپ نے ایم فل مکمل کیا اور پھر ۱۹۷۱ء میں عالم اسلام کی عظیم یونیورسٹی جامعہ ازہر سے شیخ عبد الوہاب عبد اللطیف اور شیخ محمد حکیمؒ کی نگرانی میں "الحافظ الخطیب البغدادي وأثره في علوم الحدیث" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل

کیا۔ پھر وہاں سے جامعۃ الامام ریاض تشریف لے گئے، کچھ عرصہ وہاں قیام کیا اور اسی قیام کے دوران آپ نے "تیسیر مصطلح الحدیث" اور "اصول التخریج ودراسۃ الاسانید" جیسی مقبول اور مفید کتابیں لکھیں۔ یہ دونوں کتابیں مختلف جامعات اور مدارس میں شامل نصاب ہیں۔

۱۹۸۲ء میں جامعہ کویت کے کلیۃ الشریعہ میں استاذ مقرر ہوئے اور ۲۰۰۵ء تک وہیں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے، دورانِ قیام درسِ حدیث کا سلسلہ جاری رکھا اور آپ کے زیر اشراف سینکڑوں طلباء وطالبات نے اپنے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے مکمل کیے۔

اساتذہ ومشائخ:

آپ نے اپنے دور کے اکابر علماء اور مشائخ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے اور کسبِ فیض کیا۔ آپ کے مشاہیر اساتذہ کرام یہ ہیں:

ڈاکٹر محمد محمد ابوزہو۔ ڈاکٹر محمد سماجی۔ مفتی اعظم منبج شیخ جمعہ ابوزلام۔ شیخ عبدالوہاب سکر۔ شیخ محمد ابوالخیر زین العابدین۔ شیخ محمد ملاح۔ شیخ القراء محمد نجیب خیاطہ۔ شیخ محمد سلقینی۔ مفتی حلب شیخ محمد اسعد عبجی۔ شیخ محمد ناجی ابوصالح۔ شیخ عبداللہ حماد۔ وغیرہ۔

تلامذہ:

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعہ الامام ریاض اور جامعہ کویت میں تعلیم وتدریس کے دوران سینکڑوں تشنگانِ علوم نبویہ نے آپ سے کسبِ فیض کیا اور مختلف ممالک کے طلبہ کرام آپ کے حلقہ درس سے مستفید ہوئے، تاہم آپ کے چند مشاہیر تلامذہ یہ ہیں:

ڈاکٹر عبدالرزاق شایجی۔ ڈاکٹر محمد عوضی۔ ڈاکٹر حسام الدین عفانہ۔ ڈاکٹر دلید طبطبائی۔ ڈاکٹر فہد خنہ۔ ڈاکٹر نہاد عبید۔ وغیرہ۔

تصانیف:

شیخ محمود طحان حفظہ اللہ نے تعلیم وتدریس کیساتھ ساتھ تصنیف وتالیف پر بھی خصوصی توجہ دی، آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں بعض کتابوں کو اللہ تعالیٰ نے قبولیت عامہ

سے نوازا ہے اور وہ عرب و عجم کے مختلف جامعات اور مدارس میں شامل نصاب ہیں۔ آپ کے چند مشہور تصانیف یہ ہیں:

1 – حجية السنة ودحض الشبهات التي تثار حولها.

2 – مفهوم التجديد بين السنة النبوية وأدعياء التجديد.

3 – معجم المصطلحات الحديثية.

4 – تيسير مصطلح الحديث.

5 – أصول التخريج ودراسة الأسانيد.

6 – تحقيق الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع، للخطيب البغدادي(٤٦٣ﻫ) .

7 – تحقيق المعجم الأوسط للطبراني .

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي مَنَّ على المسلمين بإنزال القرآن الكريم، وتكفل بحفظه في الصدور والسطور إلى يوم الدين، وجعل من تتمة حفظه حفظ سنة سيد المرسلين. والصلاة والسلام على سيدنا ونبينا محمد الذي أوكل الله إليه تبيان ما أراده من التنزيل الحكيم، بقوله تعالى: {وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ}(١). فقام ﷺ مبينا له بأقواله وأفعاله وتقريراته بأسلوب واضح مبين. والرضَا عن الصحابة الذين تلقوا السنة النبوية عن النبي الكريم، فوعوها، ونقلوها للمسلمين كما سمعوها، خالصة من شوائب التحريف والتبديل. والرحمة والمغفرة للسلف الصالح الذين تناقلوا السنة المطهرة جيلا عن جيل، ووضعوا لسلامة نقلها وروايتها قواعد وضوابط دقيقة لتخليصها من تحريف المبطلين. والجزاء الخيِّر لمن خَلَفَ السلف من علماء المسلمين الذين تلقوا قواعد رواية السنة وضوابطها عن السلف، فهذبوها ورتبوها و جمعوها في مصنفات مستقلة، سميت فيما بعد بـ "علم مصطلح الحديث".

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے قرآن مجید نازل فرما کر مسلمانوں پر احسانِ عظیم کیا، اور قیامت تک اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود لے لی، نیز رسول اللہ ﷺ کی سنت کی حفاظت کو قرآن مجید کی حفاظت کا تتمہ قرار دیا۔ درود و سلام ہو ہمارے آقا اور نبی حضرت محمد ﷺ پر کہ جنہیں اللہ تعالی کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید کی منشائے الٰہی کے مطابق تشریح و توضیح کی ذمہ داری سپرد کی گئی، اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔

"وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ-" (النحل:۴۴)

"ہم نے آپ پر قرآن مجید نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو بیان کریں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے اور تا کہ وہ لوگ غور و فکر کریں۔"

---

(١) سورۃ النحل:۴۴۔ (ط)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ اپنے اقوال، افعال اور تقریرات (تائید و توثیق) کے ذریعے واضح اور بلیغ انداز میں قرآنی آیات و احکام کی تشریح و توضیح فرماتے رہے[۱]۔

اللہ تعالی صحابہ کرام سے راضی ہو، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے احادیث مبارکہ کو سیکھنے کے بعد نہ صرف اسے محفوظ کرلیا، بلکہ کسی تحریف و تبدیلی کے بغیر اسے من و عن مسلمانوں

---

[۱] مذکورہ آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ احادیث قرآن مجید کی توضیح و تشریح ہے اوراس کے بغیر قرآن مجید کا فہم ناممکن ہے، خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) اور علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ (م ۴۶۳ھ) نے سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ:

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ اپنے چند ساتھیوں کیساتھ بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے کہا ہمارے سامنے قرآن مجید کے علاوہ اور کچھ نہ بیان کرو۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے کہا: ذرا قریب آجاؤ! جب وہ ان کے پاس گیا تو آپ نے اس سے کہا کہ تم مجھے بتاؤ اگر تم کو اور تمہارے ہم خیال لوگوں کو صرف قرآن مجید پر چھوڑ دیا جائے تو کیا تم بتا سکتے ہو کہ قرآن میں کس جگہ ظہر کی چار رکعت اور مغرب کی تین رکعت لکھی ہیں اور قرآن میں کہاں ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں قراءت کرنی ہے؟ اسی طرح اگر تم کو اور تمہارے ہمنواؤں کو قرآن پر چھوڑ دیا جائے تو بتاؤ کہ قرآن میں خانہ کعبہ کے طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کا سات سات مرتبہ حکم کس جگہ ہے؟ پھر آپ نے فرمایا:

" أَيْ قَوْمُ خُذُوا عَنَّا فَإِنَّكُمْ ، وَاللهِ إِلَّا تَفْعَلُوا لَتَضِلُّنَّ."

(الکفایۃ فی علم الروایۃ: ۱۵، جامع بیان العلم وفضلہ: ۲/ ۱۱۹۲)

"لوگو! ہم سے علم حدیث حاصل کرو اور اللہ کی قسم! اگر تم ایسا نہ کروگے تو یقیناً گمراہ ہو جاؤگے۔"

علامہ ابن البر اندلسیؒ (م ۴۶۳ھ) نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"سَيَأْتِي قَوْمٌ يُجَادِلُونَكُمْ بِشُبُهَاتِ الْقُرْآنِ فَخُذُوهُمْ بِالسُّنَنِ؛ فَإِنَّ أَصْحَابَ السُّنَنِ أَعْلَمُ بِكِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ." (جامع بیان العلم وفضلہ: ۲/ ۱۰۰۹)

"عنقریب ایک ایسی جماعت نمودار ہوگی جو تم سے قرآنی شبہات لے کر جھگڑا کرے گی، تم ان کی گرفت احادیث نبویہ سے کرنا اس لیے کہ احادیث کا علم رکھنے والے ہی کتاب اللہ کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھتے ہیں۔"

ایک شخص نے تابعی جلیل مطرف بن عبد اللہ شخیرؒ سے کہا کہ:

"لَا تُحَدِّثُونَا إِلَّا بِالْقُرْآنِ! "

ہمیں قرآن کے سوا اور کچھ نہ سنایا کرو تو آپ نے فرمایا:

"وَاللهِ مَا نُرِيدُ بِالْقُرْآنِ بَدَلًا وَلَكِنْ نُرِيدُ مَنْ هُوَ أَعْلَمُ بِالْقُرْآنِ مِنَّا. "

اللہ کی قسم! ہم قرآن کا بدل نہیں تلاش کرتے بلکہ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے قرآن

=

کو منتقل کر دیا[1]۔ اور اللہ تعالیٰ سلف صالحین پر اپنی رحمت نازل کرے اور مغفرت سے نوازے، جنہوں نے سنت مطہرہ کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا اور نقل وروایت کے اس عمل کو اہل باطل کی تحریفات سے پاک رکھنے کے لیے دقیق قواعد وضوابط وضع کیے۔

اور اللہ تعالیٰ سلف صالحین کے مسند ارشاد سنبھالنے والے علماء کرام کو جزائے خیر دے کہ جنہوں نے اپنے اساتذہ اور مشایخ سے روایت کے قواعد وضوابط کا علم حاصل کیا اور انہیں

= کے اس مفہوم کا سب سے زیادہ سمجھنے والا کون ہے جو رسول اللہ ﷺ نے سمجھا تھا؟!

(جامع بیان العلم وفضلہ: ۲/۱۱۹۳)

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور سلف صالحین کے درمیان حدیث کی تشریعی حیثیت بالکل واضح تھی اور وہ تمام معاملات میں بیک وقت قرآن وحدیث ہی سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ (م)

[1] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے ہر ایک قول وفعل کو محفوظ رکھا اور یہ حفاظت کا یہ عمل بے ہنگم نہیں تھا وزِ اول ہی سے احتیاط پیشِ نظر رہی۔ ابتدائی دور میں جو سادہ احتیاطی تدابیر تھیں آگے چل کر اصول علمیہ کی صورت اختیار کر گئیں۔

معروف محدث امام شمس الدین ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں رقم طراز ہیں۔

”كان أول من احتاط في قبول الأخبار.“ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۹)

”وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے خبر کو قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیا۔“

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

”وهو الذي سن للمحدثين التثبت في النقل وربما كان يتوقف في خبر الواحد إذا ارتاب.“

(تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۱)

”انہوں نے محدثین کرامؒ کے لیے روایت میں جانچ پڑتال کا طریقہ وضع کیا اور جب انہیں شک ہوتا تو خبر واحد کو قبول کرنے میں توقف سے کام لیتے۔“

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

”وكان إماما عالما متحريا في الأخذ بحيث أنه يستحلف من يحدثه بالحديث.“

(تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۴)

”وہ امام عالم تھے اور روایت قبول کرنے میں انتہائی احتیاط وجستجو سے کام لیتے یہاں تک کہ روایت کرنے سے قسم کا مطالبہ کرتے۔“ =

بہتر سے بہتر انداز سے سنوارنے اور مرتب کرنے کے بعد مستقل تصانیف اور فن کی شکل دے دی، جس کو بعد میں علم مصطلح الحدیث کا نام دیا گیا[1]۔

أما بعد: چند سال قبل مجھے جامعہ اسلامیہ مدنیہ منورہ کے کلیۃ الشریعہ میں فن مصطلح الحدیث کی تدریس سپرد خدمت کی گئی، جامعہ کے نصاب میں اس سے پہلے علامہ ابن الصلاحؒ[2] کی شہرہ آفاق کتاب "علوم الحدیث" شامل تھی، تاہم بعد میں اس کی جگہ امام نوویؒ[3] کی معروف کتاب "التقریب" مقرر کی گئی، جو دراصل علامہ ابن الصلاحؒ کی معروف کتاب "علوم الحدیث" کا اختصار ہے، ان دونوں کتابوں کی علمی جلالت اور بے پناہ علمی معلومات کے باوجود دوران تدریس میں نے یہ بات محسوس کی کہ طلبہ کرام کو ان کے مباحث مرتب اور منظم طور پر اخذ کرنے میں کافی مشکلات پیش آتی ہیں، جن میں چند درج ذیل ہیں:

= مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روایت قبول کرنے میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے اور ان حضرات کا احتیاط صحابہ رضی اللہ عنہم پر کسی عدم اعتماد کا نتیجہ نہ تھا، کیونکہ یہ سب لوگ صحبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ تھے، بلکہ یہ ان کی متقیانہ روش تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سماع وفہم کی غلطی سے کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ (م)

(۱) اس کو علوم الحدیث اور اصول الحدیث بھی کہتے ہیں۔ (ط)

(۲) عثمان بن عبد الرحمن ابن عثمان بن موسی بن ابی نصر شہر زوری کردی، ابو عمرو تقی الدین، ابن الصلاح، ۵۷۷ھ کو شرخان میں پیدا ہوئے، جو شہر زور کے قریب واقع ہے، موصل، خراسان اور بیت المقدس میں ایک زمانے تک رہے، بیت المقدس کے مدرسہ صلاحیہ میں مدرس رہے، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول حدیث اور اسماء رجال کے بہت بڑے عالم تھے، تیرہ سال تک دمشق کے دار الحدیث میں مدرس رہے، دمشق ہی میں ۶۴۳ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان: ۳/ ۲۴۳، تذکرۃ الحفاظ: ۴/ ۱۴۹، مرآۃ الزمان: ۲۲/ ۳۹۳، شذرات الذہب: ۷/ ۳۸۳، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۲۰۷)۔ (م)

(۳) یحیی بن شرف بن مِرَی بن حسن نووی شافعی، ابو زکریا محیی الدین، سوریا میں حوران کے نَوا، نامی گاؤں میں ۶۳۱ھ کو پیدا ہوئے، دمشق میں تعلیم حاصل کی اور طویل مدت تک وہاں مقیم رہے، حدیث، اصول حدیث، قراءت اور فقہ کے بے نظیر عالم تھے، ۶۷۶ھ کو اپنے گاؤں میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۴/ ۱۷۴، شذرات الذہب: ۱/ ۵۵، الاعلام للزرکلی: ۸/ ۱۴۹)۔ (م)

اول: علامہ ابن الصلاح کی ''علوم الحدیث'' میں بعض مسائل بے جا طویل ہیں، جیسے کیفیت طرق تحمل اداء کی بحث ۴۶ صفحات پر محیط ہے اور جب کہ علامہ نووی کی ''التقریب'' میں بے جا اختصار ہے، جیسے ضعیف کی بحث جو انیس کلمات سے متجاوز نہیں[1]۔

دوم: بعض عبارات کی الجھن اور پیچیدہ اسلوب۔

سوم: بعض مسائل کا نامکمل اور تشنہ رہ جانا، جیسے کسی اصطلاح کی تعریف یا مثال کا سرے سے غائب ہونا، مثلاً ''مقلوب'' کی بحث میں علامہ نوویؒ نے صرف اتنی بات لکھی ہے کہ ''مقلوب'' یہ ہے کہ مثلاً ایک مشہور حدیث سالم سے مروی ہے اس کی روایت نافع سے اس لیے کی گئی کہ لوگوں میں رغبت پیدا ہو۔ اہل بغداد نے امام بخاریؒ کے سامنے سو احادیث پیش کیں۔ مقصد یہ تھا کہ امام بخاریؒ کا امتحان لیا جائے، آپ نے ان احادیث کو درست اسانید کیساتھ اسانید کیساتھ انہیں سنا دیا، جس کی وجہ سے لوگوں نے آپ کی علمی جلالت کا اعتراف کیا[2]۔

چہارم: کسی بحث سے حاصل ہونے والے فائدے کا ذکر نہ ہونا یا اس فن سے متعلق مشہور تصانیف کی نشاندہی نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ان دونوں حضرات کے علاوہ متقدمین میں سے جن لوگوں نے اس فن پر قلم اٹھایا ہے ان کی تصانیف میں بھی مجھے یہی مشکلات اور خامیاں نظر آئیں، بلکہ بعض تو پورے علوم حدیث کا احاطہ کرنے سے قاصر رہے اور بعض میں موضوع کی ترتیب و تہذیب کا فقدان رہا۔ ان حضرات کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ جن امور کا انہوں نے تذکرہ نہیں کیا دراصل وہ ان کے نزدیک پوری طرح واضح تھے، اس لیے انہوں نے اس پر قلم اٹھانا ضروری نہیں سمجھا، یا جن مباحث کا انہوں نے طوالت کیساتھ ذکر کیا ہے، ان کا زمانہ اس طوالت کا متقاضی تھا، یا کچھ اور وجوہات تھیں، جن کا ہمیں علم نہیں۔

اس صورتِ حال کے پیش نظر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کلیۃ الشریعہ کے طلباء کے لیے

---

(۱) دیکھئے: التقریب والتیسیر للنووی: ۱:۳۱۔ (م)

(۲) دیکھئے: التقریب والتیسیر للنووی: ۴۷۔ (م)

علوم حدیث پر مشتمل ایک سہل اورآسان کتاب تصنیف کروں، جس سے ان طلبہ کے لیے فن حدیث کے قواعد واصطلاحات کا سمجھنا آسان ہو جائے اوراس تصنیف کی یہ صورت ہو کہ ہر بحث کو چند نمبر وار مسلسل پیروں میں تقسیم کر دیا جائے، جس کی ابتداء تعریف سے کی جائے، پھر مثال دی جائے اور پھر اس کی اقسام بیان کی جائیں اوراختتامی پیرے میں مشہور تصانیف کا تذکرہ کیا جائے، عبارت سہل ہو، اسلوب بیان واضح اورانداز علمی ہو، جس میں نہ کوئی پیچیدگی ہو اور نہ ہی کوئی ابہام اورالجھن ہو۔

میں نے اپنی کتاب میں اختلاف اوراختلافی اقوال کے ذکراور مسائل ومباحث کو بسط وتفصیل کیساتھ بیان کرنے سے گریز کیا ہے، تاکہ کلیات الشریعہ اوراسلامک سٹڈیز کے کلیات کے نظام الاوقات میں اس مضمون کے لیے مقررہ شدہ مختصر دورانئے کی پوری رعایت ہو۔

میں نے اس کتاب کانام ’’تیسیر مصطلح الحدیث‘‘ رکھاہے، میں نے نہیں سمجھتا کہ میری اس کتاب کے بعد اس فن کے متقدمین علماء اوراسلاف کی بیش بہا قیمتی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، بلکہ میرا مقصد تو یہ ہے کہ میری کتاب متقدمین کی کتابوں کے لیے کلید کا کام دے اوران کے معانی اور مفاہیم کو آسان کر دے، جب کہ متقدمین محدثین کرام کی تصانیف اس فن کے علماء کے لیے حسب سابق مراجع اور مآخذ بنی رہیں اوران علمی چشموں سے وہ ہمیشہ اپنی پیاس بجھاتے رہے۔

میں یہاں اس حقیقت کا اظہار ناگزیر سمجھتاہوں کہ اس دور میں بعض محققین کی تصانیف منظر عام پر آئی ہیں، جن میں بڑی مفید معلومات ہیں، خصوصاان میں مستشرقین اور منحرفین کے شکوک وشبہات کی مدلل تردید ہے، تاہم ان کتابوں میں بعض تو بے حد طویل ہیں اور بعض بہت مختصر ہیں، جب کہ بعض میں جملہ مباحث کا استیعاب نہیں۔ اس لیے میں نے اس بات کا عزم کیاہے کہ میری یہ کتاب طوالت اوراختصار کی درمیانی کڑی بن کر اس موضوع کے تمام مباحث اور مسائل کا احاطہ کر لے۔

کتاب کا منہج اور میری جدید کاوشوں کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

ا۔ تقسیم:

میں نے ہر بحث کو نمبر وار پیراؤں میں تقسیم کیا ہے، تا کہ طلبہ کے لیے سمجھنے میں آسانی رہے[1]۔

۲۔ تکامل (ہر بحث کو مکمل کرنا):

میں نے ہر بحث کے بنیادی اور عمومی ڈھانچے کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے، مثلاً تعریف، مثال وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ استیعاب:

میں نے مصطلح الحدیث کی جملہ مباحث کو مختصر اور جامع اسلوب میں بیان کیا ہے۔

واضح رہے کہ میں نے اس کتاب کی تبویب وترتیب میں محدث جلیل حافظ ابن حجر عسقلانیؒ[2] کے طریقے سے استفادہ کیا ہے، جو انہوں نے "نخبۃ الفکر" اور اس کی شرح "نزہۃ النظر" میں اختیار کیا ہے، کیونکہ میری نظر میں ان کی ترتیب سب سے بہتر ہے اور جب کہ علمی مواد کے لیے میں نے علامہ ابن الصلاحؒ کی کتاب "علوم الحدیث"، علامہ نوویؒ کی کتاب "التقریب" اور علامہ سیوطیؒ[3] کی کتاب "تدریب الراوی" پر اعتماد کیا ہے۔

---

(۱) میں نے مباحث کی اس طرح تقسیم کا طریقہ اپنے کبار اساتذہ (مثلا: استاذ مصطفیٰ زرقاء نے اپنی کتاب "الفقه الاسلامی فی ثوبه الجدید"، ڈاکٹر معروف دولیبی نے اپنی کتاب "اصول الفقه" اور ڈاکٹر محمد ذکی عبد البنی نے علامہ مرغینانیؒ کی کتاب "الهدایة" پر ہمارے لیے تیار کردہ نوٹس میں- جب ہم دمشق یونیورسٹی کے شریعت کالج میں طالب علم تھے- یہی طریقہ اختیار کیا ہے) سے سیکھا۔ اس اچھوتی تقسیم کا ان علوم کے فہم پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اور ہمارے لیے مباحث کا سمجھنا آسان ہو گیا جب اس سے پہلے ان مباحث کو سمجھنے میں ہمیں بڑی مشکلات پیش آتی تھیں۔ (ط)

(۲) احمد بن علی بن محمد کنانی عسقلانی، ابو الفضل شہاب الدین ابن حجر، قاہرہ میں ۷۷۳ھ کو پیدا ہوئے، اصل عسقلان فلسطین کے تھے، یمن اور حجاز کے سفر کیے، شعر وادب کے رسیا تھے، پھر حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بڑی شہرت حاصل کی، کئی مرتبہ مصر کے قاضی رہے، حدیث، اصول حدیث، رجال اور تاریخ کے بے نظیر عالم تھے، ۸۵۲ھ کو قاہرہ میں وفات پائی۔ (الضوء اللامع: ۲/ ۳۶، البدر الطالع: ۱/ ۸۷، الاعلام للزرکلی: ۱/ ۱۷۸)۔ (م)

(۳) عبد الرحمن بن ابی بکر بن محمد ابن سابق الدین خضیری سیوطی جلال الدین، ۸۴۹ھ کو قاہرہ میں پیدا ہوئے، پانچ سال کے عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چالیس سال کی عمر میں دریائے نیل کے روضۃ المقیاس میں عزلت نشیں =

میں نے اس کتاب کو ایک مقدمہ اور چار ابواب پر تقسیم کیا ہے:

بابِ اول: خبر کے متعلق

بابِ دوم: جرح وتعدیل کے متعلق

بابِ سوم: روایت اور اصولِ روایت کے متعلق

بابِ چہارم: اسناد اور معرفتِ رُواۃ کے متعلق

عزیز طلبہ کے سامنے اس حقیر کاوش کو پیش کرتے ہوئے میں میں اپنی بے بضاعتی اور عجز و تقصیر کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس علم کا حق ادا نہیں کیا اور میں لغزشوں اور خطاؤں سے اپنے آپ کو مبرا نہیں سمجھتا۔ اگر کسی کو اس کتاب میں کوئی غلطی یا خطا نظر آئے تو مجھے اس کی اطلاع دے کر شکریئے کا موقع دیں، تاکہ میں اس کا تدارک اور ازالہ کرسکوں۔ اللہ تعالی کی ذات سے اُمید اور دُعا ہے کہ وہ اس کتاب سے عزیز طلبہ اور علم حدیث میں مشغول رہنے والوں کو نفع دے۔ اور اسے خالص اپنی رضا کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

= ہوئے اور وہی اکثر کتابیں لکھیں، امراء وشرفاء ملنے آتے، تحفے و تحائف پیش کرتے، مگر آپ نہ کسی سے ملتے اور نہ ہی تحائف و وظائف قبول کرتے، چھ سو کے لگ بھگ کتابیں لکھیں، تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، تاریخ اور فنون کے نابغہ روزگار عالم تھے۔ ٩١١ھ کو وفات پائی۔ (شذرات الذہب: ٨/ ٥١، الضوء اللامع: ٤/ ٦٥، الکواکب السائرۃ: ١/ ٢٢٧، الاعلام للزرکلی: ٣/ ٣٠١)۔ (م)

مقدمہ علمیہ

یہ مقدمہ درج ذیل مباحث پر مشتمل ہے:

۱۔ علم مصطلح الحدیث کی ابتداء وارتقاء

۲۔ علم مصطلح الحدیث پر مشہور و معروف تصانیف

۳۔ بنیادی اصطلاحات

علم مصطلح الحدیث کی ابتداءوارتقاء

علم مصطلح الحدیث پر تحقیق کرنے والا محقق اور سکالر اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ علمِ روایت اور نقلِ اخبار کی بنیاد اور اساس قرآن وسنت میں موجود ہے، قرآن مجید میں ہے۔

"یَا أَیُّہَا الَّذِینَ آمَنُوا إِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَیَّنُوا". (١)

"اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔"

ایک حدیث میں ہے۔

"«نَضَّرَ اللہُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَیْئًا فَبَلَّغَہُ کَمَا سَمِعَ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَی مِنْ سَامِعٍ»-(٢)"

"اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے ہم سے کوئی بات سنی اور اسے جوں کی توں دوسروں تک پہنچادی، بسا اوقات جس کی بات پہنچائی جاتی ہے وہ پہنچانے والے سے بڑھ کر محفوظ کرلیتا ہے۔"

ایک روایت میں ہے۔

"فَرُبَّ حَامِلِ فِقْہٍ إِلَی مَنْ ہُوَ أَفْقَہُ مِنْہُ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْہٍ لَیْسَ بِفَقِیہٍ»-(٣)

"بسا اوقات کوئی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص دین کی کوئی بات سن کر ایسے شخص کو پہنچادیتا ہے جو اس سے بڑھ کر سمجھ دار ہوتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہنچانے والا شخص خود دین کی سمجھ بوجھ سے عاری ہوتا ہے۔"

مذکورہ بالا قرآنی ایت اور احادیث مبارکہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قبول اخبار میں حقیقت حال کی تحقیق اور جستجو ایک لازمی امر ہے اور انہی ضبط واتقان کیساتھ محفوظ رکھنا بے حد ضروری ہے اور اخبار وآثار کو دوسروں تک پہنچانے میں باریک بینی اور تدقیق کو ملحوظ نظر رکھا

---

(١) سورۃ الحجرات:٦۔(ط)

(٢) سنن الترمذي، کتاب العلم، ٥/ ١٣، حدیث ٢٦٥٧، امام ترمذی اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ حسن صحیح ہے۔(ط)

(٣) سنن الترمذي، حدیث ٢٦٥٦ امام ترمذی اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ حسن ہے اور اس کو ابو داؤد، ابن ماجہ اور احمد نے بھی روایت کیا ہے۔(ط)

جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا تعمیل کرتے ہوئے احادیث
ہوئے احادیث اور اخبار کو قبول کرنے اور دوسروں تک پہنچانے میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے،
کرتے تھے، بالخصوص جب ناقل کی راست گوئی کے متعلق شک وشبہ ہوتا۔ اسی تناظر میں
میں احادیث اور اخبار کو قبول کرلینے یا مسترد کرنے کے لیے ایک نیا فن علم الاسناد معرض وجود
معرض وجود میں آیا، جس کی وجہ سے اسناد کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ صحیح مسلم کے مقدمہ میں
مقدمہ میں تابعی جلیل ابن سیرین رحمہ اللہ[1] کا قول مرقوم ہے۔

"لَمْ يَكُونُوا يَسْأَلُونَ عَنِ الْإِسْنَادِ، فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ، قَالُوا: سَمُّوا لَنَا رِجَالَكُمْ، فَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ، وَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ الْبِدَعِ فَلَا يُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ." [2]

"قرن اول میں لوگ اسناد کے متعلق استفسار نہیں کرتے تھے، لیکن جب فتنوں کا دور دورہ ہوا تو لوگ روایان حدیث سے کہتے کہ اس روایت کی سند بیان کرو! پھر دیکھا جاتا کہ اگر رواۃ حدیث اہل السنۃ ہوتے تو ان کی روایت کو قبول کرلیتے اور اگر رواۃ اہل بدع ہوتے تو ان کی روایت کو مسترد کیا جاتا تھا۔"

جب سند کی معرفت اور تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کے بغیر احادیث اور اخبار کو ناقابل قبول تصور کیا جاتا تھا، تو اسی ضرورت کے پیش نظر علم الجرح والتعدیل، رجال حدیث پر نقد وکلام، متصل اور منقطع اسانید کی معرفت علم علل الحدیث متنوع علوم معرض وجود میں آئے اور

---

(1) محمد بن سیرین بصری انصاری ابو بکر، بصرہ میں ۳۳ھ کو پیدا ہوئے، مشہور تابعی ہیں، زہد و تقوی اور تعبیر رویاء میں غیر معمولی شہرت حاصل کی، آپ سیدنا زید بن ثابت، سیدنا مالک بن انس، سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا حذیفۃ بن الیمان رضی اللہ عنہم سے بلاواسطہ روایت کرتے ہیں اور آپ کے مشہور تلامذہ میں امام شعبی رحمہ اللہ، امام اوزاعی رحمہ اللہ، عاصم احول اور مالک بن دینار وغیرہ ہیں۔ ابو عوانہ کہتے ہیں کہ میں ابن سیرین سے ملا انہیں دیکھ کر خدا یاد آجاتا تھا۔ ۱۱۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ (حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۲۶۳، تاریخ بغداد: ۵/ ۳۳۱، وفیات الاعیان: ۴/ ۱۸۱، الاعلام للزرکلی: ۶/ ۱۵۴) (م)

(2) مقدمۃ صحیح مسلم، ص۱۵. (ط)

بعض روایوں پر تنقید بھی ہوئی، تاہم اسی دور میں متکلم فیہ رواۃ کی تعداد بہت کم تھی اس لیے کہ اس فن کا بالکل ابتدائی دور تھا، لیکن بعد میں اہل علم نے اس فن کے دائرہ کار میں توسیع کی، جس کے لیے متنوع علوم حدیث ایجاد ہوئے، رواۃ حدیث کے ضبط واتقان پر گفتگو شروع ہوئی، کیفیت تحمل حدیث اور طرق اداء زیر بحث ہوئی اور معرفت ناسخ ومنسوخ اور غریب الحدیث وغیرہ علوم کا آغاز ہوا، تاہم بحث وتحقیق کا یہ سارا معاملہ اہل علم میں محض زبانی کلامی طور پر جاری رہا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ علوم ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ضبط تحریر میں آنے لگے، تاہم ابتداء میں مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے اور دیگر علوم علم الاصول، علم الفقہ اور علم الحدیث پر لکھی جانے والی کتابوں میں مندرج تھے، جیسے امام شافعیؒ[1] کی آفاق کتاب "الرسالۃ" اور "کتاب الام" وغیرہ۔

چوتھی صدی ہجری میں علوم وفنون کے ارتقاء اور عروج کا دور شروع ہوا، مختلف فنی اصطلاحات ایجاد ہوئیں، ہر علم نے مستقل حیثیت اختیار کرلی۔ تو اہل علم نے علم مصطلح الحدیث کو مستقل فن کی صورت میں مدون کیا اور یوں ہی اس کا باقاعدہ طور پر تدوین شروع ہوئی۔ اس موضوع پر سب سے پہلے قلم اٹھانے والے عالم قاضی ابو محمد حسن بن عبد الرحمن بن خلاد الرامھرمزیؒ (م ۳۶۰ھ) ہیں، جنہوں نے "المحدث الفاصل بین الراوی والواعی" کے نام سے

---

(۱) محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع ہاشمی قریشی ابو عبد اللہ، ۱۵۰ھ کو غزہ فلسطین میں پیدا ہوئے، دو سال کی عمر میں مکہ معظمہ میں لائے گئے اور مکہ مکرمہ میں ہی آپ نے طلبِ علم کے مراحل طے کیے، امام مالکؒ، سفیان بن عیینہؒ اور عبد الملک بن ماجشونؒ سے حدیثیں روایت کیں۔ تیرہ سال کی عمر میں چند سالوں میں امام مالکؒ کی مؤطا یاد کر کے ان کو سنا دی۔ آپ شعر، لغت، ایام عرب، فقہ اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے، پہلا فتوی بیس سال کی عمر میں دیا تھا۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں سلیمان بن داؤد، ابو بکر عبد اللہ بن زبیر حمیدی، امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راھویہؒ وغیرہ ہیں۔ ۱۹۹ھ کو مصر تشریف لائے اور ۲۰۴ھ میں قاہرہ میں وفات پائی۔ (التاریخ الکبیر: ۱/۴۲، تہذیب الکمال: ۱۴/ ۲۳۲، سیر اعلام النبلاء: ۱۰/ ۵، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۲۶۵، الاعلام للزرکلی: ۶/ ۲۶)(م)

اس فن کے پہلے کتاب لکھی[1]۔ اب ذیل میں مصطلح الحدیث پر تدوین سے لے کر آج تک لکھی جانی والی معروف کتابوں کا تعارف پیش کیا جارہاہے۔

علم مصطلح الحدیث پر مشہور و معروف تصانیف:

۱- المحدث الفاصل بین الراوی والواعی:

---

[1] خلاصہ کلام یہ ہے کہ علم مصطلح الحدیث پر درج ذیل مختلف تین ارتقائی ادوار گزرے ہیں:
(۱) تاسیسی دور (۲) تصنیفی دور (۳) تنقیحی و تشریحی دور۔

۱۔ تاسیسی دور: اہل علم کی تصریحات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس علم کی بنیادو اساس رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں پڑ گئی تھی اور پھر صحابہ کرام کے دور میں اسے فروغ دیا گیا اور شہادت عثمان کے بعد اسناد اور رواۃ کی نقد و تحقیق پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ صحابہ کرام نے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ راویوں سے حدیث اخذ کرنے میں احتیاط سے کام لیں اور صرف ان افراد سے حدیث لیں جن کے دین اور قوت حفظ پر اعتماد ہو۔ اور پھر تابعین نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا۔

۲۔ تصنیفی دور: اس دور میں دو طرح کی تصانیف معرض وجود میں آئیں:۔ (۱) جزوی تصانیف (ب) فنی تصانیف

(الف)۔ جزوی تصانیف: تابعین کے دور کے بعد یہ علم حدیث رسول ﷺ کے فروغ کیساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا یہاں تک کہ اس علم کے جزئیات کو ضمنی طور پر کتابوں میں قلم بند کیا جانے لگا۔ امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) نے اصول روایت و درایت پر مختلف زاویہ نگاہ سے گفتگو کی ہے، ان کے اقوال کتبِ جرح و تعدیل میں موجود ہیں، امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیمؒ (م ۱۸۲ھ) نے "الرد علی سیر الاوزاعی"، "کتاب الخراج" اور "امالی" میں خبر واحد کی حجیت، حدیث شاذ اور حدیث کے قبول و رد کے بعض فنی قواعد پر گفتگو کی ہے، امام محمد بن حسن شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ) نے "کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ" میں خبر واحد کی حجیت اور اختلاف حدیث وغیرہ اصولی مباحث پر بحث کی ہے، امام محمد بن ادریس شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) نے ناسخ و منسوخ، اختلاف حدیث، حجیت خبر واحد، مرسل وغیرہ مباحث کو اپنی شہرہ آفاق کتاب "الرسالۃ" اور "الام" میں ذکر کی ہیں۔

امام عیسی بن ابان حنفیؒ (م ۲۲۱ھ) نے "الحجج الصغیر" میں متواتر، مشہور، خبر واحد، حجیت خبر واحد، حدیث مرسل، مختلف الحدیث اور بعض فنی قواعد پر بسط و تفصیل کیساتھ گفتگو کی ہے۔ امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) نے صحیح بخاری کے "کتاب العلم" اور "کتاب اخبار الآحاد" وغیرہ میں مختلف اقسام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امام مسلمؒ (م ۲۶۱ھ) نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں، امام ابو داؤد سجستانیؒ (م ۲۷۵ھ) نے "رسالۃ ابی داوٗد الی اہل مکۃ" میں، امام ابو عیسی ترمذیؒ (م ۲۷۹ھ) نے اپنی "سنن" اور "علل صغیر" میں اس فن کی جزئیات کو قلم بند کیا۔ بلکہ اس دور میں علوم حدیث کے بعض فروعات پر مستقل کتابیں تصنیف ہوئیں، چنانچہ علل الحدیث میں امام علی بن مدینیؒ (م ۲۳۴ھ)، اامام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ)، امام ترمذیؒ (م ۲۷۹ھ)، امام ابن ابی حاتم رازیؒ (م ۳۲۷ھ) وغیرہ نے مستقل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

اسی طرح امام ابو داؤدؒ (م ۲۷۵ھ) اور امام اابن ابی حاتم رازیؒ (م ۳۲۷ھ) نے مراسیل پر کتابیں لکھیں۔ امام یحییٰ بن معینؒ (م ۲۳۳ھ) نے رجالِ حدیث پر "التاریخ"، امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) نے "التاریخ الکبیر"، اامام ابن ابی حاتم رازیؒ (م ۳۲۷ھ) نے "الجرح والتعدیل" تصنیف فرمائی۔ اسی طرح امام

=

اس کتاب کے مصنف قاضی ابو عبد الرحمن بن خلاد رامہرمزیؒ (م۳۶۰ھ)[1] ہیں، یہ اس فن کی سب سے پہلی تصنیفی کاوش ہے، تاہم موصوف اس فن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہ کر سکے اور یہی صورت حال ہر اس شخص کی ہوتی ہے، جو کسی فن میں سب سے پہلے قدم رکھتا ہے۔

۲- معرفة علوم الحدیث:

یہ معروف محدث ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیسابوریؒ (م۴۰۵ھ)[2] کی تصنیف لطیف ہے، اس کتاب میں مباحث کو مناسب فنی انداز اور صحیح ترتیب و تہذیب کیساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے۔

= بخاریؒ (م۲۵۶ھ) نے "کتاب الوحدان" اور امام مسلمؒ (م۲۶۱ھ) نے "المنفردات الوحدان" تحریر فرمائی۔ امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاویؒ (م۳۲۱ھ) نے "شرح مشکل الآثار" اور "شرح معانی الآثار" میں قبول ورد حدیث کے اصولی مباحث پر جابجا گفتگو کی اور بعض فنی قواعد بھی بیان کیے۔ پھر ان کے بعد فقہائے حنفیہؒ میں امام ابو بکر احمد بن علی جصاص رازیؒ (م۳۷۰ھ) نے "الفصول فی الاصول" میں، امام ابوزید عبد اللہ بن عمر دبوسیؒ (م۴۳۰ھ) نے "تقویم الادلۃ" میں، فخر الاسلام ابو العسر علی بن محمد بزدویؒ (م۴۸۲ھ) نے "کنز الوصول الی معرفۃ الاصول" میں اور شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسیؒ (م۴۸۳ھ) نے "اصول السرخسی" میں مبحث السنہ میں اصول حدیث کے مصطلحات، حدیث کے قبول ورد کے معیارات و موازین اور فنی قواعد وضوابط پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

(ب)۔ فنی تصانیف: چوتھی صدی ہجری میں امام ابو محمد حسن بن عبد الرحمن بن خلاد رامہرمزیؒ (م۲۶۰ھ) نے اس علم کے منتشر جزئیات کو تصنیفی شکل دے دی اور اصول الحدیث کے معمار اول ہونے کا شرف حاصل کیا اور اپنی کتاب کو اصول حدیث کی سب سے پہلی کتاب ہونے کا اعزاز بخشا۔ پھر اس کے بعد اس علم پر متنوع تصانیف لکھی گئیں۔

۳۔ تنقیحی و تشریحی دور: خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) اور بعض دیگر حضرات نے اس فن پر مختلف کتابیں تصنیف کیں یہاں تک معروف محدث وفقیہ علامہ ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمن بن صلاحؒ (۶۴۳ھ) کا دور آیا۔ آپ نے اس فن کے قواعد وضوابط کی تہذیب و تنقیح کی اور اصولی مصطلحات کو جامع ومانع بنانے کی سعی مشکور کی۔ اور یوں ہی یہ اس فن کی بنیادی کتاب قرار پائی۔ (م)

[1] حسن بن عبد الرحمن بن خلاد ابو محمد رامہرمزی، اپنے زمانہ میں عجم کے محدث تھے، پہلی دفعہ فارس میں ۲۹۰ھ میں سماع حدیث کی، حدیث، تاریخ اور ادب کے امام تھے، آپ نے اپنے والد اور دیگر مشائخ محمد بن عبد اللہ حضرمیؒ، ابو حصین وادعیؒ، محمد بن حیان مازنیؒ، ابو شعیب حرانیؒ، محمد بن عثمان بن ابی شیبہؒ اور ابو قاسم بغویؒ سے کسبِ فیض کیا۔ ۳۶۰ھ کو رامہرمز میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۳/ ۹۰۵، سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۷۳، شذرات الذہب: ۳/ ۳۰)(م)

[2] محمد بن عبد اللہ بن حمدویہ بن نعیم، ابو عبد اللہ حاکم نیشاپوری، ۳۲۱ھ کو نیشاپور میں پیدا ہوئے، حافظ حدیث تھے، ۳۴۱ھ کو عراق کا سفر کیا اور اسی سال فریضہ حج ادا کیا، خراسان اور ماوراء النہر میں تقریبا دو ہزار شیوخ سے استفادہ کیا۔ ۳۵۹ھ کو نیشاپور کے قاضی مقرر ہوئے، اسی وجہ سے حاکم کا لقب پڑ گیا، ان کی اکثر تصانیف حدیث اور علوم الحدیث سے متعلق ہیں، نیشاپور میں ۴۰۵ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد: ۵/ ۴۷۳، غایۃ النہایۃ: ۲/ ۱۸۲، الاعلام للزرکلی: ۶/ ۲۲۷)(م)

٣- المستخرج على معرفة علوم الحديث:

یہ حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانیؒ (م ۴۳۰ھ) [(۱)] کی تصنیفی کاوش ہے، امام حاکم نیسابوریؒ (م ۴۰۵ھ) کی کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں اس علم کی فنی مباحث اور قواعد ضبط تحریر میں نہیں لائے گئے، امام ابو نعیم اصبہانی نے انہیں اپنی کتاب میں مندرج کیے، تاہم ان سے بہت سے مباحث اور فنی قواعد رہ گئیں، جو بعد میں آنے والے اہل علم کو اس فن پر خامہ فرسائی کی دعوت دے رہے ہیں۔

٤- الكفاية فى علم الرواية:

یہ معروف محدث ابو بکر احمد بن علی بن ثابت خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) [(۲)] کی تصنیف لطیف ہے، یہ کتاب فنی مباحث و مسائل اور قواعد الروایہ کا بیش بہا ذخیرہ ہے اور اسے فن کے اہم ترین مصادر میں شمار کیا جاتا ہے۔

٥- الجامع لاخلاق الراوى وآداب السامع:

اس کتاب کے مصنف بھی خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) ہیں، کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں روایت کے آداب سے بحث کی گئی ہے، یہ اپنی افادیت کے پیش نظر ایک منفرد کتاب ہے، اس کے مندرجات اور مباحث بہت قیمتی ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) نے علوم حدیث کی ہر ایک فن پر مستقل کتاب لکھی ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار حافظ

---

(۱) احمد بن عبد اللہ بن احمد اصفہانی، ابو نُعیم، حافظ حدیث اور مؤرخ تھے، اصفہان میں ۳۳۶ھ کو پیدا ہوئے، حفظ اور روایتِ حدیث میں ثقہ ہیں، اصفہان ہی میں ۴۳۰ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان: ۱/ ۹۲، تذکرۃ الحفاظ: ۳/ ۱۰۹۲، الاعلام: ۱/ ۱۶۷) (م)

(۲) احمد بن علی بن ثابت، ابو بکر، خطیب بغدادی، ۳۹۲ھ کو غزیۃ (بصیغہ التصغیر) میں پیدا ہوئے، جو مکہ مکرمہ اور کوفہ کے درمیان مساوی مسافت پر واقع ہے، مکہ، بصرہ، دینور اور کوفہ وغیرہ کے اسفار کیے، بغداد میں رہائش پذیر تھے، ایک زمانہ تک شام، دمشق، طرابلس اور حلب میں مقیم رہے اور آخری عمر میں بغداد واپس آئے، حدیث، اصول حدیث اور تاریخ کے بے نظیر عالم تھے۔ ۴۶۳ھ کو بغداد میں وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۸/ ۲۷۰، النجوم الزاہرۃ: ۵/ ۸۷، الاعلام للزرکلی: ۱/ ۱۷۲) (م)

ابو بکر بن نقطہؒ[۱] یوں فرماتے ہیں۔

"کل من أنصف عَلِمَ أن المحدثين بعد الخطيب عيال على كتبه.[۲]"

"ہر منصف مزاج شخص کو اس بات کا علم ہے کہ خطیب بغدادی کے بعد آنے والے محدثین کرام ان کے علم کے محتاج ہیں۔"

۶- الالماع الى معرفة اصول الرواية وتقييد السماع :

یہ معروف محدث قاضی عیاض بن موسی یحصبیؒ (م ۵۴۴ھ) [۳] کی تصنیف ہے، یہ کتاب اصول حدیث کے جملہ مباحث پر مشتمل نہیں، بلکہ اس میں زیر بحث صرف تحمل حدیث اور طرق اداء اور ان کے متعلقہ امور ہیں، تاہم یہ کتاب اس فن میں ایک عمدہ اور بہترین تصنیف ہے، اس کی ترتیب و تنسیق بہت اعلی ہے۔

۷- ما لا يسع المحدث جهله:

یہ علامہ ابو حفص عمر بن عبد المجید میانجیؒ (م ۵۸۰ھ) [۴] کی تصنیف ہے، یہ ایک مختصر کتاب ہے، اس میں کوئی متعدبہا فوائد نہیں۔

۸- علوم الحديث :

---

[۱] محمد بن عبد الغنی بن ابی بکر بن شجاع، ابو بکر معین الدین ابن نقطہ حنبلی بغدادی، ۵۷۹ھ کو پیدا ہوئے، بے شمار شیوخ سے کسب فیض کیا اور حصولِ علم کے متعدد اسفار کیے، خراسان، شام اور مصر وغیرہ کے دور دراز سفر کیے، حدیث، رجال اور انساب کے بہت بڑے عالم تھے، ۶۲۹ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ (وفیات الاعیان:۴/ ۳۹۲، شذرات الذہب:۵/ ۱۳۲، الاعلام للزرکلی:۶/ ۲۱۱)(م)

[۲] التقیید فی رواۃ السنن والمسانید ا/ ۱۷۰، نزہۃ النظر:۳۹، قفو الأثر:۳۵، تدریب الراوي:۱/ ۴۴۔(م)

[۳] عیاض بن موسی بن عیاض بن عمرون یحصبی سبتی، ابو الفضل، سبتہ (مغرب) میں ۴۷۶ھ کو پیدا ہوئے، حدیث، اصول حدیث، انساب اور ایام عرب بہت بڑے عالم تھے، ایک زمانے تک غرناطہ کے قاضی رہے، ۵۴۴ھ میں مراکش میں ایک یہودی نے زہر دے کر شہید کر دیا تھا۔ (وفیات الاعیان:۳/ ۴۸۳، النجوم الزاہرۃ:۵/ ۲۸۵، شذرات الذہب:۴/ ۱۳۸، الاعلام للزرکلی:۵/ ۹۹)(م)

[۴] عمر بن عبد المجید بن عمر بن حسین قرشی، ابو حفص میانجی (مَيَّانِشِي)، میانش افریقہ کے باشندے تھے، پھر مکہ منتقل ہوئے اور مکہ میں شیخ الحرم تھے، وہیں ۵۸۱ھ میں وفات پائی۔ (شذرات الذہب:۴/ ۲۷۲، الاعلام:۵/ ۵۳)(م)

اس کتاب کے مصنّف علامہ ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمن شہرزوریؒ ابن الصلاح (م ۶۴۳ھ) ہیں، یہ کتاب علمی حلقوں میں "مقدمہ ابن الصلاح" کے نام سے معروف ہے، یہ اصول حدیث میں عمدہ ترین اور بہت قیمتی کتاب ہے، علامہ ابن الصلاحؒ نے اس کتاب میں خطیب بغدادیؒ اور متقدمین کے کتابوں سے خوب استفادہ کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب مفید معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے، تاہم اس میں ایک خامی یہ ہے کہ اسے مناسب فنی انداز میں مرتب نہیں کیا گیا ہے، جس کی بظاہر وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ مصنف نے اسے تھوڑا تھوڑا املاء کرایا تھا، جس کی وجہ سے حسن ترتیب و تنسیق سے عاری رہی، لیکن اس کے باوجود یہ کتاب متاخرین علماء کرام کا ہمیشہ مأخذ اور مرجع رہی۔

بعض اہل علم نے اس کی اختصار اور تلخیص کی [1]۔

بعض نے اسے منظوم قالب میں ڈھالا [2]۔ بعض حضرات نے اس پر تعاقب کیا اور

---

[1] مقدمہ ابن الصلاح کے چند تلخیصات یہ ہیں:
۱۔ ارشاد طلاب الحقائق الی معرفۃ سنن خیر الخلائق، از امام یحیی بن شرف نوویؒ (م ۶۷۶ھ)
۲۔ التقریب والتیسیر لمعرفۃ سنن البشیر النذیر، از امام یحیی بن شرف نوویؒ (م ۶۷۶ھ)
۳۔ الخلاصۃ فی اصول الحدیث النبوی، از علامہ بدر الدین ابن جماعۃؒ (م ۷۳۳ھ)
۴۔ الخلاصۃ فی علوم الحدیث، از علامہ حسین بن عبد اللہ طیبیؒ (م ۷۴۳ھ)
۵۔ اختصار علوم الحدیث، از علامہ اسماعیل بن عمر ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ)
۶۔ المقنع فی علوم الحدیث، از علامہ عمر بن علی بن ملقن (م ۸۰۴ھ)
۷۔ التذکرۃ فی علوم الحدیث، از علامہ عمر بن علی بن ملقن (م ۸۰۴ھ)
۸۔ محاسن الاصطلاح، از علامہ سراج الدین عمر بن رسلان بلقینیؒ (م ۸۰۵ھ)۔ وغیرہ۔ (م)

[2] چند منظومات یہ ہیں:
نظم الدرر فی علم الأثر، از علامہ زین الدین عبد الرحیم بن حسین عراقیؒ (م ۸۰۶ھ)۔
یہ الفیۃ العراقی کے نام سے مشہور ہے، اس کی شرح خود مصنف نے "التبصرۃ والتذکرۃ" کے نام سے تصنیف کی ہے، ایک شرح اسماعیل بن ابراہیم (م ۱۴۲۲ھ) نے "شرح الالفیۃ" کے نام سے لکھی، ایک نامکمل شرح امام بقاعیؒ (م ۸۸۵ھ) نے "النکت علی شرح الفیۃ العراقی" کے نام سے تصنیف کی ہے، الفیۃ العراقی کی سب سے بہترین شرح حافظ محمد بن عبد الرحمن سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) نے "فتح المغیث" کے نام سے لکھی ہے۔ (م)

بعض نے اس کی تائید اور دفاع میں منہمک رہے[1]۔

۹- التقریب والتیسیر لمعرفة سنن البشیر النذیر :

یہ امام محی الدین یحی بن شرف نوویؒ (م٦٧٦ھ) کی تالیف ہے، یہ کتاب در حقیقت علامہ ابن الصلاحؒ کی شہرہ آفاق "علوم الحدیث" کی اختصار اور تلخیص ہے، بہت اہم اور مفید کتاب ہے، تاہم بعض مقامات پر اس کی عبارت مغلق اور پیچیدہ ہے۔

۱۰- تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی:

یہ علامہ جلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) کی شہرہ آفاق تصنیف ہے ،یہ کتاب در حقیقت امام شرف الدین نوویؒ (م٦٧٦ھ) کی معروف کتاب "التقریب" کی شرح ہے ،جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اس کتاب میں علوم الحدیث کے متعلق اہم معلومات جمع کیے ہیں۔

۱۱- نظم الدرر فی علم الأثر:

یہ علامہ زین الدین عبد الرحیم بن حسین عراقیؒ (م۸۰٦ھ)[2] کی تالیف ہے، یہ کتاب علمی حلقوں میں "الفیہ عراقی" کے نام سے معروف ہے، علامہ عراقیؒ نے علامہ ابن الصلاحؒ کی شہرہ

---

[1] چند شروحات یہ ہیں:

۱۔النکت علی مقدمة ابن الصلاح، از علامہ بدرالدین زرکشیؒ (م۷۹۴ھ)

۲- التقییدوالایضاح لما اطلق واغلق من کتاب ابن الصلاح، از علامہ زین الدین عبد الرحیم عراقیؒ (م ۸۵۲ھ)۔

۳- النکت علی ابن الصلاح، از حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م۸۵۲ھ)

۴- محاسن الاصطلاح فی تضمین کتاب ابن الصلاح، از علامہ سراج الدین عمر بن رسلان بلقینیؒ (م۸۰۵ھ)۔(م)

[2] عبد الرحیم بن حسین بن عبد الرحمن ابو الفضل، زین الدین، کبار حفاظِ حدیث میں سے تھے، رازنان (اربل) میں ۷۲۵ھ کو پیدا ہوئے، بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ مصر کوچ کر گئے، وہاں تعلیم حاصل کی، حجاز مقدس، شام اور فلسطین کے سفر کیے، پھر واپس مصر لوٹ آئے اور قاہرہ میں ۸۰٦ھ کو وفات پائی۔ (الضوء اللامع: ۴/ ۱۷۱، غایة النہایة: ۱/ ۳۸۲، الاعلام للزرکلی: ۳/ ۳۴۴)(م)

آفاق "علوم الحدیث" کو شعری قالب میں ڈھالا ہے اور بعض مقامات میں مفید فوائد کا اضافہ کیا ہے، بہت عمدہ اور قیمتی کتاب ہے، مفید معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ اس کتاب کی متعدد شروحات لکھی گئیں ہیں، جن میں دو شرحیں خود مصنف علامہ عراقیؒ کی ہے۔

۱۲- فتح المغیث فی شرح الفیة الحدیث:

یہ علامہ محمد بن عبد الرحمن سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) [1] کی تصنیف ہے، یہ کتاب "الفیة عراقی" کی شرح ہے اس کا شمار "الفیہ عراقی" کے عمدہ اور جامع ترین شروحات میں ہوتا ہے۔

۱۳- نخبة الفکر فی مصطلح اهل الاثر:

یہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) کی معروف و مقبول کتاب ہے، یہ کتاب حجم کے اعتبار سے بہت مختصر ہے، تاہم بے شمار خصوصیات و مزایا کی حامل ہے، نہایت عمدہ اور مفید معلومات پر مشتمل ہے، ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے بے مثال کتاب ہے، مؤلفؒ نے "نزهة النظر" کے نام سے اس کی ایک بہترین شرح لکھی ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد شروحات لکھی گئیں ہیں۔

۱٤- المنظومة البیقونیة:

یہ علامہ عمر بن محمد بیقونیؒ (م ۱۰۸۰ھ) [2] کی منظوم تصنیف ہے، یہ مختصر منظومہ چونتیس اشعار پر مشتمل ہے۔ علوم حدیث میں یہ ایک عمدہ اور معروف منظومہ شمار کیا جاتا ہے ،اس کی متعدد شروحات ہیں۔

---

(۱) محمد بن عبد الرحمن بن محمد، شمس الدین سخاوی، ۸۳۱ھ کو سخا (مصر میں ایک گاؤں کا نام ہے) میں پیدا ہوئے، اسی نسبت سے سخاوی کہلاتے ہیں، حصولِ علم کے لیے طویل اسفار کیے، حدیث، تفسیر، تاریخ اور ادب کے یگانہ روزگار عالم تھے، دوسو کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کیں، مدینہ منورہ میں ۹۰۲ھ کو وفات پائی۔ (الضوء اللامع:۸/ ۲، الکواکب السائرة:۱/ ۳۵، شذرات الذهب:۸/ ۱۵، الاعلام للزرکلی:۶/ ۱۹۴)(م)

(۲) عمر (اوطه) بن محمد بن فتوح بیقونی، شافعی، دمشق کے باشندے تھے، اصول حدیث پر گہری نظر تھی، اس موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کیں، جس میں "المنظومة البیقونیة" مشہور ہے، جو علوم حدیث میں ایک مختصر، عمدہ اور معروف منظومہ شمار کیا جاتا ہے، اس کی متعدد شروحات لکھی گئیں، ۱۰۸۰ھ کو وفات پائی۔ (معجم المؤلفین:۵/ ۴۴، الاعلام للزرکلی:۵/ ۶۴)(م)

۱۵- قواعد التحدیث:

یہ علامہ محمد جمال الدین قاسمیؒ (م ۱۳۳۲ھ) [1] کی تصنیفی کاوش ہے، یہ اس فن میں عمدہ اور مفید کتاب ہے۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ اس فن میں متعدد کتابیں لکھی گئیں ہیں، جن کا ذکر طوالت کے خوف سے ترک کردیا گیا ہے، ماقبل میں چند مشہور معروف کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے[2]۔ اللہ تعالی ان کے مولفین اور مصنفین کو ہماری طرف سے اور پوری امت مسلمہ کی طرف سے اجر جزیل عطاء فرمائے۔ آمین !

---

[1] محمد جمال الدین بن محمد سعید بن قاسم حلاق، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اولاد میں سے تھے، ۱۲۸۳ھ کو دمشق میں پیدا ہوئے، اپنے زمانے میں شام کے امام و مقتدیٰ تھے، مفسر، محدث اور ادیب تھے، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، سلفی العقیدہ تھے، تقلید کے بالکل قائل نہ تھے، ۱۳۳۲ھ کو دمشق میں وفات پائی۔ (معجم المؤلفین: ۳/۱۵۷، الاعلام للزرکلی: ۲/۱۳۵)(م)

[2] ان کے علاوہ چند کتابیں یہ ہیں:

۱۔ الموقظۃ فی مصطلح الحدیث، از امام شمس الدین ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ)

۲- تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم، از علامہ بدر الدین محمد بن ابراہیم بن جماعۃؒ (م ۷۳۳ھ)

۳- تنقیح الانظار، از علامہ محمد بن ابراہیم وزیر صنعانیؒ (م ۸۴۰ھ)

۴- توضیح الافکار لمعنی تنقیح الانظار، از علامہ امیر محمد بن اسماعیل صنعانیؒ (م ۱۱۸۲ھ)

۵- توجیہ النظر الی اصول الاثر، از شیخ طاہر ابن صالح جزائریؒ (م ۱۳۳۸ھ)

۶- العرجون فی شرح البیقون، از علامہ نواب صدیق حسن خانؒ (م ۱۳۰۷ھ)

۷- الاقتراح فی بیان الاصطلاح، از علامہ محمد بن علی ابن دقیق العیدؒ (م ۷۰۲ھ)

۸- المختصر لمعرفۃ علوم الحدیث، از سید شریف جرجانیؒ (م ۸۱۶ھ)

۹- المختصر فی مصطلح اہل الاثر، از محیی الدین محمد بن سلمان حنفی کافیجیؒ (م ۸۷۹ھ)

۱۰- ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی، از محمد عبد الحی بن محمد عبد الحلیم لکھنویؒ (م ۱۳۰۴ھ)۔(م)

بنیادی اصطلاحات

۱۔ علم مصطلح الحدیث کی تعریف:

وہ علم ہے جس کے ذریعے سند اور متن کے احوال کی معرفت حاصل ہوتی ہے، تاکہ حدیث کے قبول اور عدم قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔

۲۔ علم مصطلح الحدیث کا موضوع:

سند اور متن کے متعلق قبول اور عدم قبول کا فیصلہ کرنا۔

۳۔ علم مصطلح الحدیث کی غرض وغایت:

صحیح اور غیر صحیح احادیث کے درمیان خط امتیاز کھینچنا ہے۔

۴۔ حدیث کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ حدیث کی لغوی تعریف:

حدیث لغت میں جدید اور نئی چیز کو کہتے ہیں، اس کی جمع خلاف القیاس احادیث آتی ہے[1]۔

---

[1] حدیث کے لغوی معنی جدید کے ہیں، جو قدیم کی ضد ہے، کتب حدیث میں اس مفہوم کے استعمال کی کئی مثالیں موجود ہیں، جیسے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

" كُنَّا نُسَلِّمُ فِي الصَّلَاةِ وَنَأْمُرُ بِحَاجَتِنَا، فَقَدِمْتُ عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَهُوَ يُصَلِّي، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ السَّلَامَ، فَأَخَذَنِي مَا قَدُمَ وَمَا حَدُثَ، فَلَمَّا قَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ الصَّلَاةَ قَالَ: «إِنَّ اللهَ يُحْدِثُ مِنْ أَمْرِهِ مَا يَشَاءُ، وَإِنَّ اللهَ جَلَّ وَعَزَّ قَدْ أَحْدَثَ مِنْ أَمْرِهِ أَنْ لَا تَكَلَّمُوا فِي الصَّلَاةِ »، فَرَدَّ عَلَيَّ السَّلَامَ." (سنن ابی داؤد: ۱/ ۲۴۳، رقم: ۹۲۴)

ترجمہ: پہلے ہم نماز میں سلام کیا کرتے تھے اور اپنے کام کاج کی باتیں کرلیتے تھے، میں حبشہ سے رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، میں سلام کیا آپ ﷺ نے جواب نہ دیا۔ مجھے فکر پیدا ہوئی پرانی اور نئی باتوں کی۔ جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی جو چاہتا ہے نیا حکم اتارتا ہے۔ اب نیا حکم یہ ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو۔ پھر میرے سلام کا جواب دیا۔"

حدیث کا معنی کلام، بیان، واقعہ اور قصہ بھی آتا ہے، جیسے قرآن مجید میں ہے۔ =

(ب)۔ حدیث کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں ہر اس قول، فعل، تقریر اور صفت کو کہتے ہیں، جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جاتی ہو[1]۔

۵۔ خبر کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

= (اللہ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا). [الزمر:۲۳]
ترجمہ: اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے۔
ایک جگہ ارشاد ہے۔
(فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا)- (الکہف:٦)
ترجمہ: سو شاید آپ ان کے پیچھے غم کی وجہ سے اپنی جان دے دیں گے اگر یہ لوگ اس کلام پر ایمان نہ لائیں۔
ایک جگہ ارشاد ہے۔
(فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ). [المرسلات:۵۰]
ترجمہ: اس قرآن کے بعد اور کونسا کلام ایسا ہو سکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں۔
(وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ)- (الضحی:۱۱)
ترجمہ: اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔

رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں آپ ﷺ کے بیانات، ارشادات اور افعال کے لیے حدیث کا لفظ استعمال ہوتا رہا، جس کو تابعین نے بعد میں بھی استعمال کیا۔ اس کی مثالیں کتب تاریخ وحدیث میں بکثرت ملتی ہیں، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! قیامت کے دن آپ کی شفاعت کے لحاظ سے کون انسانوں میں سے زیادہ خوش نصیب ہو گا؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

" «لَقَدْ ظَنَنْتُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ أَنْ لاَ يَسْأَلُنِي عَنْ هَذَا الحَدِيثِ أَحَدٌ أَوَّلُ مِنْكَ لِمَا رَأَيْتُ مِنْ حِرْصِكَ عَلَى الحَدِيثِ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِي يَوْمَ القِيَامَةِ، مَنْ قَالَ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللهُ، خَالِصًا مِنْ قَلْبِهِ، أَوْ نَفْسِهِ» "(صحیح بخاری: ۱/۳۱، رقم:۹۹)

ابوہریرہ! میرا اندازہ تھا کہ اس بات کے بارے میں تم سے پہلے کوئی مجھ سے سوال نہیں کرے گا، کیونکہ میں حدیث میں تمہارا شوق دیکھتا ہوں۔ میری شفاعت کے لحاظ سے قیامت کے دن وہ شخص سب سے زیادہ خوش نصیب ہو گا جو کہے گا: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں! (م)

[1] محدثین کرام کی اصطلاح میں حدیث رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب قول، فعل، تقریر اور وصفِ خَلقی و خُلقی کا نام ہے۔

=

(الف)۔ خبر کی لغوی تعریف:

خبر لغت میں "اطلاع" کو کہتے ہیں اور اس کی جمع "اخبار" آتی ہے[(۱)]۔

(ب)۔ خبر کی اصطلاحی تعریف میں تین اقوال ہیں:۔

پہلا قول: خبر حدیث کا مترادف ہے، یعنی خبر اور حدیث دونوں کا مفہوم ایک ہے۔

دوسرا قول: خبر کا مفہوم حدیث کے برعکس ہے، حدیث وہ کلام ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہو اور خبر وہ کلام ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور سے منقول ہو۔

تیسرا قول: خبر حدیث سے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے، حدیث اس کلام کو کہتے ہیں، جو صرف رسول اللہ ﷺ سے منقول ہو اور خبر وہ کلام ہے، جو رسول اللہ ﷺ یا کسی اور شخص سے منقول ہو[(۲)]۔

۶۔اثر کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ اثر کی لغوی تعریف:

= حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

" الْمُرَادُ بِالْحَدِيثِ فِي عُرْفِ الشَّرْعِ مَا يُضَافُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ. "(فتح الباری:۱/۱۹۳)

"اصطلاح شرع میں حدیث سے مراد وہ اقوال وافعال اور تقریر مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوں۔"

علامہ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) یوں تعریف کرتے ہیں۔

"مَا أُضِيفَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَوْلًا لَهُ أَوْ فِعْلًا أَوْ تَقْرِيرًا أَوْ صِفَةً، حَتَّى الْحَرَكَاتُ وَالسَّكَنَاتُ فِي الْيَقَظَةِ وَالْمَنَامِ."(فتح المغیث:۱/۲۲)

"رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب قول، فعل، تقریر اور وصفِ خَلقی و خُلقی کا نام حدیث ہے حتی کہ بیداری اور نیند کی حالت کی حرکات وسکنات بھی حدیث کہلاتی ہیں۔" (م)

(۱) دیکھئے لسان العرب:۴/۲۲۷۔(م)

(۲) نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر:۴۱. یعنی حدیث اور خبر میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے، ہر حدیث خبر ہے، لیکن ہر خبر حدیث نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) نے اسی قول کو ترجیح دیتے ہوئے کہا ہے۔

"وعبَّرْتُ هنا بالخبَرِ ليكونَ أشملَ"۔(نزہۃ النظر:۳۶)

=

اثر لغت میں کسی چیز کی باقی ماندہ کو کہتے ہیں[1]۔

(ب)۔ اثر کی اصطلاحی تعریف:

اثر کی اصطلاحی تعریف میں دو قول ہیں:

۱۔ پہلا قول: اثر حدیث کا مترادف ہے یعنی ان دونوں کا مفہوم ایک ہے۔

۲۔ دوسرا قول: اثر کا مفہوم حدیث کے برعکس ہے، اثر وہ قول اور فعل ہے، جس کی نسبت صحابہ کرام یا تابعینؒ کی طرف کی گئی ہو[2]۔

۷۔ اسناد کا مفہوم:

اسناد کے دو معانی ہیں:

(الف)۔ حدیث کی نسبت اس کے قائل کی طرف کرنے کو کہتے ہیں۔

= میں نے اس کتاب میں حدیث سے مراد خبر ہی لی ہے تاکہ یہ بات زیادہ جامع رہے۔(م)

[1] "اثر" لغت میں کسی شئ کے باقی ماندہ نشان کو کہتے ہیں۔ یاریتلی زمین پر آدمی کے چلنے کے نشانات کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔"أَوْ أَثَارَةٍ مِنْ عِلْمٍ." (سورۃ الاحقاف:۴) میں"أَثَارَةٍ" سے مراد وہ علم ہے جس کے آثار تاحال روایت یا تحریر کی وجہ سے باقی ہوں۔ کہاجاتاہے۔"اثرت العلم رویته" میں نے علم کو روایت کیا۔ اوراس کی جمع "آثار" آتی ہے۔(لسان العرب:۱/۲۵، الصحاح للجوهري ۲/۵۷۴، المعجم الوسیط ۱/۵).

[2] حاصل یہ ہے کہ اثر عام اور حدیث خاص ہے، یعنی اثر اسے کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے یا کسی اور سے مروی ہو۔ اس لیے مرفوع، موقوف اور مقطوع کو بھی اثر کہا جاتا ہے، جس کی مثال امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاویؒ (م ۳۲۱ھ) کی کتاب "شرح معانی الآثار" ہے جس میں مرفوع، موقوف، مقطوع اور مراسیل روایات ہیں۔ لغوی اعتبار سے یہ معنی زیادہ صحیح ہے اور محدثین کرام نے اسے معنی میں اس کو استعمال کیا ہے۔ علامہ عبد الحی لکھنویؒ (م ۱۳۰۴ھ) فرماتے ہیں۔

"الأثر هوالمروى عن رسول الله ﷺ أو عن صحابى أو عن تابعى مطلقاً، وبالجملة مرفوعا كان أوموقوفا، عليه جمهورالمحدثين من السلف والخلف-"(ظفر الامانی:۲۵)

"اثر اس روایت کو کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے یا صحابی سے یا تابعی سے مروی ہو۔ خواہ مرفوع ہو یا موقوف ہو۔ جمہور محدثین کرام کا یہی موقف ہے۔

علمائے خراسان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اثر حدیث سے مختلف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اقوال کے علاوہ صحابہ کرام و تابعین کے اقوال، افعال اور تقریرات کو بھی کہتے ہیں۔ اس تعریف کی رُو سے اثر کا اطلاق صرف موقوف =

(ب)۔ اسناد رواۃ حدیث کے اس سلسلہ کو کہتے ہیں، جو متن تک پہنچانے والا ہو[1]۔

اس مفہوم کے اعتبار سے اسناد اور سند باہم مترادف ہیں۔

۸۔ سند کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ سند کی لغوی تعریف:

لغت میں "سند" سہارے کو کہتے ہیں اور "سند" کو اس لیے "سند" کہا جاتا ہے کہ متن کا اعتماد اور سہارا اسی پر ہوتا ہے[2]۔

(ب)۔ سند کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں سند اس سلسلہ رجال کو کہتے ہیں، جو متن حدیث تک پہنچا دے[3]۔

۹۔ متن کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

= اور مقطوع پر ہو گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام محمد بن حسن شیبانیؒ (م۱۸۹ھ) نے اپنی موقوف روایات پر مشتمل کتاب کا نام "الآثار" رکھا ہے۔ علامہ شمس الدین سخاویؒ (م۹۰۲ھ) فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حسین بیہقیؒ (م۴۵۸ھ) کی کتاب "معرفۃ السنن والآثار" کا نام بظاہر اسی چیز کو اجاگر کرتا ہے کہ اثر کا اطلاق غیر مرفوع پر ہوتا ہے۔ (م)

(۱) سند اور اسناد دونوں متقارب المعنی ہیں، محدثین کرام ان دونوں کو ایک مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، علامہ ابن جماعہؒ (م۷۳۳ھ) فرماتے ہیں۔

" الْمُحَدِّثُونَ يَسْتَعْمِلُونَ السَّنَدَ وَالْإِسْنَادَ لِشَيْءٍ وَاحِدٍ."

(تدریب الراوی:۱/۲۸)

"محدثین کرام سند اور اسناد کو ایک ہی شئی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔"

(۲) امام خلیل بن احمدؒ (م۱۷۵ھ) سند کا لغوی معنی یوں بیان کرتے ہیں۔

" السَّنَدُ: ما ارتَفَعَ من الارض في قُبُل جَبَلٍ أو وادٍ. وكلُّ شيءٍ أسْنَدْتَ اليه شيئاً فهو مسند."

(کتاب العین:۷/۲۲۸)

"سند پہاڑ یا وادی میں بلند مقام کو کہتے ہیں اور ہر وہ چیز جس پر کوئی چیز بھروسہ کرے مسند کہلاتی ہے۔"

معروف لغوی علامہ ابن منظور افریقیؒ (م۷۱۱ھ) رقم طراز ہیں۔

"السَّنَدُ: مَا ارتَفَعَ مِنَ الأَرض فِي قُبُل الْجَبَلِ أَو الْوَادِي، وَالْجَمْعُ أَسْنادٌ۔" (لسان العرب:۳/۲۲۰)

"سند وادی یا پہاڑ میں بلند جگہ کو کہتے ہیں اور اس کی جمع اسناد آتی ہے۔" (م)

(۳) اصطلاح میں سند رواۃ کے اس سلسلے کو کہتے ہیں جو متنِ حدیث تک پہنچاتا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔ =

(الف)۔ متن کی لغوی تعریف:

لغت میں متن زمین کے اس سخت حصہ کو کہتے ہیں جو سطح سے بلند ہو[(۱)]۔

(ب)۔ متن کی اصطلاحی تعریف:

= ”هو حكاية طريق المتن“۔(شرح نخبۃ الفکر:٣٧)
”سند متن کے طریق (راویوں کے نام) کی حکایت کو کہتے ہیں۔“
علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ٩١١ھ) رقم طراز ہیں۔
” وَأَمَّا السَّنَدُ فَقَالَ الْبَدْرُ بْنُ جَمَاعَةَ وَالطِّيبِيُّ: هُوَ الْإِخْبَارُ عَنْ طَرِيقِ الْمَتْنِ. قَالَ ابْنُ جَمَاعَةَ: وَأَخْذُهُ إِمَّا مِنَ السَّنَدِ، وَهُوَ مَا ارْتَفَعَ وَعَلَا مِنْ سَفْحِ الْجَبَلِ؛ لِأَنَّ الْمُسْنِدَ يَرْفَعُهُ إِلَى قَائِلِهِ، أَوْ مِنْ قَوْلِهِمْ: فُلَانٌ سَنَدٌ، أَيْ مُعْتَمَدٌ، فَسَمَّى الْإِخْبَارَ عَنْ طَرِيقِ الْمَتْنِ سَنَدًا لِاعْتِمَادِ الْحُفَّاظِ فِي صِحَّةِ الْحَدِيثِ وَضَعْفِهِ عَلَيْهِ.وَأَمَّا الْإِسْنَادُ فَهُوَ رَفْعُ الْحَدِيثِ إِلَى قَائِلِهِ. قَالَ الطِّيبِيُّ: وَهُمَا مُتَقَارِبَانِ فِي مَعْنَى اعْتِمَادِ الْحُفَّاظِ فِي صِحَّةِ الْحَدِيثِ وَضَعْفِهِ عَلَيْهِمَا. وَقَالَ ابْنُ جَمَاعَةَ: الْمُحَدِّثُونَ يَسْتَعْمِلُونَ السَّنَدَ وَالْإِسْنَادَ لِشَيْءٍ وَاحِدٍ. “ (تدریب الراوی:١/٢٧-٢٨)
”علامہ بدرالدین بن جماعہؒ اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ متنِ حدیث تک پہنچنے کے واسطے کو سند کہتے ہیں۔علامہ ابن جماعہؒ فرماتے ہیں کہ سند پہاڑ کی چوٹی کو کہا جاتا ہے اوراس میں بھی مسند حدیث کو اس کے راوی تک پہنچا دیتا ہے اور یا اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ فلاں شخص سند ہے،یعنی قابل اعتماد ہے، پس متن کے طریق کی خبر دینے کو سند اس لیے کہتے ہیں کہ حفاظ اس پر حدیث کی صحت یا ضعف کے فیصلہ کے لیے اعتماد کرتے ہیں جب کہ حدیث کو اس کے قائل تک پہنچانے کو اسناد کہا جاتا ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کی صحت اور ضعف کے فیصلہ کے لیے محدثین کرامؒ کے ان پر اعتماد کرنے کے اعتبار سے یہ دونوں چیزیں ہم معنی ہیں۔علامہ ابن جماعہؒ کا قول ہے کہ محدثین کرامؒ سند اور اسناد ایک ہی چیز کے لیے استعمال کرتے ہیں۔“ (م)

(۱) متن کا لفظ لغت میں کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً سخت وبلند زمین، دور کرنا، غائب ہونا وغیرہ۔ متن کا معنی قوی اور مضبوط کے بھی ہیں۔اسی سے ”الحبل المتين“ مستعمل ہے۔علامہ ابن جماعہؒ (٧٣٣ھ) فرماتے ہیں۔
”وَأَخْذُهُ إِمَّا مِنَ الْمُمَاتَنَةِ، وَهِيَ: الْمُبَاعَدَةُ فِي الْغَايَةِ؛ لِأَنَّهُ غَايَةُ السَّنَدِ، أَوْ مِنْ مَتَنْتُ الْكَبْشَ: إِذَا شَقَقْتُ جِلْدَةَ بَيْضَتِهِ وَاسْتَخْرَجْتُهَا، فَكَأَنَّ الْمُسْنِدَ اسْتَخْرَجَ الْمَتْنَ بِسَنَدِهِ؛ أَوْ مِنَ الْمَتْنِ وَهُوَ: مَا صَلُبَ وَارْتَفَعَ مِنَ الْأَرْضِ؛ لِأَنَّ الْمُسْنِدَ يُقَوِّيهِ بِالسَّنَدِ وَيَرْفَعُهُ إِلَى قَائِلِهِ؛ أَوْ مِنْ تَمَتَّنَ الْقَوْسَ أَيْ شَدَّهَا بِالْعَصَبِ؛ لِأَنَّ الْمُسْنِدَ يُقَوِّي الْحَدِيثَ بِسَنَدِهِ.“ (تدریب الراوی:١/٢٨) =

اصطلاح میں متن کلام کے اس حصہ کو کہتے ہیں، جس پر سند ختم ہو[۱]۔

۱۰۔ مسنَد (نون مفتوح کیساتھ) کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ مسند کی لغوی تعریف:

لغت میں مسند "أسند" سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ "أسند الشيء إليه" کے معانی کسی چیز کو منسوب کرنے کے آتے ہیں[۲]۔

(ب)۔ مسند کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں "مسند" کے تین معانی آتے ہیں:

۱۔ مسند ہر اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں ہر صحابی کی الگ الگ مرویات جمع کی گئی ہوں۔

۲۔ مسند ہر اس مرفوع حدیث کو کہتے ہیں، جس کی مسند متصل ہو۔

۳۔ یہ مصدر میمی ہے اس سے سند مراد ہے، اس معنی کے اعتبار سے یہ سند کا مترادف ہو گا[۳]۔

۱۱۔ مسنِد (نون مکسور کیساتھ) کی تعریف:

= "متن یا متانت سے ماخوذ ہے اور وہ انتہائی دوری کا نام ہے کیونکہ وہ سند کا آخر ہوتا ہے، یا یہ "مَتَنْتُ الْكَبْشَ" (میں نے مینڈھے کی کھال اتاری) سے ماخوذ ہے، جب آپ نے اس کو جلد کو پھاڑ کر اسے باہر نکالا تو گویا سند نے متن کو اپنی سند کے ذریعہ نکال دیا ہے۔ یا یہ "متن" سے ماخوذ ہے جو زمین کے سخت اور بلند حصے کا نام ہے، کیونکہ مسند سند کے ذریعے اسے مضبوط کرتا ہے اور قائل کی طرف لے جاتا ہے۔ یا "تَمَتَّنَ الْقَوْسَ" سے ماخوذ ہے، یعنی اس نے "عصب" سے کمان کو مضبوط کیا، کیونکہ مسند سند کے ذریعے حدیث کو مضبوط کرتا ہے۔"

[۱] متن اصطلاح میں سند سے اگلا حصہ کہلاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) رقم طراز ہیں۔
"«والمتن هو غاية ما ينتهي إليه الإسناد من الكلام». "(نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۱)
"متن حدیث کے ان الفاظ کو کہا جاتا ہے جہاں سند ختم ہو جاتی ہے۔"
علامہ ابن جماعہؒ (م ۷۳۳ھ) فرماتے ہیں۔
" هُوَ مَا يَنْتَهِي إِلَيْهِ غَايَةُ السَّنَدِ مِنَ الْكَلَامِ " (تدریب الراوی: ۱/۲۲۸)
"متن وہ ہے جس پر سند کا اختتام ہوتا ہے۔" (م)

[۲] القاموس المحیط: (ص ۳۷۰)، لسان العرب: (۳/۲۲۱) .(م)

[۳] تدریب الراوی: ۱/۲۸، الیواقیت والدرر شرح نخبۃ الفکر: ۲/۲۲۸، قواعد التحدیث للقاسمی: ۲۰۲۔(م)

مسنِد اس شخص کو کہتے ہیں، جو حدیث کو سند کے ساتھ روایت کرے، خواہ حدیث کا علم رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو[(۱)]۔

۱۲۔ محدث کی تعریف:

محدث وہ شخص کہلاتا ہے، جس کا مشغلہ روایت اور درایت کے اعتبار سے علم حدیث ہو اور اس کو اکثر روایات اور ان کے رواۃ کا علم ہو[(۲)]۔

۱۳۔ حافظ کی تعریف:

حافظ کے متعلق اہل علم کے دو قول ہیں:

(الف)۔ اکثر محدثین کرامؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حافظہ محدث کا مترادف ہے۔

---

(۱) تدریب الراوی: ۱/ ۳۰، قواعد التحدیث: ۷۷، منہج النقد فی علوم الحدیث: ۷۶۔ (م)

(۲) اہل علم نے محدث کی تعریف میں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے، تاہم محدث کہلانے کے لیے علوم الحدیث کی مہارت ضروری ہے۔ علامہ ابن سید الناسؒ (م ۷۳۴ھ) فرماتے ہیں۔

" الْمُحَدِّثُ فِي عَصرِنَا فَهُوَ مَنِ اشْتَغَلَ بِالْحَدِيثِ رِوَايَةً وَدِرَايَةً، وَجَمَعَ رُوَاةً، وَاطَّلَعَ عَلَى كَثِيرٍ مِنَ الرُّوَاةِ وَالرِّوَايَاتِ فِي عَصْرِهِ، (وَتَمَيَّزَ فِي ذَلِكَ حَتَّى عُرِفَ فِيهِ حِفْظُهُ) وَاشْتُهِرَ فِيهِ ضَبْطُهُ."

(تدریب الراوی: ۱/ ۳۸).

"ہمارے زمانے میں محدث وہ ہے جو فن حدیث بحیثیت روایت اور درایت اور راویوں کے جمع کرنے میں مصروف عمل ہو اور اپنے زمانے کے راویوں اور روایتوں کی اکثریت سے مطلع ہو۔ اسے اس میں امتیاز حاصل ہو حتی کہ اس کا خط پہچانا جائے اور اس کا ضبط مشہور ہو۔"

علامہ ابن جزریؒ محدث کی تعریف یوں فرماتے ہیں۔

"والمحدث من تحمل الحَدِيث رِوَايَة، واعتنى بِهِ دِرَاية."

(شرح شرح نخبۃ الفکر للقاری: ۱۲۲، منہج النقد فی علوم الحدیث: ۷۶)

"محدث وہ ہے جو روایت کے لحاظ سے حامل حدیث ہو اور جس کو روایتِ حدیث میں خصوصی مہارت حاصل ہو۔"

محدثین کو اہل حدیث بھی کہتے ہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) فرماتے ہیں۔

" وَنَحْنُ لَا نَعْنِي بِأَهْلِ الْحَدِيثِ الْمُقْتَصِرِينَ عَلَى سَمَاعِهِ أَوْ كِتَابَتِهِ أَوْ رِوَايَتِهِ بَلْ نَعْنِي بِهِمْ: كُلَّ مَنْ كَانَ أَحَقَّ بِحِفْظِهِ وَمَعْرِفَتِهِ وَفَهْمِهِ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا وَاتِّبَاعِهِ بَاطِنًا وَظَاهِرًا وَكَذَلِكَ أَهْلُ الْقُرْآنِ." (مجموع الفتاوی: ۴/ ۹۴)

=

(ب)۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ حافظ کا درجہ محدث سے بلند ہے، اس لیے کہ حافظ کو رواۃ کے ہر طبقہ میں سے اکثر کا علم ہوتا ہے، یعنی یہ ہر طبقہ کے اکثر رواۃ سے واقف ہوتا ہے[1]۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل حدیث ہر اس شخص کو کہتے ہیں، جو حصولِ حدیث میں منہمک ہو اور اس کی طلب میں یکسو ہو گیا ہو، پس یہی اہل حدیث ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی مسلک سے ہو، خود ائمہ حدیث کے بیان سے اس کا ثبوت ملتا ہے، کیونکہ وہ سب اس امر پر متفق ہیں، امام حاکم صاحب مستدرک ائمہ حدیث میں سے ہیں، حالانکہ محدثین جانتے ہیں کہ وہ شیعہ تھے۔

حافظ محمد بن عبد الرحمن سخاویؒ (م ۹۰۲) فرماتے ہیں۔

"أهل الحديث عندنا من يستعمل الحديث."

(الجواہر والدرر فی ترجمة شیخ الاسلام ابن حجر: ۱/ ۷۸)

"اہل حدیث وہ ہیں جو حدیث پر عمل پیرا ہوں۔"

حافظ محمد بن عبد الرحمن سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) نے "الجواہر والدرر" میں اہل علم کے متعدد اقوال و آراء نقل کیے ہیں کہ:

اہل حدیث ان کو کہتے ہیں جو حدیث پر عمل کرتے ہوں اور ان کا شب و روز مشغلہ حدیثوں کو بیان کرنا اور ان کا پڑھنا پڑھانا ہو۔ لیکن اس قسم کے لوگ بہت ہی کم اور ناپید ہیں، امام شہاب الدین زہریؒ سے منقول ہے۔

"مثل أصحاب الحديث مثلُ التِّمساح يبيضُ مائة بيضة، تفسُد تسعة وتسعون، وتسلم واحدة." (الجواہر والدرر فی ترجمة شیخ الاسلام ابن حجر: ۱/ ۸۶)

"اہل حدیث کی مثال اس مگرمچھ کی طرح ہے جو ایک سو انڈے دے دیتا ہے، جس میں صرف ایک انڈہ محفوظ رہتا ہے اور باقی ننانوے خراب ہو جاتے ہیں۔" (م)

[1] حافظ وہ ہے جس نے احادیث کی کثیر تعداد کو حفظ کیا ہو اور اس کو علوم حدیث میں اس قدر مہارت حاصل ہو کہ رجال حدیث کو طبقہ بہ طبقہ محفوظ کیا ہو اور ان کے احوال، تراجم اور بلدان کی پوری معرفت حاصل کی ہو۔ علامہ ابن الجزریؒ نے یوں تعریف کی ہے۔

"الحافظ: من روى ما يصل إليه ووعى ما يحتاج لديه".

(شرح شرح نخبة الفکر للقاری: ۱۲۲، منہج النقد فی علوم الحدیث: ۷۶)

"حافظ وہ ہے جس نے روایت کیا اس علم کو جو اس تک پہنچا اور محفوظ رکھا اسے جس کی ضرورت محسوس کی۔"

=

....

= بعض متاخرین حضرات کہتے ہیں کہ حافظ وہ ہے جس کو ایک لاکھ احادیث سنداً ومتناً یاد ہوں، تاہم یہ بات محلِ نظر ہے، اس لیے کہ محدثین کرام کے نزدیک حفظ کے معنی معرفت کے ہیں، زبانی یاد کرنے کے نہیں ہیں، حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

"لقب من مهر فِي معرفَة الحَدِيث." (نزہۃ الالباب فی الالقاب:۱/۱۸۸)

"حافظ اس کو کہتے ہیں جو حدیث کی معرفت میں مہارت رکھتا ہو۔"

نیز حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

"فللحافظ في عرف المحدثين شروط إذا اجتمعت في الراوي سموه حافظا.وهو الشهرة بالطلب والأخذ من أفواه الرجال لا من الصحف.والمعرفة بطبقات الرواة ومراتبهم. والمعرفة بالتجريح والتعديل، وتمييز الصحيح من السقيم حتى يكون ما يستحضره من ذلك أكثر مما لا يستحضره مع استحضار الكثير من المتون. فهذه الشروط إذا اجتمعت في الراوي سموه حافظا." (النکت علی کتاب ابن الصلاح:۱/۲٦۸)

"محدثین کے نزدیک حافظ کے لیے چند شروط کا ہونا ضروری ہے کہ وہ حصول اور طلبِ حدیث کے سلسلے میں شہرت کا حامل ہو، کتب اور صحف کے بجائے شیوخ سے بالمشافہ کسبِ فیض کیا ہو۔ طبقات رواۃ اور ان کے مراتب سے معرفت سے واقف ہو، جرح وتعدیل میں مہارت رکھتا ہو۔ صحیح سقیم میں خطِ امتیاز کھینچ سکتا ہو۔ اور اس کیساتھ ساتھ کثیر متون اس کو مستحضر ہوں، جب راوی میں یہ شروط پائی جائیں تو اسے حافظ کہتے ہیں۔"

حافظ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) اس پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں اپنی رائے کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔

" واعلم أنه ينبغي أن لا يقبل الوصف بذلك إلا مِنْ موصوف به، فربَّ من يسردُ كثيرًا من الأنساب والمتون ممن هو قاصر في تخريج الحديث، وتمييز صحيحه من سقيمه، ومعرفة علله وقصور عبارته، وجمود فهمه، عند مَنْ لا تمييز له، فيصفه بذلك ظنًّا منه أنَّ ذلك بمجرده كافٍ، وهذه غفلةٌ، إنَّما الحفظ المعرفة." (الجواہر والدرر:۱/۸۹)

" یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ حافظ کا لقب اس شخص کو دیا جائے جو اس کا اہل ہو، ورنہ بہت لوگ انساب اور متونِ حدیث کو بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں، لیکن حدیث کی تخریج، صحیح وضعیف میں تمیز اور علل کی معرفت نہیں رکھتے، فہم کے جمود اور قصور کے شکار ہوتے ہیں اور اس کے باوجود بھی ناواقف لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ حافظ ہیں، حالانکہ یہ ان کی غفلت ولا پرواہی ہے! اس لیے کہ حفظ کے معنی فہم ومعرفت کے ہیں۔"

مذکورہ شروط کے تناظر میں حافظ کے لقب پانے والے محدثین بہت کم ہیں، اس لیے ہر کس وناکس کو اس =

۱۴۔حاکم کی تعریف:

بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ حاکم اس محدث کو کہتے ہیں، جس کو تمام ذخیرہ احادیث کا علم اور جو احادیث اس کے احاطہ علم سے باہر ہوں ان کی تعداد بہت کم ہوں[1]۔

= لقب سے نوازنا مناسب نہیں، حافظ شمس الدین سخاویؒ (م۹۰۲ھ) نے محدث سمعانی کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ بغداد میں ایک بڑی جماعت حافظ کے لقب سے مشہور ہیں، حالانکہ وہ حدیث کے ابجد تک سے واقف نہیں! شاہد ان کا لقب اس لیے پڑ گیا کہ وہ کپڑوں کے حفاظت کرنے والے ہوں تو ان کا لقب حافظ پڑ گیا ہو!! دیکھئے: الجواہر والدرر:۱/۸۸، معرفتِ علوم حدیث:۱۲۶۔(م)

(۱) بعض حضرات نے حاکم کی یہ تعریف کی ہے کہ حاکم وہ ہے جو تمام ذخیرہ احادیث سنداً متناً، جرحاً وتعدیلاً وتاریخاً مستحضر ہو۔ لیکن یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ حاکم اس شخص کو کہتے ہیں جو قضاء کے عہدے سے وابستہ رہا ہو، اس لقب کا حدیث اور اس کے روایت ودرایت سے کوئی تعلق نہیں، جہاں تک حاکم نیسابوریؒ (م۴۰۵ھ) سے جڑا یہ لقب تو وہ ان کے قصبہ شاش کی قضاء پر ایک طویل عرصہ فائز ہونے کی وجہ سے تھا۔ نہ کہ علم حدیث میں ان کی قدر ومنزلت کی وجہ سے تھا۔ (ہامش قواعد فی علوم الحدیث:۲۹، علوم حدیث غوری:۱۵۹، معرفت علوم حدیث:۱۳۰)

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ القاب محدثین کے متعلق فرماتے ہیں۔

"محدث، حافظ، حجت اور حاکم مخصوص اصطلاحات ہیں، جس کا اطلاق احادیث کی کچھ معین تعداد یاد ہونے پر ہوتا ہے، لیکن محققین کے نزدیک یہ بات درست نہیں۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تعظیمی الفاظ ہیں جو مختلف محدثین کو دیئے جاتے ہیں، خاص طور سے یہ کہنا کہ "حاکم اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے پورا ذخیرہ حدیث یاد ہو" بالکل بے اصل بات ہے کیونکہ آج تک کوئی ایسا محدث نہیں گزرا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تعظیمی القاب مختلف درجات کے لیے ہیں۔ ادنی درجہ محدث ہے، پھر حافظ اور پھر حجت، جس کے لیے کوئی خاص مقدار مقرر نہیں۔"

(درسِ ترمذی:۱/۱۵۰)

مذکورہ مراتب کے علاوہ دیگر مراتب (حجۃ، امیر المؤمنین فی الحدیث) بھی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ حجۃ: حجۃ کا اطلاق حافظ پر ہی ہوتا ہے، لیکن اس وقت جب اسے اسانید ومتون کے حفظ میں اتقان حاصل ہو اور تمام علوم پر گہری نظر رکھتا ہو۔ متاخرین کے ہاں حجۃ کی تعریف میں یہ شرط بیان کی گئی ہے کہ اسے تین لاکھ احادیث مع سند ومتن یاد ہوں۔ (منہج النقد فی علوم الحدیث:۷۷)

=

=متاخرین حضرات کی یہ تعریف درست نہیں، اس لیے کہ حجت کے لقب کا تعلق روایت کیساتھ نہیں، بلکہ درایت کیساتھ ہے، اس کا درجہ ثقہ سے اوپر ہے، امام شمس الدین ذہبیؒ (م۷۴۸ھ) فرماتے ہیں۔
"الحجة: فوق الثقة." (تذکرۃ الحفاظ:۳/۹۷۹)

نیز دوسری بات یہ ہے کہ محدثین میں سے بے شمار حضرات کو حجت کے لقب سے موسوم کیا گیا ہے، حالانکہ ان کی اتنی مرویات نہیں جتنی متاخرین نے بتلائی ہے، جیسے ثابت بن اسلم ابو محمد بُنانی کو حجت کہا گیا ہے، لیکن امام علی بن مدینیؒ (م۲۳۴ھ) کی تصریح کے مطابق ان کی مرویات صرف دوسو پچاس ہیں۔ اسی طرح محدثین نے امام شعبة بن حجاجؒ (م۱۶۱ھ) کو حجت کہا ہے حالانکہ ان کی کل مرویات دو ہزار ہیں۔ دیکھئے: تذکرۃ الحفاظ:۱/۱۹۳، ۱۲۵۔(م)

۲۔ امیر المؤمنین فی الحدیث: یہ سب سے اعلی مرتبہ ہے اس کا مستحق وہ محدث ہے جو حفظ واتقان، تعمق فی الحدیث اور معرفتِ علل میں سب سے فائق ہو حتی کہ اس کے ہمعصر حدیث کے تمام معاملات میں اس کی طرف رجوع کریں۔ اس لقب سے ملقب معروف محدثین میں شعبہ بن الحجاجؒ، سفیان الثوریؒ، عبد اللہ بن مبارکؒ، مالک بن انسؒ، احمد بن حنبلؒ، محمد بن اسماعیل بخاریؒ اور مسلم بن حجاج نیسابوریؒ شامل ہیں۔ (منہج النقد فی علوم الحدیث:۷۷، اصول الحدیث:۱/۵۵)

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام مراتب محدث کے وسعت علم اوراتقان کی بناپر طے ہوتے ہیں، ایک محدث جتنا تعمق فی الحدیث حاصل کرتا ہے اور اسے معرفت علل میں رسوخ پیدا ہوتا ہے اتنا ہی اس کا مرتبہ ومقام بڑھتا جاتا ہے۔ امام نوویؒ نے ان کو امور کو گنوایا ہے جو ایک محدث کے لیے ناگزیر ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"وليس المراد من هذا العلم مجرد السماع ولا الاسماع ولا الكتابة بل الاعتناء بتحقيقه والبحث عن خفى معانى المتون والاسانيد والفكر في ذلك ودوام الاعتناء به ومراجعة أهل المعرفة به ومطالعة كتب أهل التحقيق فيه وتقييد ما حصل من نفائسه وغيرها." (شرح النووی:۱/۴۷)

"اس علم سے مراد مجرد سماع، سنانا اور لکھنا نہیں بلکہ اس کی تحقیق کی طرف توجہ دینا ہے اور متون واسانید میں جو کچھ مخفی ہے اسے تلاش کرنا، مسلسل اعتناء اور اہل معرفت کی طرف رجوع کرنا ہے اور اس میں محققین کی کتب سے مطابقت حاصل کرنے کیساتھ حاصل شدہ عمدہ حقائق کو ضبط کرنا ہے۔"

مذکورہ القاب کی تحدید اور حدبندی جن محدثین سے منقول ہے یہ ان کے اپنے زمانہ اور عرف کے اعتبار سے ہے، محدث جلیل علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے مذکورہ القاب کی جدید تشکیل وتدوین کی ہے اور شیخ عبد الفتاح ابوغدةؒ (م۱۴۱۷ھ) نے بھی ان کی تائید وتصویب فرمائی ہے۔ قواعد فی علوم الحدیث:۲۸-۳۰۔(م)

باب اول: خبر کے متعلق

یہ باب درج ذیل تین فصلوں پر مشتمل ہے:

فصل اول: ہم تک پہنچنے کے اعتبار سے خبر کی تقسیم

فصل دوم: خبر واحد کی اقسام وانواع

فصل سوم: حدیث مقبول اور غیر مقبول پر ایک نظر

فصل اول: ہم تک پہنچنے کے اعتبار سے خبر واحد کی تقسیم

یہ فصل دو مباحث پر مشتمل ہے:

مبحث اول: خبر متواتر کا بیان

مبحث دوم: خبر واحد کا بیان

فصل اول: ہم تک پہنچنے کے اعتبار سے خبر کی تقسیم

تمہید:

ہم تک پہنچنے کے اعتبار سے خبر کی دو قسمیں ہیں[(۱)]:

۱۔ خبر متواتر[(۲)]   ۲۔ خبر آحاد[(۳)]

---

(۱) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) نے مصطلحات کی بحث کا آغاز سند کے لحاظ سے کیا ہے یہاں بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، تاہم علامہ ابن صلاحؒ نے "مقدمہ ابن الصلاح" میں اور امام نوویؒ نے "التقریب" میں مصطلحات کا آغاز صحیح، حسن اور ضعیف کی تقسیم سے کیا ہے اور علامہ سیوطیؒ نے "تدریب الراوی" میں اسی ترتیب کو قائم رکھا ہے۔ (م)

(۲) علامہ ابن الصلاحؒ اور امام نوویؒ نے "التقریب" میں متواتر کو حدیثِ مشہور کی اقسام میں شمار کیا ہے۔ دیکھئے مقدمہ ابن الصلاح: ۲۷۲، التقریب: ۸۵۔ (م)

(۳) مذکورہ تقسیم محدثین کرام کے منہج اور اسلوب کے مطابق ہے، تاہم فقہائے حنفیہ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف اتصال کی نسبت سے حدیث رسول کی تین قسمیں بیان کی ہیں:۔

۱۔ کامل و مکمل درجہ کا اتصال ہو جس میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہو۔

۲۔ اتصال ہو، لیکن اس میں صورۃً شبہ ہو، معناً شبہ نہ ہو، اس حیثیت سے کہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں تواتر قائم ہو۔

۳۔ اتصال ہو، لیکن صورۃً اور معناً دونوں اعتبار سے شبہ پایا جاتا ہو۔

پہلی قسم متواتر، دوسری قسم مشہور اور تیسری قسم خبر واحد کہلاتی ہے، البتہ ائمہ احناف میں امام ابو بکر جصاصؒ اور امام دبوسیؒ نے اس تقسیم سے اختلاف کیا ہے اور انہوں نے بنیادی طور پر دو قسمیں بیان کی ہیں، پھر ان دونوں حنفی علماء کی تقسیم کی نوعیت میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام ابو بکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ خبر کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: متواتر اور غیر متواتر۔ پھر متواتر کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ جس سے بدیہی طور پر علم و یقین حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرا جس سے دلیل و نظر کے ذریعہ علم و یقین حاصل ہوتا ہو۔ متواتر کی نظری صورت کو مشہور سے تعبیر کرتے ہیں۔

(الفصول فی الاصول: ۳/ ۳۵)

یاد رہے کہ امام ابو بکر جصاصؒ کے نزدیک مشہور متواتر کی ایک قسم ہے جب کہ امام عیسی بن ابانؒ نے اسے الگ قسم بیان کیا ہے، جمہور احناف نے امام عیسی بن ابانؒ کے مذہب کو اختیار کیا ہے۔

امام ابوزید دبوسیؒ (م ۴۳۰ھ) نے خبر کی دو قسمیں بیان کی ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں۔

"الأخبار التي يعمل بها ضربان: مشهور، وغريب. فالمشهور: ضربان، ما بلغ حد التواتر، وما اشتهر ولم يبلغ حد التواتر." (تقویم الادلہ فی اصول الفقہ: ۲۰۷) =

۱۔ اگر خبر کے طرق غیر محصور ہوں اور تعداد متعین نہ ہو تو اسے خبر متواتر کہتے ہیں۔
۲۔ اور اگر خبر کے طرق محصور اور تعداد متعین ہو تو اسے خبر آحاد کہا جاتا ہے۔٭

٭ = ''معمول بہ احادیث کی دو قسمیں ہیں: مشہور اور غریب۔ پھر مشہور کی دو قسمیں ہیں: ایک جو درجہ تواتر کو پہنچ جائے، دوسری جس کو شہرتِ عامہ حاصل ہو، لیکن درجہ تواتر کو نہ پہنچے۔''

امام ابوزید دبوسیؒ کی اس تعبیر سے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ ان کی تقسیم اامام ابو بکر جصاصؒ سے ملتی جلتی ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں، بلکہ امام ابوزید دبوسیؒ کی تقسیم جمہور احناف کے قریب تر ہے اس لیے کہ انہوں نے مشہور کے حکم میں امام عیسی بن ابانؒ کے قول کو ترجیح دی ہے، جس میں انہوں نے مشہور کو متواتر سے کم اور خبر واحد پر فوقیت دی ہے، اس حکم کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے امام ابوزید دبوسیؒ کا جمہور ائمہ احناف سے اختلاف لفظی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے، تاہم ابو بکر جصاصؒ کا جمہور ائمہ احناف سے اختلاف حقیقی معلوم ہوتا ہے۔

بعض متاخرین حنفیہ نے بھی متقدمین احناف کے تعبیرات سے الگ محدثین کرام کو بیان کردہ تقسیم کو اختیار کیا ہے، جن میں ابن حنبلی حنفیؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور عبدالعزیز فرہارویؒ کے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دیکھئے: قفو الاثر: ۴۶-۴۸، اصول الحدیث: ۴۷-۵۷، کوثر النبی: ۴-۶۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ متاخرین حنفیہ نے مجموعی طور پر صرف پیروی کی ہے، بنیادی تقسیم میں کوئی پیروی نہیں۔ محدثین کرام اور فقہائے احناف کے اصطلاح میں اس فرق کی وضاحت علامہ ابن ہمامؒ، علامہ ابن امیر حاجؒ، علامہ محمد امین بن محمود امیر بادشاہؒ، علامہ محب اللہ بہاریؒ، عبدالعلی انصاریؒ، علامہ عبدالحی لکھنویؒ اور مولانا محمد اکرم سندیؒ نے کی ہے۔ دیکھئے: التحریر: ۳۰۸-۳۱۱، التقریر والتحبیر: ۲/ ۲۳۰-۲۳۵، تیسر التحریر: ۳/ ۳۰-۳۷، مسلم الثبوت: ۲/ ۸۷-۹۷، فواتح الرحموت: ۲/ ۲۳۵، ظفر الامانی: ۳۲-۳۳، امعان النظر: ۳۱۔

محدثین کرام اور فقہائے حنفیہ کی اصطلاحات میں مختلف پہلوؤں سے نمایاں فرق ہے:

۱۔ محدثین کرام کی تقسیم ثنائی ہے اور جب کہ فقہائے حنفیہ کی تقسیم ثلاثی ہے۔

۲۔ خبر مشہور محدثین کے نزدیک خبر واحد کی قسم ہے اور فقہائے حنفیہ کے نزدیک خبر مشہور خبر واحد کی قسم نہیں بلکہ قسیم ہے۔

۳۔ محدثین کرام کے نزدیک خبر متواتر اور خبر واحد کے درمیان اور کوئی قسم نہیں، جب کہ حنفی فقہاء اور اصولیین کے نزدیک خبر متواتر اور خبر واحد کے درمیان ایک قسم ''مشہور'' ہے۔

۴۔ محدثین کرام کے نزدیک خبر واحد کبھی تو آحاد الاصل ہو کر متواتر الفرع ہوتی ہے اور اس کے برعکس، جیسے ایک روایت کو ایسی جماعت نے نقل کی ہے جس کی تعداد حد تواتر کو نہیں پہنچتی، اس کے بعد وہ روایت متصل زمانہ یا اس کے بعد کے زمانہ میں پھیل جاتی ہے، اس اعتبار سے وہ متواتر الفروع ہو جاتی ہے، =

پھر ان دونوں میں سے ہر ایک کی مختلف اقسام وانواع ہیں، جنہیں ان شاء اللہ درج ذیل مباحث میں پوری بسط وتفصیل کے ساتھ بیان کریں گے، ملاحظہ ہوں۔

= یاوہ روایت آغاز میں متواتر کی تک جو پہنچ رہی ہے، لیکن اس کے بعد وہ روایت سند کے ایک حصے میں، یاپھر سند کے تمام طبقات میں آحاد ہو جاتی ہے جب کہ حدیثِ مشہوراحناف کے نزدیک عصر صحابہ میں آحاد ہوتی ہے، لیکن وہ روایت قرنِ ثانی اور قرنِ ثالث میں پھیل کر متواتر بن جاتی ہے۔ دیکھئے: کشف الاسرار:۲/ ۶۵۴، فتح الغفار:۲/ ۷۶، اصول السرخسی:۱/ ۲۸۲، امعان النظر:۳۱۔(م)

مبحث اول: خبر متواتر کا بیان[۱]

ا۔ خبرِ متواتر کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ خبر متواتر کی لغوی تعریف:

لغت میں متواتر (اسم فاعل) "تواتر" سے مشتق ہے، جس کے معانی پے در پے ہونے کے ہیں، جیسے عربی محاورہ ہے۔" تواتر المطر"۔ (مسلسل بارش ہوئی)۔

(ب)۔ خبر متواتر کی اصطلاحی تعریف:

متواتر وہ حدیث ہے، جس کو ہر دور میں اتنی کثیر تعداد نے روایت کی ہو، جن کا کذب بیانی پر متفق ہونا محال ہو[۲]۔

اس اصطلاحی تعریف کا مفہوم یہ ہے کہ خبر متواتر اس حدیث اور خبر کو کہتے ہیں، جس کے ہر طبقہ میں اتنی کثیر تعداد میں رواۃ موجود ہوں کہ عقل انسانی ان سب کا جھوٹ پر متفق ہونے کو عادۃً محال قرار دے۔[۳]

---

[۱] محدثین متواتر کی بحث مستقل طور پر ذکر نہیں کرتے بلکہ اس سلسلے میں فقہاء اور اصولیین کی پیروی کرتے ہیں، کیونکہ تواتر علم الاسناد کے مباحث میں سے نہیں۔ علم الاسناد میں حدیث کی صحت اور اس کے ضعف کا تذکرہ ہوتا ہے تاکہ بصورت صحت اس پر عمل کیا جائے اور ضعیف ہونے کی صورت میں اس پر عمل نہ کیا جائے۔ اور جہاں تک متواتر کا تعلق ہے تو اس میں رجال کی بحث ہی نہیں ہوتی اس پر عمل بغیر بحث کے واجب ہوتا ہے۔ دیکھئے: نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۵۔ (م)

[۲] الكفاية في علم الرواية: ۱۶، مقدمہ ابن الصلاح: ۲۷۳، المستصفی: ۱/ ۱۳۲، المحصول: ۲/ ۱۰۸، البحر المحیط: ۴/ ۲۳۱، نزهة النظر: ۵۳، تدريب الراوي: ۲/ ۱۷۶، ظفر الأماني: ۳۹، توجیہ النظر: ۱/ ۱۰۷، مقدمۃ نظم المتناثر: ۱۱. (م)

[۳] مذکورہ تعریف محدثین کرام کی ذکر کردہ ہے، تاہم فقہائے حنفیہ سے خبر متواتر کی تعریف میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ امام ابو بکر جصاصؒ (م ۳۷۹ھ) فرماتے ہیں۔

"فَالْمُتَوَاتِرُ مَا تَنْقُلُهُ جَمَاعَةٌ لِكَثْرَةِ عَدَدِهَا لَا يَجُوزُ عَلَيْهِمْ فِي مِثْلِ صِفَتِهِمْ الِاتِّفَاقُ وَالتَّوَاطُؤُ فِي مَجْرَى الْعَادَةِ عَلَى اخْتِرَاعِ خَبَرٍ لَا أَصْلَ لَهُ." (الفصول فی الاصول: ۳/ ۳۷) =

۲۔ خبر متواتر کے شرائط:

ماقبل میں خبر متواتر کے اصطلاحی تعریف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خبر متواتر کے تحقق کے لیے درج ذیل شرائط ہیں:

(الف)۔ اس کے رواۃ کثیر ہوں، تاہم اس میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کثیر کی تعداد کم سے کم کتنی ہے؟ مختلف اقوال ہیں، لیکن راجح قول یہ ہے کہ کم از کم دس راوی..................

= "خبر متواتر وہ ہے جس کو ایک جماعت نقل کرے، عام طور پر اس جیسے کثرت سے توقع نہیں کی جاتی کہ وہ کسی ایسی بات پر جمع ہو جائیں جس کی حقیقت اور بنیاد نہ ہو۔"

امام ابو زید دبوسیؒ (م ۴۳۰ھ) فرماتے ہیں۔

"بأن ينقل إليك قوم لا يتوهم في العادات تواطؤهم على الكذب لكثرتهم، وبعد أماكنهم عن قوم مثلهم، حتى يكون آخر طرفيه كأوله، وأوسطه كطرفيه." (تقویم الادلۃ: ۲۰۷)

"متواتر ایسی روایت ہے جس کو ایسی قوم نے بیان کیا ہو، عام طور پر جن کے کثرتِ عدد اور ایسے افراد کے تباین اماکن کی وجہ سے جھوٹ پر جمع ہونا خیال نہ کیا جاتا ہو، یہاں تک کہ اس کے دو حصوں کی انتہا شروع جیسی اور اس کا درمیان اس کے آخر کی طرح ہو۔"

امام بزدویؒ، امام سرخسیؒ اور بعض دیگر اہل علم نے بھی اسی تعریف کو پسند کیا ہے۔ (کنز الاصول: ۱۵۰، اصول السرخسی: ۱/ ۲۸۲، کشف الاسرار: ۲/ ۶، التوضیح: ۲/ ۶)

بعض فقہائے احناف نے "خبر جماعة مفيد للعلم بنفسه" کی اضافی قید لگائی ہے، جن کی پیروی بعض متاخرین احناف میں علامہ عبد العزیز بن احمد علاؤ الدین بخاریؒ (م ۷۳۰ھ)، علامہ کمال الدین ابن ہمامؒ (م ۸۶۱ھ)، علامہ زین الدین قاسم بن قطلوبغاؒ (م ۸۷۹ھ)، علامہ محمد امین بن محمد امیر بادشاہؒ (م ۹۷۲ھ)، ملا علی قاریؒ (م ۱۰۱۴ھ) اور علامہ محب اللہ بن عبد الشکور بہاریؒ (م ۱۱۱۹ھ) اور بعض دیگر حضرات نے کی ہے۔ دیکھئے: کشف الاسرار: ۲/ ۶۵۶، التحریر: ۳۰۸، خلاصۃ الافکار: ۱۲۹، تیسیر التحریر: ۳/ ۳۰، توضیح المبانی: ۳۰۵، مسلم الثبوت: ۱/ ۷۸۔

فقہائے احناف کی خبر متواتر کے متعلق تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک خبر متواتر کے تحقق کے لیے تین شرطیں ہیں اور دوسرا یہ کہ خبر متواتر کا تعلق امر حسی سے ہے نہ کہ محض عقل سے، مثلاً: علامہ مظفر الدین ابن ساعاتیؒ (م ۶۹۴ھ) فرماتے ہیں کہ جمہور ائمہ احناف کے نزدیک تواتر کے لیے تین شرطیں ہیں:

۱۔ ناقلین کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ ان سے جھوٹ کا پایا جانا ممتنع ہو۔

۲۔ ناقلین کے ہاں امر حسی ہو، خواہ بصر سے ہو یا سمع سے ہو۔

۳۔ ناقلین اول و آخر کیساتھ درمیان میں بھی برابر ہو۔ (بدیع النظام: ۱۵۹) (م)

ہوں[۱]۔ *

(ب)۔ رواۃ کی کثرت سند کی ہر طبقے میں پائی جائے[۲]۔

(ج)۔ اس کثیر تعداد کا کذب بیانی پر عادۃ متفق ہونا محال ہو[۳]۔

---

(۱) تدریب الراوي ج۲، ص۱۷۷. (ط)

* بعض اہل علم نے اپنے ذوق کے مطابق تعیین کی ہے، بعض حضرات نے شہادتِ زنا پر قیاس کرتے ہوئے کم از کم تعداد چار بتلائی ہے۔ بعض نے شہادت لعان پر قیاس کرتے ہوئے کم از کم تعداد پانچ بتلائی ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ کم از کم تعداد دس ہے، اس لیے کہ کثرت کا اطلاق کم از کم دس پر ہوتا ہے۔ بعض نے نقباء بنی اسرائیل پر قیاس کرتے ہوئے کم از کم تعداد بارہ بتلائی ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ کم از کم تعداد بیس ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کے غلبہ کی جو تعداد قرآن مجید نے بیان کی ہے وہ بیس ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ راویوں کی تعداد ستر ہونی چاہیے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا تھا۔ بعض علماء نے اہل بدر کی تعداد پر قیاس کرتے ہوئے تین سو تیرہ کا عدد تجویز کیا ہے۔

مذکورہ تعداد کو اگرچہ قرآن مجید سے مستنبط کیا گیا ہے، تاہم اسے قطعی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ جو تعداد بھی مفید علم یقینی ہو وہ متواتر ہونے کے لیے کافی ہے، اس کے لیے کوئی خاص حد مقرر کرنا مطلوب نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔

"فلا مَعْنى لِتعْيينِ العَدَدِ على الصَّحيحِ،" (نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۲)

"صحیح بات یہ ہے کہ تعداد کا تعین بے معنی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ خبر متواتر میں کثرت رواۃ مطلوب ہے کہ روایت کرنے والے اتنے ہوں کہ عادتاً ان کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو۔ (م)

(۲) یعنی یہ تعداد ہر طبقہ میں یکساں ہو۔ ورنہ ایسا ممکن ہے کہ ایک خبر ایک سطح پر تو متواتر ہو، لیکن دوسری سطح پر وہ منقطع التواتر ہو۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

"أَنْ يستويَ الأمْرُ فيهِ في الكثرةِ المذكورةِ من ابتدائِهِ إلى انتهائِهِ - والمرادُ بالاستواءِ أَنْ لا تَنْقُصَ الكَثْرَةُ المَذكورةُ في بعضِ المَواضِعِ لا أَنْ لا تَزيدَ، إذ الزِّيادَةُ هُنا مطلوبةٌ مِن بابِ أَوْلى"۔ (نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۳)

"مذکورہ کثرت شروع سے لے کر آخر تک برابر رہے۔ برابر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ کثرت کسی مقام پر بھی کم نہ ہو۔ زیادہ ہونے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس سلسلہ میں زیادہ ہونا بطریق اولیٰ مطلوب ہے۔" (م)

(۳) روایت کرنے والوں کا تعلق مختلف ممالک یا مختلف اقوام سے ہو یا وہ مختلف مسالک سے تعلق رکھتے ہوں، اس بنا پر بعض راویوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، لیکن ان کی روایت کردہ خبر متواتر نہیں ہوتی اور بعض دفعہ راویوں کی تعداد کم ہوتی ہے، لیکن ان کی روایت کردہ خبر متواتر ہوتی ہے، اصل بات یہ ہے کہ راویوں کے احوال کے مدنظر یہ فرق وقوع پذیر ہوتا ہے۔ (ط)

(د)۔ راویوں کو اس خبر یا حدیث کا علم ظاہری حواس کے ذریعے حاصل ہو مثلاً: روایت کرنے والے یوں کہیں۔ ”ہم نے سنا، یا ہم نے دیکھا، یا ہم نے ہاتھ لگایا“ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ اس خبر کا دارومدار محض عقل پر نہ ہو، جیسے حدوث عالم وغیرہ کی خبر دینا، ورنہ ایسی صورت میں یہ خبر متواتر کے زمرے میں شمار نہیں ہوگی[1]۔

۳۔ خبر متواتر کا حکم:

خبر متواتر ایسے علم یقینی کا فائدہ دیتا ہے کہ انسان قطعی طور پر اس کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جس طرح کوئی شخص ایک واقعہ کا بذات خود مشاہدہ کرے تو اسے اس کی تصدیق کرنے میں ذرا بھر تردد اور تأمل نہیں ہوتا[2]۔ خبر متواتر کی بھی یہی صورت حال ہوتی ہے اس لیے خبر متواتر بہر صورت قابل قبول ہوتا ہے اور اس کے رواۃ پر تحقیق اور بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۴۔ خبر متواتر کی اقسام وانواع:

خبر متواتر کی دو قسمیں ہیں:

(الف)۔ متواتر لفظی (ب) متواتر معنوی

(الف)۔ متواتر لفظی کا مفہوم:

وہ خبر ہے، جس کے الفاظ اور معنی دونوں متواتر ہوں[3]، جیسے یہ حدیث ہے۔

---

(۱) حاصل یہ ہے کہ جس خبر کا تعلق عقل سے ہو وہ متواتر نہیں بن سکتی، اس لیے جس خبر کا تعلق عقل سے ہو اس کے بارے میں سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور سوچ سمجھ کے طریقے متنوع اور صلاحیتیں مختلف ہو سکتی ہیں جب کہ دیکھنے اور سننے میں اختلاف کی گنجائش کم ہے۔(م)

(۲) خبر متواتر مفید علمِ یقینی ضروری ہوتا ہے یا مفید علم یقینی نظری؟ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ خبر متواتر مفید علمِ یقینی ضروری ہوتی ہے اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ مفید علمِ یقینی نظری ہوتی ہے، یہ اشاعرہ میں سے امام الحرمین، معتزلہ میں سے ابوالحسن بصری اور کعبی وغیرہ کی رائے ہے جس کی طرف حافظ ابن حجرؒ نے ”قیل“ سے اشارہ کیا ہے۔(نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۴)۔ (م)

(۳) متواتر لفظی وہ خبر ہے جس کو رواۃ کی جماعت اول، وسط اور آخر سند میں ایک ہی لفظ اور ایک ہی صورت میں روایت کرے۔ علامہ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) کا نقطہ نظر یہ ہے کہ متواتر لفظی نادرالوجود بلکہ معدوم ہے اس کی مثال تلاشِ بسیار کے باوجود بھی نہیں مل سکتی، تاہم یہ حدیث «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ =

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ».(١)

”جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کی وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔“

اس حدیث کو ستر سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے(٢)۔

(ب)۔ متواتر معنوی کا مفہوم:

وہ خبر ہے، جس کا صرف معنی متواتر ہو، لیکن الفاظ میں تواتر نہ ہو(٣)، جیسے دعاء میں رفع یدین کی احادیث اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ تقریباً سو کے لگ بھگ احادیث منقول ہیں، ہر حدیث میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعاء کے لیے ہاتھ مبارک اٹھائے تھے، تاہم

= النَّارِ». اس سے مستثنیٰ ہے اس کو باسٹھ صحابہ کرامؓ نے روایت کیا ہے۔(مقدمہ ابن الصلاح:٣٧٣)

لیکن حافظ ابن حجرؒ(م٨٥٢ھ)نے علامہ ابن الصلاحؒ(م٦٤٣ھ)کے اس دعوی کو محل نظر قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

” ومِن أَحْسَنَ مَا يُقَرَّرُ بِهِ كونُ المُتواترِ مَوجوداً وُجودَ كَثْرةٍ في الأَحاديثِ أَنَّ الكُتُبَ المشهورةَ المُتداوَلَةَ بأَيدي أَهْلِ العِلْمِ شَرْقاً وغَرْباً المَقْطوعَ عِنْدَهُم بِصحَّةِ نِسْبَتِها إلى مُصَنِّفيها، إذا اجْتَمَعَتْ على إِخراجِ حَديثٍ، وتعدَّدَتْ طُرُقُه تعدُّداً تُحيل العادةُ تواطُؤَهُمْ على الكَذِبِ إلى آخِرِ الشُّروطِ؛ أَفادَ العِلْمَ اليَقينيَّ بصحَّتِهِ إلى قائِلِهِ. ومِثْلُ ذلكَ في الكُتُبِ المَشْهُورَةِ كَثيرٌ.“(نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر:٤٦)

”جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ متواتر احادیث بکثرت موجود ہیں یہ بات ہے کہ جو مشہور و معروف کتب حدیث عام طور سے شرق و غرب میں لوگوں کے ہاتھوں میں متداول ہیں اور جن کی نسبت ان کے جامعین کی جانب بالکل قطعی ہے جب یہ کتب کسی حدیث کے روایت کرنے میں متفق و متحد ہوں، اس حدیث کے طرق واسانید بھی اس قدر متعدد ہوں کہ عقل عادۃً ان کے کذب پر جمع ہونے کو محال سمجھتی ہو۔ تو ایسی حدیث یقینی علم کا فائدہ دے گی اور اس کی نسبت اس کے قائل کی جانب صحیح ہو گی۔ کتبِ حدیث میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔“

علامہ عبد الرحمن سیوطیؒ(م٩١١ھ)نے بھی علامہ ابن الصلاحؒ(م٦٤٣ھ)کی نظریے کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ بہت سی احادیث متواتر لفظی ہیں۔(تدریب الراوی:٢/ ٦٣٠)۔(م)

(١) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب إثم من کذب علی النبي ﷺ: ١/ ٢٠٢، حدیث ١١٠، صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب التثبت في الحدیث: ٤/ ٢٢٩٨، حدیث ٧٢. اس حدیث کو ابو داوٗد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی اور امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔(ط)

(٢) دیکھئے: نظم المتناثر من الحدیث المتواتر:٢٨۔(م)

(٣) متواتر لفظی کو متواتر اسنادی اور متواتر معنوی کو متواترِ قدرِ مشترک بھی کہتے ہیں۔(تدریب الراوی:٢/ ٦٣١)

مواقع مختلف ہیں اور ہر موقع اور محل کے متعلق روایات میں تواتر نہیں۔ البتہ جملہ روایات میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعاء کے لیے ہاتھ اٹھائے ہیں۔ اب یہ قدر مشترک مجموعہ طرق کے اعتبار سے متواتر معنوی کہلاتا ہے[1]۔[2]

۵۔ خبر متواتر کا وجود:

خبر متواتر کی ایک اچھی خاصی کتب احادیث میں موجود ہے[3]، جیسے "حدیث حوض کوثر

---

(۱) تدریب الراوي ۲ / ۱۸۰. (م)

(۲) اصولِ حدیث کی عام کتابوں میں متواتر کی یہی دو قسمیں مذکور ہیں، تاہم امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ (م۱۳۵۳ھ) نے ان پر مزید دو کا اضافہ کیا ہے:

۱- متواترِ عملی ۲- متواترِ طبقہ

۱۔ متواترِ عملی: وہ متواتر ہے جس پر قرن وعہد کا ایک بڑا مجمع وجماعت عمل پیرا ہو، جیسے مسواک، پنج وقتہ نماز اور دیگر شعائرِ اسلام جو رسول اللہ ﷺ کے عہد سے آج تک نسل در نسل عملاً نقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس کو تواتر العمل والتوارث بھی کہتے ہیں۔

۲۔ متواترِ طبقہ: وہ متواتر ہے جس کو ایک نسل وطبقہ اپنے سے پہلی نسل وطبقہ سے نقل کرے، جیسے قرآن مجید کا تواتر۔ قرآن مجید مشرق ومغرب میں درس وتلاوت اور حفظ وقراءت کے ذریعے ایک زمانے کے لوگ دوسرے زمانے کے لوگوں سے نقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس کو تواتر الطبقہ بھی کہتے ہیں۔ (فیض الباری: ۱/ ۷۰)

علامہ ابراہیم بن موسی غرناطی شاطبیؒ (م۷۹۰ھ) نے متواتر کی ایک پانچویں قسم "المستفاد من الاستقراء فی موارد الشریعۃ" بھی ذکر کی ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے دلائل مہیا ہو جائیں جن کا مجموعی تاثر قطعیت کا فائدہ دے۔ ان میں سے ہر دلیل مطلوب پر دال ہو، کوئی بلاواسطہ اور کوئی بالواسطہ۔ تاہم سب کا مفہوم ایک ہو۔ اگرچہ انفرادی طور پر ایک ظنی ہو، جیسے نماز اس کی فرضیت ان دلائل سے ثابت ہوتی ہے جن کا مجموعہ قطعیت ظاہر کرتا ہے اور اس کے دلائل حد متواتر تک ہیں، بعض میں اس کی ادائیگی کا صریح مطالبہ ہے، بعض میں نماز پڑھنے پر مدح اور اجر وثواب اور نہ پڑھنے پر مذمت اور سزا کا ذکر ہے۔ اس کو متواتر استدلالی بھی کہتے ہیں۔ (الموافقات: ۱/ ۳۸)

متواتر معنوی اور متواتر استدلالی میں فرق یہ ہے کہ متواتر معنوی بلاواسطہ دلالت کرتی ہے جب کہ متواتر استدلالی بالواسطہ دلالت کرتی ہے۔ (اصول الحدیث: ۱/ ۶۷) (م)

(۳) معروف محدث ابن حبانؒ (م۳۵۴ھ) نے صحیح ابن حبان کے مقدمہ میں تواتر کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ تمام احادیث خبر آحاد ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ " وَأَمَّا الْأَخْبَارُ فَإِنَّهَا كُلُّهَا أَخْبَارُ آحَادٍ ؛ لِأَنَّ لَيْسَ يُوجَدُ عَنْ النَّبِيِّ ﷺ خَبَرٌ مِنْ رِوَايَةِ عَدْلَيْنِ ، رَوَى أَحَدُهُمَا عَنْ عَدْلَيْنِ وَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَنْ عَدْلَيْنِ حَتَّى يَنْتَهِي ذَلِكَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا اسْتَحَالَ هَذَا وَبَطَلَ ، ثَبَتَ أَنَّ الْأَخْبَارَ كُلَّهَا أَخْبَارُ آحَادٍ ، وَمَنْ رَدَّ قَبُولَهُ فَقَدْ رَدَّ السُّنَّةَ كُلَّهَا ؛ لِعَدَمِ وُجُودِ السُّنَنِ إِلَّا مِنْ رِوَايَةِ الْآحَادِ ." (الإحسان في تقريب صحیح ابن حبان (۱/ ۱۵۶) (م)

[1]، حدیث مسح علی الخفین [2]، حدیث رفع الیدین فی الصلاۃ [3]، حدیث «نضَّر الله امرأ سمع مَقَالتي ...» "[4] وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی متعدد احادیث ہیں [5]۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اگر ہم اخبار آحاد کے اعداد وشمار پر نظر ڈالیں تو ہمیں ان کے مقابلے میں خبر متواتر کی تعداد بہت کم معلوم ہوگی۔

٦۔ خبر متواتر پر مشہور و معروف تصانیف:

محدثین نے احادیث متواترہ کو یکجا جمع کرنے پر بھرپور توجہ دی اور انہیں مستقل تصانیف کی صورت میں مرتب فرمایا، تاکہ طالب حدیث کو بوقت ضرورت کسی قسم پریشانی کا سامنا نہ پڑے اور سہولت وآسانی کیساتھ مراجعت کرسکے، اسی نوعیت کے چند معروف تصانیف یہ ہیں۔

(الف)... الْأَزْهَارُ الْمُتَنَاثِرَةُ فِي الْأَخْبَارِ الْمُتَوَاتِرَةِ:

یہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی تصنیف لطیف ہے اور یہ ابواب پر مرتب ہے۔

(ب)... قَطْفُ الْأَزْهَار:

یہ بھی علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی تالیف ہے، جو درحقیقت "الْأَزْهَارُ الْمُتَنَاثِرَةُ فِي الْأَخْبَارِ الْمُتَوَاتِرَةِ" کی اختصار اور تلخیص ہے۔

---

(1) حدیث حوض کوثر تقریباً پچاس سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔(نظم المتناثر:۲۳۶، رقم:۳۰۵)(م)

(2) حدیث مَسْح علی الخُفَّین ستر سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔(نظم المتناثر:٦٠، رقم:۳۲)(م)

(3) حدیث رفع الیدین في الصَّلاۃ پچاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، حافظ ابن کثیرؒ (م۷۷۴ھ) فرماتے ہیں کہ اس سے رفع الیدین عند الافتتاح مراد ہے۔ دیکھئے نظم المتناثر:۸۵، رقم:٦٧۔(م)

(4) حدیث «نضَّر الله امرأ سمع مَقَالتي ...» تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔(نظم المتناثر:۳۳، رقم:۳)(م)

(5) علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) اور علامہ محمد بن جعفر کتانیؒ (م) نے متواتر احادیث کی ایک معتد بہا تعداد بتلائی ہے، جیسے: ۱۔ حدیث: «نزل القُرآن على سَبْعة أحرف ...» .ستائیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے: نظم المتناثر:۱۷۳، رقم:۱۹٦۔

۲۔ حدیث: «من بَنَى لله مَسْجدًا بَنَى الله له بيتا في الجنَّة». اکیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے: نظم المتناثر٦٧، رقم:۵۴۔

۳۔ حدیث: «كُل مُسْكر حرام». تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے: نظم المتناثر:۱۵۳، رقم:۱٦۵۔

(ج)...نظم المتناثر من الحديث المتواتر:
یہ علامہ محمد بن جعفر کتانیؒ کی تصنیفی کاوش ہے[١]۔ *

۴۔حدیث: «بَدَأ الإسلام غَرِيبًا». انیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے: نظم المتناثر:۴۸،رقم:۲۰۔
۵۔حدیث: سُؤال مُنكر ونَكير. چھبیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے: نظم المتناثر:۱۲۳،رقم:۱۱۱۔
٦۔حدیث: «عذاب القبر ونعيمه». اکتیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے: نظم المتناثر:۱۲۵،رقم:۱۱۳۔
۷۔حدیث: «المَرءُ مع من أحبَّ». پندرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے: نظم المتناثر:۲۰۲،رقم:۲۴٦۔
۸۔ حدیث: «إنَّ أحدكُم ليَعْمل بعمل أهل الجنَّة. سولہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے: نظم المتناثر:۱۸۳،رقم:۲۱۵۔
۹۔حدیث: «بَشِّر المَشّائين في الظُّلَم إلى المَسَاجد بالنُّور التَّام يوم القيامة». پندرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے نظم المتناثر:۸۰،رقم:٦۰۔(م)

[١] علامہ محمد بن جعفر کتانیؒ نے اس میں تین سو دس احادیث جمع کی ہیں اور ان کے مصادر پر بحث کی ہے۔
* اس کے علاوہ دیگر کتب یہ ہیں۔
۱۔لقط اللآلي المتناثرة في الأحاديث المتواترة، از علامہ أبو الفیض محمد مرتضی الحسینی الزبیدیؒ۔
۲۔اللآلي المتناثرة في الأحاديث المتواترة، از علامہ محمد بن طولون دمشقیؒ (م۹۵۳ھ)(م)

مبحث دوم: خبر آحاد کا بیان

ا۔ خبر آحاد کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ خبر آحاد کی لغوی تعریف:

لغت کے لحاظ سے آحاد "احد" کی جمع ہے، جو "واحد" کے معنی میں ہے اور خبر واحد اور خبر واحد اس خبر کو کہتے ہیں، جس کو ایک شخص روایت کرے [1]۔

(ب)۔ اخبار آحاد کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں خبر واحد اس خبر کو کہتے ہیں، جس میں خبر متواتر کے شرائط نہ ہوں [2]۔ *

۲۔ خبر آحاد کا حکم:

خبر واحد علم نظری کا فائدہ دیتا ہے، جس کا مدار غور و فکر اور استدلال پر ہوتا ہے اور اس

---

(۱) نزهة النظر: ٥٠. (ط)

(۲) نزهة النظر ص ٢٦، الكفاية في علم الرواية: ١٦، المستصفى: ١١٦، الرسالة للشافعي: ٣٦٩۔ (م)

* مذکورہ تعریف محدثین کی بیان کردہ ہے، فقہائے حنفیہ نے خبر واحد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"كل خبريرويه الواحد أو الإثنان فصاعداً، لاعبرة للعدد فيه بعد أن يكون دون المشهور والمتواتر." (کنز الاصول: ١١٢)

"خبر واحد وہ روایت ہے جس کا نقل کرنے والا ایک دو، یا اس سے زیادہ ہوں، تعداد کا کوئی اعتبار نہیں ہے، البتہ خبر مشہور اور خبر متواتر سے عدد میں کم ہو۔"

خبر واحد کے حکم کے بارے میں فقہائے حنفیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس پر عمل پر واجب ہے تاہم اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا۔ امام ابو بکر جصاصؒ (م ٣٧٠ھ) فرماتے ہیں۔

"خبرذلك الواحد يوجب العمل بموجب حكمه." (الفصول فی الاصول: ١/ ٥٥١)

"خبر واحد اپنے حکم کے بارے میں عمل کو لازم کرتی ہے۔"

یہی نقطہ نظر امام شمس الائمہ سرخسیؒ (م ٤٨٣ھ)، امام ابو زید دبوسیؒ (م ٤٣٠ھ)، امام بزدویؒ (م ٤٨٢ھ) علامہ ابن نجیمؒ (م ٩٧٠ھ) اور دیگر فقہائے حنفیہ کا بھی ہے۔ دیکھئے: اصول السرخسی: ١/ ٣٢١، تقویم الادلۃ: ١٧٠، کنز الاصول: ١١٢، فتح الغفار: ٢/ ٧٨، نہایۃ الوصول: ١٦٣، التوضیح: ٢/ ٨۔ (م)

کے بعد اس کے متعلق فیصلہ کیا جا سکتا ہے[1]۔

واضح رہے کہ اخبار آحاد کی مختلف اعتبارات سے دو قسمیں ہیں، جس کا تذکرہ فصل ثانی میں کیا جائے گا۔

---

(۱) اہل علم کا اس بات میں اختلاف ہے کہ صحیح خبر واحد سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے یا یقینی؟ احناف، شوافع اور مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ صحیح خبر واحد سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے اور وجوبِ عمل اور علمِ یقینی کا فائدہ نہیں دیتا۔ امام احمدؒ، داؤد ظاہریؒ اور امام ابن حزمؒ، حسین بن علی کرابیسی، حارث بن اسد محاسبی کا مذہب یہ ہے کہ خبر واحد صحیح حدیثِ متواتر کی طرح یقینی علم کا فائدہ دیتی ہے۔ امام ابن حزمؒ (م۴۵۶ھ) رقم طراز ہیں۔" قال أبو محمد قال أبو سليمان والحسين عن أبي علي الكرابيسي والحارث بن أسد المحاسبي وغيرهم أن خبر الواحد العدل عن مثله إلى رسول الله ﷺ يوجب العلم والعمل معا وبهذا نقول وقد ذكر هذا القول أحمد بن إسحاق المعروف بابن خويز منداد عن مالك بن أنس وقال الحنفيون والشافعيون وجمهور المالكيين وجميع المعتزلة والخوارج إن خبر الواحد لا يوجب العلم ومعنى هذا عند جميعهم أنه قد يمكن أن يكون كذبا أو موهوما فيه." (الإحكام في أصول الأحكام:۱/۱۱۹)

امام محمد بن محمد غزالیؒ (م۵۰۵ھ) فرماتے ہیں۔

"خَبَرُ الْوَاحِدِ لَا يُفِيدُ الْعِلْمَ، وَهُوَ مَعْلُومٌ بِالضَّرُورَةِ فَإِنَّا لَا نُصَدِّقُ بِكُلِّ مَا نَسْمَعُ، وَلَوْ صَدَّقْنَا وَقَدَّرْنَا تَعَارُضَ خَبَرَيْنِ فَكَيْفَ نُصَدِّقُ بِالضِّدَّيْنِ-" (المستصفى:۱۱۶)

"خبر واحد مفید علم نہیں اور یہ بات واضح طور پر معلوم ہے کیونکہ ہم ہر سنی ہوئی بات کی تصدیق نہیں کر سکتے اگر ہم نے تصدیق کی اور دو خبروں کا تعارض مانا تو ہم ضدین کی تصدیق کیسے کریں گے؟"

معروف اصولی علامہ حسام الدینؒ (م۶۴۴ھ) خبر واحد پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"وخبرالواحد غالب الرأى والمستنكرمنه يفيدالظن، وإن الظن لايغنى من الحق شئيا"-(الحسامی:۷۶)

"اور خبر واحد جس میں راجح پہلو رائے کا ہو اور طمانیت کی حامل نہ ہو تو وہ ظن کا فائدہ دیتی ہے اور ظن حق بات کے مقابلے میں کچھ کام نہیں دیتا۔"

علامہ عبد العلی محمد الانصاریؒ (م۱۲۳۵ھ) شرح مسلم الثبوت میں خبر واحد پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"الأكثر من أهل الاصول ومنهم الأئمة الثلاثة (على أن خبر الواحد إن لم يكن) هذا الواحد المخبر (معصوما) نبيا (لا يفيد العلم مطلقا) سواء احتف بالقرائن أوّلا." (فواتح الرحموت:۳/۲۵۲)

"اکثر اصولیین اور ائمہ ثلاثہ کی رائے ہے کہ خبر واحد اگر خبر دینے والا نبی نہیں تو یہ مطلقا مفید علم نہیں، خواہ اس سے قرائن ملحق ہوں یا نہ ہوں۔"

اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کے لیے دیکھئے: اصول الحدیث، از ڈاکٹر خالد علویؒ: ۱/۹۵۔(م)

فصل ثانی: خبر آحاد کے اقسام وانواع

یہ فصل دو مباحث پر مشتمل ہے:

مبحث اول: تعدد طرق کے اعتبار سے خبر آحاد کی تقسیم

مبحث دوم: قوت وضعف کے اعتبار سے خبر آحاد کی تقسیم

مبحث اول: تعدد طرق کے اعتبار سے خبر آحاد کی تقسیم

تعدد طرق کے اعتبار سے خبر آحاد کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مشہور ۲۔ عزیز ۳۔ غریب

ذیل میں ہر ایک قسم پر الگ الگ بحث کی جائے گی۔

مطلب اول: مشہور کا بیان[۱]

۱۔ مشہور کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ مشہور کی لغوی تعریف:

لغت کے اعتبار سے یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے، عربی محاورہ ہے۔ "شهرتُ الأمر" (میں نے بات ظاہر کر دی) یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی بات کا اعلان اور اظہار مقصود ہو۔ اس شہرت کی بنیاد پر اسے خبر مشہور کیا جاتا ہے[۲]۔

(ب)۔ خبر مشہور کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں خبر مشہور اس روایت کو کہتے ہیں، جس کے سند کے ہر طبقہ میں تین یا تین سے زائد راوی ہوں، بشر طیکہ تین سے زائد کی تعداد حد تواتر کو نہ پہنچے[۳]۔ *

---

[۱] معرفة علوم الحدیث: ۹۲ - ۹۴، مقدمة ابن الصلاح: ۲۷۰-۲۷۳، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۳۸ - ۵۴۴، التقریب: ۱۵۲ - ۱۵۳، الاقتراح: ۳۱۰، اختصار علوم الحدیث: ۱۶۵ - ۱۶۶ الشذا الفیاح: ۲/ ۴۳۴ - ۴۴۵، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۴۲۷ - ۴۴۰، فتح الباقي: ۲/ ۲۶۵ - ۲۷۷، نزهة النظر: ۶۲ - ۷۱، فتح المغیث: ۳/ ۲۷ - ۴۱، و تدریب الراوي: ۲/ ۱۷۳ - ۱۷۹، توضیح الأفکار ۲/ ۴۰۱ - ۴۱۱، ظفر الأماني: ۳۹ - ۷۶. اصول السرخسی: ۲/ ۶۴، الاحکام لابن حزم: ۲/ ۱۴۳، ارشاد الفحول للشوکانی: ۱۰۵۔ (م)

[۲] مختار الصحاح: ۱/ ۱۶۷. (م)

[۳] نزهة النظر، ص ۲۳، توجیه النظر إلی أصول الأثر: ۱ / ۱۸. (ط)

* مذکورہ تعریف محدثین کرام کی بیان کردہ ہے، تاہم فقہائے حنفیہ خبر مشہور کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں، امام ابوزید دبوسیؒ (۴۲۰ھ) اور علامہ بزدویؒ (م ۴۸۲ھ) فرماتے ہیں۔ خبر مشہور وہ ہے، جس کے =

۲۔ خبر مشہور کی مثال:

خبر مشہور کی مثال یہ حدیث ہے۔

«إِنَّ اللّٰه لاَ يَقْبِضُ العِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ العِبَادِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ العِلْمَ بِقَبْضِ العُلَمَاءِ، حَتَّى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ

= ناقلین صدرِ اول میں درجہ تواتر کو نہ پہنچ پائیں، خواہ ابتداء میں ایک راوی ہو یا زیادہ ہوں، لیکن بعد ازاں وہ روایت قرن ثانی اور قرن ثالث میں قبولیت و شہرت عامہ حاصل کر لے اور اس کے ناقلین کے بارے میں جھوٹ پر جمع ہونا گمان نہ کیا جاسکے۔ یہی تعریف امام شمس الائمہ سرخسیؒ (م ۴۸۳ھ) نے بھی ذکر کی ہے۔

(تقویم الادلہ: ۲۱۲، کنز الاصول: ۱۵۲، اصول السرخسی: ۱/ ۲۹۲)

جمہور فقہائے احناف کا بھی یہی نقطہ نظر رہا ہے، تاہم علامہ ابو الیسر بزدویؒ نے مشہور کی تعریف جمہور حنفیہ سے مختلف کی ہے۔

"فصل فی الخبرالمشهور: أما إذا ثبت قول النبی ﷺ ثبوتاً مع الشبهة، بأن يروی قوم لا يتصور منهم الكذب ولكن الظاهر منهم الصدق بأن كانوا عدولاً، أو روی واحدعدل، فإن كان الخبرمشهوراً إذا شهربين الفقهاء فی الأزمنة أجمع، وقبله الفقهاء، وعملوا به فهذا مثل الخبرالمتواتر." (معرفة الحجج الشرعية: ۱۰۷)

"خبر مشہور یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا فرمان اس طرح سے ثابت ہو جائے کہ شبہ موجود ہو، اس طور پر کہ ایسی قوم روایت کرے جس سے جھوٹ کا وہم و گمان نہیں کیا جاسکتا۔ عادل ہونے کی وجہ سے بظاہر ان سے سچ کی توقع ہے، یا پھر کوئی ایک عادل راوی بیان کرے، پس اگر خبر مشہور فقہاء کے ہاں بہترین زمانہ میں شہرت پالے اور فقہاء کے ہاں قبولیت پالے اور وہ اس عمل پر عمل کریں تو ایسی خبر درجہ متواتر کی طرح ہے۔"

اس تعریف کو بعض اہل علم علامہ عبد العزیز بخاریؒ، ملا علی قاریؒ اور محدث جلیل علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے پسند کیا ہے اور اپنی تصانیف میں اسی تعریف کو اختیار کیا ہے کہ خبر کو قرنِ اول میں تلقی بالقبول حاصل ہو جائے تو متواتر ہو گی، اگر قرن ثانی میں حاصل ہو جائے تو خبر مشہور اور اگر قرن ثالث میں حاصل ہو جائے تو خبر واحد ہو گی۔

(کشف الاسرار: ۲/ ۶۷۸، توضیح المبانی: ۳۰۷، فیض الباری: ۴/ ۲۸۱، معارف السنن: ۱/ ۱۱۸-۱۱۹)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک خبر واحد وہ ہے جس کی سند مشہور سے کم ہو اور اصولیین کے ہاں یہ ہے کہ زمانہ سلف میں تلقی بالقبول نہ ملے، ہاں اگر تلقی بالقبول حاصل ہو جائے تو وہ مشہور ہے، اصولیین حضرات نے خبر کی تقسیم تلقی اور عدم تلقی کے اعتبار سے کی ہے، گویا اصولیین کے نزدیک تلقی کی بنیاد پر خبر مشہور ہونے کا درجہ پاتی ہے۔ اس تقریر سے محدثین اور فقہاء حنفیہ کے تعریفات میں نمایاں فرق نظر آرہا ہے۔ (م)

عِلْمٍ، فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا»[(١)].

ترجمہ: اللہ تعالی علم کو اس طرح نہیں اٹھالے گا کہ اس کو بندوں سے چھین لے، بلکہ وہ پختہ کار علماء کو موت دے کر علم کو اٹھائے گا حتی کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، ان سے سوالات کیے جائیں گے وہ بغیر علم کے جواب دیں گے، اس لیے خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

۳۔ مستفیض کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ مستفیض کی لغوی تعریف:

لغت کے اعتبار سے مستفیض (اسم فاعل)"استفاض" سے مشتق ہے، جو "فَاضَ الماءُ" (پانی پھیل گیا) کے محاورے سے مأخوذ ہے[(٢)]، اسی وجہ سے جس حدیث کی شہرت زیادہ ہو تو اسے مستفیض کہتے ہیں۔

(ب)۔ مستفیض کی اصطلاحی تعریف:

مستفیض کی اصطلاحی تعریف[(٣)] میں اہل علم[(٤)] کے تین اقوال ہیں:

۱۔ مستفیض مشہور کے مترادف ہے۔

---

(١) اس حدیث کی تخریج امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام احمدؒ اور خطیب بغدادیؒ نے چار طریقوں سے کی ہے: امام بخاریؒ نے صحیح بخاری، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم: ١ / ١٩٤، اور امام مسلمؒ نے صحیح مسلم، کتاب العلم، باب رفع العلم وقبضہ: ٤ / ٢٠٨٥، رقم: ١٣، نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، امام احمدؒ نے مسند احمد: ٤ / ٢١٨، ١٦٠ میں زیاد بن لبید سے تقریبا اسی طرح روایت کیا ہے اور طبرانی نے معجم اوسط: رقم: ٦٤٠٣ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور خطیب بغدادیؒ نے تاریخ بغداد: ٥ / ٣١٢ میں ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ (ط)

(٢) فتح المغیث: ٤ / ١٠، نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ٤٦۔ (م)

(٣) مستفیض کی تعریف کے لیے دیکھئے: اختصار علوم الحدیث: ١٦٥، المنہل الراوی: ٣٢، نزہۃ النظر: ٤٩، فتح المغیث: ٤ / ١٠، تدریب الراوی: ٢ / ٦٢١، ألفیۃ السیوطي في علم الحدیث: ١ / ١٣) (م)

(٤) مستفیض سے فقہاء کرام بحث کرتے ہیں، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے مشہور اور مستفیض میں مغایرت ذکر کی ہے تاہم یہ مباحث ہمارے فن سے متعلق نہیں۔ (نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ٤٦) (م)

۲۔ یہ مشہور سے اخص ہے، اس لیے کہ مستفیض میں طرفین (اول وآخر) سند مساوی ہوتے ہیں، تاہم مشہور میں یہ شرط نہیں۔
۳۔ یہ مشہور سے اعم ہے، یہ دوسرے قول کا عکس ہے[۱]۔

۴۔ غیر مصطلح مشہور:

اصطلاحی مشہور کے علاوہ ایک غیر اصطلاحی مشہور بھی ہے، یہ وہ مشہور کہلاتا ہے جو کثرت کے ساتھ زبان زد عام ہو، لیکن اس میں مشہور کی مطلوبہ شرائط نہ ہوں۔ اس کی تین صورتیں ہیں:۔

(الف)۔ جس کی سند ایک ہو۔
(ب)۔ جس کی ایک سے زائد اسناد ہوں۔
(ج)۔ جس کی سرے سے کوئی سند نہ ہو[۲]۔

۵۔ غیر مصطلح مشہور کی اقسام وانواع:

غیر اصطلاحی مشہور کی متعدد اقسام وانواع ہیں، جن میں زیادہ مشہور درج ذیل ہیں:

(الف)۔ صرف اہل حدیث میں مشہور و معروف ہو، جیسے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے۔

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَنَتَ شَهْرًا بَعْدَ الرُّكُوعِ يَدْعُو عَلَى رِعْلٍ وَذَكْوَانَ».[۳]

”رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینے تک رکوع کے بعد قنوت نازلہ پڑھی، جس میں رعل اور ذکوان قبائل کے لیے بددعا کی۔“

(ب)۔ محدثین کرام، علماء اور عوام میں مشہور و معروف ہو، جیسے یہ حدیث ہے۔

---

[۱] نزہۃ النظر:۴۶، فتح المغیث:۲/۱۵۶، توجیہ النظر:۱/۱۱۲، تدریب الراوی:۲/۶۲۱، منہج النقد فی علوم الحدیث:۴۱۵۔(م)

[۲] نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر:۴۷۔ (م)

[۳] صحیح بخاري، کتاب الوتر:۲/ ۴۹۰، حدیث، ۱۰۰۳، صحیح مسلم، کتاب المساجد:۱/ ۴۶۸، حدیث ۲۹۹.(ط)

«الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ».(١)

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔"

(ج)۔ فقہاء کرام میں مشہور و معروف ہو، جیسے یہ حدیث ہے۔

«أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللهِ الطَّلَاقُ».(٢)

"حلال چیزوں میں اللہ تعالی کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔"

(د)۔ فقہاء اور اصولیین میں مشہور و معروف ہو، جیسے یہ حدیث ہے۔

«رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأُ، وَالنِّسْيَانُ وَمَا اُسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ».(٣)

"میری امت پر خطاء، بھول چوک اور زبردستی کیساتھ کرائے گئے فعل کی ذمہ داری ساقط کر دی گئی ہے۔"

حافظ ابن حبانؒ اور حاکم نیسابوریؒ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے(٤)۔

(ہ)۔ علمائے نحات میں مشہور و معروف ہو، جیسے یہ روایت ہے۔

«نِعْمَ الْعَبْدُ صُهَيْبٌ: لَوْ لَمْ يَخَفِ اللهَ، لَمْ يَعْصِهِ»

"صہیب بہت اچھا بندہ ہے! اگر اس میں خوف خدا نہ ہوتا تو گناہ نہ کرتا۔"

اب اس حدیث کی کوئی اصل نہیں مگر نحویوں میں بہت مشہور ہے(٥)۔

(و)۔ عوام میں مشہور و معروف ہو جیسے یہ حدیث ہے۔

---

(١) صحيح بخاري، كتاب الإيمان:١/ ٥٣-رقم:١٠، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، حديث ٦٥. (ط)

(٢) حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے بھی ان کی تصویب کی ہے، لیکن اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: دیکھئے: مستدرک حاکم، کتاب الطلاق، ٢/ ١٩٦. (ط)

(٣) معجم کبیر طبرانی (٢/٩٧، رقم ١٤٣٠) حافظ ہیثمی مجمع الزوائد: (٦/ ٢٥٠) فرماتے ہیں کہ اس میں یزید بن ربیعہ رحبی ہے اور وہ ضعیف ہے۔(م)

(٤) تدریب الراوی:٢/ ٦٢٤۔(م)

(٥) اسنی المطالب:٣٠٧، التذکرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ:١٦٩، المقاصد الحسنۃ للسخاوی:٧٠١، کشف الخفاء للعجلونی: ٢/ ٣٢٣، الاسرار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ:٣٧٢، تذکرۃ الموضوعات:١٠١، المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع:٢٠٢۔(م)

«الْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ[1]»

”جلد بازی شیطان کی جانب سے ہوتی ہے۔“

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے[2]۔

٦۔ خبر مشہور کا حکم:

مشہور اصطلاحی اور غیر اصطلاحی کو اول وہلہ میں صحیح یا غیر صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ ان مشہور حدیثوں میں بعض صحیح، بعض حسن، بعض ضعیف اور بعض موضوع ہیں، تاہم اگر مشہور مصطلح صحیح ہو تو اسی خصوصیت کی بناء پر اسے عزیز اور غریب پر ترجیح دی جائے گی۔

۷۔ خبر مشہور پر معروف تصانیف:

---

(1) تدریب الراوی: ٢/ ٦٢٥۔ (م)

(2) حدیث مشہور (غیر مصطلح) کی چار قسمیں ہیں:

١- حدیثِ مشہور صحیح ٢- حدیثِ مشہور حسن ٣- حدیثِ مشہور ضعیف ٤- حدیثِ مشہور موضوع۔

١۔ حدیثِ مشہور صحیح کی مثال، جیسے: ” «إِنَّ اللهَ لاَ يَقْبِضُ العِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ العِبَادِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ العِلْمَ بِقَبْضِ العُلَمَاءِ“.

(صحیح بخاری: ١/ ٣١، رقم: ١٠٠، صحیح مسلم: ٤/ ٢٠٥٨، رقم: ٢٦٧٣)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ علم کو فوراً نہیں اٹھائے گا بلکہ علماء کو اٹھا لینے کیساتھ علم کو اٹھالے گا۔

٢۔ حدیثِ مشہور حسن کی مثال، جیسے: ” «طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ»“.

ترجمہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

علامہ جمال الدین مزیؒ (م ٧٤٣ھ) فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے متعدد طرق ہیں جس کی وجہ سے یہ حدیث حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

(تدریب الراوی: ٢/ ٦٢٢)

٣۔ حدیثِ مشہور ضعیف کی مثال، جیسے: ” «الْأُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ»“.

(تدریب الراوی: ٢/ ٦٢٢)

ترجمہ: دونوں کان سر کا جزء ہیں۔

٤۔ حدیثِ مشہور موضوع، اس کی بے شمار مثالیں ہیں، جیسے: ” «مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ».

ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

اور « كُنْتُ كَنْزًا لَا أُعْرَفُ».“ وغیرہ۔ (تدریب الراوی: ٢/ ٦٢٢)(م)

یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ مشہور ومعروف تصانیف سے وہ کتابیں مراد ہیں، جن میں زیادہ زبان زد عام احادیث جمع کی گئی ہوں، اس لیے کہ اہل علم نے مصطلح مشہور احادیث پر مستقل تصانیف نہیں لکھیں اور غیر اصطلاحی مشہور احادیث پر چند معروف کتب یہ ہیں:

(أ)... المقاصد الحسنة، فيما اشتهر على الألسنة، از علامہ شمس الدین سخاویؒ۔

(ب)...كشف الخفاء، ومزيل الإلباس فيما اشتهر من الحديث على ألسنة الناس، از علامہ عجلونیؒ۔

(ج)....تمييز الطيب من الخبيث، فيما يدور على ألسنة الناس من الحديث، علامہ ابن الدیبع شیبانیؒ[1].

---

[1] ان کے علاوہ دیگر کتب یہ ہیں۔

اللآلئ المنثورة في الأحاديث المشهورة، از علامہ بدرالدین زرکشیؒ (م۷۹۴ھ)

اللآلئ المنتثرة في الأحاديث المشتهرة، از عبدالرحمن سیوطیؒ (م۹۱۱ھ)

الدرر المنتثرة في الأحاديث المشتهرة، از عبدالرحمن سیوطیؒ (م۹۱۱ھ).(م)

مطلب دوم: عزیز کا بیان [1]

۱۔ عزیز کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ عزیز کی لغوی تعریف:

لغت میں عزیز"عَزَّ یَعِزّ"(باب ضرب) سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے، جس کے معانی قلیل اور نادر الوجود کے ہیں۔ یا"عَزَّ یَعزُّ"(باب فتح) سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے، جس کے معانی قوی اور مضبوط ہونے کے ہیں اور"عزیز"کو"عزیز" یا تو اس لیے کہتے ہیں کہ یہ قلیل اور نادر الوجود ہوتا ہے اور یا یہ کہ دوسرے طریق سے مروی ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کو قوت حاصل ہو جاتی ہے [2]۔

(ب)۔ عزیز کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح عزیز اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے تمام طبقات میں کسی طبقہ میں بھی دو سے کم راوی نہ ہوں [3]۔ *

۲۔ اصطلاحی تعریف کا مفہوم:

اس کا مفہوم یہ ہے کہ سند کے جملہ طبقات میں کسی ایک طبقہ میں بھی دو سے کم راوی نہ ہوں، تاہم اگر کسی طبقہ میں تین، یا اس سے زائد رواۃ پائے جائیں تو یہ مضر نہیں، بشر طیکہ کسی

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۹۴ - ۹۶ ، مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۷۴-۳۷۸، جامع الأصول ۱/ ۱۷۴ - ۱۷۸، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۴۵ - ۵۴۹، التقریب: ۱۵۳ - ۱۵۵، الاقتراح: ۳۰۹ - ۳۱۰، الموقظۃ: ۴۳، اختصار علوم الحدیث: ۱۶۶ - ۱۶۷، الشذا الفیاح: ۲/ ۴۴۶ - ۴۵۰، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۴۴۱ - ۴۴۲، فتح الباقی: ۲/ ۲۶۵ - ۲۷۷، نزہۃ النظر: ۲۴ - ۲۸، فتح المغیث: ۳/ ۲۷ - ۴۱، تدریب الراوي: ۲/ ۱۸۰ - ۱۸۳، توضیح الأفکار: ۲/ ۴۰۱ - ۴۱۱، ظفر الأماني: ۶۸ - ۷۶.(م)

(۲) نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۸۔(م)

(۳) نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۷۔(م)

* یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ عزیز اور غریب صرف محدثین کرام کی اصطلاحات ہیں اور محدثین ہی ان سے بحث کرتے ہیں، فقہائے حنفیہ کے ہاں یہ اصطلاحات ہی نہیں، اس لیے وہ ان سے بحث نہیں کرتے۔(م)

کسی ایک طبقہ میں دو راوی ہوں، اس لیے کہ طبقات سند میں کم از کم کا اعتبار کیا جاتا ہے[۱]۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس تعریف کو راجح قرار دیا ہے[۲]، تاہم بعض اہل علم فرمائے ہیں کہ عزیز وہ حدیث ہے جس کو دو یا تین راویوں نے روایت کیا ہو۔ لیکن اب ظاہر ہے کہ اس تعریف کے مطابق بعض صورتوں میں عزیز اور مشہور کے درمیان حد فاصل باقی نہیں رہے گا[۳]۔

۳۔ عزیز کی مثال:

صحیحین میں سیدنا انسؓ اور صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

[۱] عزیز بھی مشہور کی طرح ہے کہ وہ صحیح، حسن اور ضعیف ہو سکتی ہے اور اس کا دارومدار شرائط قبول کے وجود اور عدم وجود پر ہو گا۔ اصولیین کے نزدیک یہ ایک بحث ہے کہ کیا خبر صحیح کے لیے عزیر ہونا شرط ہے؟ جمہور اہل علم کا نظریہ یہ ہے کہ کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے عزیز ہونا شرط نہیں۔ لیکن اس کے برعکس ابو علی جبائی معتزلی، حاکم نیسابوری اور قاضی ابو بکر ابن العربی کا مذہب یہ ہے کہ حدیث صحیح کے لیے عزیز ہونا شرط ہے۔ قاضی ابو بکر ابن العربیؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے حدیثِ صحیح کے لیے عزیز ہونا شرط قرار دیا ہے، تاہم یہ بات درست نہیں، کیونکہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کے شروع میں حدیث غریب ''«إنما الأعْمَالُ بالنِّيَّاتِ»'' نقل کی ہے جس کو صحابہ کرام میں سے صرف سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، پھر آپ سے صرف علقمہ بن وقاص اللیثی نے روایت کیا ہے پھر آگے ان سے صرف محمد بن ابراہیم نے اور پھر ان سے صرف یحیی بن سعید الانصاری نے روایت کیا ہے۔

اگر امام بخاریؒ کے نزدیک حدیث صحیح کے لیے عزیز ہونا شرط ہوتا تو آپ صحیح بخاری کے اول میں غریب حدیث ذکر نہ فرماتے، حالانکہ محدثین کرام کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، لیکن عزیز نہیں۔ (نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۸)(م)

[۲] دیکھئے: شرح نخبۃ الفکر: ص ۲۴،۲۱۔ (ط)

[۳] محدثین کرام کو حدیث مشہور اور مستفیض میں کوئی شبہ نہیں، اس لیے کہ ان کی مثالیں بے شمار ہیں۔ البتہ حدیث عزیز کے متعلق انہوں نے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے، معروف محدث ابن حبان بستیؒ (م ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں۔

''إِنَّ رِوايَةَ اثنَيْنِ عَنِ اثنَيْنِ إِلى أَنْ يَنْتَهِيَ لا تُوجَدُ أَصْلاً۔'' (نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۹)

''حدیث عزیز کا کوئی وجود ہی نہیں، اس لیے کہ عزیز اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو دو راوی دوسرے دو راویوں سے سلسلہ سند کے آخر تک روایت کریں۔''

حافظ ابن حبان بستیؒ (م ۳۵۴ھ) کے خیال کے مطابق اس کو حدیث عزیز اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا =

«لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ». (۱)

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب کہ میں اس کی نظر میں اس کے والدین، اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

= وجود عزیز یعنی دشوار ہے، اس لیے نہیں کہ یہ قلیل الوجود یا نادر الوجود ہوتی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) ان کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"قُلْتُ: إِنْ أرادَ بهِ أَنَّ رِوايَةَ اثْنَيْنِ فَقَطْ عَنِ اثْنَيْنِ فَقَطْ لا تُوجَدُ أَصْلاً؛ فيُمْكِنُ أَنْ يُسَلَّمَ، وأَمَّا صُورَةُ العَزيزِ الَّتي حَرَّرْناهافمَوْجودَةٌ بأَنْ لا يَرْوِيَهُ أَقَلُّ مِن اثْنَيْنِ عَنْ أَقَلَّ مِنَ اثْنَيْنِ. "(نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۴۹-۵۰)

"اگر ابن حبان کا مطلب یہ ہے کہ دو راویوں کی صرف دو سے روایت اصلاً موجود نہیں تو یہ بات قابلِ تسلیم ہے، مگر حدیث عزیز کی جو صورت ہم نے بیان کی ہے وہ موجود ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ عزیز اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو دو سے کم راوی دوسرے دو سے کم راویوں سے نقل نہ کرتے ہوں۔

حدیث کی اصطلاحات میں یہ صورت بڑی نادر ہے کہ کسی حدیث میں عزیز اور مشہور دونوں کے اوصاف پائے جاتے ہوں، اس حالت میں اس کو عزیز مشہور کہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کسی حدیث کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کسی خاص طبقہ میں دو راویوں سے مروی ہونے کی وجہ سے عزیز کے درجہ کی حدیث ہے مگر اس سے پہلے یا بعد کے طبقہ میں زیادہ راویوں سے منقول ہونے کی بناء پر مشہور کے درجہ پر فائز ہو گی۔ حافظ علائیؒ اس کی مثال میں "«نَحْنُ الْآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»" یہ حدیث پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث عزیز ہے۔ اس کو سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سات راویوں نے یہ حدیث روایت کی۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ابو سلمہ بن عبد الرحمن، ابو حازم، طاؤس، اعرج، ہمام، ابو صالح، عبد الرحمن مولی ام بُرثُن۔ (تدریب الراوی: ۲/۷/۶۳، علوم الحدیث صبح صدلح مترجم: ۲۸۵)

(۱) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول عن الایمان: ۱/۸۵، رقم: ۱۵، مذکورہ الفاظ کیساتھ سیدنا انس رضی اللہ سے مروی ہے، رقم: ۱۴ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے روایت میں "والناس أجمعين" کے الفاظ نہیں اور جب کہ اول میں "فو الذي نفسي بيده" کا اضافہ ہے اور صحیح مسلم، کتاب الایمان: رقم: ۷۰، ۶۹ میں دونوں جگہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ (ط)

اس حدیث کو سیدنا انسؓ سے قتادہؒ اور عبد العزیز بن صہیبؒ سے روایت کیا ہے، قتادہؒ سے شعبہؒ اور سعیدؒ نے روایت کیا ہے اور عبد العزیز بن صہیبؒ سے اسماعیل بن علیہؒ اور عبد الوارثؒ نے روایت کیا ہے، پھر ان میں سے ہر ایک سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے[1]۔

۴۔ عزیز پر مشہور و معروف تصانیف:

محدثین کرام نے عزیز احادیث پر کوئی مستقل کتابیں نہیں لکھیں، بظاہر اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس نوعیت کی احادیث بہت کم ہے، اس لیے اس پر تصنیف کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں تھا۔

---

(١) تدریب الراوی: ٢/ ٦٣٢۔ (م)

مطلب سوم: غریب کا بیان[۱]

ا۔ غریب کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ غریب کی لغوی تعریف:

لغت کے اعتبار سے "غریب" صفت مشبہ کا صیغہ ہے، جس کے معانی منفرد اور اپنے عزیز و اقارب سے دور ہونے کے ہیں[۲]۔

(ب)۔ غریب کی اصطلاحی تعریف:

غریب وہ حدیث ہے، جس کو صرف ایک راوی نے روایت کیا ہو[۳]۔

۲۔ اصطلاحی تعریف کا مفہوم اور تشریح:

اصطلاح میں غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو مستقل طور پر ایک شخص نے روایت کیا ہو، پھر یہ عام ہے خواہ سند کے ہر طبقے میں ایک راوی ہو اور بعض میں ایک سے زائد ہوں، تاہم بعض طبقات میں ایک سے زائد ہونا اسے حیز غرابت سے نہیں نکال سکتا ہے، اس لیے کہ اس میں اقل اور کم از کم کا اعتبار کیا جاتا ہے[۴]۔

---

(۱) معرفة علوم الحديث: ۹۴ - ۹۶، مقدمة ابن الصلاح: ۳۷۴-۳۷۸، جامع الأصول: ۱/ ۱۷۴ - ۱۷۸، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۴۵ - ۵۴۹، التقريب: ۱۵۳ - ۱۵۵، الاقتراح: ۳۰۹ - ۳۱۰، الموقظة: ۴۳، اختصار علوم الحديث: ۱۶۶ - ۱۶۷، الشذا الفياح: ۲/ ۴۴۶ - ۴۵۰، المقنع في علوم الحديث: ۲/ ۴۴۱ - ۴۴۲، فتح الباقي: ۲/ ۲۶۵ - ۲۷۷، نزهة النظر: ۲۴ - ۲۸، فتح المغيث: ۳/ ۲۷ - ۴۱، تدريب الراوي: ۲/ ۱۸۰ - ۱۸۳، توضيح الأفكار: ۲/ ۴۰۱ - ۴۱۱، ظفر الأماني: ۶۸ - ۷۶.(م)

(۲) لسان العرب: ۱/ ۲۷۷۔(م)

(۳) معرفة علوم الحديث: ۹۶، مقدمة ابن الصلاح: ۳۷۴، اختصار علوم الحديث: ۱۶۷.(م)

(۴) محدثین کرام نے حدیث غریب کی مختلف انداز میں تعریفیں کیں ہیں، تاہم سب کا ماخذ علامہ ابن صلاحؒ کی پیش کردہ تعریف ہے، چنانچہ علامہ ابن صلاحؒ (م ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں۔ =

۳۔ غریب کا ایک اور نام:

اکثر علماء کرام غریب پر ایک اور نام فرد کا اطلاق بھی کرتے ہیں، اس اعتبار سے یہ دونوں مترادف ہے، تاہم بعض اہل علم نے ان دونوں میں کچھ مغائرت بیان کرکے انہیں مستقل الگ الگ اقسام قرار دیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ان دونوں کو لغت اور اصطلاح دونوں کے اعتبار سے باہم مترادف قرار دیا ہے۔ البتہ فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث نے ان میں قلت اور کثرت کے لحاظ سے فرق بیان کیا ہے کہ فرد کا اطلاق عام طور پر فرد مطلق پر ہوتا ہے اور غریب کا اطلاق فرد نسبی پر کیا جاتا ہے[1]۔ *

= "الحديثُ الذي يَتَفَرَّدُ بهِ بعضُ الرواةِ يُوصَفُ بالغريبِ، وكذلكَ الحديثُ الذي يَتَفَرَّدُ فيهِ بعضُهُمْ بأمْرٍ لا يذكُرُهُ فيهِ غيرُهُ إمَّا في مَتْنِهِ، وإمَّا في إسْنادِهِ." (مقدمہ ابن الصلاح:۳۷۴)

"غریب حدیث وہ ہے جس میں بعض رواۃ متفرد ہوں، اسی طرح وہ حدیث بھی جس میں کوئی راوی کسی معاملے میں منفرد رہ گیا ہے جس کو اس کے سوا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ یہ تفرد خواہ متن میں ہو یا اسناد میں غریب کہلائے گی۔"

حافظ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) نے بعض اہل علم کے حوالے سے غریب حدیث کی وضاحت یوں فرمائی ہے۔

" قَالَ بَعْضُهُمْ: الْغَرِيبُ مِنَ الْحَدِيثِ عَلَى وِزَانِ الْغَرِيبِ مِنَ النَّاسِ، فَكَمَا أَنَّ غُرْبَةَ الْإِنْسَانِ فِي الْبَلَدِ تَكُونُ حَقِيقَةً بِحَيْثُ لَا يَعْرِفُهُ فِيهَا أَحَدٌ بِالْكُلِّيَّةِ، وَتَكُونُ إِضَافِيَّةً بِأَنْ يَعْرِفَهُ الْبَعْضُ دُونَ الْبَعْضِ، ثُمَّ قَدْ يَتَفَاوَتُ مَعْرِفَةُ الْأَقَلِّ مِنْهُمْ تَارَةً وَالْأَكْثَرِ أُخْرَى، وَقَدْ يَسْتَوِيَانِ، وَكَذَا الْحَدِيثُ."

(فتح المغیث:۴/۷)

"غریب حدیث اجنبی انسان جیسی ہے جس طرح شہر میں انسان کی اجنبیت حقیقی ہوتی ہے کہ اسے بالکل کوئی نہیں جانتا، کبھی اضافی ہوتی ہے کہ اسے کچھ لوگ جانتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے، پھر اس معرفت میں کمی بیشی بھی ہوسکتی ہے اور مساوی بھی۔ یہی معاملہ حدیث غریب کا ہے۔"(م)

[1] نزھۃ النظر ص۲۸.(ط)

* یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ فرد اور غریب کے درمیان لغت اور اصطلاح دونوں کے اعتبار سے گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے اس لیے کہ دونوں میں تفرد کا مفہوم موجود ہے، اسی ربط کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض اہل علم =

۴۔ غریب کے اقسام وانواع(1):

= نے دونوں کو مترادف قرار دیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "تفرد به فلان" اور "أغرب به فلان" کے معنی و مفہوم میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں حق بات یہ ہے کہ اکثر محدثین کثرت و قلت استعمال کے اعتبار سے دونوں میں فرق کرتے ہیں، چنانچہ فرد کا اطلاق وہ زیادہ تر فردِ مطلق پر کرتے ہیں جو ہر قید و شرط سے آزاد ہوتا ہے، بخلاف ازیں غریب کا لفظ فرد نسبی پر بولتے ہیں، جس میں نسبت ایک معین چیز کی جانب کی جاتی ہے۔ گویا اصطلاحی معنی و مفہوم کے اعتبار سے دونوں میں فرق پایا جاتا ہے، اس لیے اپنی اصل کے لحاظ سے یہ دونوں مترادف نہیں ہیں، مگر جب فرد اور غریب کے افعال مشتقہ استعمال کرتے ہیں تو ان میں اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ (علوم الحدیث حریری: ۲۷۳-۲۷۴) (م)

(1) امام حاکم نیسابوریؒ (م ۴۰۵ھ) نے غریب کی تین انواع بیان کی ہیں:۔

۱- غرائب الصحیح ۲- غرائب الشیوخ ۳- غرائب المتون

۱۔ **غرائب الصحیح:** وہ صحیح حدیث جس کی سند میں تفرد واقع ہو، جیسے سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جس کو عبد الاحد بن ایمن المخزومی نے روایت کیا ہے۔ "حَدَّثَنَا أَبُو الْعَبَّاسِ مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ الْجَبَّارِ قَالَ: ثنا يُونُسُ بْنُ بُكَيْرٍ ، عَنْ عَبْدِ الْوَاحِدِ بْنِ أَيْمَنَ الْمَخْزُومِيِّ قَالَ: حَدَّثَنِي أَيْمَنُ قَالَ: سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ يَقُولُ:"كُنَّا يَوْمَ الْخَنْدَقِ نَحْفِرُ الْخَنْدَقَ فَعَرَضَتْ فِيهِ كَذَّانَةٌ وَهِيَ الْجَبَلُ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ كَذَّانَةٌ قَدْ عَرَضَتْ فِيهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «رُشُّوا عَلَيْهَا» ، ثُمَّ قَامَ النَّبِيُّ ﷺ فَأَتَاهَا، وَبَطْنُهُ مَعْصُوبٌ بِحَجَرٍ مِنَ الْجُوعِ." (معرفة علوم الحديث: ۹۴)

"عبد الواحد بن ایمن بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے ایمن سے روایت کیا انہوں نے کہا کہ میں نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو کہتے سنا: ہم جنگ خندق کے موقعہ پر خندق کھود رہے تھے کہ اتنے میں ایک چٹان نکل آئی میں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! چٹان نکل آئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں پانی چھڑکو۔ اسی اثناء میں آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور اس جگہ آئے، اس وقت آپ کے بطن مبارک پر بھوک کی وجہ سے پتھر بندھا ہوا تھا۔"

امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں خلاد بن یحیی بواسطہ عبد الواحد بن ایمن

=

....

= روایت کیا ہے۔ یہ صحیح حدیث ہے۔اس میں عبد الواحد بن ایمن اپنے باپ سے روایت کرنے میں متفرد ہیں اور غرائب الصحیح کی قسم ہے۔

۲۔ **غرائب الشیوخ:** جس میں ایک محدث جس کی روایات جمع ہوتی ہیں اس کی روایت میں راوی متفرد ہو، امام حاکم نیسابوریؒ نے اس کی مثال میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کی ہے۔

" حَدَّثَنَاهُ أَبُو الْعَبَّاسِ مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ قَالَ: ثنا الرَّبِيعُ بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ: أَخْبَرَنَا الشَّافِعِيُّ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ»"۔

(معرفۃ علوم الحدیث:۹۵)

۔۔۔"نافع ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شہری دیہاتی کے لیے بیع نہ کرے۔"

امام حاکم نیسابوریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مالک بن انس بواسطہ نافع غریب ہے، کیونکہ امام مالکؒ وہ امام ہیں جن کی احادیث کو جمع کیا جاتا ہے۔ امام مالکؒ سے روایت کرتے میں امام شافعیؒ متفرد ہیں اور وہ بھی ان کے بعد آنے والے امام ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ کسی نے ان سے ربیع بن سلیمان کے علاوہ یہ حدیث بیان کی ہو اور یہ ثقہ و مامون ہے۔

۳۔ **غرائب المتون:** یہ غریب الاسناد والمتن ہے۔ امام حاکم نیسابوریؒ نے اس کی مثال سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث پیش کی ہے۔

" حَدَّثَنَا أَبُو مُحَمَّدٍ عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ الْخُزَاعِيُّ بِمَكَّةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو يَحْيَى بْنُ مَسَرَّةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا خَلَّادُ بْنُ يَحْيَى قَالَ: ثنا أَبُو عَقِيلٍ ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سُوقَةَ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ، عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ هَذَا الدِّينَ مَتِينٌ فَأَوْغِلْ فِيهِ بِرِفْقٍ، وَلَا تُبَغِّضْ إِلَى نَفْسِكَ عِبَادَةَ اللهِ فَإِنَّ الْمُنْبَتَّ لَا أَرْضًا قَطَعَ، وَلَا ظَهْرًا أَبْقَى»." (معرفۃ علوم الحدیث:۹۵)

۔۔۔"محمد بن منکدر سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ یہ دین مضبوط و مستحکم ہے اس میں نرمی اور سہولت ہے اور اپنی ذات کو اللہ تعالی کی عبادت سے متنفر نہ کرو، کیونکہ لاحاصل سفر کرنے والا منزل بھی نہیں پاتا اور سواری کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔" =

(الف) غریب مطلق (ب) غریب نسبی

(الف)۔ غریب مطلق یا فرد مطلق کی تعریف اور مثال:

۱۔غریب مطلق یا فرد مطلق کی تعریف:

غریب مطلق وہ حدیث ہے، جس کے اصل سند میں غرابت ہو،یعنی اس کے اصل سند اصل سند میں ایک ہی راوی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک صحابیؓ نے اس نے اس حدیث کو روایت کیا ہو[۱]۔

۲۔غریب مطلق کی مثال: جیسے یہ حدیث ہے:

«إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ».[۲]

”اعمال کا دار مدار نیتوں پر ہے۔“

= امام حاکم نیسابوریؒ (م ۴۰۵ھ) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب الاسناد والمتن ہے۔اس میں جو کچھ مروی ہے وہ محمد بن سوقہ سے مختلف ہے جہاں تک محمد بن منکدر عن جابر کا تعلق ہے تو محمد بن سوقہ ان کے سوا کسی سے روایت نہیں کرتے۔ان سے ابو عقیل اوران سے خلاد بن یحیی نے روایت کیا ہے۔(م)

(۱) اصل سند سے مراد اس کا وہ طرف ہے جس میں صحابی ہوتا ہے،صحابی سلسلہ سند کی ایک کڑی ہوتا ہے،یعنی اگر صحابی ایک ہو تو ایسی حدیث غریب مطلق کہلاتی ہے،حافظ ابن حجرؒ اصل سند کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”سلسلہ روایت کے مدار و مرجع کو اصل سند کہتے ہیں،خواہ اس تک پہنچنے والے طریق یعنی سلسلہ ہائے روایت متعدد ہی کیوں نہ ہوں،یہ مدار و مرجع سند کا دوسرا طرف ہے جس میں صحابی ہوتا ہے“۔حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے ملا علی قاریؒ یہ نتیجہ نکالا ہے کہ صحابی اگر ایک ہو تو ایسی حدیث میں غرابت نہیں ہو گی،یعنی اسے غریب شمار نہیں کیا جائے گا۔
ملا علی قاریؒ کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ میں ایسی کوئی بات نہیں جو اس کی عدالت کو مجروح کر دے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ تمام صحابہ عادل ہیں،میری رائے یہ ہے کہ حافظ ابن حجرؒ کا یہ مقصد نہیں ہے۔واللہ اعلم! اس کی دلیل یہ ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے حدیث غریب کی یہ تعریف کی ہے کہ ”غریب وہ حدیث ہے جس کا راوی صرف ایک ہو خواہ یہ صورت سند کے کسی بھی حصے میں کیوں نہ پیش آئے۔“یعنی راوی کا تفرد خواہ صحابی کے موقع و محل میں ہی کیوں نہ پایا جائے۔اس لیے کہ صحابی سلسلہ سند کی ایک کڑی ہوتا ہے۔ بہر حال ملا علی قاریؒ نے جو کچھ کہا ہے یہ بعض محدثین کی رائے ہے۔واللہ اعلم!(ط)

(۲) صحیح بخاري،کتاب الإیمان،حدیث ۱، صحیح مسلم،کتاب الإمارۃ،حدیث ۱۵۵.

اس حدیث کو صرف سیدنا عمر بن خطابؓ نے روایت کیا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ کبھی یہ تفرد (راوی کا ایک ہونا) آخر سند تک جاری رہتا ہے اور کبھی ایک راوی سے متعدد افراد روایت کرتے ہیں۔

(ب)۔ غریب نسبی یا فرد نسبی کی تعریف، مثال اور وجہ تسمیہ:

۱۔ غریب نسبی یا فرد نسبی کی تعریف:

غریب نسبی وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان غرابت ہو[۱]، یعنی ابتداء سند میں ایک سے زائد راوی اس کو روایت کریں، لیکن پھر ان رواۃ سے ایک راوی روایت کرے۔

۲۔ غریب نسبی یا فرد نسبی کی مثال:

جیسے امام مالکؒ[۲]، امام زہریؒ سے اور وہ سیدنا انس بن مالک[۳] رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: «دَخَلَ مَكَّةَ عَامَ الفَتْحِ وَعَلَى رَأْسِهِ المِغْفَرُ».[٤]

"رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن مکہ مکرمہ میں اس حالت میں داخل ہوئے کہ آپ ﷺ کے سر

---

(۱) نزهة النظر، ص۲۸. (ط)

(۲) مالک بن انس بن مالک اصبحی حمیری، ابو عبد اللہ، امام دار الھجرۃ اور ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں، ۹۳ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، دینی امور میں انتہائی متصلب اور امراء ووزراء سے کوسوں دور رہتے تھے، خلیفہ منصور کے کہنے پر آپ نے مؤطا تصنیف فرمائی۔ ۱۷۹ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء:۸/۴۸، وفیات الاعیان:۴/۱۳۵، تذکرۃ الحفاظ:۱/۲۰۷، الاعلام للزرکلی:۵/۲۵۷)(م)

(۳) سیدنا انس بن مالک بن نضر بن ضمضم نجاری، خزرجی انصاری، ابو ثمامۃ، یا ابو حمزہ رضی اللہ عنہ، جلیل القدر صحابی اور خادم رسول تھے، مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور بچپن میں اسلام لائے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات تک ان کی خدمت کرتے رہے، آپ ﷺ کے وفات کے بعد دمشق ہجرت کی اور پھر وہاں سے بصرہ چلے گئے، آپ کی مرویات کی تعداد ۲۲۸۶ ہے، ۹۳ھ کو بصرہ میں وفات پائی، بصرہ میں وفات پانے والے آپ سب سے آخری صحابی ہیں۔
(اسد الغابة:۱/۱۵۱، الاصابة:۱/۷۱، طبقات ابن سعد:۷/۱۷، التاریخ الکبیر:۲/۲۷، سیر اعلام النبلاء:۳/۳۹۵، الاعلام للزرکلی:۳/۳۹۶)(م)

(۴) صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث ۴۲۸۶، صحیح مسلم، کتاب الحج، حدیث ۴۵۰. (م)

مبارک پر خول تھا۔"

اس حدیث کو امام زہری[۱] سے صرف امام مالکؒ نے روایت کیا ہے۔

۴۔ غریب نسبی یا فرد کی وجہ تسمیہ:

غریب نسبی کو غریب نسبی اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں صرف ایک متعین راوی کی راوی کی نسبت سے تفرد پایا جاتا ہے[۲]۔

۵۔ غریب نسبی کی اقسام وانواع:

یہاں غرابت اور تفرد کی بعض اقسام وانواع ایسی ہیں، جنہیں غریب نسبی میں شمار کرنا قرین قیاس ہے، اس لیے کہ ان کی غرابت مطلق نہیں، بلکہ ایک متعین پہلو کے اعتبار سے ہوتی ہے، وہ اقسام یہ ہیں:

---

(۱) محمد بن مسلم بن عبد اللہ بن شہاب زہری، ابو بکر، قریش کی ذیلی شاخ بنی زہرہ بن کلاب سے تعلق تھا، ۵۸ھ کو پیدا ہوئے، جلیل القدر تابعی ہیں، سب سے پہلے انہوں نے احادیث کی تدوین شروع کی، شام میں سکونت اختیار کی، خلیفہ وقت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے عمال کے نام ایک خط لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ تم ابن شہاب زہریؒ سے کسب فیض کرو، اس لیے کہ ان سے بڑھ کر اور کوئی سنت کا سمجھنے والا نہیں! ۱۲۴ھ کو حجاز اور فلسطین کے سرحد پر وفات پائی۔ (التاریخ الکبیر: ۱/ ۲۲۰، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۰۸، وفیات الاعیان: ۴/ ۱۷۷، سیر اعلام النبلاء: ۵/ ۳۲۶، الاعلام للزرکلی: ۷/ ۹۷)

(۲) یہاں یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ فردِ مطلق کا التباس شاذ کیساتھ نہیں پڑتا، کیونکہ شاذ میں دو شرطیں ناگزیر ہوتی ہیں:۔ ا۔ تفرد ۲۔ مخالفت۔ بخلاف ازیں فرد میں صرف تفرد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اسی لیے حدیث فرد کی تعریف محدثین ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

«الحَدِيثُ الذِي اِنْفَرَدَ بِهِ رَاوٍ وَاحِدٍ، وَإِنْ تَعَدَّدَتْ الطُّرُقُ إِلَيْهِ». (علوم الحدیث ومصطلحہ: ۲۲۶)

"حدیثِ فرد اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی روایت میں ایک راوی منفرد ہو، اگرچہ اس کے طرق متعدد ہوں۔"

حدیثِ فرد کو اس کے رواۃ ورجال کے مرتبہ ومقام کے پیش نظر حسن یا ضعیف کیساتھ موصوف کرسکتے ہیں، حدیثِ فرد مطلق صحیح کی مثال میں محدثین وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں ولاء (غلام کا حق وراثت جو آزاد کنندہ کو غلام کی موت کے بعد حاصل ہوتا ہے) کو فروخت اور ہبہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ عبد اللہ بن دینار سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس حدیث کو روایت کرنے میں متفرد ہیں اور عبد اللہ بن دینار بالاتفاق ایک ثقہ راوی ہے۔ فرد نسبی (جس کو اصطلاحاً غریب کہتے ہیں) کا التباس بھی شاذ کیساتھ نہیں پڑتا، =

(الف)۔ کسی ایک ثقہ راوی نے اس حدیث کو روایت کیا ہو، جیسے محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو فلاں ثقہ کے علاوہ کسی اور نے روایت نہیں کیا ہے۔

(ب)۔ ایک معین راوی سے دوسرے معین راوی نے روایت کی ہو، جیسے محدثین کرام فرماتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں سے روایت کرنے میں متفرد ہے، اگرچہ وہ حدیث اس راوی کے علاوہ دیگر طرق سے بھی مروی ہوتی ہے۔

(ج)۔ ایک شہر یا ایک علاقہ کے رواۃ اسے روایت کرنے میں متفرد ہوں، جیسے محدثین کا یہ قول ہے کہ اس حدیث کو صرف اہل مکہ یا صرف اہل شام نے روایت کیا ہے۔

(د)۔ ایک شہر یا ایک علاقہ والوں نے دوسرے شہر، یا علاقہ والوں سے حدیث روایت کیا ہو، جیسے محدثین کرام کا یہ قول ہے کہ اہل بصرہ نے اہل مدینہ سے روایت کیا ہے، یا صرف اہل شام نے اہل حجاز سے روایت کیا ہے[1]۔

۶۔ حدیث غریب کی ایک دوسری تقسیم:

= کیونکہ اس میں مخالفت اور تفرد (شاذ کی دو شرطیں) دونوں کا وجود نہیں ہوتا، بخلاف ازیں فرد نسبی میں ایک خاص قسم کا تفرد پایا جاتا ہے جو ایک خاص راوی یا ایک خاص شہر کے رہنے والوں سے روایت کرنے تک محدود ہوتا ہے۔ اسی لیے محدثین نے فرد نسبی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

«الحديثُ الذِي يَنْفَرِدُ بِرِوَايَتِهِ شَخْصٌ وَاحِدٌ فِي أَيِّ مَوْضِعٍ وَقَعَ التَّفَرُّدُ بِهِ مِنَ السَّنَدِ». (نزہۃ النظر: ۵۴)

”فرد نسبی اس کو کہتے ہیں جس کے روایت کرنے میں ایک شخص منفرد ہو۔ خواہ تفرد سند کے کسی حصہ میں واقع ہو۔“

حدیث غریب میں بعض اوقات تفرد وسط سند میں واقع ہوتا ہے اور اسی جگہ کیساتھ مخصوص ہو جاتا ہے، مثلاً صحابی سے روایت کرنے والے ایک سے زیادہ راوی ہوں۔ پھر ان میں سے کسی ایک سے روایت کرنے والا منفرد ہو۔ بخلاف ازیں حدیث فرد میں تفرد اس جانب واقع ہوتا ہے جس طرف صحابی ہوتا ہے اگرچہ اس حدیث کے طرق متعدد ہوں، مگر تفرد کا تعلق اسی جانب کیساتھ ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیثِ غریب کا راوی جملہ حالات میں صرف ایک ہی ہوتا ہے۔

(علوم الحدیث صبحی: ۲۷۴-۲۷۵)(م)

[1] تدریب الراوی: ۱/ ۲۹۱۔ (م)

محدثین نے حدیث غریب کی ایک اور تقسیم بیان کی ہے کہ سند اور متن کے غرابت کے اعتبار سے غریب کی دو قسمیں ہیں[۱]:

(الف)۔ غریب متناً واسناداً:

وہ حدیث ہے، جس کے متن کو روایت کرنے والا ایک راوی ہو[۲]۔

---

(۱) معروف محدث ابن سید الناسؒ (م ۷۳۴ھ) نے "شرح ترمذی" میں غریب حدیث کی پانچ اقسام بیان کی ہیں:
۱-غریب سنداً ومتنا ۲-غریب متنالا سنداً ۳-غریب سنداً لا متنا ۴-غریب بعض السند فقط ۵-غریب بعض المتن فقط۔

(فتح المغیث للعراقی:۴/۳۰۷-۳۰۸)(م)

(۲) اس کی مثال سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے۔

"حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ، عَنْ عُمَارَةَ بْنِ القَعْقَاعِ، عَنْ أَبِي زُرْعَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّه عَنْهُ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: " كَلِمَتَانِ حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمَنِ، خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيلَتَانِ فِي المِيزَانِ: سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللَّهِ العَظِيمِ" (صحیح بخاری:۹/۱۶۲، رقم:۷۵۶۳)

"محمد بن فضیل عمارہ بن قعقاع سے روایت کرتے ہیں وہ ابوزرعہ سے اور ابوزرعہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ دو کلمے ہیں جو اللہ تعالی کو محبوب ہیں، زبان پر ہلکے، میزان میں وزن دار ہیں، وہ کلمے یہ ہیں۔ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللَّهِ العَظِيمِ۔"

اس حدیث میں سید ابوہریرہ رضی اللہ عنہ متفرد ہیں، ان سے روایت میں ابوزرعہ متفرد ہیں، ابوزرعہ سے عمارہ بن قعقاع متفرد ہیں اور محمد بن فضیل بھی روایت میں متفرد ہیں۔

اور غریب اسناداً لا متنا کے متعلق حافظ ابن صلاحؒ (م ۶۴۲ھ) فرماتے ہیں۔

" ومنهُ ما هوَ غريبٌ إسْناداً لا مَتْناً كالحديثِ الذي مَتْنُهُ مَعروفٌ مَرْوِيٌّ عَنْ جَمَاعةٍ مِنَ الصَّحابةِ إذا تَفَرَّدَ بعضُهُمْ بروايتِهِ عَنْ صَحَابِيٍّ آخَرَ كانَ غَريباً مِنْ ذلكَ الوجهِ معَ أنَّ مَتْنَهُ غيرُ غريبٍ."

(مقدمہ ابن الصلاح:۳۷۵)

" غریب اسناداً لا متنا کی مثال وہ حدیث ہے جس کا متن معروف ہو اور صحابہ کرام کی ایک جماعت سے منقول ہو، تاہم اس کو ایک راوی صحابی سے نقل کرنے میں متفرد ہو۔ تو یہ اس اعتبار سے غریب ہو گا، لیکن اس کا متن غریب نہیں ہو گا۔"

=

....

= امام ترمذیؒ (م۲۷۹ھ) نے اس قسم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

" رب حديث يروى من أوجه كثيرة، وإنما يستغرب لحال الإسناد-"

(شرح علل الترمذی:۲/۶۴۳)

"بہت سی احادیث ایسی ہیں کہ متعدد اسانید سے مروی ہیں، لیکن صرف اسناد کی وجہ سے غریب قرار دی گئیں۔"

اس کی مثال امام ترمذیؒ (م۲۷۹ھ) نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے:

" حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ ، وَأَبُو السَّائِبِ ، وَحُسَيْنُ بْنُ الْأَسْوَدِ الْبَغْدَادِيُّ ، قَالُوا: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ ، عَنْ بُرَيْدِ بْنِ عَبْدِ اللهِ ، عَنْ جَدِّهِ أَبِي بُرْدَةَ ، عَنْ أَبِي مُوسَى ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْكَافِرُ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ وَالْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِي مِعًى وَاحِدٍ»"۔(شرح علل الترمذی:۲/۶۴۳)

۔۔۔"ابو اسامہ نے برید بن عبد اللہ بن ابی بردہ سے، اس نے اپنے دادا ابو بردہ سے، انہوں نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں۔"

امام ترمذیؒ (م۲۷۹ھ) اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

" هذا حديث غريب من هذا الوجه، من قبل إسناده، وقد روي من غير وجه عن النبي ﷺ وإنما يستغرب من حديث أبي موسى. " (شرح علل الترمذی:۲/۶۴۴)

"یہ حدیث اس طریق کیساتھ اسناد کی وجہ سے غریب ہے تاہم یہ حدیث دیگر طرق کیساتھ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے اس کا غریب ہونا صرف سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے طریق سے ہے۔"

اور جہاں تک غریب متناً لا اسناداً کا تعلق ہے اس کے بارے میں علامہ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) فرماتے ہیں۔

" ولا أرى هذا النوعَ يَنْعَكِسُ، فلا يُوجدُ إذَنْ ما هوَ غريبٌ مَتْناً وليسَ غريباً إسْناداً إلاَّ إذا اشْتَهَرَ الحديثُ الفَرْدُ عَمَّنْ تَفَرَّدَ بِهِ فَرَواهُ عنهُ عددٌ كثيرونَ فإنَّهُ يَصِيرُ غريباً مَشْهُوراً، وغريباً مَتْناً وغيرَ غريبٍ إسْناداً لكنْ بالنَّظَرِ إلى أحدِ طَرَفَي الإسنادِ، فإنَّ إسنادَهُ مُتَّصِفٌ بالغرابةِ في طَرَفِهِ الأوَّلِ مُتَّصِفٌ بالشُّهْرَةِ في طَرَفِهِ الآخَرِ، كحَديثِ:(إنَّمَا الأعْمالُ بالنِّيَّاتِ)، وكسَائِرِ الغرائِبِ التي اشْتَمَلَتْ عليها التَّصانيفُ المشْتَهرَةُ."(مقدمہ ابن الصلاح:۳۷۵)

"مجھے اس نوع کے بر عکس صورت (غریب متناً لا اسناداً) کا علم نہیں، لہذا ایسی کوئی روایت نہیں جو متناً غریب ہو، لیکن اسناداً غریب نہ ہو۔" (م)

(ب)۔ غریب اسناداً لا متناً:

وہ حدیث ہے، جس کا متن صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے منقول ہو، پھر یہ حدیث ایک حدیث ایک صحابی سے دوسرا شخص روایت کرے، جو اس میں منفرد ہو۔ اس قسم حدیث کے حدیث کے متعلق امام ترمذیؒ [۱] فرمایا کرتے ہیں۔

"غريب من هذا الوجه." [۲]

"یہ حدیث اس طریق سے غریب ہے۔"

۷۔ احادیث غریب کے مظان اور مواقع:

درج ذیل کتابوں میں غریب احادیث کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں:

(الف)۔ مسند البزار۔

(ب)۔ المعجم الأوسط، از طبرانیؒ۔

۸۔ غریب احادیث پر مشہور و معروف تصانیف:

(الف)۔ غرائب مالك، از امام دار قطنیؒ.

(ب)۔ الأفراد، از امام دار قطنیؒ.

(ج)۔ السنن التي تفرد بكل سنة منها أهل بلدة، از امام ابوداود سجستانیؒ [۳].

---

[۱] محمد بن عیسی بن سورة بن موسی سلمی بوغی ترمذی، ابوعیسی، ۲۰۹ھ کو پیدا ہوئے، دریائے جیحون کے قریب ترمذ کے باسی تھے، خراسان، عراق اور حجاز کے اسفار کیے، نابغہ روزگار محدث تھے، ترمذ میں ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ (وفیات الاعیان: ۴/ ۲۷۸، تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۶۳۳، سیر اعلام النبلاء: ۱۳/ ۲۷۰، الاعلام للزرکلی: ۶/ ۳۲۲)(م)

[۲] امام ترمذیؒ (م ۲۷۹ھ) نے اس طرح کے الفاظ متعدد مقامات پر کہے ہیں، چند مقامات یہ ہیں:

حدیث رقم: ۳۶۰، ۵۸، ۴۱۳، ۴۲۰، ۴۱۴، ۴۲۸، ۴۴۸، ۴۸۹، ۴۵۵، ۶۱۴، ۶۰۷، ۶۵۴، ۶۴۶، ۶۶۴۔ (م)

[۳] ان کے علاوہ دیگر کتب یہ ہیں:

۱...كتاب اطراف الغرائب والافراد، از محمد بن طاہر مقدسیؒ.

۲...الاحاديث الصحاح والغرائب، ازابوالحجاج مزیؒ (م ۷۴۲ھ)(م)

مبحث دوم: قوت وضعف کے اعتبار سے خبر آحاد کی تقسیم

خبر آحاد (خواہ مشہور ہو یا عزیز ہو یا غریب ہو) کی قوت اور ضعف کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں[۱]:

(الف) مقبول (ب) مردود

(الف)۔ مقبول کی تعریف:

وہ خبر واحد ہے، جس کو مخبر بہ (نفس مضمون) کی صدق کی وجہ سے ترجیح دی جائے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اسے احتجاج اور استدلال کے طور پر پیش کرنا واجب ہے اور اس پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے[۲]۔

(ب)۔ مردود کی تعریف:

وہ خبر ہے جس کو مخبر بہ (نفس مضمون) کی عدم صدق کی وجہ سے ترجیح نہ دی جائے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ نہ یہ قابل استدلال ہوتا ہے اور نہ اس پر عمل پیرا ہونا واجب ہے[۳]۔

مقبول اور مردود احادیث کی مختلف اقسام اور تفصیلات ہیں، جنہیں ہم ان شاء اللہ مختلف مطالب میں تقسیم کر کے بیان کریں گے۔

---

[۱] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے خبر واحد کی ایک تیسری قسم "متوقف فیہ" بھی ذکر کی ہے، وہ خبر جس میں صدق وکذب میں سے کوئی پہلو قابلِ ترجیح نہ ہو اسے متوقف فیہ کہا جائے گا، الا یہ کہ کوئی قرینہ اسے مقبول یا مردود بنادے۔ توقف عن العمل اگرچہ مردود ہی ایک صورت ہے مگر اس لیے نہیں کہ اس میں مردود کی صفات ہیں، بلکہ اس لیے کہ اس میں قبولیت کی صفات نہیں پائی جاتیں۔ (نزہۃ النظر: ۵۱)(م)

[۲] نزہۃ النظر في توضیح نخبۃ الفکر: ۵۱۔(م)

[۳] نزہۃ النظر في توضیح نخبۃ الفکر: ۵۱۔(م)

مطلب اول:

خبر مقبول کا بیان

یہ دو اہم مقاصد پر مشتمل ہے:

مقصد اول: خبر مقبول کی اقسام وانواع

مقصد دوم: معمول بہ اور غیر معمول بہ کے اعتبار سے خبر مقبول کی تقسیم

مقصد اول: خبر مقبول کی اقسام وانواع

خبر مقبول کی اپنے مراتب کے اعتبار سے دو بڑی قسمیں ہیں، صحیح اور حسن، پھر ان میں سے ہر ایک کی ذیلی دو دو قسمیں ہیں: لذاتہ اور لغیرہ۔ اب ظاہر بات ہے کہ مقبول کی چار قسمیں ہوئیں:

۱۔ صحیح لذاتہ ۲۔ صحیح لغیرہ ۳۔ حسن لذاتہ ۴۔ حسن لغیرہ [۱]

اب ذیل میں مذکورہ چاروں قسموں کی وضاحت کی جاتی ہے، ملاحظہ ہوں۔

۱۔ صحیح لذاتہ کا بیان [۲]

۱۔ صحیح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ صحیح کی لغوی تعریف:

لغت میں "صحیح" کا لفظ "سقیم" کی ضد ہے، یعنی تندرست شخص کو صحیح اور بیمار وناتواں کو سقیم کہتے ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ صحیح کا لفظ اجسام میں حقیقت کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور خبر وحدیث اور دیگر معانی میں مجاز مستعار کے طور پر استعمال ہوتا ہے [۳]۔

---

[۱] ان کا اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی خبر میں اعلی درجہ کی صفات قبولیت پائی جائیں تو صحیح لذاتہ ہو گی۔ اگر کسی خبر میں ان صفات کی کمی کثرت طرق سے پوری ہو گئی ہو تو وہ صحیح لغیرہ ہو گی۔ جب تمام صفات اعلی درجہ کی ہوں، لیکن ضبط ناقص ہو تو وہ حسن لذاتہ ہو گی اور اگر صفات قبولیت میں اتنی کمی ہو کہ بات درجہ توقف تک پہنچ جائے تو قرینہ قبولیت کی بنا پر حسن لغیرہ کہلائے گی۔ (نزہۃ النظر: ۵۸، تدریب الراوی: ۱/ ۵۹) (م)

[۲] معرفۃ علوم الحدیث: ۵۸، مقدمۃ ابن الصلاح: ۷۹، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۱۰ - ۱۳۶، التقریب: ۳۱ - ۴۲، الاقتراح: ۱۵۲، المنھل الروي: ۳۳، الخلاصۃ فی معرفۃ الحدیث: ۳۵، الموقظۃ: ۲۴، اختصار علوم الحدیث: ۲۱، المقنع فی علوم الحدیث: ۱/ ۴۱، شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۱/ ۱۱۰، نزھۃ النظر: ۸۲، المختصر للکافیجي: ۱۱۳، فتح المغیث: ۱/ ۱۷، ألفیۃ السیوطي: ۳ - ۱۵، شرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي: ۹۸، توضیح الأفکار: ۱/ ۷، ظفر الأماني: ۱۲۰، قواعد التحدیث: ۷۹. (م)

[۳] صحیح بخاري، کتاب الأذان، باب الجھر في المغرب، ۲/ ۲۴۷، حدیث ۷۶۵. (ط)

(ب)۔ صحیح کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں صحیح وہ حدیث ہے، جس کی سند متصل ہو، جملہ رواۃ عادل اور تام الضبط ہو الضبط ہو اور اس میں شذوذ اور علل نہ ہوں[۱]۔ *

۲۔ اصطلاحی تعریف کا مفہوم اور تشریح:

صحیح کی تعریف میں جو امور ملحوظ ہیں، ان سب کا صحیح میں پایا جانا ضروری ہے، تب جا کر حدیث صحیح ہو گی وہ امور حسب ذیل ہیں:

(الف)۔ اتصال سند:

اس کا مفہوم یہ ہے کہ سند کے ہر ایک راوی نے اپنے استاذ اور شیخ سے روایت بلاواسطہ حاصل کی ہو اور یہی صورتِ حال سند کی ابتداء سے انتہاء تک ہو[۲]۔

---

[۱] نزہۃ النظر:۵۸۔(م)

* حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) نے صحیح کی تعریف یوں فرماتے ہیں۔

" فهو الحديثُ المسنَدُ الذي يتَّصِلُ إسنادُهُ بنقلِ العَدْلِ الضابطِ عنِ العَدْلِ الضابطِ إلى منتهاهُ، ولا يكونُ شاذّاً، ولا مُعلَّلاً. "(مقدمہ ابن الصلاح:۷۹)

" صحیح وہ مسند حدیث ہے جس کی سند متصل ہو، جس کو عادل ضابط، عادل ضابط راوی سے آخر تک نقل کرے اور وہ شاذ و معلل نہ ہو۔ "

حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) نے صحیح کی تعریف میں "مسند" کی قید لگائی ہے، تاہم بعد میں آنے والے محدثین نے صحیح کی تعریف سے "مسند" کا قید نکال دیا۔ امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) کی صحیح کی جو تعریف کی اس کے الفاظ یہ ہیں:

"وَهُوَ مَا اتَّصَلَ سَنَدُهُ بِالْعُدُولِ الضَّابِطِينَ مِنْ غَيْرِ شُذُوذٍ وَلَا عِلَّةٍ. "(التقریب والتیسیر:۲۵)

علامہ طیبیؒ (م۷۴۳ھ) کی تعریف میں بھی "مسند" کی قید نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

"الصَّحِيحُ: هو ما اتَّصل سَنَدُه بِنَقل العَدل الضَّابط عن مثله، وسَلِم من شُذُوذ وعِلَّة"۔

(الخلاصۃ فی معرفۃ الحدیث:۳۵)۔

غالباً اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ "مسند" کی قید لگانے سے مرفوع ہونے کا اشارہ ملتا ہے، حالانکہ غیر مرفوع روایت بھی صحیح ہو سکتی ہے اس لیے بعد کے مصنفین نے "مسند" کی قید ختم کر دی۔(م)

[۲] حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) اتصالِ سند کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ =

(ب)۔عدالت رواۃ:

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حدیث کے تمام رواۃ اسلام، عقل اور بلوغ کے اوصاف کیساتھ متصف ہوں اور ان میں فسق وفجور نہ ہوں[1] اور نہ ہی ان میں کوئی خلاف مروّت کام پایا.........

= "ومتى قالُوا: (هذا حديثٌ صحيحٌ)فمعناهُ: أَنَّهُ اتَّصَلَ سَندُهُ معَ سائرِ الأوصافِ المذكورةِ."(مقدمہ ابن الصلاح:۸۰)

"جب محدثین کہتے ہیں:"یہ حدیث صحیح ہے"تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی سند متصل مذکورہ اوصاف کیساتھ متصل ہے۔" (م)

[1] عدالتِ راوی سے مراد یہ ہے کہ وہ دینی امور میں استقامت کی راہ پر گامزن ہو اور فسق اور غیر اخلاقی وغیر شرعی امور سے کنارہ کش ہو۔ خطیب بغدادیؒ(م ۴۶۳ھ) نے عدل کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

" «مَنْ عُرِفَ بِأَدَاءِ فَرَائِضِهِ وَلُزُومِ مَا أُمِرَ بِهِ، وَتَوَقِّي مَا نُهِيَ عَنْهُ، وَتَجَنُّبِ الْفَوَاحِشِ الْمُسْقِطَةِ، وَتَحَرِّي الْحَقِّ وَالْوَاجِبِ فِي أَفْعَالِهِ وَمُعَامَلَتِهِ، وَالتَّوَقِّي فِي لَفْظِهِ [مَا] يَثْلِمُ الدِّينَ وَالْمُرُوءَةَ، فَمَنْ كَانَتْ هَذِهِ حَالَهُ فَهُوَ الْمَوْصُوفُ بِأَنَّهُ عَدْلٌ فِي دِينِهِ، وَمَعْرُوفٌ بِالصِّدْقِ فِي حَدِيثِهِ»." (الکفایۃ:۸۰)

"عادل وہ شخص ہے جو فرائض اور اوامر کی تعمیل کرتا ہو، منکرات وفواحش سے گریزاں رہتا ہو، معاملات میں حق کا طالب اور غیر شرعی وغیر اخلاقی امور سے بچنے والا ہو۔ جس آدمی میں یہ اوصاف پائے جاتے ہوں وہ دین میں عادل اور روایتِ حدیث میں صادق کہلانے کا مستحق ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ(م ۸۵۲ھ)"عدل" کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"والمُرادُ بالعَدْلِ: مَنْ لهُ مَلَكَةٌ تَحْمِلُهُ على مُلازمةِ التَّقوى والمُروءةِ. والمُرادُ بالتَّقوى: اجْتِنابُ الأعمالِ السَّيِّئةِ مِن شِرْكٍ أَو فِسقٍ أَو بدعةٍ."(نزہۃ النظر:۵۸)

"عادل سے مراد وہ شخص ہے جسے وہ قوت راسخہ حاصل ہو جو اسے تقوی اور مروءت پر آمادہ کرے اور تقوی سے مراد شرک، فسق اور بدعت جیسے برے اعمال سے اجتناب ہے۔"

حاکم نیسابوریؒ(م ۴۰۵ھ) نے عدالت کی یوں وضاحت کی ہے۔

"وَأَصْلُ عَدَالَةِ الْمُحَدِّثِ أَنْ يَكُونَ مُسْلِمًا لَا يَدْعُو إِلَى بِدْعَةٍ، وَلَا يُعْلِنُ مِنْ أَنْوَاعِ الْمَعَاصِي مَا تَسْقُطُ بِهِ عَدَالَتُهُ." (معرفۃ علوم الحدیث:۵۳)

"محدث کی عدالت کی اساس یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو اور بدعت کا داعی نہ ہو اور گناہوں کی ان اقسام کا علانیہ مرتکب نہ ہو جو اس کی عدالت کو ساقط کر دیں۔"

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ راویوں کے ایسے عیوب سے چشم پوشی ضروری ہے جن سے کسی =

جاتا ہو۔[1] ....

= انسان کا دامن بھی پاک نہیں۔ ہر راوی اور عالم کی اکثر باتیں لوگوں سے پوشیدہ اور بہت کم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ خطیب بغدادیؒ (۴۶۳ھ) فرماتے ہیں۔

"«لَيْسَ مِنْ شَرِيفٍ وَلاَ عَالِمٍ وَلاَ ذِي سُلْطَانٍ إِلاَّ وَفِيهِ عَيْبٌ، لاَ بُدَّ، وَلَكِنْ مِنَ النَّاسِ مَنْ لاَ تُذْكَرُ عُيُوبُهُ»." (الکفایۃ:۷۹)

"کوئی شریف آدمی ہو یا عالم دین ہو یا تخت سلطنت پر فائز ہو۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہو گا، مگر بات یہ ہے کہ لوگوں میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے عیوب ذکر نہیں کیے جاتے۔"

تابعی جلیل سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں۔

" «مَنْ كَانَ فَضْلُهُ أَكْثَرَ مِنْ نَقْصِهِ وُهِبَ نَقْصُهُ لِفَضْلِهِ»." (الکفایۃ:۷۹)

"جس آدمی کے محاسن نقائص سے زیادہ ہوں تو اس کے عیوب فضائل کی وجہ سے معاف کر دیئے جائیں گے۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ راوی کا ثابت العدالت ہونا ضروری ہے اس سلسلہ میں راوی کے عیوب کے کشف و اظہار کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور یہ بات ظاہر ہے کہ کسی شخص کی عدالت کا پتہ اس کے اعمال وافعال اور معاملات کی آزمائش کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اور عدالت کی بحث و تحقیق اسی طرح ضروری ہے جس طرح شاہد کی عدالت معلوم کرنے کے لیے گہری طلب و تلاش ناگزیر ہے۔ (م)

[1] عدالت کی مذکورہ تفصیل محدثین کرامؒ کی بیان کردہ ہے، فقہائے احناف نے عدالت کو عدالتِ ظاہرہ اور عدالتِ باطنہ میں تقسیم کیا ہے، عدالتِ ظاہرہ یہ ہے کہ راوی مسلمان اور عاقل ہو اور عدالتِ باطنہ یہ ہے کہ راوی محرمات اور اعتقادات باطلہ کا مرتکب نہ ہو۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک عدالت کی دونوں قسمیں صحتِ روایت کے لیے ضروری ہیں، محض عدالتِ ظاہرہ ناکافی ہے۔ امام ابو زید دبوسیؒ (م ۴۳۰ھ) فرماتے ہیں۔

"والعدالة أيضاً قسمان:عدالة ظاهرة...وعدالة باطنة يوقف عليها بالنظر في باطن معاملاته... وبهذه العدالة يصير الخبر حجة. "(تقویم الادلۃ:۱۸۶)

"عدالت کی بھی دو قسمیں ہیں: ظاہری اور باطنی عدالت، عدالت باطنی میں راوی کے باطنی معاملات کو پرکھ جائے گا اور اسی عدالت کی بنیاد پر خبر معتبر اور حجت ہو گی۔"

راوی کے عدالت کے ضمن میں یہ پہلو بھی فقہاء اور محدثین کے درمیان زیر بحث رہا ہے کہ عادل راوی کا ایسے راوی سے روایت کرنا جس کی عدالت کے بارے میں کوئی واضح ثبوت نہ ہو تو ایسی روایت کے صحت کے متعلق فقہائے حنفیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر راوی کی عدالت واضح نہیں ہے، باوجود اس کے کہ ثقہ افراد نے اس سے روایت کی ہے تو ایسے راوی کی روایت کو قبول کرنا چاہیے، امام ابو بکر جصاصؒ (۳۸۳ھ) فرماتے ہیں۔

=

(ج)۔ضبط رواۃ:

اس کا مفہوم یہ ہے کہ رواۃ میں سے ہر ایک روای کا حافظہ قوی اور مضبوط ہو، خواہ اس نے حدیث کو سینہ میں محفوظ کیا ہو یا کتاب میں رقم کیا ہو[1]۔ *

= "مَا يَرْوِيهِ مَنْ لَا يُعْرَفُ ضَبْطُهُ وَإِتْقَانُهُ، وَلَيْسَ بِمَشْهُورٍ بِحَمْلِ الْعِلْمِ، إِلَّا أَنَّ الثِّقَاتِ قَدْ حَمَلُوا عَنْهُ، فَيَكُونُ حَمْلُهُمْ عَنْهُ تَعْدِيلًا مِنْهُمْ لَهُ، فَخَبَرُهُ مَقْبُولٌ." (الفصول فی الاصول:۳/۱۳۶)

"ایسی روایت جس کا راوی ضبط واتقان میں مشہور نہیں ہے اور نہ ہی اہل علم کے ہاں شہرت رکھتا ہے، لیکن ثقہ رواۃ نے ان سے روایت کی ہے تو ایسے شخص سے روایت کرنا اس کے تعدیل کے مترادف ہے۔"

محدثین کرام اس راوی کے روایت قبول نہیں کرتے جب تک اس کی تعدیل کی تصریح نہ ملے۔ اگر کسی نے عدالت کی تصریح کر دی تو پھر اس کی روایت کو قبول کیا جائے گا۔(م)

[1] محدثین کے نزدیک ضبط سے مراد یہ ہے کہ اس نے حدیث کو سنا، بہت اچھی طرح سمجھا اور ایسے طریقہ سے ذہن میں محفوظ رکھا ہو جس میں شک وشبہ کی کوئی مجال نہ ہو۔ نیز یہ کہ وقت سماع سے لے کر روایت کرنے تک اس میں کوئی فرق نہ آیا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ضبط میں دو چیزیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں:

۱۔ قوتِ حافظہ ۲- غور و فکر اور دقتِ نظر۔

نیز ضبط کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ ضبط قلبی ۲۔ ضبط کتابی۔

۱۔ ضبط قلبی: ضبط قلبی سے مراد یہ ہے کہ راوی نے جو کچھ سنا ہے اس کو اس مستحضر ہے کہ وہ جب چاہے اسے ادا کر دے۔

۲۔ ضبط کتابی: ضبط کتابی سے مراد راوی کا سننے اور درست کرنے کے بعد اپنے پاس محفوظ رکھنا ہے یہاں تک کہ دوسرے راوی تک پہنچادے۔

باقی رہی یہ بات کہ راوی کا ضبط کس طرح معلوم کیا جائے گا؟ تو راوی کا ضبط معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب اس کی روایت کا مقابلہ اصحاب حفظ وضبط اور ثقہ راویوں کی روایت کیساتھ کیا جائے تو اس کی روایت ان کے مطابق ہو۔ اگر اس کی روایت کردہ حدیث صرف معنی میں ہی ضابط راویوں کے مطابق ہو، اگرچہ الفاظ مختلف ہوں تو اس کو ضابط راوی قرار دیں گے۔ تھوڑی بہت خلاف ورزی قابل برداشت ہے، اگر یہ راوی ضابط و ثقہ راویوں کی اکثر مخالفت کرتا ہو اور تطابق و توافق کے مواقع کم ہوں تو اس کا ضبط خلل پذیر سمجھا جائے گا اور اس کی حدیث سے قابل احتجاج نہیں ہو گی۔

(علوم الحدیث:۱۶۰-۱۶۱)(م)

* مذکورہ منہج محدثین کا ہے، فقہائے احناف نے ضبط کو ضبط ظاہر اور ضبطِ باطن میں تقسیم کیا ہے، جمہور فقہائے احناف نے راوی کے لیے ضبطِ ظاہر کو کافی قرار دیا ہے، ضبطِ ظاہری میں متن کو لغوی اعتبار سے محفوظ کیا جاتا ہے اور باطنی ضبط میں لغوی معنی کو محفوظ کرنے کے کیساتھ فقہی و شرعی مفہوم کو بھی محفوظ کیا جاتا ہے، بعض فقہاء کی رائے میں راوی میں فہم صحیح اور ضبط کامل کا ہونا ضروری ہے گویا کہ راوی میں اتنی استعداد .... =

= وصلاحیت ہونی چاہیے کہ جو چیز سنے اس کو اچھے انداز سے سمجھے اور پھر کو یاد رکھے اگرچہ سماع اور روایت کے درمیان طویل زمانہ گزر جائے۔ امام بزدویؒ (م ۴۸۲ھ) فرماتے ہیں۔

"وهو نوعان: ضبط المتن بصيغته ومعناه لغةً. والثاني:أن ينضم إلى هذه الجملة ضبط معناه فقهاً وشريعة، وهذا أكملهما، والمطلق من الضبط يتناول الكامل." (کنز الاصول:۱۶۵-۱۶۶)

"ضبط دو طرح کا ہے، پہلی قسم یہ ہے کہ لغوی اعتبار سے متن کی عبارت کو محفوظ کرنا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ عبارتِ متن کیساتھ فقہی و شرعی معنی کو محفوظ کرنا ہے۔ یہ دوسری صورت کمال درجہ کی ہے، باقی مطلق ضبط بھی کامل میں شمار ہوتا ہے۔"

فقہائے احناف میں امام ابو زید دبوسیؒ (م ۴۳۰ھ) نے "تقویم الادلۃ:۱۸۷" میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ قبولیت روایت کے باب میں ضبط ظاہر و ضبط باطن دونوں کا اعتبار کیا جائے گا۔ لیکن راوی کے لیے ضبط ظاہر اور ضبط باطن دونوں شرطوں کو لازمی قرار دینا انتہائی مشکل معاملہ ہے، اس لیے کہ ہر راوی میں دوسری صفت "ضبط باطن" کا پایا جانا مشکل ہے جس کے نتیجہ میں ناقلین کی تعداد خاصی کم ہو کر رہ جائے گی، البتہ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ جس راوی میں صفت فقہاہت پائی جائے اسے ترجیح کے باب میں رکھا جائے گا، لیکن قبول روایت کے باب میں ظاہری ضبط ہی کافی ہے، علامہ عبد العزیز بخاریؒ (م ۷۳۰ھ) نے بھی اسی بات کی تصریح کی ہے۔

(غایۃ التحقیق شرح الحسامی:۱۵۹)

محدثین کرام اور فقہائے حنفیہ کے نقطہ ہائے نظر کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ محدثین کرام کے فقہ راوی شرط نہیں ،جب کہ فقہائے حنفیہ کے نزدیک ضبطِ ظاہر کیساتھ ضبط باطن (فقاہت) بھی ہونی چاہیے اور یہ وجہ ترجیح میں شامل ہے۔

۲۔ محدثین کرامؒ کے نزدیک صفتِ ضبط کثرتِ غفلت سے متاثر ہوتی ہے، جب کہ فقہائے حنفیہ نے مغفل، متساہل اور مجازف کے بارے میں نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر مغفل میں غفلت کم درجہ کی پائی جائے اور اکثر احوال میں متیقظ رہتا ہے تو ایسی غفلت کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ اتنی غفلت کا پایا جانا انسانی فطرت کا تقاضا ہے، البتہ اگر فحش غفلت موجود ہو اور جس کے نتیجہ میں اکثر اوقات قوتِ ضبط پر غفلت کے اثرات نمایاں رہتے ہیں تو پھر ایسی صورت میں ان کی روایت کو قبول نہیں کیا جائے۔

۳۔ محدثین کرام کا مذہب یہ ہے کہ راوی کے لیے قوتِ یاداشت کے ذریعہ روایت کو بیان کرنا ضروری نہیں، بلکہ کتاب سے بھی نقل کر سکتا ہے، جب کہ فقہائے حنفیہ نے ضبطِ راوی میں یہ شرط بھی عائد کی ہے کہ راوی کا تحمل ادا کے وقت سے لے کر بیان روایت تک محفوظ رکھے اور اس دوران میں کوئی خلل واقع نہ ہونے پائے۔ اسی بنا پر فقہائے احناف نے ایسے شیخ کی روایت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے جس پر نسیان طاری ہو اور اپنی روایت کے بیان کی نفی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے حنفیہ نے محدثین کرام سے ضبط راوی کی مختلف تقسیم بیان کی ہے۔ (م)

(د)۔عدم شذوذ:

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حدیث شاذ نہ ہو۔ شاذ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ثقہ راوی اپنے سے بڑھ کر ثقہ کی مخالف کرے[1]۔

(ہ)۔عدم علت:

اس کا مفہوم ہے کہ حدیث معلول نہ ہو، یعنی اس میں کوئی علت نہ پائی جائے[2]۔

---

(۱) نزہۃ النظر:۲۰۶۔(م)

علامہ ابن دقیق العید(م ۷۰۲ھ) نے علامہ ابن الصلاح(م ۶۴۳ھ) پر اعتراض کیا ہے کہ اِنہوں نے صحیح کی تعریف میں عدم شذوذ اور عدم علل کی قید لگائی ہے حالانکہ یہ فقہاء کے اصولوں کو شامل نہیں، اس لیے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محدثین کے نزدیک علت ہیں، لیکن فقہاء اسے علت نہیں کہتے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ ”وَزَاد أَصْحَاب الحَدِيث أَن لَا يكون شاذا وَلَا مُعَللا وَفِي هذَيْن الشَّرْطَيْنِ نظر على مُقْتَضى مَذْهَب الْفُقَهَاء فَإِن كثيرا من الْعِلَل الَّتِي يُعلل بهَا المحدثون الحَدِيث لَا تجْرِي على أُصُول الْفُقَهَاء۔“ (الاقتراح في بيان الاصطلاح:۵)

حافظ زین الدین عراقیؒ(م ۸۰۶ھ) نے علامہ ابن دقیق العید(م ۷۰۲ھ) کے اعتراض کا یہ جواب دیا ہے۔

”وَالْجَوَابُ أَنَّ مَنْ يُصَنِّفُ فِي عِلْمِ الْحَدِيثِ إِنَّمَا يَذْكُرُ الْحَدَّ عِنْدَ أَهْلِهِ لَا عِنْدَ غَيْرِهِمْ مِنْ أَهْلِ عِلْمٍ آخَرَ، وَكَوْنُ الْفُقَهَاءِ وَالْأُصُولِيِّينَ لَا يَشْتَرِطُونَ فِي الصَّحِيحِ هَذَيْنِ الشَّرْطَيْنِ لَا يُفْسِدُ الْحَدَّ عِنْدَ مَنْ يَشْتَرِطُهُمَا، وَلِذَا قَالَ ابْنُ الصَّلَاحِ بَعْدَ الْحَدِّ: فَهَذَا هُوَ الْحَدِيثُ الَّذِي يُحْكَمُ لَهُ بِالصِّحَّةِ بِلَا خِلَافٍ بَيْنَ أَهْلِ الْحَدِيثِ، وَقَدْ يَخْتَلِفُونَ فِي صِحَّةِ بَعْضِ الْأَحَادِيثِ، لِاخْتِلَافِهِمْ فِي وُجُودِ هَذِهِ الْأَوْصَافِ فِيهِ، أَوْ لِاخْتِلَافِهِمْ فِي اشْتِرَاطِ بَعْضِهَا كَمَا فِي الْمُرْسَلِ.“ (التقييد والإيضاح:۲۰، تدریب الراوی:۱/۶۳)

”اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص علم الحدیث میں تصنیف کرتا ہے وہ اسی تعریف کا ذکر کرے گا جو محدثین میں متداول ہے نہ کہ وہ تعریف جو کسی دیگر علوم میں مہارت رکھنے والوں کے درمیان متداول ہو۔ اور فقہاء و اصولیین کے نزدیک ان کا شرط نہ ہونا اس تعریف کو نقصان نہ دے گا جو انہیں شرط قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے حافظ ابن الصلاحؒ نے تعریف بیان کرنے کے بعد کہا: یہ وہ حدیث ہے جس پر محدثین کے ہاں بلا اختلاف صحت کا حکم لگایا جاتا ہے۔ کبھی وہ بعض احادیث کی صحت میں ان اوصاف کی موجودگی میں اختلاف کے باعث مختلف رائے رکھتے ہیں، یا بعض اوصاف کے شرط ہونے پر اختلاف کرتے ہیں، جیسے مرسل کے متعلق اختلاف ہے۔“

حافظ ابن حجرؒ(م ۸۵۲ھ)، حافظ شمس الدین سخاویؒ(م ۹۰۲ھ)، علامہ برہان الدین بقاعیؒ(م ۸۸۵ھ) سیوطیؒ(م ۹۱۱ھ) اور علامہ محمد بن اسماعیل صنعانیؒ(م ۱۱۸۲ھ) نے بھی علامہ دقیق العیدؒ(م ۷۰۲ھ) کے اس اعتراض پر خوب گفتگو کی ہے، تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ آخری دونوں شرطیں مختلف فیہ ہیں، جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔(النکت علی مقدمہ ابن الصلاح:۱/۲۳۵، فتح المغیث :۲/ ۴۲، النکت الوفیۃ بمافي شرح الألفیۃ:۱/۸۵، تدریب الراوی:۱/۶۳، توضیح الافکار:۱/۱۳)۔(م)

(۲) نزہۃ النظر:۵۸۔(م)

=

علت مبہم قسم کا ایک مخفی نقص ہوتا ہے، جو حدیث کی صحت پر اثر انداز ہوتا ہے، اگرچہ بظاہر حدیث فنی نقائص سے مبرا نظر آتی ہے۔

۳۔ صحیح حدیث کی شرائط:

صحیح حدیث کی اصطلاحی تعریف سے یہ بات واضح ہوئی کہ اس کے تحقق کے لیے پانچ شرائط ہیں، جو یہ ہے:

۱۔ اتصال سند ۲۔ عدالت رواۃ ۳۔ ضبط رواۃ ۴۔ شذوذ کی عدم موجودگی ۵۔ انتفائے علت۔

اگر ان مذکورہ پانچ شرائط میں کوئی ایک شرط نہیں پایا گیا، تو وہ حدیث صحیح نہیں کہلائے گی [1]۔

= حدیثِ صحیح کے لیے پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ معلل نہ ہو۔ علت سے مراد وہ علتِ خفیہ قادحہ ہے جو حدیث کی صحت کو مجروح کر دے باوجود اس کے کہ بظاہر وہ حدیث اس سے محفوظ ہو۔ حدیث معلل کی تفصیل آگے آئے گی، وہاں ملاحظہ ہو۔ (م)

[1] حدیث صحیح کے تحقق کے محدثین کرام نے مذکورہ پانچ شرائط ذکر کی ہیں، ان پانچ شرائط میں پہلی تین شرطیں وجودی ہیں اور بعد کی دو شرطیں عدمی ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

پہلی شرط اتصالِ سند کی شرط کے تحقق کے لیے مشہور ہے کہ امام بخاریؒ اور ان کے شیخ محدث جلیل علی بن مدینیؒ کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ شیخ اور اس کے شاگرد کے درمیان لقاء یا سماع کا ثبوت ہو۔ اور متعدد حضرات نے اسی کو ترجیح دی ہے جب کہ جمہور محدثین اور امام مسلمؒ کے نزدیک معاصرت (امکانِ لقاء) بھی اتصال پر محمول کرنے کے لیے کافی ہے، بشرطیکہ راوی مدلس نہ ہو۔

دوسری شرط عدالت کے تحقق کے لیے یہ اوصاف درکار ہیں:۔ ۱۔ راوی کا مسلمان ہونا۔ ۲۔ بالغ ہونا۔ ۳۔ عاقل ہونا۔ ۴۔ اسباب فسق سے محفوظ ہونا۔ ۵۔ خلاف مروت کاموں سے محفوظ ہونا۔ ۶۔ بدعت سے محفوظ ہونا۔ بالفاظ دیگر عقیدہ اور عمل دونوں اعتبار سے مذہب اسلام کا پابند ہونا کسی راوی کے عادل ہونے کے بعد مترادف ہے۔

تیسری شرط ضابط ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کو محفوظ رکھ کر جیسی سنی تھی ویسی ہی کمی وبیشی کے بغیر ادا کر دینا، خواہ راوی نے اس کو سینے میں محفوظ رکھا ہو یا لکھ کر محفوظ کیا ہو۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ عدالت اور ضبط میں تلازم نہیں، یہ بات ممکن ہے کہ راوی عادل ہو ضابط نہ ہو، یا ضابط ہو اور عادل نہ ہو۔ جس راوی میں یہ دونوں صفات موجود ہوں تو وہ ثقہ کہلائے گا۔ ان دونوں اوصاف میں جتنا کمال اور پختگی ہوگی اتنا ہی راوی کی ثقاہت میں اضافہ ہوگا اور جس قدر کمی ہوگی اسی کے مطابق راوی کمزور ہوگا۔

چوتھی شرط شذوذ سے خالی ہونا کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ثقہ راوی اپنی روایت میں اپنے سے زیادہ ثقہ کی مخالفت کرے اور جمع کی کوئی صورت ممکن نہ ہو۔ شذوذ کبھی سند میں اور کبھی متن میں پائی جاتی ہیں۔ =

= پانچویں شرط علل سے محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سند کے بظاہر صحیح ہونے کے باوجود اس میں باطنی طور ہو جو حدیث کو ناقابل قبول قرار بنادے، علت کبھی سند اور کبھی متن میں پائی جاتی ہے اور کبھی دونوں میں۔

واضح رہے کہ شذوذ در حقیقت علت ہی کے تحقق کا دوسرا نام ہے کیونکہ جب راوی اپنے سے اوثق یا کثیرین کی مخالفت کرے گا تو اس کے نتیجے میں علت کا ظہور ہو گا، علت کی شناخت ہو جانے کے بعد اس کی ایسی صورتیں بنتی ہیں، جن کو الگ الگ ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، مثلاً: رفعِ موقوف، وصلِ مرسل، متن میں زیادتی، منکر، مرسلِ خفی، مزید فی متصل الاسانید، مقلوب، مصحف، مدرج اور مضطرب وغیرہ۔ اور کچھ صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا اس طور پر کہ اہل علم کا ضمیر اس کے معلول ہونے کی شہادت دیتا ہے، مگر وہ اس کی نوعیت نہیں بیان کر سکتے اور نہ ہی اسے مدلل کر سکتے ہیں، در حقیقت اس جگہ شاذ سے یہی معنی مراد ہیں، ورنہ شذوذ اور علل میں فرق کیا رہے گا؟! اور دونوں ایک ہی معنی کے لیے مترادف الفاظ ہوں گے، حالانکہ تعریفات میں الفاظ مترادفہ سے اجتناب کیا جاتا ہے، گویا شاذ معلل سے بھی مشکل اور پیچیدہ چیز ہے!

یہاں یہ بات خوب نشیں رکھیں کہ شذوذ و علل سے محفوظ رہنے کی شرط کو صرف متاخرین محدثین کرام ضروری قرار دیتے ہیں، جب کہ متقدمین محدثین اور فقہائے کرام اس شرط کو ضروری نہیں قرار دیتے، ان کے نزدیک حدیث صحیح کے تحقق کے لیے صرف بنیادی تین شرطوں (عدالت، ضبط، اتصال) کا ہونا ضروری ہے۔ حافظ عبد الرحمن سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) سے نقل کرتے ہیں۔

" فَمُجَرَّدُ مُخَالَفَةِ أَحَدِ رُوَاتِهِ لِمَنْ هُوَ أَوْثَقُ مِنْهُ أَوْ أَكْثَرُ عَدَدًا لَا يَسْتَلْزِمُ الضَّعْفَ، بَلْ يَكُونُ مِنْ بَابِ صَحِيحٍ وَأَصَحَّ. قَالَ: وَلَمْ يُرْوَ مَعَ ذَلِكَ عَنْ أَحَدٍ مِنْ أَئِمَّةِ الْحَدِيثِ اشْتِرَاطُ نَفْيِ الشُّذُوذِ الْمُعَبَّرِ عَنْهُ بِالْمُخَالَفَةِ. وَإِنَّمَا الْمَوْجُودُ مِنْ تَصَرُّفَاتِهِمْ تَقْدِيمُ بَعْضِ ذَلِكَ عَلَى بَعْضٍ فِي الصِّحَّةِ." (تدریب الراوی: ۱/ ٦٤)

"محض اتنی سی بات کہ ثقہ شخص کی اس سے زیادہ ثقہ یا کثیر تعداد کے ذریعہ مخالفت کی گئی ہے حدیث کے ضعف کو مستلزم نہیں، بلکہ دونوں کی حیثیت یہ ہو گی کہ ایک صحیح ہے اور ایک زیادہ صحیح۔ نیز محدثین میں سے کسی سے اس شذوذ کی نفی منقول بھی نہیں، جس کی تعریف "ثقہ کی اس سے راجح کے مخالفت کیا جانا" سے کی جاتی ہے، بلکہ ان حضرات کے طرزِ عمل سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ صحت کے باب میں ایک کو دوسری پر مقدم کیا جائے گا اور بس!"

اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے اس کی مثال یوں دی ہے:

اس کی مثالیں صحیحین وغیرہ میں موجود ہیں: =

....

= پہلی مثال: امام بخاری اور مسلم دونوں نے سیدنا جابر کا اونٹ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ خریدے جانے کے واقعہ کو مختلف سندوں سے روایت کیا ہے، اس واقعہ میں رواۃ کا اختلاف دو چیزوں میں بہت زیادہ ہے، ایک تو یہ کہ ثمن کی مقدار کیا مقرر ہوئی؟ دوسرا یہ کہ معاملہ کرتے وقت سیدنا جابر نے رسول اللہ ﷺ سے یہ شرط لگائی تھی یا نہیں کہ وہ اس اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ منورہ تک جائیں گئے اور پھر اونٹ حوالہ کریں گے۔ امام بخاریؒ نے راویوں کی کثرت اور قوت کی بنیاد پر شرط مقرر کیے جانے پر دلالت کرنے والی روایات کو راجح قرار دیا ہے، اس کے باوجود کہ شرط کی نفی کرنے والی روایت کا بھی آپ نے تخریج کی ہے، اسی طرح جس روایت میں مقدارِ ثمن ایک اوقیہ بتائی گئی ہے اس کو دیگر روایات پر راجح قرادیا ہے حالانکہ اس کے مخالف روایات بھی آپ نے تخریج کی ہے۔

دوسری مثال: امام مسلم نے صحیح مسلم میں "مالک عن الزہری عن عروۃ عن عائشۃ" کے طریق سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر سے فارغ ہو کر فجر کی سنتوں سے پہلے دائیں پہلو پر لیٹتے تھے، جب کہ امام مالکؒ کے علاوہ امام زہریؒ کے کئی تلامذہ مثلاً: معمر، یونس، عمرو بن حارث، اوزاعی، ابن ابی ذئب اور شعیب وغیرہ امام زہری سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں تو فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنے کی بات نقل کرتے ہیں نہ کہ پہلے۔ اور حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے ان ہی حضرات کی روایت کو امام مالکؒ کی روایت پر راجح قرار دیا ہے، چنانچہ یہ قواعد محدثین کے مطابق شاذ کہلاتی ہے، پھر بھی صحیح کے مصنفین امام مالکؒ کی اس حدیث کو کتاب مسمیٰ بہ صحیح میں روایت کرتے ہیں، یہ دلیل ہے کہ محض کسی راوی کا اس سے اوثق کے ذریعہ مخالفت کیا جانا، اس کی حدیث کو صحیح کے زمرے سے خارج کرنے والا نہیں ہے۔ اس کی مثالیں تعداد میں موجود ہیں۔ (تدریب الراوی: ۱/ ۶۴)

اسی طرح امام تقی الدین ابن دقیق العیدؒ (م ۷۰۲ھ) خوب وضاحت کیساتھ رقم طراز ہیں۔

" وَفِي هذَيْن الشَّرْطَيْنِ نظر على مُقْتَضى مَذْهَب الْفُقَهَاء فَإِن كثيرا من الْعِلَل الَّتِي يُعلل بهَا المحدثون الحدِيث لَا تجْري على أُصُول الْفُقَهَاء." (الاقتراح في بيان الاصطلاح:۵)

"یہ دونوں شرطیں (شذوذ وعلل سے محفوظ رہنے کی شرطوں) فقہاء کے نزدیک محلِ نظر ہیں، کیونکہ بہت سی وہ وہ علتیں جن کو محدثین کرام مضر سمجھتے ہیں وہ فقہاء کرام کے اصول سے میل نہیں کھاتیں۔"

نیز علامہ ابن دقیق العیدؒ (م ۷۰۲ھ) اپنی شہرہ آفاق کتاب "الالمام" میں فرماتے ہیں۔

" أنَّ لكل من أئمة الحديث والفقه طريقًا غيرَ طريق الآخر، فإن الذي يتَبيَّنُ وتقتضيه قواعدُ الأصول والفقه: أنَّ العمدةَ في تصحيح الحديث عدالةُ الراوي وجزمُهُ بالرواية، ونظرُهُم يميل إلى اعتبارِ التجويزِ الذي يمكن معه صدقُ الراوي وعدم غلطه، فمتى حصل ذلك =

....

= وجاز أن لا يكونَ غلطًا وأمكنَ الجمعُ بين روايته ورواية مَنْ خالفه بوجهٍ من الوجوه الجائزة، لم يُترَكْ حديثه. وأمَّا أهلُ الحديث: فإنهم قد يروو ن الحديثَ من رواية الثقاتِ العدول، ثم تقوم لهم عللٌ فيه تمنعهم من الحكم بصحته؛ كمخالفة جمعٍ كثير له، أو مَنْ هو أحفظُ منه، أو قيامِ قرينة تؤثر في أنفسهم غلبةَ الظنِّ بغلطه." (الالمام باحادیث الاحکام:۱/۴۷)

"احادیث پر صحت کا حکم لگانے کے سلسلہ میں حضرات محدثین اور فقہاء دونوں کا نقطہ نظر مختلف ہے، چنانچہ فقہ اور اصول کے قواعد کا تقاضا تو یہ ہے کہ راوی اگر عادل ہو، صیغہ جزم سے روایت کر رہا ہو اور اس طرح کے آثار و قرائن موجود ہوں جن کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ راوی نے صحیح بیان کیا، اس میں کوئی غلطی نہیں کی، نیز اس کی اور اس کے مخالف حدیث کے درمیان تطبیق دینا ممکن ہو تو اس کی حدیث ترک نہیں جائے گی، جب کہ محدثین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ثقات وعدول کے طریق سے حدیث روایت کرتے ہیں، پھر جب ان کے سامنے کوئی علت ظاہر ہوتی ہے تو وہ صحت کا حکم لگانے سے رُک جاتے ہیں، مثلاً: کوئی زیادہ ثقہ یا متعدد ثقات کی مخالفت ہو، یا کوئی ایسا قرینہ ہو جس سے ظن غالب مخالف روایت کی غلطی کا ہو۔

مذکورہ بالا تصریحات سے واضح طور پر معلوم ہوئی کہ چوتھی اور پانچویں شرطیں اہل علم کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ فقہائے کرام حدیث صحیح کے تحقق کے لیے شذوذ اور علل سے محفوظ ہونے کی شرط کو نہیں مانتے! نیز یہاں بات بھی بڑی عجیب وغریب ہے کہ محدثین کرام صحتِ حدیث کے لیے شذوذ سے محفوظ ہونے کی قید ضرور لگاتے ہیں اور اس کی حقیقت یہ بتاتے ہیں کہ ثقہ اپنے سے اوثق راوی کی مخالفت کرے۔ پھر مخالفت کی تفصیل یہ بتاتے ہیں کہ دونوں کی روایتوں میں اتنا فرق ہو کہ ایک کو اختیار کرنا دوسری کے ترک کو مستلزم ہو اور دونوں میں جمع و تطبیق دُشوار ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ جمع و تطبیق کے دشوار ہونے کا کیا معیار ہے؟ اور یہ بات ظاہر ہے کہ ایک شخص دو متعارض نصوص میں تطبیق آسانی سے دے سکتا ہے اور دوسرے شخص کے لیے یہ کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو تطبیق دے دے گا اس کے نزدیک دونوں میں تعارض ہی نہ ہوگا کہ وہ اوثق کی روایت کو اختیار کرے اور ثقہ کی روایت کو چھوڑ دے۔ جب کہ دوسرا شخص ایسا کرنے پر مجبور ہوگا، پھر نصوص شرعیہ بازیچہ اطفال بن جائیں گی اور اسی طرح کتنے ثقہ رواۃ کے متعلق نادانستہ طور سے یہ فیصلہ ہوجائے گا کہ وہ ثقات کی مخالفت کرتے ہیں، اس لیے ان کی روایات ناقابل احتجاج ہیں۔ جیسا کہ امام شعبہ بن حجاجؒ (م ۱۶۰ھ) نے عبد الملک بن ابی سلیمان کی حدیث شفعہ جوار کی وجہ سے اس پر تنقید کی، پھر بعد کے لوگوں نے ان ہی کی اتباع میں عبد الملک پر جرح کی، حالانکہ عبد الملک کی حدیث دیگر رواۃ کی حدیث سے حقیقت میں متعارض تھی ہی نہیں! اس لیے حافظ محمد بن احمد بن عبد الہادی حنبلیؒ (م ۷۴۴ھ) فرماتے ہیں۔ =

۴۔ حدیث صحیح کی مثال:

صحیح کی مثال وہ حدیث ہے، جس کو امام بخاریؒ[1] نے صحیح بخاری میں درج ذیل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

= "وطعن شعبة في عبد الملك بسبب هذا الحديث لا يقدح في عبد الملك، فإن عبد الملك ثقة مأمون، وشعبة لم يكن من الحذاق في الفقه، ليجمع بين الأحاديث إذا ظهر تعارضها، وإنما كان إمامًا في الحفظ." (تنقیح التحقیق فی احادیث التعلیق:۴/۱۷۵)

"شعبہ کا عبد الملک بن ابی سلیمان پر اس حدیث کی وجہ سے جرح کرنا درست نہیں، کیونکہ وہ ثقہ ہے، شعبہؒ محض ایک حافظ اور محدث تھے ان کی فقہ پر کوئی دسترس نہیں کہ وہ متعارض احادیث کو جمع کر سکیں۔"

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ثقات کی روایتوں میں تعارض اور مخالفت کا فیصلہ کرنا بھی فقہاء کرام ہی کا کام ہے۔ محدثین کرام کے پیش نظر صرف حدیث کا اسنادی پہلو ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ محدثین کرام تو یہ صرف نشاندہی کریں گے کہ فلاں راوی ثقہ ہے اور جو شخص کے خلاف روایت کر رہا ہے وہ اس سے اوثق ہے یا وہ متعدد ہیں، اس لیے کہ انہوں نے غلطی نہیں کی ہے، غلطی اسی نے کی ہو گی!! لہذا یہ روایت راجح ہے اور وہ مرجوح! حالانکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ متعارض نصوص میں ترجیح دینے کا یہی ایک واحد معیار نہیں، بلکہ حافظ زین الدین عراقیؒ نے سو سے بھی زائد وجوہ ترجیح ذکر کی ہیں، جن کا تعلق سند اور متن کے علاوہ خارجی امور سے بھی ہے، ان وجوہ کو نظر انداز کر کے صرف ایک وجہ کو مضبوطی سے پکڑ لینا کہاں کا انصاف ہے؟!!! معلوم ہوا کہ محدثین کرام کا دائرہ عمل محدود ہے ان کے پیش نظر صرف اسنادی پہلو ہوتا ہے اور دیگر متنی و معنوی پہلوؤں سے غور و خوض فقہاء کرام کا کام ہے۔ اب اگر کسی حدیث کا قابل عمل ہونا، یا نا قابل عمل ہونا معلوم کرنا ہو تو اس کے لیے قواعد فقہاء اور اصولِ درایت کو اچھی طرح سمجھنا پڑے گا۔ دیکھئے مزید تفصیل کے لیے: حدیث اور فہم حدیث:۳۳۸-۳۴۳۔ (م)

[1] محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بخاری، ابو عبد اللہ، امیر المؤمنین فی الحدیث، ۱۹۴ھ کو بخارا میں پیدا ہوئے، بچپن میں یتیم ہو گئے، حصولِ حدیث کی خاطر غیر معمولی مشقتیں برداشت کیں، ۲۱۰ھ میں طلب حدیث کے لیے سفر شروع کیا، خراسان، عراق، مصر اور شام کے دور دراز اسفار کیے، تقریبا ایک ہزار شیوخ سے کسب فیض کیا۔ ۲۵۶ھ کو خرتنگ (سمرقند) میں وفات پائی۔ (وفیات الاعیان:۴/۱۸۸، شذرات الذہب:۲/۱۳۴، مرآۃ الجنان:۲/۱۶۷، سیر اعلام النبلاء:۱۲/۳۹۱، الاعلام للزرکلی:۶/۳۴)

"حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ: «قَرَأَ فِي المَغْرِبِ بِالطُّورِ».(۱)"

"عبد اللہ بن یوسف نے ہم سے بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں مالک نے خبر دی وہ ابن شہاب سے اور وہ محمد بن جبیر سے اور وہ اپنے والد مطعم بن جبیر سے روایت کی ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مغرب کی نماز میں سورہ طور پڑھتے ہوئے سنا تھا۔

یہ حدیث صحیح ہے اس لیے کہ اس کی سند متصل ہے کیونکہ ہر ایک راوی نے اسے اپنے شیخ سے بلا واسطہ سنا ہے، باقی رہا مالک، ابن شہاب اور معمر بن جبیر کا عنعنہ (۲) تو اسے اتصال سند پر محمول کیا جائے، اس لیے کہ ان حضرات میں کوئی راوی مدلس نہیں۔

اس حدیث کے جملہ رواۃ عادل اور تام الضبط ہیں، ان کے متعلق علماء جرح وتعدیل کے اقوال درج ذیل ہیں:۔

۱۔ عبد اللہ بن یوسف: ثقہ اور متقن ہیں (۳)۔

۲۔ مالک بن انس: امام اور حافظ حدیث ہیں (۴)۔

۳۔ ابن شہاب زہری: فقیہ اور حافظ حدیث ہیں اور ان کے جلالت علمی اور ضبط و اتقان پر اہل علم کا اتفاق ہے (۵)۔

۴۔ محمد بن جبیر: ثقہ ہیں (۶)۔

---

(۱) صحیح بخاری: ۱/ ۱۵۳، رقم: ۷۶۵۔ (م)

(۲) شیخ سے کسی حدیث کو لفظ "عن" کیساتھ روایت کرنا "عنعنہ" کہلاتا ہے، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ (م)

(۳) تہذیب الکمال: ۱۶/ ۳۳۳، سیر أعلام النبلاء: ۱۰ / ۳۵۷، تذکرۃ الحفاظ: ۴۰۴، تھذیب التھذیب: ۶ / ۸۶ - ۸۸، تقریب التھذیب: ۱ / ۴۶۳. (م)

(۴) تہذیب الکمال: ۲۷ / ۹۱، سیر اعلام النبلاء: ۸ / ۴۸، تذکرۃ الحفاظ: ۱ / ۱۵۴، الکاشف: ۳ / ۱۱۲، تہذیب التہذیب: ۱۰ / ۵۔ (م)

(۵) تہذیب الکمال: ۲۶ / ۴۱۹، تذکرۃ الحفاظ: ۱ / ۱۰۸، ثقات ابن حبان: ۵ / ۳۴۹، تہذیب التہذیب: ۹ / ۴۴۵۔ (م)

(۶) تہذیب الکمال: ۲۴ / ۵۷۳، سیر اعلام النبلاء: ۴ / ۵۴۳، طبقات ابن سعد: ۵ / ۲۰۵، تہذیب التہذیب: ۹ / ۹۱۔ (م)

۵۔ جبیر بن مطعم: صحابی رسول اللہ ﷺ ہے[1]۔

یہ حدیث شاذ نہیں، اس لیے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں، جو اس سے اقوی حدیث کی معارض ہو اور اس میں کوئی علت خفیہ قادحہ بھی نہیں پائی جاتی ہے۔

۵۔ صحیح حدیث کا حکم:

محدثین، فقہاء کرام اور اصولیین کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحیح حدیث پر عمل کرنا واجب ہے[2] اور دلائل شرعیہ میں سے ایک مستقل دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

---

(۱) الاستیعاب:۱/۲۳۲، اسد الغابۃ:۱/۵۱۵، الاصابۃ:۱/۵۷۰، تہذیب الکمال:۴/۵۰۶، سیر اعلام النبلاء:۳/۹۵۔ (م)

(۲) حدیث صحیح پر عمل کب ضروری ہے؟ اور اس کے لیے کیا شرائط ہیں؟ اس مسئلہ پر عصر حاضر کے عظیم محقق محدث شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ نے بڑی محققانہ اور مدلل تفصیلی گفتگو کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث صحیح پر عمل تب ضروری ہے کہ جب حدیث صحیح میں عمل کی جملہ شروط موجود ہوں، اس میں حدیث کی سند اور متن کی صحت اور تکمیل کے لیے علاوہ دیگر شرائط حدیثیہ اور اصولیہ کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے، حدیث پر عمل کرنے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ "تقریب التہذیب" وغیرہ میں اس کی سند کے رجال کا حال معلوم کر لیا جائے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، اگر محض اتنی سی بات ہوتی پھر تو فقہ کو غیر مؤثر کرنے سے پہلے بہت سے احادیث سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ محدث ابن ابی خیثمہؒ نے "شرح علل الترمذی" اور ابو نُعیم نے "حلیہ الاولیاء" میں عیسی بن یونس عن الاعمش کی سند سے ابراہیم نخعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"میں جب حدیث سنتا ہوں تو اس میں اختیار کرنے والی بات ہے اس کو اختیار کر لیتا ہوں اور باقی کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

حافظ ابن عبد البرؒ اپنی سند سے قاضی اور مجتہد ابن ابی لیلیٰؒ کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ:

"حدیث میں تفقہ اس وقت تک کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس میں سے بعض کو اختیار کر لے اور بعض کو چھوڑ دے۔"

حافظ ابن حبانؒ نے اپنی سند کیساتھ امام عبد اللہ بن وہبؒ کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے:

"میں نے تین سو ساٹھ علماء سے ملاقات کی، لیکن اگر امام مالکؒ اور امام لیث بن سعدؒ نہ ہوتے تو گمراہ ہو جاتا پھر ان سے یہ قول بھی روایت کیا کہ ہم نے علم حدیث میں چار ائمہ کی اقتداء کی دو اماموں کی مصر میں جو لیث بن سعدؒ اور عمرو بن حارث ہیں اور دو اماموں کی مدینہ منورہ میں جو امام مالکؒ اور امام ماجشونؒ ہیں اور اگر یہ لوگ نہ ملتے تو ہم گمراہ ہو جاتے۔"

قاضی عیاضؒ نے ترتیب المدارک (۲/۴۲۷) میں لکھا ہے کہ ابن وہبؒ نے فرمایا: =

۶۔ ”ہذا حدیث صحیح“ اور ”ہذا حدیث غیر صحیح“ کا مفہوم:

محدثین جب کسی حدیث کے متعلق ”ھذا حدیث صحیح“ (یہ حدیث صحیح ہے) کہتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ بالا پانچوں شرائط موجود ہیں، تاہم اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ یہ حدیث نفس الامر اور حقیقت میں صحیح ہے، اس لیے کہ ثقہ رواۃ میں غلطی کرنے اور بھول جانے کا امکان موجود ہوتا ہے اور ”ھذا حدیث غیر صحیح“ (یہ حدیث صحیح نہیں) کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ بالا تمام شرائط یا بعض شرائط متحقق نہیں، تاہم یہ مطلب نہیں کہ یہ نفس الامر اور حقیقت میں جھوٹ ہے، اس لیے کہ کثرت

= ”اگر اللہ تعالیٰ مالک اور لیث کی راہ نمائی کے سبب مجھے نہ بچاتا تو میں گمراہ ہو جاتا ان سے دریافت کیا گیا کہ: کیسے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے بہت سی احادیث جمع کیں تو میں اس کی تطبیق میں پریشان ہو گیا تو میں ان احادیث کو امام مالکؒ اور لیثؒ پر پیش کرتا تھا تو وہ مجھے کہتے تھے: اس پر عمل کرو اور اس اسے چھوڑ دو۔“

امام مالکؒ فرماتے ہیں۔

” احادیث پر فقہاء کے عمل کے مطابق عمل کرنا از خود عمل کی راہ اختیار کرسے زیادہ بہتر ہے۔“

نیز فرماتے ہیں۔

”جس قول کی میں اتباع کرتا ہوں اس کے بارے میں کسی کا یہ کہنا کہ مجھے فلان عن فلاں سے یہ حدیث پہنچی ہے مجھے اپنے موقف کے چھوڑنے پر اس لیے آمادہ نہیں کر سکتی کہ تابعین میں ایسے رجال کار تھے جن کے یہاں احادیث غیروں سے پہنچیں تو جواب میں انہوں نے کہا کہ ان احادیث کا ہمیں اچھی طرح علم ہے، لیکن چونکہ محدثین اور فقہاء کی جماعت کا عمل اس کے خلاف ہے اس لیے ہم ان کی عمل کے مخالفت نہیں کریں گے۔“

متقدمین کے ہاں اس بات کے بکثرت شواہد موجود ہیں کہ حدیث صحیح ان کے سامنے آئی اور انہوں نے اس پر عمل نہیں۔ حدیث پر تب عمل ہو گا جب کسی امام کے ہاں معمول بہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کسی امام کے عمل کو حدیث پر ترجیح دی جا رہی ہے اور یوں کہا جا رہا ہے کہ حدیث حجت اور دلیل ہی اس وقت بنتی ہے جب کوئی امام محدث اس پر عمل کرے اور اس سے پہلے وہ حدیث حجت نہیں بن سکتی! معاذ اللہ! ایسا ہرگز نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کا کلام تو ہر حال میں قابل عمل اور ہر مسلمان کا سر تسلیم خم کرنے کے لیے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کسی امام کا عمل کر لینا اس بات کی دلیل بن جاتی ہے کہ متقدمین نے اس حدیث کے ترک پر اجماع نہیں کیا ہے کیونکہ کسی حدیث کے ترک پر علماء متقدمین کا اجماع اس بات کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں دوسری قابلِ عمل حدیث موجود ہے جو اس حدیث پر عمل کے باب میں مقدم اور راجح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمۃ الفقہاء مترجم: ۹۶-۱۳۲۔ (م)

سے غلطیاں کرنے والے راوی سے بھی صحیح روایت کا منقول ہونا ممکن ہے[(۱)]۔

۷۔ کیا قطعی طور پر کسی سند کو مطلقاً "اصح الأسانید" کہنا درست ہے؟

اس مسئلہ میں مختار مسلک یہ ہے کہ کسی سند کے متعلق قطعی طور پر یہ رائے قائم نہیں کی جاسکتی ہے کہ یہ سند مطلقاً صحیح ترین سند ہے، اس لیے کہ صحت کے مراتب باہم متفاوت ہیں اور یہ تفاوت اس حقیقت پر مبنی ہے کہ سند میں پائی جانے والی شرائط کس معیار کی ہیں؟ اور یہ بات ظاہر ہے کہ شاذ و نادر ایسا ہوتا ہے کہ صحت کے جملہ شرائط اعلیٰ ترین معیار کے ہوں اس لیے بہتر یہ ہے کہ کسی سند پر علی الاطلاق "اصح الأسانید" کے حکم لگانے سے احتراز کیا جائے، تاہم بعض محدثین کرام سے "اصح الاسانید" کے متعلق اقوال منقول ہیں، جس کی بظاہر یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہر ایک محدث نے اپنی صواب دید کے مطابق اس سند کو ترجیح دی ہے، جو اس کے نزدیک قوی تھا، ذیل میں ہم چند "اصح الاسانید" کا تذکرہ کرتے ہیں:

(الف)۔ امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ[(۲)] کے نزدیک صحیح ترین سند: "الزهري عن سالم عن أبيه" ہے۔ (یعنی جس میں ابن شہاب زہری نے سالم سے اور انہوں نے اپنے والد عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہو۔

---

(۱) تدریب الراوي ج۱، ص۷۵-۷۶. (ط)

(۲) اسحاق بن ابراہیم بن مخلد حنظلی تمیمی مروزی، ابویعقوب ابن راہویہ، اپنے زمانے میں خراسان کے بہت بڑے عالم تھے، ۱۶۱ھ کو پیدا ہوئے، کبار حفاظ حدیث میں سے تھے، امام بخاریؒ، امام نسائیؒ اور امام ترمذیؒ جیسے اساطین علم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے، چونکہ ان کے والد ولادت دورانِ سفر ہوئی تھی اسی لیے راہویہ کہلائے، نیشاپور میں ۲۳۸ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان: ۱/ ۱۹۹، الاعلام للزرکلی: ۱/ ۲۹۲) (م)

یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ "راهويه" کے تلفظ میں اہل علم کا اختلاف ہے، علامہ عبدالرحمن سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) فرماتے ہیں کہ نحوی حضرات کا مذہب اس سلسلے میں یہ ہے کہ یہ مرکب امتزاجی ہے، دو کلموں "رَا" اور "وَيهِ" سے مرکب ہے، پہلا مبنی پر بر فتحہ اور دوسرا مبنی بر کسرہ ہوگا، چنانچہ وہ لوگ اس کا تلفظ "رَاهَوَيْهِ" سے کرتے ہیں اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا تلفظ "رَاهُوْيَهْ" ہے، یعنی واؤ ما قبل مضموم، واؤ ساکن، پھر یاء مفتوح اور ہاء پر سکون ہوگا۔ ان کے نزدیک "رَاهَوَيْهِ" کہنا غیر مستحسن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابراہیم نخعیؒ سے منقول ہے کہ "وَيْه" شیطان کا نام ہے، اس لیے یہ لوگ اس تلفظ سے اجتناب کرتے ہیں، یہی حال اس کے =

(ب)۔ امام علی بن مدینیؒ[1] اور فلاسؒ[2] کے نزدیک صحیح ترین سند: "ابن سيرين عن عبيدة عن علي رضی اللہ عنہ" ہے۔(جس کو ابن سیرین نے عبیدہ اور انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہو) ہے۔

(ج)۔ امام یحیی بن معینؒ[3] کے نزدیک صحیح ترین سند: "أعمش عن إبراهيم عن علقمه عن عبد الله رضی اللہ عنہ" ہے۔(جس کو اعمش نے ابراہیم سے انہوں نے علقمہ سے اور انہوں نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہو) ہے۔

(د)۔ امام ابو بکر بن شیبہؒ[4] کے نزدیک صحیح ترین سند: "الزهري عن علي بن الحسين عن أبيه عن علي رضی اللہ عنہ" ہے۔(جس میں امام زہری نے علی بن حسین سے انہوں نے اپنے والد حسین سے اور انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہو) ہے۔

= تمام نظائر سیبویہ، نفطویہ، مردویہ وغیرہ کا ہے۔ محدثین "راہویہ" کی وجہ تسمیہ بیان فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ سے منقول ہے کہ میرے والد کی پیدائش راستہ میں ہوتی تھی، اس لیے مروزی لوگوں نے انہیں "راہویہ" (راستہ والا کہنا) شروع کیا۔ دیکھئے: تدریب الراوی: ۱/ ۴۰۰-۴۰۱۔(م)

[1] علی بن عبداللہ بن جعفر سعدی ابن المدینی بصری، بصرہ میں ۱۶۱ھ کو پیدا ہوئے، محدث ومؤرخ اور اپنے دور کے حافظ حدیث تھے، دوسو کے لگ بھگ کتابیں لکھیں، علم مختلف الحدیث میں امام احمد بن حنبلؒ کے پائے کے عالم تھے۔ ۲۳۴ھ کو سامراء میں وفات پائی۔(تاریخ بغداد: ۱۱/ ۴۵۸، تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۴۲۸، الاعلام: ۴/ ۳۰۳)(م)

[2] عمرو بن علی بن بحر، ابو حفص باہلی، صیرفی فلاس، ۱۶۰ھ کے بعد پیدا ہوئے، بصرہ کے باشندے تھے، بغداد میں رہائش پذیر تھے، اپنے دور کے حفاظ حدیث، مجود، ناقد اور ثقہ عالم تھے، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام ابوداؤدؒ، امام نسائیؒ، امام ابن ماجہؒ اور امام ابو حاتمؒ وغیرہ نے ان سے روایات نقل کی ہیں، ۲۴۹ھ کو بسر (رای) میں وفات پائی۔(تاریخ بغداد: ۱۲/ ۲۰۷، تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۴۸۷، سیر اعلام النبلاء: ۱۱/ ۴۷۰، الاعلام للزرکلی: ۵/ ۸۲)(م)

[3] یحیی بن مَعین بن عون بن زیاد، ابو زکریا، انبار کے قریب ۱۵۸ھ کو نقیا نامی بستی میں پیدا ہوئے، بلند پایہ ناقد، محدث، مؤرخ اور حافظ حدیث تھے، ان کے والد محکمہ خراج میں عامل تھے، آپ لاکھوں احادیث کے کاتب اور حافظ تھے، ۲۳۳ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔(تاریخ بغداد: ۱۴/ ۱۷۷، تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۴۲۹، الاعلام: ۸/ ۱۷۲)(م)

[4] عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ عبسی کوفی، ابو بکر، ۱۵۹ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے نابغہ روزگار محدث اور حافظ تھے، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ جیسے اساطین علم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے، ۲۳۵ھ کو کوفہ میں وفات پائی۔(تاریخ بغداد: ۱۰/ ۶۶، الثقات لابن حبان: ۸/ ۳۵۸، تہذیب الکمال: ۲/ ۱۳۸، الاعلام: ۴/ ۱۱۷)(م)

(ہ)۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک صحیح ترین سند: " مالك عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ " ہے۔(جس میں امام مالک نے نافع سے اور انہوں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہو) ہے۔

۸۔ صحیح احادیث پر پہلی تصنیفی کاوش:

صرف صحیح احادیث پر سب سے پہلی تالیف صحیح بخاری ہے (۱) اور پھر اس کے بعد صحیح

---

(۱) صحیح بخاری سے پہلے احادیث پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، عام محدثین کا نقطہ نظریہ ہے کہ صرف صحیح احادیث پر لکھی جانے والی کتابوں میں اولیت کا شرف صحیح بخاری کو حاصل ہے۔ ابراہیم بن معقل نسفیؒ (م۲۹۵ھ) نے امام بخاریؒ سے نقل کیاہے۔ "كُنَّا عِنْدَ إِسْحَاقَ بْنِ رَاهَوَيْهِ فَقَالَ: لَوْ جَمَعْتُمْ كِتَابًا مُخْتَصَرًا لِصَحِيحِ سُنَّةِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فَوَقَعَ ذَلِكَ فِي قَلْبِي، فَأَخَذْتُ فِي جَمْعِ الْجَامِعِ الصَّحِيحِ." (تدریب الراوی:۱/۹۲)"

ہم اسحاق بن راہویہ کے ہاں تھے انہوں نے فرمایا۔ کاش! تم رسول اللہ ﷺ کی صحیح سنت پر ایک مختصر کتاب مرتب کرتے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں نے "الجامع الصحیح" کو مرتب کرنے کا کام شروع کیا۔"

نیز ان سے یہ بات بھی منقول ہے کہ امام بخاریؒ (م۲۵۶ھ) فرماتے ہیں۔

" رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ وَكَأَنَّنِي وَاقِفٌ بَيْنَ يَدَيْهِ وَبِيَدِي مَرْوَحَةٌ أَذُبُّ عَنْهُ، فَسَأَلْتُ بَعْضَ الْمُعَبِّرِينَ فَقَالَ لِي: أَنْتَ تَذُبُّ عَنْهُ الْكَذِبَ، فَهُوَ الَّذِي حَمَلَنِي عَلَى إِخْرَاجِ الْجَامِعِ الصَّحِيحِ. قَالَ: وَأَلَّفْتُهُ فِي بِضْعَ عَشْرَةَ سَنَةً. " (تدریب الراوی:۱/۹۲-۹۳)

"میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا گویا میں ان کے سامنے کھڑا ہوں اور میرے ہاتھ میں پنکھا ہے اور ان سے مکھیاں ہٹا رہا ہوں، میں نے کسی معبر سے پوچھا تو اس نے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی سنت سے دفاع کرو گئے۔ یہ واقعہ ہے جس نے "الجامع الصحیح" کی تالیف پر آمادہ کیا۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں: میں نے دس سے کچھ اوپر سالوں میں اسے تالیف کیا۔"

امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) نے "التقریب (ص۳۷)" میں صحیح بخاری کا ذکر کرتے ہوئے "الصحیح المجرد" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، علامہ عبد الرحمن سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) کے بقول "المجرد" کا اضافہ دراصل اس اعتراض کا جواب ہے کہ امام مالکؒ (م۱۷۹ھ) نے صحیح بخاری سے پہلے مؤطا تصنیف کی ہے؟ ان کے بعد امام احمد نے مسند احمد اور امام عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمیؒ (م۲۵۵ھ) نے سنن الدارمی تصنیف کیں؟ (تدریب الراوی:۱/ ۹۵)

حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے جو مؤطا کی اولین حیثیت پر شاہد ہے۔

"ما أعلمُ في الأرضِ كتاباً في العلمِ أكثرَ صواباً مِنْ كتابِ مالكٍ." (مقدمہ ابن الصلاح:۸۴)

"میں روئے زمین پر حدیث کی کسی ایسی کتاب سے واقف نہیں جو صحت کے لحاظ سے امام مالکؒ کی کتاب سے بہتر ہو۔"

امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) نے "الارشاد (ص۵۹)" میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ امام شافعیؒ (م۲۰۴ھ) کا قول صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تالیف سے پہلے کا ہے۔ حافظ زین الدین عراقیؒ (م۸۰۶ھ) فرماتے ہیں۔

"أَنَّ مَالِكًا لَمْ يُفْرِدِ الصَّحِيحَ بَلْ أَدْخَلَ فِيهِ الْمُرْسَلَ وَالْمُنْقَطِعَ وَالْبَلَاغَاتِ، وَمِنْ بَلَاغَاتِهِ أَحَادِيثُ لَا تُعْرَفُ، كَمَا ذَكَرَهُ ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ، فَلَمْ يُفْرِدِ الصَّحِيحَ إِذَنْ." (تدریب الراوی:۱/۹۵) =

مسلم ہے ....

= "امام مالکؒ نے صرف صحیح احادیث جمع کرنے کا التزام نہیں کیا ہے، بلکہ مرسل، منقطع اور بلاغات کو بھی جمع کیا ہے اور امام مالکؒ کی بلاغات میں سے بقول عبد البرؒ وہ احادیث ہیں جو غیر معلوم ہیں۔ سو امام مالک نے صرف صحیح پر اکتفاء نہیں کیا۔"

حاصل کلام یہ ہے کہ مؤطا اپنی عمدگی اور نقدِ رجال کے اعتبار سے اپنے زمانے اور قریبی دور میں تصنیف ہونے والی تمام کتب میں اولیت کی حامل ہے، جیسے سعید بن ابی عروبہ، حماد بن سلمہ، سفیان ثوری، ابن اسحاق، معمر بن راشد، ابن جریج، عبد الرزاق وغیرہ کی تالیفات۔ اور مؤطا کو جنہوں نے اصح قرار دیا ہے وہ ان کے لیے ہے جو مرسل اور موقوف کو حجت کہتے ہیں اور جہاں تک ایسی صحیح تصنیف کا تعلق ہے جو ائمہ حدیث کے نزدیک معتبر ہو۔ اور اتصال جیسے اوصاف سے متصف ہو تو ایسی کتاب کو سب سے پہلے امام بخاریؒ نے جمع کیا ہے اور پھر امام مسلمؒ نے جمع کیا ہے۔
(النکت علی مقدمہ بنا الصلاح:۱/۱۳۹)

مذکورہ رائے عام محدثین کرام کی ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صحیح احادیث پر سب سے پہلی تصنیف امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) کی "کتاب الآثار" ہے، جو صحیحین سے تقریباً ایک صدی پہلے لکھی جاچکی ہے، ماضی قریب کے عظیم محقق اور محدث علامہ عبد الرشید نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے حاکم نیسابوریؒ نے یہ بات کہی ہے کہ صحیح احادیث پر سب سے پہلی تصنیف امام بخاریؒ کی "صحیح بخاری" ہے اور حاکم نیسابوریؒ کی تقلید میں حافظ ابن الصلاحؒ نے بھی بغیر تحقیق کیے اولیت کا سہرا امام بخاریؒ کے سر پر باندھ دیا، پھر متاخرین نے بھی بغیر تحقیق کے حافظ ابن الصلاحؒ کی بات کو اپنی تصانیف میں دھرانا شروع کر دیا، لیکن یہ بات بالکل بے اصل ہے۔ (اصول حدیث کے بعض اہم مباحث:۵۵)

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ احادیث صحیحہ کی سب سے پہلی اور قدیم ترین کتاب "کتاب الآثار" ہے جو دوسری صدی کے ربع ثانی کی تالیف ہے۔۔۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ "کتاب الآثار" کو احادیث صحیحہ کا اولین مجموعہ بتانے پر چونکیں، اس لیے کہ اس حقیقت کو آشکار کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صحیح بخاری سے پہلے کوئی کتاب احادیث صحیحہ کی مدون نہیں کی گئی وہ سخت غلطی میں مبتلا ہیں، حافظ سیوطیؒ "تنویر الحوالک" میں لکھتے ہیں۔

"وقال الحافظ مغلطاي: أول من صنف الصحيح مالك" وقال الحافظ ابن حجر: كتاب مالك صحيح عنده وعند من يقلده على ما اقتضاه نظره من الاحتجاج بالمرسل والمنقطع وغيرهما "قلت: ما فيه من المراسيل فإنها مع كونها حجة عنده بلا شرط وعند من وافقه من الأئمة على الاحتجاج بالمرسل فهي أيضا حجة عندنا لأن المرسل عندنا حجة إذا اعتضد وما من مرسل في الموطأ إلا وله عاضد أو عواضد فالصواب إطلاق أن الموطأ صحيح لا يستثنى منه شيء." (تنویر الحوالک:۱/۴، طبع مصر ۱۳۴۳ھ)
=

....

= ”حافظ مغلطائی نے کہاہے کہ پہلے جس نے صحیح تصنیف کی وہ مام مالک ہیں،حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ امام مالک کی کتاب خودان کے نزدیک اوران کے مقلدین کے نزدیک صحیح ہے کیونکہ ان کی نظرمیں مرسل اور منقطع وغیرہ سے احتجاج کی مقتضی ہے، میں سیوطی کہتاہوں کہ مؤطامیں جومراسیل ہیں وہ علاوہ اس امر کے کہ وہ بلاکسی شرط کے امام مالک اوران ائمہ کے نزدیک کہ جومرسل کوان کی طرح سندمانتے ہیں حجت ہیں،ہمارے نزدیک بھی حجت ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک جب مرسل کاکوئی مؤید موجود ہوتووہ حجت ہوتی ہے اور مؤطامیں کوئی مرسل روایت ایسی موجود نہیں کہ جس کاایک یاایک سے زائد مؤید موجود نہ ہو، چنانچہ میں اپنی اس شرح میں کوبیان کروں گااس لیے حق یہی ہے کہ کل مؤطاکو صحیح کہاجائے اوراس سے کسی چیز کو مستثنیٰ نہ کیاجائے۔“

امام سیوطیؒ نے حافظ مغلطائیؒ کے جس بیان کاحوالہ دیاہے کہ وہ خودان کی زبان سے سنناز یادہ مناسب معلوم ہوتاہے،علامہ محمد امیر یمانیؒ ”توضیح الافکار شرح تنقیح الانظار“ میں رقم طراز ہیں۔

”أول من صنف صحيح البخاري" هذا كلام ابن الصلاح١ قال الحافظ ابن حجر إنه اعترض عليه شيخ علاء الدين مغلطاى فيما قرأت بخطه بأن مالكا أول من صنف الصحيح وتلاه أحمد بن حنبل وتلاه الدارمى٢ قال وليس لقائل أن يقول لعله أراد الصحيح المجرد فلا يرد كتاب مالك لأن فيه البلاغ٣ والموقوف والمتقطع والفقه وغير ذلك لوجود ذلك في كتاب البخاري.“ (توضیح الافکار:۱/۴۲)

”پہلے جس نے جمع صحیح میں تصنیف کی وہ بخاری ہیں،یہ ابن صلاح کابیان ہے،حافظ ابن حجرنے کہاہے کہ اس پر شیخ مغلطائی نے اعتراض کیاہے،چنانچہ انہوں نے خودان کی تحریر میں پڑھاہے کہ پہلے جس نے صحیح تصنیف کی وہ امام مالکؒ ہیں،ان کے بعد امام احمد بن حنبل اور پھر دارمی۔اور کسی کواعتراض کاحق نہیں کہ غالباًابن الصلاح کی مراد صحیح سے صحیح مجردہے،لہٰذاامام مالک کی کتاب اس سلسلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی،کیونکہ اس میں بلاغات،موقوف،منقطع اور فقہ وغیرہ بھی موجودہے اس لیے کہ یہ سب چیزیں توامام بخاری کی کتاب میں بھی پائی جاتی ہیں۔“

بلاشبہ علامہ مغلطائیؒ کے نزدیک اس بارے میں اولیت کاشرف امام مالک کوحاصل ہے،لیکن کتاب الآثار مؤطاسے پہلے کی تصنیف ہے جس سے خود مؤطاکی تالیف میں استفادہ کیاگیاہے،چنانچہ حافظ سیوطیؒ ”تبیض الصحیفہ فی مناقب الامام ابی حنفیہ“ میں تحریر فرماتے ہیں۔

”من مناقب أبي حنيفة التى انفرد بها أنه أول من دون علم الشريعة ورتبه أبوابا، ثم تبعه مالك بن أنس فى ترتيب المؤطا، ولم يسبق أباحنيفة أحد.“(تبیض الصحیفہ:۳۶)

”امام ابوحنفیہؒ کے ان خصوصی مناقب میں سے کہ جن میں وہ متفرد ہیں ایک یہ بھی ہے وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم شریعت کومدون کیااوراس کی ابواب پر ترتیب کی پھر امام مالک بن انس نے مؤطاکی ترتیب میں انہی کی پیروی کی =

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے بعد یہ دونوں دنیا کی صحیح ترین کتابیں ہیں[۱] اور ان کی قبولیت پر امت مسلمہ کا اجماع ہے۔

اب یہاں بظاہر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(الف)۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں سے اصح کونسی کتاب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح بخاری اصح اور بے حد مفید کتاب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کی احادیث اتصال سند اور ثقاہت کے اعتبار سے بہت زیادہ معیاری ہیں، نیز فقہی استنباطات اور حکیمانہ نکات کے اعتبار سے بھی اس کا درجہ صحیح مسلم سے بلند اور فائق ہے، اس قسم کے فوائد اور نکات صحیح مسلم میں ہی بہت کم ہیں[۲]۔

=اور اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں۔"

امام ابو حنیفہؒ کی تصانیف سے امام مالکؒ کے استفادہ کا ذکر کتب تاریخ میں صراحت سے مذکور ہے، قاضی ابو العباس احمد بن محمد بن عبد اللہ بن ابی العوام "اخبار ابی حنیفہ" میں بسند متصل عبد العزیز بن محمد دراوردی سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالکؒ امام ابو حنیفہؒ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے۔

کتاب الآثار میں جو احادیث ہیں وہ مؤطا کی روایات سے قوت وصحت میں کم نہیں، ہم نے خود اس کے ایک ایک راوی کو جانچا اور ایک ایک روایت کو پرکھا ہے اور جس طرح مؤطا کے مراسیل کے مؤید موجود ہیں، اسی طرح اس کے مراسیل کا حال ہے اس لیے صحت کے جس معیار پر حافظ مغلطائیؒ اور حافظ سیوطیؒ کے نزدیک مؤطا صحیح قرار پائی ہے، ٹھیک اسی معیار پر کتاب الآثار صحیح اترتی ہے، مؤطا کو کتاب الآثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: امام ابن ماجہ اور علم حدیث: ۱۵۹-۱۶۳، اصول حدیث کے بعض اہم مباحث: ۵۲-۵۸۔

(۱) تدریب الراوی: ۱/۹۶، مقدمہ ابن الصلاح: ۸۴۔ (م)

(۲) صحیحین کی مقبولیت ایک متفق علیہ مسئلہ ہے، لیکن ان دونوں کے مراتب میں اختلاف ہے، جمہور محدثین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ صحیح بخاری صحت کے لحاظ سے تمام کتب احادیث میں فائق اور مقدم ہے۔ صحیح بخاری کے بارے میں یہ مقولہ زبان زد عام ہے۔"أصح الكتب بعد كتاب الله الباري الجامع الصحيح للبخاري"۔ لیکن بعض اہل علم صحیح مسلم کو اولین درجہ دیتے ہیں، محدث ابو علی حسین بن علی نیسابوریؒ (م ۳۴۹ھ) فرماتے ہیں۔

"ما تحت أديم السماء كتاب أصح من كتاب مُسْلِم بن الحجاج."(مقدمہ ابن الصلاح: ۳۶)

"آسمان کے نیچے صحیح مسلم سے زیادہ کوئی صحیح کتاب نہیں۔" =

= اسی طرح بعض مغربی اہل علم سے یہ منقول ہے کہ وہ صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر فضیلت دیتے ہیں، معروف محدحافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) ان دونوں آراء کا ذکر کر کے بعد رقم طراز ہیں۔

"إن كانَ المرادُ بهِ أنَّ كتابَ مسلمٍ يترجَّحُ بأنَّهُ لَمْ يُمازِجْهُ غيرُ الصحيحِ، فإنَّهُ ليسَ فيهِ بعدَ خُطبتِهِ إلاَّ الحديثُ الصحيحُ مسروداً غيرَ ممزوجٍ بمثلِ ما في كتابِ البخاريِّ في تراجمِ أبوابِهِ مِنَ الأشياءِ التي لَمْ يُسندْها على الوصفِ المشروطِ في الصحيحِ فهذا لا بأسَ بهِ. وليسَ يلزمُ منهُ أنَّ كتابَ مسلمٍ أرجحُ فيما يرجعُ إلى نفسِ الصحيحِ على كتاب البخاريِّ، وإنْ كانَ المرادُ بهِ أنَّ كتابَ مسلمٍ أصحُّ صحيحاً، فهذا مردودٌ على مَنْ يقولُهُ۔" (مقدمہ ابن الصلاح:۸۵)

"اگر اس سے مراد یہ ہے کہ صحیح مسلم کو ترجیح حاصل ہے، اس لیے انہوں نے غیر صحیح کو ساتھ نہیں ملایا اور اس میں خطبہ کے بعد صرف صحیح احادیث کو بیان کیا ہے اور ان کیساتھ غیر صحیح احادیث کو شامل نہیں کیا، جیسا کہ صحیح بخاری میں تراجم الابواب میں ایسی روایات ہیں، جنہیں امام بخاریؒ نے صحیح کے شرائط پر ذکر نہیں کیے تو ایسا ماننے میں کوئی حرج نہیں اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلم کی کتاب اس حوالے سے جس کا تعلق صحیح احادیث سے ہے قابل ترجیح ہے اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مسلم کی کتاب صحیح احادیث کے اعتبار سے اصح ہے تو یہ قول جس کا بھی ہے نا قابل اعتناء ہے، یعنی کی کوئی حقیقت نہیں۔۔"

محدثِ جلیل علامہ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ صحیح بخاری کی افضلیت پر محدثین کرام کے بے شمار اقوال ہیں، لیکن اتنی بات کافی ہے کہ ان سب اس بات پر اتفاق ہے کہ امام بخاریؒ فن حدیث میں امام مسلمؒ سے فائق تھے۔ نیز صحیح بخاری صحیح مسلم سے اس لیے افضل ہے کہ جن صفات و شرائط پر صحت کا مدار ہے وہ صحیح مسلم کی بجائے صحیح بخاری میں زیادہ اقوی اور اتم ہیں، مثلاً:

۱۔ **اتصالِ سند:** اتصالِ سند کے اعتبار سے صحیح بخاری کو ترجیح حاصل ہے، کیونکہ امام بخاریؒ کے نزدیک راوی کا مروی عنہ سے کم از کم ایک مرتبہ ملنا ضروری ہے جب کہ امام مسلمؒ کہ ان کے نزدیک معاصرت کافی ہے۔
(نزہۃ النظر:۵۹، النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح:۱/۲۸۸)

۲۔ **عدالت وضبطِ رواۃ:** عدالت اور ضبط کے اعتبار سے بھی صحیح بخاری کے رواۃ صحیح مسلم کے رواۃ سے فائق ہیں، چنانچہ صحیح بخاری میں متکلم فیہ رواۃ کی تعداد صحیح مسلم کی بنسبت کم ہے، صحیح بخاری کے منفرد رجال کی تعداد چار سو پینتیس ہے اور متکلم فیہ رواۃ کی تعداد اسی ہے۔ اس کے برعکس صحیح مسلم کے منفرد رجال کی تعداد چھ سو بیس ہے اور متکلم فیہ رواۃ کی تعداد ایک سو ساٹھ ہے۔ دوسری وجہ ہے کہ صحیح بخاری کے متکلم فیہ رواۃ اکثر امام بخاریؒ کے شیوخ ہیں، جس سے وہ ملے ہیں، جن کے احوال سے واقف ہیں، لہٰذا ان کی ناقص احادیث میں تمیز کر سکتے ہیں جب کہ صحیح مسلم کے متکلم فیہ رجال کا تعلق متقدمین سے ہے، جن کے متعلق امام مسلمؒ کو بلاواسطہ واقفیت حاصل نہ تھی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اکثر امام بخاریؒ متکلم فیہ رواۃ کی تخریج استشہادات، .... =

یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ صحیح بخاری کی فوقیت صحیح مسلم پر مجموعی حیثیت سے ہے، ورنہ صحیح مسلم کی بعض احادیث صحیح بخاری سے زیادہ قوی الاسناد ہیں، اس وجہ سے بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم صحیح بخاری سے اصح ہے، تاہم پہلا قول درست اور راجح ہے[1]۔

= متابعات اور تعلیقات میں کرتے ہیں جب کہ امام مسلمؒ متکلم فیہ رواۃ سے اصول اور قابل حجت امور میں روایت کرتے ہیں۔ نیز امام بخاریؒ ان کی اکثریت پر اعتماد نہیں کرتے جب کہ امام مسلمؒ انہیں قابل حجت سمجھتے ہیں جن کی تخریج امام بخاریؒ کے ہاں متابعات میں ہے۔(تدریب الراوی:۱/۶۹، النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح:۱/۲۸۸)

۳۔ **عدم شذوذ وعدم تعلل:** عدمِ شذوذ وعدمِ تعلل کی بنیاد پر بھی صحیح بخاری کو فضیلت حاصل ہے۔ امام بخاریؒ کی اھادیث پر امام مسلمؒ کی احادیث کے مقابلے میں نسبتاً کم تنقید کی گئی ہے۔ صحیحین کی دوسودس احادیث پر تنقید کی گئی ہے، جن میں اٹھتر صرف صحیح بخاری میں ہیں اور سو صرف صحیح مسلم میں ہے، جب کہ باقی دونوں میں مشترک ہیں۔(تدریب الراوی:۱/۹۷)۔

حافظ ابن حجرؒ(م ۸۵۲ھ) میں رقم طراز ہیں۔

"هذا مع اتِّفاقِ العُلماءِ على أنَّ البُخاريَّ كانَ أَجلَّ مِن مُسْلِمٍ في العُلومِ وأَعْرَفَ بصِناعةِ الحَديثِ مِنهُ، وأَنَّ مُسلماً تِلْميذهُ وخِرِّيجُهُ، ولم يزَلْ يَسْتَفيدُ منهُ ويتَتَبَّعُ آثارَهُ حتَّى قالَ الدَّارَقُطنِيُّ: لولا البُخاريُّ لَمَا راحَ مُسْلِمٌ ولا جَاءَ." (نزہۃ النظر:۶۴)

"تاہم اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ علوم میں بخاری کا درجہ مسلم سے زیادہ تھا اور بخاری فن حدیث میں مسلم سے زیادہ عارف تھے اور یہ کہ مسلم تو ان کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے۔ وہ ہمیشہ ان سے استفادہ کرتے رہتے اور پیروی کرتے رہے حتی کہ امام دار قطنی نے کہا: اگر بخاری نہ ہوتے تو مسلم اس مقام پر فائز نہ ہوتے۔"

مقدمہ فتح الباری میں اس پر مفصل بحث کی گئی ہے، ملاحظہ ہو۔(م)

[1] علامہ عبدالرحمن سیوطیؒ(م۹۱۱ھ) نے ایک تیسری رائے یہ بھی نقل کی ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم مرتبہ کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں، چنانچہ وہ معروف محدث علامہ ابن الملقنؒ(م۸۰۴ھ) کا قول نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

" رَأَيْتُ بَعْضَ الْمُتَأَخِّرِينَ قَالَ: إِنَّ الْكِتَابَيْنِ سَوَاءٌ فَهَذَا قَوْلٌ ثَالِثٌ، وَحَكَاهُ الطُّوفِيُّ فِي شَرْحِ الْأَرْبَعِينَ وَمَالَ إِلَيْهِ الْقُرْطُبِيُّ."(تدریب الراوی:۱/۱۰۱)

"میں نے دیکھا کہ بعض متاخرین نے کہا کہ دونوں کتابیں برابر ہیں۔"

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اس قول کو طوفی نے "شرح اربعین" میں نقل کیا ہے اور علامہ قرطبیؒ(م) کا میلان بھی اسی طرف ہے۔(تدریب الراوی:۱/۱۰۱)(م)

(ب)۔ ایک سوال یہ ہے کہ کیا شیخینؒ نے صحیح احادیث کا استیعاب کیا ہے؟ یا جملہ صحیح احادیث جمع کرنے کا التزام کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے صحیح احادیث کا استیعاب اور احاطہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان دونوں حضرات نے جملہ صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام کیا ہے، امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ فرماتے ہیں:۔

"مَا أَدْخَلْتُ فِي كِتَابِي الْجَامِعِ إِلَّا مَا صَحَّ، وَتَرَكْتُ مِنَ الصِّحَاحِ لِحَالِ الطُّولِ(۱)*".

"میں نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں وہی احادیث ذکر کی ہیں، جو صحیح تھیں اور جب کہ بہت سی احادیث کو طوالت کی خوف سے چھوڑ دی ہیں۔"

امام مسلم بن حجاجؒ(۲) فرماتے ہیں۔

"لَيْسَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدِي صَحِيحٌ وَضَعْتُهُ هَاهُنَا، إِنَّمَا وَضَعْتُ هَاهُنَا مَا أَجْمَعُوا عَلَيْهِ"(۳)".

"میں نے اس بات کا التزام نہیں کیا کہ جو حدیث بھی میرے نزدیک صحیح تھی میں نے اس کتاب (صحیح مسلم) میں درج کر دیا ہو۔ البتہ میں نے اس میں وہ احادیث جمع کی ہیں، جن کی صحت پر محدثین کرامؒ کا اجماع رہا ہے۔"(۴)

---

(۱) مقدمۃ الکامل لابن عدی:۱/۱۴۰، تاریخ بغداد:۲/۲۵، شروط الأئمۃ الخمسۃ للحازم:۶۴، سیر أعلام النبلاء:۱۲/۴۱۵، مقدمۃ ابن الصلاح:۸۵، ھدی الساری:۱۸، توضیح الافکار:۱/۵۴، فتح المغیث:۱/۴۷، توجیہ النظر:۱۱/۲۲۴.(م)

* بعض روایت میں یہ الفاظ ہیں:" لملال الطول"مطلب یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں بہت سی احادیث صحیحہ کی روایت اس خوف سے ذکر نہیں کیں کہ کہیں کتاب کی طوالت سے لوگ اُکتا نہ جائیں۔(ط)

(۲) مسلم بن حجاج بن مسلم قشیری، نیشاپوری، ابو الحسین، ۲۰۴ھ کو نیشاپور میں پیدا ہوئے، کبار ائمہ حدیث اور حفاظ میں سے تھے، حجاز، مصر، شام اور عراق کے دور دراز اسفار کیے، ۲۶۱ھ کو نیشاپور ہی میں وفات پائی۔

(تذکرۃ الحفاظ:۲/۱۵۰، وفیات الاعیان:۵/۵۸۸، الاعلام للزرکلی:۷/۲۲۱)(م)

(۳) تدریب الراوی:۱/۱۰۴۔

(۴) یعنی ایسی احادیث جن میں حدیث صحیح کی وہ شرطیں موجود تھیں جن پر محدثین کا اجماع ہے۔(ط)

(ج)۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ ان دو کتابوں کے علاوہ صحیح احادیث کی تعداد زیادہ ہے یا کم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے، حافظ ابو عبد اللہ بن اخرمؒ فرماتے ہیں۔

"لَمْ يَفُتْهُمَا إِلَّا الْقَلِيلُ[1]."

"بہت ہی کم ایسی احادیث ہیں، جو ان دونوں کتابوں میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں۔

لیکن اہل علم نے اس بات کو مسترد کیا ہے اور اس کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے[2]، صحیح اور راجح بات یہ ہے کہ بہت سی صحیح احادیث ان کتابوں میں درج ہونے سے رہ گئیں ہیں، امام بخاریؒ سے منقول ہے۔

"وَمَاتَرَكْتُ مِنَ الصِّحَاحِ أَكْثَر[3]."

"جتنی صحیح حدیثیں میں نے چھوڑدی ہیں، وہ بہت زیادہ ہیں۔"

نیز فرماتے ہیں۔

"أَحْفَظُ مِائَةَ أَلْفِ حَدِيثٍ صَحِيحٍ، وَمِائَتَيْ أَلْفِ حَدِيثٍ غَيْرِ صَحِيحٍ[4]."

"مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں۔"

(د)۔ ایک سوال یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں احادیث کی تعداد کتنی ہیں؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح بخاری میں مکررات سمیت کل احادیث (۷۲۷۵) اور اگر مکررات حذف کی جائیں تو احادیث کی تعداد (۴۰۰۰) رہ جاتی ہے[5]۔

صحیح مسلم میں احادیث کی تعداد مکررات سمیت (۱۲۰۰۰) ہے اور اگر مکررات حذف کی جائیں

---

(۱) تدریب الراوی: ۱/ ۱۰۴۔(م)

(۲) امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) اس قول کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اصولِ خمسہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن الترمذی، سنن ابی داؤد، سنن النسائی) سے روایات کا بہت تھوڑا حصہ رہے چکا ہے۔ (التقریب: ۲۶)(م)

(۳) تدریب الراوی: ۱/ ۱۰۵۔(م)

(۴) تدریب الراوی: ۱/ ۱۰۶۔(م)

(۵) التقریب والتیسیر: ۲۶، تدریب الراوی: ۱/ ۱۰۹۔(م)

تو احادیث کی تعداد تقریباً (۴۰۰۰) رہ جاتی ہے [1]۔

(ہ)۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ وہ صحیح احادیث جو بخاری اور مسلم میں درج نہیں، وہ ہمیں کہاں مل سکتی ہیں؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی صحیح احادیث ہمیں معروف اور قابل اعتماد کتب حدیث میں مل سکتی ہیں، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبّان، مستدرک حاکم، سنن اربعہ (سنن ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ اور سنن نسائی، سنن دار قطنی اور سنن بیہقی وغیرہ [2]۔

۹۔ مستدرک حاکم، صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان پر ایک نظر:

(الف)۔ مستدرک حاکم: یہ حدیث کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں مؤلف نے ایسی صحیح احادیث جمع کی ہیں، جو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ یا ان دونوں میں سے کسی ایک کے شرائط کے مطابق ہیں، لیکن ان دونوں حضرات نے انہیں اپنی کتابوں (بخاری و مسلم) میں ذکر نہیں کیے، اس میں مؤلف نے اس قسم کی حدیثیں بھی درج کی ہیں، جو ان کی مطابق صحیح ہیں، اگر چہ وہ امام بخاریؒ اور امام

---

[1] التقریب والتیسیر:۲۶، تدریب الراوی:۱/۱۰۹۔(م)

[2] التقریب:۲۶، تدریب الراوی:۱/۱۱۱۔(م)

یہ بات صحیح ہے کہ صحیحین کے علاوہ مذکورہ کتابیں بھی صحیح احادیث کے مصادر وماخذ ہیں، تاہم کسی حدیث کا ان کتابوں میں موجود ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں، بلکہ اس کی تحقیق کی جائے گی کہ اس میں حدیث صحیح کے شرائط موجود ہیں یا نہیں؟ البتہ جن محدثین کرامؒ نے اپنی کتابوں میں صحیح درج کرنے کا التزام کیا ہے وہ اس سے مستثنی ہیں، چنانچہ علامہ نوویؒ (م۶۷۶ھ) نے تحریر فرماتے ہیں۔ " ولا يكفي وجوده فيها إلا في كتاب من شرط الاقتصار على الصحيح، واعتنى الحاكم بضبط الزائد عليهما، وهو متساهل، فما صححه ولم نجد فيه لغيره من المعتمدين تصحيحاً ولا تضعيفاً حكمنا بأنه حسن إلا أن يظهر فيه علة توجب ضعفه، ويقاربه في حكمه صحيح أبي حاتم بن حبان." (التقریب:۲۶-۲۷)

"کسی حدیث کی صحت کے لیے یہ کافی نہیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کتاب میں موجود ہو، الا یہ کہ وہ کتاب جس نے یہ شرط لگائی کہ وہ صحیح کے علاوہ کچھ درج نہیں کرے گا، جیسے ابن خزیمہ کی کتاب اور صحیحین سے تخریج کردہ کتابیں مثلا: ابو بکر اسماعیلی اور ابو بکر برقانی کی کتابیں اور ابو عوانہ اسفرائینی کی کتاب۔" (م)

مسلمؒ کے شرائط مطابق نہیں، لیکن انہیں بھی صحیح الاسناد کہہ دیتے ہیں اور بعض اوقات غیر صحیح احادیث بھی درج کر لیتے ہیں، لیکن اس کیساتھ ساتھ غیر صحیح ہونے پر متنبہ بھی کرتے ہیں، تاہم ان کی تصحیح پر کلی طور اعتماد نہ کیا جائے، اس لیے کہ مؤلف نے تصحیح کے معاملہ میں متساہل ہیں۔ اس لیے مستدرک حاکم کی احادیث کی تتبع اور تحقیق ضروری ہے اور ہر حدیث کے متعلق وہی فیصلہ کرنا چاہیے، جو اس کے حسب حال ہو۔

امام شمس الدین ذہبیؒ[۱] نے اس کی اکثر احادیث کی تحقیق و تنقیح کی ہے اور حسب حال ان پر حکم لگایا ہے[۲]۔ تاہم اس بات کی اب بھی گنجائش ہے کہ اس پر علمی اور تحقیقی کام کیا جائے[۳]۔

(ب)۔ صحیح ابن حبّان:

اس کتاب کا منہج اور اسلوب دیگر حدیث کی کتابوں سے بالکل الگ تھلگ ہے، اس لیے کہ اس کی ترتیب و تنسیق اختراعی ہے، نہ تو فقہی ابواب پر مرتب ہے اور نہ ہی مسانید کے طرز پر ہے، یہی وجہ ہے کہ مؤلف نے اس کا نام " التقاسیم والانواع" تجویز کیا ہے، اس کتاب میں کسی حدیث کی تلاش انتہائی مشکل ہوتی ہے، تاہم علامہ امیر علاء الدین ابو الحسن علی بن بلبانؒ[۴] (م

---

[۱] محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز، شمس الدین، ابو عبداللہ، ۶۷۳ھ کو دمشق میں پیدا ہوئے، نابغہ روزگار محقق، ناقد، محدث، حافظ اور مؤرخ تھے، حصول علم کے لیے اطراف عالم کے دور دراز اسفار کیے، بے شمار کتابیں کے مصنف ہیں، دمشق ہی میں ۷۴۸ھ کو وفات پائی۔ (الدرر الکامنۃ:۳/۳۳۶، النجوم الزاہرۃ:۱۰/۱۸۲، شذرات الذہب: ۶/۱۵۳، االاعلام للزرکلی:۵/۳۲۶)(م)

[۲] امام شمس الدین ذہبیؒ (م۷۴۸ھ) نے مستدرک کی تلخیص کی ہے اوراس میں موجود ضعیف اور منکر احادیث کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور تقریباً سو ایسی احادیث جمع کی ہیں جو موضوع ہیں۔ (تدریب الراوی:۱/۱۱۲)(م)

[۳] ہمارے بھائی فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر محمود میرہ جو بڑے محقق عالم ہیں، آج کل اس کتاب کی احادیث کا تتبع کر رہے ہیں، جن کے متعلق امام ذہبیؒ نے کوئی فیصلہ نہیں دیا ہے، تحقیق کے بعد وہ ایسی احادیث کے حسب حال حکم لگائیں گے، ان کا ارادہ ہے کہ اس کام سے فارغ ہو کر مستدرک کو از سر نو طبع کرائیں گے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ (ط)

[۴] علی بن بلبان بن عبد اللہ، علاء الدین فارسی، حنفی، ۶۷۵ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محقق اور فقہی تھے، قاہرہ میں رہائش پذیر تھے، کئی مرتبہ منصب قضاء پر فائز رہے اور قاہرہ ہی میں ۷۳۹ھ کو وفات پائی۔ (الدرر الکامنۃ: ۴/۳۷، الجواہر المضیۃ:۱/۳۵۴، الاعلام للزرکلی:۴/۲۶۷)(م)

۳۹ ۷ھ) نے اسے فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے جس کا نام ''الإحسان في تقريب ابن حبان'' ہے، علامہ ابن حبانؒ[۱] تصحیح حدیث میں متساہل ہیں، لیکن ان کا تساہل حاکم نیسابوریؒ کے تساہل کے مقابلہ میں کم ہے[۲]۔

(ج)۔ صحیح ابن خزیمہ:

یہ کتاب صحیح ابن حبان کے مقابلہ میں صحت کے اعتبار سے زیادہ معیاری ہے، اس لیے کہ امام ابن خزیمہؒ[۳] تحقیق کے حوالہ سے انتہائی محتاط ہیں، یہی وجہ ہے کہ سند پر ادنی کلام کی صورت میں بھی حدیث کو صحیح قرار دینے سے گریز کرتے ہیں[۴]۔

۱۰۔ صحیحین پر مستخرجات:

(الف)۔ مستخرج کا مفہوم اور موضوع:

مستخرج کا مفہوم اور موضوع یہ ہے کہ کوئی مؤلف حدیث کی کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کو منتخب کر کے اس میں مندرجہ احادیث کی تخریج صاحب کتاب کے سند کے علاوہ اپنی سند سے کرے اور یہ دونوں شیخ یا شیخ الشیخ میں جمع ہوں[۵]۔

---

[۱] محمد بن حبان بن احمد بن حبان بن معاذ بن معبد تمیمی، ابو حاتم بُستی، سجستانی، بُست (سجستان) میں پیدا ہوئے، حدیث، تاریخ، جغرافیہ اور رجال کے بہت بڑے عالم تھے، حصول علم کے سلسلے میں خراسان، شام، مصر، عراق اور جزیرہ کے دور دراز اسفار کیے، ایک عرصے تک سمرقند کے قاضی رہے، پھر نیشاپور لوٹ آئے، کثیر التصانیف محدث ہیں، اسی سال کی عمر میں ۳۵۴ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۲۹۰، شذرات الذہب: ۳/ ۱۶، الاعلام للزرکلی: ۶/ ۷۸)

[۲] تدریب الراوی: ۱/ ۱۰۵۔ (ط)

[۳] محمد بن اسحاق بن خزیمہ سلمی، ابو بکر، ۲۲۳ھ کو نیشاپور میں پیدا ہوئے، اپنے دور میں نیشاپور کے امام تھے، فقہ اور حدیث کے نابغہ روزگار عالم تھے، حصولِ علم کے سلسلے میں عراق، شام، جزیرہ اور مصر کے اسفار کیے۔ نیشاپور ہی میں ۳۱۱ھ کو وفات پائی۔ (الجرح والتعديل: ۷/ ۱۹۶، تذكرة الحفاظ: ۲/ ۷۲۰، البداية والنهاية: ۱۱/ ۱۴۹، الاعلام للزرکلی: ۶/ ۲۹) (م)

[۴] تدریب الراوی: ۲/ ۱۰۹۔ (ط)

[۵] حاصل یہ ہے کہ مستخرج ہر اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کوئی محدث کسی صاحب کتاب کی روایتوں کو اپنی سند سے روایت کرے اس طرح سے کہ اس کی سند صاحب کتاب کے شیخ یا شیخ الشیخ سے مل جائے، بشرطیکہ درمیان میں اس مؤلف کا روواسطہ نہ ہو۔ (تدریب الراوی: ۱/ ۱۱۷) (م)

(ب)۔ صحیحین پر معروف مستخرجات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ المستخرج علی البخاری از ابو بکر اسماعیلی رحمہ اللہ[(۱)]۔

۲۔ المستخرج علی مسلم از ابو عوانہ اسفرائینی رحمہ اللہ[(۲)]۔

۳۔ المستخرج علی الصحیحین از ابو نعیم اصبہانی رحمہ اللہ۔

(ج)۔ کیا مستخرجات کے مؤلفین نے الفاظ حدیث میں صحیحین کی موافقت کا التزام کیا ہے، یا نہیں؟

مستخرجات کے مؤلفین نے اس بات کا التزام نہیں کیا، اس لیے کہ انہوں نے وہ الفاظ روایت کی ہیں، جو انہوں نے اپنے اساتذہ اور مشایخ سے سنے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ بعض الفاظ میں قدرے اختلاف اور تفاوت ضرور ہو گا[(۳)]۔ نیز اس قبیل سے وہ احادیث بھی ہیں، جن کے متعلق امام بیہقیؒ[(۴)]، امام بغویؒ[(۵)] اور دیگر محدثین کرام رحمہم اللہ نے تخریج کرنے کے بعد لکھا

---

(۱) احمد بن ابراہیم بن اسماعیل، ابو بکر اسماعیلی، ۲۹۷ھ کو پیدا ہوئے، جرجان کے باشندے تھے، فقہ، تاریخ اور حدیث کے بہت بڑے عالم تھے، سخاوت و مروت میں ضرب المثل تھے، ۳۷۱ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ جرجان:٦۹، تذکرۃ الحفاظ:۳/ ۹۴۷، النجوم الزاہرۃ:۴/ ۱۴۰، الاعلام للزرکلی:۱/ ۸٦)(م)

(۲) یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم ،نیشاپوری اسفرائینی، ابو عوانہ، کبار حفاظ حدیث میں سے تھے، حصول حدیث کے سلسلے میں شام، عراق، حجازِ مقدس، جزیرہ، یمن اور بلاد فارس کے دور دراز اسفار کیے، یاقوت حموی نے انہیں حافظ الدنیا کے لقب سے موسوم کیا ہے، اسفرائین میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۳۱٦ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان :٦/ ۳۹۴، تذکرۃ الحفاظ:۳/ ۷۸۰، النجوم الزاہرۃ:۳/ ۲۲۲، الاعلام للزرکلی:۸/ ۱۹٦)

(۳) تدریب الراوی:۱/ ۱۱۸۔(م)

(۴) احمد بن حسین بن علی، ابو بکر شافعی، ۳۸۴ھ کو خسروجرد، بیہق (نیشاپور) میں پیدا ہوئے، حصول علم کے سلسلے میں بغداد، کوفہ اور مکہ مکرمہ کے اسفار کیے، حدیث، تاریخ اور رجال کے بہت بڑے عالم تھے، بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں، امام شافعیؒ کی تائید و دفاع میں متعدد کتابیں لکھیں، امام الحرمین فرماتے ہیں کہ شوافع پر امام بیہقیؒ کا بہت بڑا احسان ہے۔ نیشاپور ہی میں ۴۵۸ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ:۲/ ۱۳۲، المنتظم لابن الجوزی:۸/ ۲۴۲، سیر اعلام النبلاء:۱۸/ ۱٦۳، الاعلام للزرکلی:۱/ ۱۱٦)(م)

(۵) حسین بن مسعود بن محمد، ابن الفراء، ابو محمد، محیی السنۃ بغوی، ۴۳٦ھ میں پیدا ہوئے، بہت بڑے فقیہ، محدث اور مفسر تھے، بغا (خراسان اور ہرات کے درمیان ایک بستی ہے) کی طرف منسوب ہونے کی وجہ =

ہے۔"رواہ البخاری"(بخاری نے یہ حدیث روایت کی ہے)، یا"رواہ مسلم"(مسلم نے یہ حدیث روایت کی ہے)، حالانکہ بعض احادیث میں الفاظ اور معانی دونوں کے اعتبار سے واضح تفاوت پایا جاتا ہے۔ تو ایسے مواقع میں محدثین کرام رحمہم اللہ کی اس قول(رواہ البخاری ومسلم) کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے اصل حدیث روایت کی ہے۔

(د)۔ کیا یہ جائز ہے کہ ہم کسی مستخرج سے حدیث نقل کریں اور اس کی نسبت بخاری اور مسلم کی طرف کردیں؟

ما قبل تفصیلات کے تناظر میں یہ بات درست نہیں کہ مستخرجات کی مذکورہ بالا کتابوں سے کوئی حدیث نقل کرتے ہوئے یہ کہا جائے "رواہ البخاری" یا "رواہ مسلم" اس حدیث کو بخاری یا مسلم نے روایت کی ہے، تاہم دو صورتوں میں یہ کہہ سکتا ہے۔

پہلی صورت: مستخرج کی حدیث کا بخاری اور مسلم کیساتھ باہم موازنہ کیا جائے۔

دوسری صورت: یا یوں کہا جائے کہ اس حدیث کو صاحب مستخرج، یا مذکورہ بالا کتابوں کے مؤلفین نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے، مذکورہ دونوں صورتوں میں ناقلین حدیث کہتے ہیں کہ حدیث کی نسبت بخاری اور مسلم کی طرف کرنا درست ہے[1]۔

(ہ)۔ صحیحین پر مستخرجات کی فوائد:

صحیحین پر مستخرجات کے متعدد فوائد ہیں، علامہ سیوطیؒ نے دس کے لگ بھگ فوائد ذکر کیے ہیں[2]، جن میں اہم فائدے یہ ہیں:

= سے بغوی کہلاتے ہیں، مروالزوذ(خراسان، ترکستان) میں ۵۱۰ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ:۴/۱۲۵۷، وفیات الاعیان:۲/۱۳۶، سیر اعلام النبلاء:۱۹/۴۳۹، النجوم الزاہرۃ:۵/۲۲۳، الاعلام للزرکلی:۲/۲۵۹)(م)

[1] اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی روایت کو مستخرج اسماعیلی سے نقل کیا گیا ہو تو تخریج کرتے وقت یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، اس لیے کہ ممکن ہے کہ دونوں کے الفاظ میں کچھ فرق ہو۔ تاہم اگر قطعی طور سے یہ معلوم ہو کہ دونوں کے الفاظ ایک ہیں تو پھر نسبت جائز ہے۔ (توضیح الافکار:۱/۱۷)(م)

[2] تدریب الراوی:۱/۱۱۵-۱۱۶۔(ط)

۱۔ **علو اسناد:** اگر مستخرج کا مصنف کوئی حدیث مثلاً امام بخاریؒ کی طریق سے روایت کرے گا تو اس روایت میں واسطوں کی تعداد مستخرج کی روایت کے واسطوں سے کم ہو گی۔

۲۔ **صحیح احادیث کے الفاظ میں اضافہ:** بعض روایات میں مختلف الفاظ اور زوائد و تتمے ہوتے ہیں، جن کا اظہار مستخرج کی روایت کے اندر ہو جاتا ہے اور یوں ہی مستخرج کی روایت اصل کتاب کی روایت کی مقدار میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔

۳۔ **کثرت طرق کی بناء پر قوت:** متعدد طرق سے روایت کا مروی ہونا، اس کی قوت کا باعث ہوتا ہے، جس کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ روایات کے اختلاف کے موقع پر کثرت طرق والی حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے۔

۱۱۔ صحیح بخاری اور مسلم کے تعلیقات:

یہ بات ما قبل گذر چکی ہے کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے صحیحین میں صرف وہی احادیث ذکر کیں، جو صحیح تھیں، یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ نے ان دونوں کتابوں کو سند قبولیت عطاء کی، لیکن اب سوال یہ ہے کہ صحیحین میں وہ کونسی احادیث ہیں، جن پر صحیح ہونے کا حکم لگایا گیا ہے؟ اور جنہیں امت نے متفقہ طور پر قبول کیا ہے؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ شیخین نے جن احادیث کو سند متصل کیساتھ روایت کیا ہے ان پر صحیح ہونے کا حکم لگایا گیا ہے، لیکن جن احادیث کی سند کی ابتداء میں ایک یا ایک سے زائد راوی محذوف ہوں (اس قسم کی احادیث کو معلق کہتے ہیں، صحیح بخاری میں ایسی احادیث بکثرت موجود ہیں، اگرچہ یہ تراجم ابواب اور مقدمات میں مندرج ہیں، تاہم اصل ابواب میں ایسی کوئی حدیث درج نہیں اور جب کہ صحیح مسلم [1] میں اسی قسم کی صرف ایک حدیث "باب التیمم" میں مذکور

---

[1] صحیح مسلم (باب التيمم في الحضر لرد السلام۱/۲۸۱، رقم:۳۶۹) میں ہے:" قَالَ مُسْلِمٌ، وَرَوَى اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ رَبِيعَةَ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ هُرْمُزَ، عَنْ عُمَيْرٍ، مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُولُ: أَقْبَلْتُ أَنَا وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ يَسَارٍ، مَوْلَى مَيْمُونَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ. حَتَّى دَخَلْنَا عَلَى أَبِي الْجَهْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّمَّةِ الْأَنْصَارِيِّ، فَقَالَ أَبُو الْجَهْمِ: «أَقْبَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ نَحْوِ بِئْرِ جَمَلٍ، فَلَقِيَهُ رَجُلٌ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ، فَلَمْ يَرُدَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَيْهِ، حَتَّى أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ، ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ»."

ہے، امام مسلم نے اس کی سند کو دوسری جگہ متصل بیان کیا ہے[۱]) تو ان کا حکم حسب ذیل ہے:
(الف)۔ جو حدیث معلق صیغہ جزم اور قطعیت کیساتھ منقول ہو، جیسے: ''قَالَ، أَمَرَ، ذَكَرَ'' وغیرہ تو اسے صحیح قرار دیا جائے گا۔
(ب)۔ جو حدیث معلق صیغہ جزم کے ساتھ منقول نہ ہو، جیسے ''يُرْوَى، يُذْكَر، يُحْكَى، رُوِي، ذُكِر ''وغیرہ۔ تو اس پر صحت کا حکم نہیں لگایا جائے گا[۲]۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ صحیح بخاری میں موجود کسی حدیث کو ضعیف نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ ایسی کتاب میں مندرج ہے جو ''صحیح'' کے ساتھ موسوم ہے[۳]۔

۱۲۔ صحیح کے مراتب:

ما قبل یہ بات گذر چکی ہے کہ بعض اہل علم نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے ''اصح الاسانید'' ذکر کیا ہے، اس بنیاد پر اور باقی شروط صحت کی موجودگی کی بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سند رجال کے قوت کے تفاوت کے اعتبار سے حدیث صحیح کی تین قسمیں ہیں:
(الف)۔ سب سے اعلی مرتبہ اس حدیث صحیح کا ہے جو کہ ''اصح الاسانید'' (صحیح ترین) میں سے کسی سند کے ساتھ مروی ہو، جیسے ''مالك عن نافع عن ابن عمر'' (یعنی امام مالک رحمہ اللہ نے حضرت نافع رحمہ اللہ [۴] سے اور حضرت نافع رحمہ اللہ نے سید عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ [۵] سے روایت کی ہو۔

---

[۱] تدریب الراوی: ۱/ ۱۲۴۔ (م)
[۲] تدریب الراوی: ۱/ ۱۲۵۔ (م)
[۳] تدریب الراوی: ۱/ ۱۳۰۔ (م)
[۴] نافع، ابو عبد اللہ مدنی، مولی ابن عمر، مشہور تابعی ہیں، کثیر الروایت ثقہ راوی ہیں، بعض مغازی میں سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ملے، مدینہ منورہ میں پلے، عمر بن عبد العزیز نے انہیں مصر بھیجا تا کہ لوگوں کو احادیث کا درس دیں۔ ۱۱۷ھ کو وفات پائی۔ (التاریخ الکبیر: ۸/ ۸۴، وفیات الاعیان: ۵/ ۳۶۷ تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۹۹، سیر اعلام النبلاء: ۵/ ۹۵، الاعلام للزرکلی: ۸/ ۵) (م)
[۵] سیدنا عبد اللہ بن عمر بن خطاب عدوی، ابو عبد الرحمن، جلیل القدر صحابی رسول ہیں، ۱۰ قبل از ہجری کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، اپنے والد محترم کے ہمراہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، فتح مکہ اور دیگر غزوات میں شریک رہے، اپنے والد محترم کے بہترین جانشین تھے، ان کی مرویات کی تعداد ۲۶۳۰ ہے، صحابہ میں مکہ مکرمہ میں سب سے آخری وفات پانے والے صحابی ہیں، ۷۳ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب: ۳/ ۹۵۰، اسد الغابۃ: ۳/ ۳۰۰، الاصابۃ: ۴/ ۱۵۵، تاریخ بغداد: ۱/ ۱۷۱، سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۲۰۳، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۱۰۸) (م)

(ب)۔ اس سے کم مرتبہ اس صحیح حدیث کا ہے، جس کی روایت ایسے راویوں کے واسطوں سے ہو، جو پہلی سند کے رجال سے کم درجہ کے ہوں، جیسے:"حماد بن سلمه عن ثابت عن أنس رضی اللہ عنہ "کی روایت ہے۔

(ج)۔ اس سے کم مرتبہ اس صحیح حدیث کا ہے، جس کے رواۃ میں ثقاہت کا کم سے کم درجہ پایا جاتا ہو، جیسے "سهيل بن أبی صالح عن أبيه عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ" کی روایت ہے۔

مذکورہ تفصیل کے تناظر میں حدیث صحیح کو حسب ذیل سات مراتب میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ وہ حدیث جو صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں مذکور ہو۔(یہ سب سے اعلی مرتبہ ہے)

۲۔ پھر وہ حدیث جو صرف صحیح بخاری میں مذکور ہو۔

۳۔ پھر وہ حدیث جو صرف صحیح مسلم میں مذکور ہو۔

۴۔ پھر وہ حدیث جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے شرائط کے مطابق ہو، لیکن انہوں نے اس کی تخریج نہ کی ہو۔

۵۔ پھر وہ حدیث جو امام بخاریؒ کے شرائط کے مطابق ہو، لیکن انہوں نے تخریج نہ کی ہو۔

۶۔ پھر وہ حدیث جو امام مسلمؒ کے شروط کے مطابق ہو، لیکن انہوں نے تخریج نہ کی ہو۔

۷۔ پھر وہ حدیث جو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے علاوہ دیگر محدثین کرام رحمہم اللہ جیسے امام ابن خزیمہؒ اور ابن حبانؒ وغیرہ کے نزدیک صحیح ہو، لیکن حضرات شیخینؒ کے شرائط کے مطابق نہ ہو[1]۔ *

---

[1] نزہۃ النظر:۷۳، تدریب الراوی:۱/۱۳۱۔(م)

* یہ تفاوتِ مراتب محض ان دونوں کتابوں کے پیشِ نظر ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر حال میں اس ترتیب کا لحاظ رکھا جائے گا، بعض اوقات دوسرے قرائن کی وجہ سے کسی نیچے کی قسم کے تحت آنے والی حدیث کو اوپر والی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ چنانچہ مذکور اقسام بیان کرنے کے بعد حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) رقم طراز ہیں۔

" وهذاالتَّفاوتُ إِنَّما هو بالنَّظرِ إِلى الحيثيَّةِ المذكورةِ. أَمَّا لو رُجِّحَ قِسْمٌ على ما هو فَوْقَهُ بأُمورٍ أُخرى تقتَضي التَّرْجيحَ؛ فإِنَّهُ يُقَدَّمُ على ما فَوْقَهُ إذ قَدْ يَعْرِضُ للمَفوقِ مَا يجعَلُهُ فائقاً. كما لو كان الحديثُ عندَ مُسلم مثلاً، وهُو مشهورٌ قاصِرٌ عن دَرَجَةِ التَّواتُرِ، لكنْ حَفَّتْهُ قرينةٌ صارَ بها يُفيدُ العِلْمَ؛ فإِنَّه يُقَدَّمُ بها على الحديثِ الذي يُخْرِجُهُ البُخاريُّ إِذا كانَ فَرْداً مُطْلقاً. وكما لو كانَ الحَديثُ الَّذي =

= لم يُخْرِجَاهُ مِن ترجمةٍ وُصِفَتْ بكونِها أَصَحَّ الأسانيدِ كمالِكٍ عن نافعٍ عن ابنِ عُمرَ؛ فإنه يُقَدَّمُ على ما انفرَدَ بهِ أَحدُهُما مثلاً، لا سيَّما إِذا كانَ في إِسنادِهِ مَن فيهِ مَقالٌ." (نزہۃ النظر: ۶۴-۶۵)

"ظاہر ہے کہ یہ ترتیب عدالت وضبط رواۃ کی وجہ سے ہے، لیکن کسی حدیث میں اگر ایسے امور (مثلاً شہرت وغیرہ) پائے جائیں جن سے وہ اپنے سے اونچے درجہ کی حدیث پر ترجیح حاصل کرلے تو اسے مقدم سمجھا جائے گا، کیونکہ اس میں ایسی خصوصیت پیدا ہوگئی کہ اسے مقدم سمجھا جائے گا، مثلاً مسلم کی وہ حدیث جو درجہ تواتر سے کم ہے، مگر شہرت کے درجہ کی حاصل ہو۔ اوراس کیساتھ کوئی قرینہ بھی مل جائے جس سے مفید علم یقینی ہوجائے تو ایسی حدیث بخاری کی حدیث فرد پر مقدم سمجھی جائے گی۔ اسی طرح وہ حدیث جس کی تخریج شیخین نے نہ کی ہو، مگروہ اصح الاسانید سے مروی ہو، جیسے "مالك عن نافع عن ابن عمر" تو یہ حدیث بخاری ومسلم کی فرد سے مقدم سمجھی جائے گی، بالخصوص اگر اس کی سند میں کلام ہو۔"

واضح رہے کہ حدیث صحیح کی مذکورہ سات قسمیں علامہ ابن الصلاحؒ کی اختراع ہے بعد میں آنے والے محدثین کرام نے علامہ ابن الصلاحؒ کی پیروی کرتے ہوئے یہ سات اقسام ذکر کیے ہیں، تاہم یہ تقسیم سبعی کئی وجوہات کی بنا پر درست نہیں۔ ماضی قریب کے عظیم محدث ومحقق علامہ عبد الرشید نعمانیؒ فرماتے ہیں۔

حافظ ابو بکر حازمیؒ (م ۵۸۴ھ) کے زمانہ تک حدیث کی ترجیح کی وجہ کسی کتاب میں ہونا ہم کو معلوم نہیں، کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب "الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار" میں احادیث میں باہم تعارض کے وقت پچاس وجوہ ترجیح ذکر کیے ہیں اوران سب کا تعلق اوصاف ترجیح پر ہے کسی کتاب میں کسی حدیث کی روایت کرنے کو وجہ ترجیح نہیں بتایا۔ ابن صلاحؒ نے غالباً ابو حفص میانجیؒ کے رسالہ "ما لایسع المحدث جهله" سے یہ بات لی ہے، مگر ابو حفص میانجیؒ فن حدیث میں کسی اعلی مرتبے کے مالک نہیں تھے۔ پھر ابن صلاحؒ سے یہ بات نقل در نقل اصول حدیث کی کتابوں میں ہوتی چلی آئی۔ لیکن یہ تقسیم نہایت نامناسب ہے۔ خود ابن صلاحؒ نے حدیث صحیح کی تعریف کرتے ہوئے آٹھ اہم علمی فائدے جو بیان کیے ہیں ان میں دوسرے فائدے کے ذیل میں اپنے دور میں حدیث کی تصحیح کو ممنوع قرار دیا ہے، چنانچہ تصریح فرماتے ہیں۔

" إذا وجدنا فيما يُروى مِنْ أجزاءِ الحديثِ وغيرِهَا حديثاً صحيحَ الإسنادِ، ولَمْ نجدْهُ في أحدِالصحيحينِ، ولا منصوصاً على صِحَّتِهِ في شيءٍ مِنْ مُصَنَّفَاتِ أئمَّةِ الحديثِ المعتمدةِ المشهورةِ، فإِنَّا لا نتجاسرُ على جَزْمِ الحُكْمِ بصِحَّتِهِ، فقدْ تَعَذَّرَ في هذهِ الأعصارِ الاستقلالُ بإدراكِ الصحيحِ بمجَرَّدِ اعتبارِ الأسانيدِ." (مقدمۃ ابن الصلاح: ۸۳)

=

....

= ”دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم اجزاءِ حدیث وغیرہ میں کوئی حدیث صحیح الاسناد پائیں اور صحیحین میں سے کسی ایک میں نہ پائیں اور اس کی صحت کی تصریح ائمہ حدیث کی معتمد اور مشہور کتابوں میں نہ پائیں تو ہم جزم ویقین کیساتھ اس کی صحت کی جسارت نہیں کریں گے، کیونکہ اس عہد میں اسانید کے اعتبار سے صحیح کا ادراک دشوار ہے۔“

لیکن آپ نے دیکھا کہ خود انہوں نے حدیث صحیح کی سات قسمیں ذکر کی ہیں اور اسی ترتیب سے حدیث کی اصحیت کا حکم لگایا ہے اسی طرح اصح الاسانید کے سلسلہ میں ائمہ فن کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں، چنانچہ اصح الاسانید کے بارے میں اسحاق بن راہویہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، حافظ عمرو بن علی فلاسؒ، امام یحیی بن معینؒ بلکہ خود امام بخاریؒ صاحب الصحیح کی بات بھی اس مسئلہ میں ان کو تسلیم نہیں۔ جس سے ان کے مذکورہ دو فائدوں کا باطل ہونا ثابت ہو گیا جو کہتے ہیں خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ حالانکہ اصح الکتب کے بارے میں اپنی رائے کو یقینی سمجھتے ہیں۔

ہمارے خیال میں جس امام نے کسی کتاب کے متعلق یہ ظاہر کیا کہ فلاں کتاب اصح ہے ان سب کو صحیح قرار دینا چاہیے، جیسے اصح الاسانید کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے وہی اصح الکتب کے بارے میں ہونی چاہیے کہ جیسے اصح الاسانید کا حال ہے کہ وہ سب اسنادیں صحت کے بہترین معیار ہیں ایسے ہی جس کتاب کو اصح الکتب کہا جارہا ہے وہ بھی صحت کے اعلی درجے کی صحیح قرار دینی چاہیے، لیکن علامہ ابن صلاحؒ جو کسی اصح الاسانید کو علی الاطلاق اصح کہنے کے لیے تیار نہیں ہزاروں حدیثوں کے مجموعہ کی کسی کتاب کو اصح کہنے پر مصر ہیں!! تو یہ عجیب بات ہے کہ ایک اسناد صحیح کو اصح الاسانید کہنے سے تو روکا جائے اور ہزاروں حدیثوں کے کسی مجموعے کو اصح الکتب قرار دیا جائے!!!

نیز علامہ ابن صلاحؒ نے حدیثِ صحیح کی جو تعریف کی ہے کہ صحیح حدیث وہ ہے جس کے تمام رواۃ عادل، تام الضبط اور سند متصل ہو اور شذوذ و علل سے محفوظ ہو۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ ایسی حدیث کو صحیح تسلیم کرنے میں محدثین کرامؒ کا کوئی اختلاف ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے نزدیک ان اوصاف صحیح کے بعد مزید کوئی شرط نہیں۔

محقق ابن ہمامؒ اپنی کتاب ”فتح القدیر“ میں مغرب سے پہلے دو رکعت نفل پڑھنے کی بحث میں فرماتے ہیں۔

” وَقَوْلُ مَنْ قَالَ أَصَحَّ الْأَحَادِيثِ مَا فِي الصَّحِيحَيْنِ ثُمَّ مَا انْفَرَدَ بِهِ الْبُخَارِيُّ ثُمَّ مَا انْفَرَدَ بِهِ مُسْلِمٌ ثُمَّ مَا اشْتَمَلَ عَلَى شَرْطِهِمَا مِنْ غَيْرِهِمَا ثُمَّ مَا اشْتَمَلَ عَلَى شَرْطِ أَحَدِهِمَا تَحَكُّمٌ لَا يَجُوزُ التَّقْلِيدُ فِيهِ.“

(فتح القدیر: ۱/ ۴۴۵)

”جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ اصح حدیث وہ ہے جس کو حضرات شیخین نے صحیحین میں نقل کیا ہو، پھر وہ حدیث جس کو صرف امام بخاریؒ نے نقل کیا ہو، پھر وہ حدیث جس کو صرف امام مسلمؒ نے نقل کیا ہو، پھر وہ حدیث جو شیخین کے شرط

= پر ہو اور کسی دوسرے امام نے نقل کیا ہو۔ پھر وہ حدیث جو شیخین میں سے کسی ایک کی شرط پر مشتمل ہو۔ تو یہ دعوی بلا دلیل ہے جس میں کسی کی تقلید جائز نہیں ہے۔" مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: اصولِ حدیث کے بعض اہم مباحث: ۲۰۷-۲۱۵۔ (م)

تقسیم سبعی کی عدم صحت پر ایک واضح بلکہ اوضح دلیل یہ بھی ہے کہ یہ بات کہنا کہ جس روایت کی تخریج پر شیخین متفق ہوں وہ صحت کا اعلی درجہ ہے درست نہیں، اس لیے کہ صحیفہ ہمام بن منبہ میں ۲۳ حدیثیں وہ ہیں جن کی تخریج پر شیخین کا اتفاق ہے اور سب کی سند ایک ہے: "عبدالرازق عن معمر عن همام بن منبه عن ابی هريره"۔ اور یہ سند اعلی درجہ کی سند نہیں، کیونکہ اس میں عبدالرزاق اور معمر دونوں متکلم فیہ راوۃ ہیں۔ ماضی قریب کے بلند پایہ محقق شیخ احمد شاکرؒ صحیفہ ہمام ابن منبہ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

"یہ صحیفہ اس بات کی قوی ترین دلیل ہے کہ شیخین نے تمام صحیح احادیث کی تخریج نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے اس کا التزام کیا ہے اور نہ اس کی تصریح کی ہے اور جنہوں نے اس طرح کی کوئی بات کہی ہے تو یہ ان کی جانب سے صحیحین اور شیخین کی بے جا قدر دانی اور ان کے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صحیحین پوری تعظیم کی مستحق بھی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ صحیحین کے باہر صحیحین کے معیار کی حدیثیں نہیں ہیں، چنانچہ یہ صحیفہ ہمام بن منبہ ہے جس کی چند حدیثیں دونوں نے لی ہیں اور چند احادیث کو صرف بخاری نے لی ہیں اور چند کو صرف مسلم نے لیا ہے اور کچھ ایسی ہیں جن کو دونوں میں سے کسی نے نہیں لیا ہے، یہ صحیفہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیخین جس حدیث کی تخریج پر متفق ہوں وہ ہمیشہ صحت کے اعتبار سے اعلی درجہ کی نہیں ہوتی۔ (اس لیے کہ یہ صحیفہ خود جس سند سے مروی ہے وہ اعلی درجہ کی نہیں ہے، یعنی: عبدالرزاق عن معمر عن ہمام بن منبہ، کیونکہ عبدالرزاق اور معمر دونوں متکلم فیہ ہیں)۔"

محدث جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے "توجیہ النظر" کے حاشیہ پر شیخ احمد شاکرؒ کی اس بات کو نقل کرنے بعد ایک محققانہ تبصرہ کیا ہے، جو حسبِ ذیل ہے:

۱۔ حافظ ابن الصلاحؒ اور ان کے متبعین حضرات کا یہ کہنا کہ اعلی معیار کی صحیح حدیث وہ ہے جس پر شیخین متفق ہوں ناقابل تسلیم ہے، کیونکہ شیخین نے اسی صحیفہ ہمام بن منبہ (جس کی کل احادیث ۱۴۲ ہیں) کی ۹۷ حدیثیں لی ہیں، سب کی سند ایک ہے: "عبدالرزاق عن معمر عن ہمام عن ابی ہریرہ" جس میں سے ۲۳ حدیثیں دونوں میں ہیں اور ۱۶ صرف صحیح بخاری میں اور ۵۸ صرف صحیح مسلم میں ہیں۔ اب ذرا دیکھئے! اس صحیفہ کی ۲۳ حدیثیں متفق علیہ ہیں حالانکہ یہ سند اعلی درجہ کی صحیح سند نہیں۔ معلوم ہوا کہ پہلی ہی بنیاد (یعنی یہ کہ متفق علیہ حدیث اول درجہ کی صحیح ہوتی ہے) کمزور ہے۔ =

۱۳۔ شروط شیخین:

= ۲۔ حافظ ابن الصلاحؒ اوران کے متبعین کا یہ کہنا کہ دوسرے نمبر کی صحیح وہ ہے جس کی تخریج صرف امام بخاریؒ نے کی ہو یہ بھی درست نہیں، کیونکہ اس صحیفہ کی ۱۶ حدیثیں صرف صحیح بخاری میں ہیں جن کی سند بعینہ وہی ہے جو ان ۲۳ حدیثوں کی ہے تو پھر یہ نمبر ۲ کیوں ہو گئیں؟!! اسی طرح صرف صحیح مسلم کی ان ۵۸ حدیثوں سے یہ قوی کیوں ہوئیں جن کی سند بھی یہی ہے؟! یہ سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟؟!!

۳۔ ان حضرات کا یہ کہنا کہ تیسرے نمبر کی صحیح حدیث وہ ہے جو تنہا صحیح مسلم میں ہو، یہ بات بھی صحیح نہیں، کیونکہ اس صحیفہ کی ۵۸ حدیثیں صرف صحیح مسلم میں ہیں، جن کی سند بعینہ وہی ہے جو تنہا صحیح بخاری کی ۱۶ حدیثوں اور متفق علیہ ۲۳ حدیثوں کی ہے تو پھر ان کا درجہ گھٹ کیوں گیا؟! پھر امام مسلمؒ کبھی کسی حدیث کے اخراج میں منفرد ہوتے ہیں حالانکہ اس کے کئی ایک صحیح طرق ہوتے ہیں، اس کے بالمقابل صرف صحیح بخاری میں ایک حدیث ہوتی ہے جس کی صرف ایک ہی سند ہوتی ہے، پس اس میں شک نہیں کہ صحیح مسلم کی کثیر الطرق حدیث صحیح بخاری کی غریب حدیث پر فائق ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے "النکت علی کتاب ابن الصلاح" میں فرمایا۔ لہٰذا افراد مسلم کو افراد بخاری سے کم حیثیت گرداننا بے جا ہے!!

۴۔ افراد صحیح مسلم کو تیسرے درجہ کی صحیح قرار دینا اس اعتبار سے بھی مضحکہ خیز ہے کہ بسا اوقات امام مسلم کسی ایسی حدیث کے اخراج میں منفرد ہوتے ہیں جو ان کی شرط پر صحیح ہوتی ہے، مثلاً: کسی راوی کا اپنے مروی عنہ سے سماع اور لقاء ثابت نہیں ہے، امام مسلم نے معاصرت کی بناء پر امکانِ لقاء کو کافی سمجھ کر اخراج کر لیا، کیونکہ ان کے نزدیک یہ صحیح ہے جب کہ امام بخاریؒ کے نزدیک وہ سرے سے صحیح ہی نہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ وہ تیسرے درجہ کی صحیح ہے حدیث معنعن کے مسئلہ میں امام مسلمؒ کے مذہب کو امام بخاریؒ کے مذہب پر راجح قرار دینے کے مترادف ہو گا جب کہ جمہور محدثین اس مسئلہ میں امام بخاریؒ اور ان کے متبعین کی رائے کو راجح قرار دیتے ہیں۔

پھر افراد بخاری افرادِ مسلم پر فائق اس وقت کیوں کر ہو سکتی ہیں جب کہ صحیح بخاری کی حدیث کی سند میں کوئی متکلم فیہ راوی ہو اور صحیح مسلم کے حدیث کے تمام رواۃ ثقہ ہوں۔

پھر چوتھی اور پانچویں قسم میں شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط پر ہونے کی بات سمجھ سے باہر اس لیے ہے کہ شیخین کی شرط کا تعین جب خود شیخین نے نہیں کیا ہے اور دوسرے حضرات نے جو تعین کیا ہے اس میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، پھر ایسے محتمل امر کو قاعدہ کلیہ کا درجہ دینا کہاں تک صحیح ہو گا؟! (حدیث اور فہم حدیث: ۱۷۹-۱۸۱)

=

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں میں کسی نے واضح الفاظ میں اپنی شرائط کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان دونوں نے اپنے شروط کی تعین اور نشاندہی کی ہے، تاہم محققین علمائے حدیث نے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے اسلوب روایت کے تتبع اور استقراء کے بعد اپنے ذوق کے مطابق کسی روایت کے متعلق کہہ دیا ہے کہ یہ ان دونوں حضرات کے شرائط کے مطابق ہے، یا ان میں سے کسی ایک کے شرائط کے مطابق ہے[1]۔

اسی سلسلہ میں سب سے بہتر بات یہ ہے کہ شیخینؒ یا ان میں سے ایک کی شرط سے مراد یہ ہے کہ حدیث صحیحین، یا ان میں سے کسی ایک کے رواۃ اور رجال سے مروی ہو، نیز شیخین

= مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوئی کہ تقسیم سبعی اصحیت کے اعتبار سے درست نہیں اور یہ تحدید اور درجہ بندی واقع اور نفس الامر سے کوسوں دور اور بے بنیاد ہے اور اس تقسیم کا حقیقت حال سے کوئی تعلق نہیں۔(م)

(۱) شیخینؒ کی طرح دیگر محدثین کرام نے بھی بعض امتیازی شرطوں کو ملحوظ رکھا ہے، اہل علم نے شروط ائمہ کو ایک مستقل فن قرار دیا ہے جس پر محققین نے حسب موقع تفصیل کیساتھ روشنی ڈالی ہے، جیسے علامہ حازمیؒ (م۵۸۴ھ) کی "شروط الائمۃ الخمسۃ" ہے جس میں انہوں نے پانچ محدثین (امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام ابوداوٗدؒ، امام نسائیؒ) نے اپنی کتابوں میں جن شرائط کو ملحوظ رکھا ہے ان کو جمع کیا ہے اور حافظ محمد بن طاہرؒ (م۵۰۷ھ) نے "شروط الائمۃ الستۃ" ہے جس میں انہوں نے چھے محدثین (امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام ابوداوٗدؒ، امام نسائیؒ، امام ابن ماجہ) نے اپنی کتابوں میں جن شرائط کو ملحوظ رکھا ہے ان کو جمع کیا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ شیخینؒ کے شروط کیا ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ شرطِ شیخین کے تعین کا مسئلہ بڑا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے اصولِ حدیث کی کتابوں میں اس پر بڑی بڑی بحثیں ہوئیں ہیں، ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے صحیحین میں حدیث صحیح کی ان عام شروط کے علاوہ جو عموماً علماء کے نزدیک مسلم ہے مزید احتیاط کے لیے کچھ خاص شرائط کا اضافہ کیا ہے، لیکن وہ شرائط کیا ہے؟ اور آیا دونوں کی متحد ہیں یا امام بخاریؒ کی علیحدہ اور امام مسلم کی علیحدہ شرائط ہیں، اس بات میں اہل علم کا بڑا اختلاف ہے۔

امام حاکم نیسابوریؒ فرماتے ہیں کہ شیخینؒ کی شرط یہ ہے کہ ہر طبقہ میں صحابی کے علاوہ دو دو راوی روایت بیان کریں۔ علامہ ابو حفص میانجیؒ نے اس سے بڑھ کر یہ دعوی کیا ہے کہ صحیحین میں وہ احادیث درج ہیں جس کو رسول اللہ ﷺ سے دو یا دو سے زیادہ صحابی روایت کریں اور ہر صحابی سے چار یا چار سے زیادہ تابعین اور ہر تابعی سے چار سے زیادہ تبع تابعین روایت کریں۔ لیکن علامہ ابو حفص میانجیؒ کی یہ بات درست نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

=

حضراتؒ نے ان راویوں سے روایت کرنے میں جن شروط اور کیفیت کا التزام واہتمام کیا تھا، ان سب کو ملحوظ نظر رکھا جائے۔

۱۴۔ محدثین کرامؒ کے قول "متفق علیه" کا مفہوم:

جب محدثین کرام کسی حدیث کے متعلق "متفق علیه" کہہ دیتے ہیں، تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث کی صحت پر حضرات شیخینؒ کا اتفاق ہے(۱)۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس پر امت کا اتفاق ہے، تاہم حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شیخینؒ کا اتفاق امت کے اتفاق کو مستلزم ہے، اس لیے کہ امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان دونوں حضرات کی متفق علیہ روایت کو قبول کیا جائے گا(۲)۔

= " وَهُوَ كَلَامُ مَنْ لَمْ يُمَارِسِ الصَّحِيحَيْنِ أَدْنَى مُمَارَسَةٍ، فَلَوْ قَالَ قَائِلٌ: لَيْسَ فِي الْكِتَابَيْنِ حَدِيثٌ وَاحِدٌ بِهَذِهِ الصِّفَةِ لَمَا أَبْعَدَ." (تدریب الراوی:۱/۷۰)

"یہ اس شخص کی بات ہے جس کو صحیحین کی معمولی مزاولت بھی نہ ہو۔ اگر کوئی یہ کہے کہ صحیحین میں اس صفت کی ایک حدیث بھی نہیں پائی جاتی ہے تو یہ بات بعید نہیں۔"

علامہ ابو حفص میانجیؒ تو اپنے اس دعوی میں تنہا ہیں، لیکن حاکم نیسابوریؒ سے بہت سے اہل علم نے اتفاق کیا ہے جن میں امام بیہقیؒ، حافظ ابوبکر بن العربیؒ اور علامہ ابن الاثیر جزریؒ خاص پر قابل ذکر ہیں۔ علامہ شمس الدین سخاویؒ (م۹۰۲ھ) رقم طراز ہیں۔

" وَافَقَهُ عَلَيْهَا صَاحِبُهُ الْبَيْهَقِيُّ." (فتح المغیث:۱/۶۸)

حاکم کے اس دعوی میں ان کے شاگرد بیہقیؒ بھی ان کے ہمنوا ہیں۔

علامہ محمد بن طاہرؒ (م۵۰۷ھ) نے "شروط الائمة الستة" اور علامہ ابوبکر حازمیؒ نے "شروط الائمة الخمسة" میں حاکم نیسابویؒ کی بہت سختی سے تردید کی ہے۔ اور پھر انہوں نے تتبع اور استقراء کے بعد کچھ شروط ذکر کیے ہیں، لیکن ماضی قریب کے عظیم محدث و محقق علامہ عبد الرشید نعمانیؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے نزدیک اس کے علاوہ اور کوئی شرط نہیں کہ وہ صحیحین میں جو حدیث نقل کریں گے وہ ان کے نزدیک صحیح ہو گی۔ اس شرط کے علاوہ انہوں نے کسی اور شرط کی پابندی نہیں کی۔ اور خود شیخین سے اس کے متعلق ایک بات بھی منقول نہیں اور جن علماء نے اس کے متعلق کچھ تحقیق کی ہے اس کی بنیاد سراسر حسن ظن اور قلتِ تتبع پر ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: اصولِ حدیث کے بعض اہم مباحث: ۱۰۷-۱۳۸۔ (م)

(۱) تدریب الراوی: ۱/۱۴۱۔ (م)

(۲) علوم الحدیث: ۳۴۔ (ط)

۱۵۔ کیا صحیح ہونے کے لیے "عزیز" ہونا شرط ہے؟

درست بات یہ ہے کہ صحیح ہونے کے لیے " عزیز" ہونا شرط نہیں، (عزیز اس حدیث کو کہتے ہیں، جس میں راویوں کی تعداد کسی طبقے میں دو سے کم نہ ہو) اس لیے کہ بخاری اور مسلم میں ایسی احادیث موجود ہیں، جو صحیح ہیں، لیکن کسی طبقے میں صرف ایک راوی ہونے کی وجہ سے غریب ہیں، تاہم بعض اہل علم ابو علی جبائی معتزلی[1] اور امام حاکم نیسابوریؒ نے صحیح ہونے کے لیے "عزیز" ہونے کی شرط لگائی ہے، لیکن ان حضرات کا یہ نقطہ نظر امت کے متفقہ موقف کے خلاف ہے[2]۔

---

[1] محمد بن عبد الوہاب بن سلام جبائی، ابو علی، ۲۳۵ھ کو پیدا ہوئے، معتزلہ کے امام و مقتدیٰ تھے، اپنے زمانے میں متکلمین کے سرخیل تھے، جبائیہ ان کی طرف منسوب ایک گروہ ہے، بصرہ کے گاؤں جبیٰ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے جبائی کہلائے، بصرہ میں شہرت حاصل کی۔ ۳۰۳ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان:۱/۴۸۰، البدایۃ والنہایۃ:۱۱/۱۲۵، الاعلام للزرکلی:۶/۲۵۶)(م)

[2] نزہۃ النظر:۱۹۹۔(م)

۲۔ حسن لذاتہ کا بیان[1]

ا۔ حسن لذاتہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ حسن لذاتہ کی لغوی تعریف:

”حسن“ صفت مشبہ کا صیغہ ہے، جس کا معنی جمیل اور خوبصورت ہے۔

(ب)۔ حسن لذاتہ کی اصطلاحی تعریف:

حسن کی اصطلاحی تعریف میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ حدیث حسن دراصل حدیث صحیح اور حدیث ضعیف کی درمیانی کڑی ہے، نیز بعض اہل علم نے اس کی ایسی تعریف کی ہے، جو صرف اس کی ایک قسم کو شامل ہے، میں پہلے ان میں سے بعض تعریفات کا تذکرہ کروں گا اور بعد میں اپنی ذوق کے مطابق جو تعریف مجھے جامع نظر آئے گی اسے اختیار کرلوں گا۔

ا۔ امام خطابیؒ[2] کی تعریف:

حسن وہ حدیث ہے، جس کا مأخذ معلوم ہو۔ اس کے رجال مشہور ہوں اور اکثر حدیث کا اس پر مدار ہو اور یہ وہ حدیث ہے جس کو اکثر علماء نے قبول کیا ہو اور عام فقہاء کرام اس پر عمل

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح:۹۹، إرشاد طلاب الحقائق:۱/ ۱۳۷ - ۱۵۲، التقریب:۴۲ - ۴۹، الاقتراح:۱۶۲، المنهل الروي:۳۵، الموقظة: ۲۶، اختصار علوم الحدیث:۳۷، المقنع فی علوم الحدیث:۱/ ۸۳، نزهة النظر:۹۱، فتح المغیث: ۱/ ۶۱، ألفیة السیوطي:۱۵ - ۱۹، شرح السیوطي علی ألفیة العراقي:۱۲۶، توضیح الأفکار: ۱/ ۱۵۴، ظفر الأماني:۱۷۴، قواعد التحدیث:۱۰۵.(م)

(۲) حمد بن محمد بن ابراہیم ابن خطاب بُستی، ابو سلیمان، ۳۱۹ھ کو پیدا ہوئے، بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے، بُست (کابل) کے باسی تھے، زید بن خطاب برادر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نسل سے تھے، علم حدیث پر بہت قیمتی کتابیں لکھیں۔ بُست ہی میں ۳۸۸ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان:۲/ ۲۱۴، تذکرۃ الحفاظ:۳/ ۱۰۱۸، النجوم الزاہرۃ:۴/ ۱۹۹، الاعلام للزرکلی:۲/ ۲۷۳)(م)

پیرا ہوں [۱]۔

۲۔امام ترمذی رحمہ اللہ کی تعریف:

حسن وہ حدیث ہے، جس کی اسناد میں متہم بالکذب راوی نہ ہو اور نہ ہی وہ حدیث شاذ ہو حدیث شاذ ہو اور اس سند کے علاوہ دوسرے اسناد بھی مروی ہو۔ یہی حدیث ہمارے نزدیک حسن ہے [۲]۔*

۳۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تعریف:

---

[۱] معالم السنن: ۱/ ۱۱، (ط) مقدمہ ابن الصلاح:۹۹، تدریب الراوی:۱/۱۶۶. (م)

[۲] جامع الترمذی مع تحفۃ الاحوذی، کتاب العلل:۱۰/۵۱۹۔ (ط) مقدمۃ ابن الصلاح:۹۹، تدریب الراوی:

* مذکورہ تعریفات نقل کرنے کے بعد حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) ان پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

" وقدْ أمعَنْتُ النَّظَرَ في ذلكَ والبحثَ جامعاً بينَ أطرافِ كلامِهِم، ملاحظاً مواقعَ استعمالِهِم؛ فتنَقَّحَ لي واتَّضَحَ أنَّ الحديثَ الحسَنَ قِسْمانِ:أحدُهُما: الحديثُ الذي لا يخلو رجالُ إسنادِهِ مِنْ مستورٍ لَمْ تَتَحَقَّقْ أهليَّتُهُ، غيرَ أنَّهُ ليسَ مُغَفَّلاً كثيرَ الخطأِ فيما يَرْويهِ، ولا هوَ متَّهَمٌ بالكذبِ في الحديثِ، أي: لَمْ يَظهرْ منهُ تَعمُّدُ الكذبِ في الحديثِ ولا سببٌ آخرُ مفسِّقٌ، ويكونُ متنُ الحديثِ معَ ذلكَ قد عُرِفَ بأنْ رُوِيَ مِثْلُهُ أو نحوُهُ مِنْ وجهٍ آخرَ أو أكثرَ، حتَّى اعتضَدَ بمتابعةِ مَنْ تابعَ راويَهُ على مثلِهِ، أو بما لَهُ مِنْ شاهِدٍ، وهوَ ورُودُ حديثٍ آخرَ بنحوِهِ، فيَخْرُجُ بذلكَ عَنْ أنْ يكونَ شاذّاً ومُنْكَراً. وكلامُ الترمِذِيِّ على هذا القسمِ يتَنَزَّلُ. القسمُ الثاني: أنْ يكونَ راوِيْهِ مِنَ المشهورينَ بالصدقِ والأمانةِ، غيرَ أنَّهُ لَمْ يبلغْ درجَةَ رجالِ الصحيحِ؛ لكونِهِ يقصُرُ عنهم في الحفظِ والإتقانِ، وهو معَ ذلكَ يرتفِعُ عَنْ حالِ مَنْ يُعَدُّ ما ينفرِدُ بهِ مِنْ حديثِهِ مُنكراً، ويُعْتَبَرُ في كلِّ هذا معَ سلامةِ الحديثِ مِنْ أنْ يكونَ شاذّاً ومُنكراً: سلاَمَتُهُ مِنْ أَنْ يكونَ معلَّلاً. وعلى القسم الثاني يتَنَزَّلُ كلامُ الخطَّابِيِّ. "(مقدمہ ابن الصلاح:۱۰۰-۱۰۱)

"میں غوروخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حدیث حسن کی دو قسمیں ہیں:ایک وہ جس کی سند ایسے مستور راوی سے خالی نہ ہو جس کی اہلیت متحقق نہ ہو۔البتہ وہ مغفل نہ ہو اورروایت میں کثیر الخطاء نہ ہو اوروہ متہم بالکذب بھی نہ ہو،یعنی اس سے عملاً کذب بھی سرزدنہ ہوا ہو۔اور فسق کا کوئی سبب بھی ظاہر نہ ہوا ہو۔اس کیساتھ حدیث کا متن معروف ہو،یعنی اس طرح یا اس سے ملتاجلتا متن ایک یا کئی طرق سے مروی ہو، حتی کہ وہ متابعت یا شاہد(جو ایک ایسی ہی اور حدیث بیان ہونے کے مترادف ہے)سے مضبوط ہو جائے اس طرح وہ شاذ اور منکر کی نوع سے خارج ہو جائے گی۔ امام ترمذیؒ کا کلام اس پر صادق آتا ہے اوردوسری قسم وہ ہے جس کے راوی صدق وامانت میں معروف ہوں، لیکن حفظ واتقان میں کمی کی وجہ سے صحیح کے رجال کادرجہ نہ حاصل نہ کرپائیں۔اس کے باوجود ایسے تفرد سے خالی ہوں جس سے ان کی حدیث منکر شمار ہو اوردونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ شاذ اور معلل نہ ہو۔یہ وہ قسم ہے جس پر خطابیؒ کی تعریف صادق آتی ہے۔" (م)

وہ خبر واحد جو عادل اور تام الضبط رواۃ سے سند متصل کیساتھ مروی ہو اور ہر قسم کے شذوذ اور علل سے خالی ہو وہ صحیح لذاتہ کہلاتی ہے [۱]، لیکن اگر راویوں کا ضبط کمزور ہو تو وہ حسن لذاتہ کہلاتی ہے۔ *

میری رائے کے مطابق حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک ہر صحیح حدیث حسن ہے، جب اس کے رواۃ کا ضبط کمزور ہو جائے۔ یہ حدیث حسن کی سب سے بہتر اور جامع تعریف ہے۔ رہی علامہ خطابی رحمہ اللہ کی تعریف تو اس پر محدثین نے بہت زیادہ تنقید کی ہے [۲]، جب کہ امام ترمذیؒ نے حسن کی صرف ایک قسم (حسن لغیرہ) کی تعریف کی ہے، حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ حسن لذاتہ کی تعریف کی جاتی۔ اس لیے کہ حسن لغیرہ اصل میں ضعیف حدیث کی ایک قسم ہے، جس میں متعدد طرق کی وجہ سے ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ترقی کر کے حسن لذاتہ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

۴۔ حسن لذاتہ کی پسندیدہ تعریف:

حافظ ابن حجرؒ کی بیان کردہ تعریف کی بناء پر حسن لذاتہ کی تعریف ان الفاظ میں ہو سکتی ہے کہ حسن لذاتہ وہ حدیث ہے، جس کی سند متصل ہو اور اس کے رواۃ عادل غیر تام الضبط [۳] ہوں اور شذوذ و علل سے خالی ہو۔

۲۔ حسن کا حکم:

---

[۱] نزہۃ النظر: ۲۹۔ (ط)

* حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) نے بعض متاخرین کے حوالے سے حدیثِ حسن کی ایک تعریف یہ بھی کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

" وقالَ بعضُ المتأخِّرينَ: الحديثُ الذي فيهِ ضَعْفٌ قريبٌ مُحتَملٌ هو الحديثُ الحسنُ، ويَصْلُحُ للعملِ بهِ." (مقدمہ ابن الصلاح: ۱۰۰)

"حسن حدیث وہ ہے جس میں معمولی درجہ کا ضعف ہو اور اس میں صحت کا احتمال ہو اور قابل عمل ہو۔"

[۲] تدریب الراوی: ۱/۱۶۶۔ (م)

[۳] اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام رجال اسناد غیر تام الضبط ہوں، اگر بعض غیر تام الضبط ہوں یا کوئی ایک راوی غیر تام الضبط ہوں اور باقی عادل اور تام الضبط ہوں، اس لیے کہ حکم علی الحدیث میں کسی ایک آدمی کا اعتبار ہوتا ہے، جس کی بنیاد پر حدیث پر حکم لگا جا سکتا ہے۔ (ط)

حسن لذاتہ حدیث احتجاج اور استدلال میں صحیح کی مانند ہے، اگرچہ قوت میں صحیح سے کم درجہ کی ہے، اس وجہ سے جمہور فقہاء کرامؒ نے اس سے استدلال کیساتھ ساتھ اس پر عمل بھی کیا ہے اور محدثین کرام اور اصولیین کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس سے استنباط اور استدلال کیا ہے[1]، تاہم بعض متشدد قسم کے اہل علم نے اس سے بھی احتراز کیا ہے اور جب کہ بعض متساہلین نے حسن لذاتہ کو صحیح کے اقسام میں درج کیا ہے، جیسے امام حاکمؒ، ابن حبانؒ اور ابن خزیمہؒ وغیرہ۔

---

[1] حسن حدیث بھی صحیح حدیث کی طرح احکام میں حجت ہے، علامہ نوویؒ (م۶۷۶ھ) فرماتے ہیں۔

" ثم الحسن كالصحيح في الاحتجاج به وإن كان دونه في القوة؛ ولهذا أدرجته طائفة في نوع الصحيح-" (التقريب:۲۹)

"پھر حسن حدیث حجت ہونے کے اعتبار سے صحیح کی مانند ہے گو اس سے کم درجہ قوی ہے، اسی لیے کچھ لوگوں نے اسے صحیح کی قسم میں شامل کیا ہے۔"

علامہ خطابیؒ (م۳۸۸ھ) حدیثِ حسن کی حجیت پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

" (وَعَلَيْهِ مَدَارُ أَكْثَرِ الْحَدِيثِ) لِأَنَّ غَالِبَ الْأَحَادِيثِ لَا تَبْلُغُ رُتْبَةَ الصَّحِيحِ (وَيَقْبَلُهُ أَكْثَرُ الْعُلَمَاءِ)، وَإِنْ كَانَ بَعْضُ أَهْلِ الْحَدِيثِ شَدَّدَ، فَرَدَّ بِكُلِّ عِلَّةٍ، قَادِحَةٍ كَانَتْ أَمْ لَا. كَمَا رُوِيَ عَنِ ابْنِ أَبِي حَاتِمٍ أَنَّهُ قَالَ: سَأَلْتُ أَبِي عَنْ حَدِيثٍ فَقَالَ: إِسْنَادُهُ حَسَنٌ، فَقُلْتُ: يُحْتَجُّ بِهِ؟ فَقَالَ: لَا، (وَاسْتَعْمَلَهُ) أَيْ عَمِلَ بِهِ (عَامَّةُ الْفُقَهَاءِ)-" (تدریب الراوی:۱/۱۶۷)

"حسن پر اکثر احادیث کا مدار ہے اس لیے حدیث کی اکثریت صحیح کے مرتبہ تک نہیں پہنچتی۔ اس پر عام فقہاء کا عمل ہے اور اکثر علماء نے اسے قبول کیا ہے، بعض محدثین نے تشدد سے کام لیا ہے اور ہر علت کی بنیاد پر خواہ وہ قادحہ ہو یا غیر قادحہ، رد کر دیا ہے، جیسا کہ ابن ابی حاتم سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے ایک حدیث کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: "اس کی سند حسن ہے۔" وہ کہتے ہیں میں نے کہا اس سے حجت پکڑی جا سکتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں اس پر عام فقہاء نے عمل کیا ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) حجیت حسن کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔

" وهذا القِسْمُ مِنَ الحَسَنِ مُشارِكٌ للصَّحيحِ في الاحتِجاجِ بهِ، وإِنْ كانَ دُونَه، ومشابِهٌ لهُ في انْقِسامِه إِلى مراتِبَ بعضُها فوقَ بعضٍ." (نزہۃ النظر:۲۶)

"اور حسن کی یہ قسم حجت ہونے کے لحاظ سے صحیح کے مشابہ ہے، گو رتبہ میں اس سے کم ہے اور مراتب کی کمی بیشی میں منقسم ہونے کے اعتبار سے اس کے مشابہ ہے۔" (م)

البتہ یہ حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ حسن لذاتہ کا درجہ صحیح سے کچھ کم ہے[(۱)]۔

۳۔ حسن لذاتہ کی مثال:

حسن لذاتہ کی مثال وہ حدیث ہے، جس کو امام ترمذیؒ نے درج ذیل سند کیساتھ روایت کی ہے:

حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ سُلَيْمَانَ الضُّبَعِيُّ، عَنْ أَبِي عِمْرَانَ الجَوْنِيِّ، عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي مُوسَى الأَشْعَرِيِّ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي، بِحَضْرَةِ العَدُوِّ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ أَبْوَابَ الجَنَّةِ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ»[(۲)].

"ہم سے قتیبہ نے بیان کیا کہ انہوں نے کہا، ہم سے جعفر بن سلیمان ضبعی نے ابو عمران جونی سے روایت کی، انہوں نے ابو بکر بن ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کی، ابو بکر نے کہا کہ میں نے اپنے والد ماجد (حضرت موسی اشعری رضی اللہ عنہ) کو میدان جہاد میں دشمنوں کے سامنے یہ کہتے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ تلے ہیں۔"

امام ترمذیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں۔

"هذا حديث حسن غريب.[(۳)]"

"یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث اس لیے حسن ہے کہ اس کی اسناد کے چار رجال ثقہ ہیں، سوائے جعفر بن سلیمان ضبعی کے کہ یہ حسن الحدیث ہے، اس وجہ سے اس حدیث کا درجہ صحیح کے مرتبہ

---

(۱) امام ابن خزیمہؒ اور ابن حبانؒ صحیح و حسن میں تفریق کے قائل نہیں، بلکہ ان کے نزدیک جیسا کہ ان کی شرائط سے ظاہر ہے حسن صحیح کی ایک قسم ہے، لہذا یہ قابل احتجاج ہے، لیکن امام ابو حاتم رازی (م) حدیثِ حسن کو قابل احتجاج نہیں مانتے۔ جمہور محدثین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حسن حدیث قابل احتجاج ہے۔ دیکھئے: معالم السنن:۱/۶، النکت علی مقدمہ ابن الصلاح:۱/۴۸۱، مقدمہ ابن الصلاح:۱۱۰، التقریب:۲۹، نزہۃ النظر:۶۲، فتح المغیث:۱/۱۳۳، تدریب الراوی:۱/۱۶۷۔ (م)

(۲) سنن الترمذي مع شرحه تحفة الأحوذي، أبواب فضائل الجهاد، ج۵ ص۳۰۰. (ط)

(۳) سنن الترمذي، أبواب فضائل الجهاد، ج۵ ص۳۰۰. (ط)

سے گر کر حسن کے درجہ پر آگیا[۱]۔

۴۔ حسن لذاتہ کے مراتب:

جس طرح صحیح حدیث کے مراتب ہیں، جو ایک دوسرے سے متفاوت ہیں، اسی طرح حسن لذاتہ کے بھی مراتب ہیں، امام شمس الدین ذہبیؒ نے اس کے درج ذیل مراتب بیان کیے ہیں:

(الف)۔ حسن لذاتہ کا اعلی مرتبہ: وہ حسن حدیث ہے، جس کے رواۃ کی تصحیح یا تحسین میں محدثین کرامؒ کا اختلاف ہو، جیسے وہ حدیث جس کو بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کریں اور وہ حدیث جس کو عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے بیان کریں اور وہ حدیث جسے ابن اسحاق تیمی سے روایت کریں اور اس کی دیگر مثالیں وہ احادیث ہیں، جنہیں صحیح کہا گیا ہو، لیکن وہ صحیح کے سب سے ادنی مرتبہ میں ہوں[۲]۔

(ب)۔ حسن کا ادنی مرتبہ: وہ حسن حدیث ہے، جس کے رواۃ کی تحسین اور تضعیف میں محدثین کرامؒ کا اختلاف ہو، جیسے حارث بن عبد اللہ، عاصم بن ضمرۃ اور حجاج بن ارطاۃ وغیرہ کی روایت کردہ احادیث میں اختلاف ہے[۳]۔

۵۔ محدثین کرام کے قول: "حدیث صحیح الاسناد" یا "حسن الاسناد" کا مرتبہ:

محدثین کرام کے ان دونوں اصطلاحات میں فرق حسب ذیل ہے:

(الف)۔ محدثین کے قول "ھذا حدیث صحیح الاسناد" کا مرتبہ "ھذا حدیث صحیح" سے کم ہے۔

(ب)۔ اس طرح محدثین کرام کے قول "ھذا حدیث حسن الاسناد" کا مرتبہ ان کے قول "حدیث حسن" سے کم ہے، اس لیے کہ کبھی اسناد صحیح یا حسن ہوتی ہے، لیکن شذوذ یا علل کی وجہ سے متن صحیح یا حسن نہیں ہوتا۔ اس لیے جب کوئی محدث یہ کہے۔ "ھذا حدیث

---

[۱] جیسا کہ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب: ۲/ ۹۶، میں ابو احمد سے نقل کیا ہے۔ (ط)

[۲] تدریب الراوی: ۱/ ۱۷۴۔ (م)

[۳] تدریب الراوی: ۱/ ۱۷۴۔ (م)

صحیح'' تو گویا اس نے حدیث میں پانچوں شرائط کے پائے جانے کی ضمانت دے دی، لیکن جب کوئی محدث یہ کہتا ہے۔''هذا حديث صحيح الاسناد'' تو اس نے اس حدیث میں صحت کے فقط تین شروط اتصال سند، عدالت رواۃ اور ضبط رواۃ کی ضمانت دے دی، تاہم شذوذ اور علل کی نفی کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ اس لیے کہ اس نے ان دونوں باتوں کی تحقیق و تنقیح نہیں کی[1]۔

لیکن یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ اگر کوئی قابل اعتماد حافظ اور محدث ''هذا حديث صحيح الاسناد'' پر اکتفاء کرے اور کسی قسم علت کا تذکرہ نہ کرے تو بظاہر یہ اس کے متن کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، اس لیے کہ حدیث میں علل یا شذوذ کا نہ پایا جانا اصل ہوتا ہے[2]۔

٦۔ امام ترمذیؒ اور دیگر محدثین کے قول ''هذا حديث حسن صحيح'' کا مفہوم:

امام ترمذیؒ اور دیگر محدثین کرام کا یہ قول ''هذا حديث حسن صحيح'' بظاہر مشکل ہے، اس لیے کہ حسن کا درجہ صحیح سے کم ہوتا ہے۔ اب دونوں کے مراتب میں تفاوت کے باوجود انہیں ایک جگہ میں کس طرح جمع کیا جاسکتا ہے؟ امام ترمذی رحمہ اللہ کا اس عبارت سے کیا مقصود ہے؟ تو محدثین کرام نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں[3]، تاہم ان میں سے بہتر جواب وہ ہے، جو حافظ ابن حجرؒ نے دیا ہے اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اسے پسند کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

---

[1] مقدمہ ابن الصلاح:٣٨، التقریب والتیسیر:٥، تدریب الراوی:١/١٧٥۔(م)

[2] تدریب الراوی:١/١٧٥۔(م)

[3] حاصل یہ ہے کہ امام ترمذیؒ کے اس قول سے حسن اور صحیح کے ایک ہونے کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے، حالانکہ حسن ایک مستقل قسم ہے اور صحیح سے کم درجہ کی حدیث ہے؟ محدثین کرامؒ نے اس کے متعدد جواب دیے ہیں: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حسن صحیح ہی کی ایک قسم ہے، امام حاکم نیسابوریؒ کے کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے، امام ترمذیؒ کی کتاب کو ''الجامع الصحیح'' اسی وجہ سے کیا گیا ہے، خطیب بغدادیؒ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح:٤٠، تدریب الرواى:١/١٧٦)

بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ یہاں حسن کا لغوی معنی مراد ہے نہ کہ اصطلاحی معنی۔ اس توجیہ کو ابن الصلاح نے پسند کیا ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح:٣٩، تدریب الروی:١/١٧٦) =

(الف)۔ اگر حدیث کی دو یا دو سے زائد اسناد ہوں تو پھر اس عبارت کا مفہوم یہ ہو گا کہ یہ حدیث ایک سند کے اعتبار سے حسن ہے اور کسی دوسری سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔

(ب)۔ اگر حدیث کی سند ایک ہو تو پھر اس عبارت کا مفہوم یہ ہو گا کہ یہ حدیث بعض محدثین کرامؒ کے نزدیک حسن ہے اور بعض کے نزدیک صحیح ہے، گویا کہ قائل اس بات کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ اس حدیث کے مرتبہ میں اہل علم کا اختلاف ہے، یا اس کے قائل کے نزدیک حسن یا صحیح میں کوئی حکم راجح نہیں[1]۔

۷۔ امام بغویؒ کا "مصابیح السنة" کی احادیث کو تقسیم کرنا:

"مصابیح السنة" امام بغویؒ کی شہرہ آفاق کتاب ہے، جس میں انہوں نے صحیحین اور سنن اربعہ (سنن الترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ) اور سنن دارمی سے احادیث منتخب کرکے جمع کی ہیں، خطیب تبریزیؒ[2] نے اضافہ اور تہذیب کے بعد اس کا نام "مشکاۃ المصابیح" رکھا ہے، امام بغویؒ نے اس میں اپنے ذوق کے مطابق ایک خاص اصطلاح مقرر کی ہے کہ صحیحین یا دونوں میں سے کسی ایک کتاب کی حدیث کی طرف لفظ "صحیح" کیساتھ اشارہ کرتے ہیں اور سنن اربعہ کی احادیث کی طرف لفظ "حسن" سے اشارہ کرتے ہیں، لیکن امام بغویؒ کی یہ اصطلاح

= حافظ ابن کثیرؒ (م۷۷۴ھ) فرماتے ہیں کہ "حدیث حسن صحیح" ایک مستقل قسم ہے جو صحیح سے کم، لیکن حسن سے زیادہ درجہ کی ہے۔ لیکن علامہ عراقیؒ (م۸۰۶ھ) نے اس کو محل نظر قرار دیا ہے۔ (اختصار علوم الحدیث:۱۷، تدریب الراوی:۱/۱۷۶)

معروف محدث ابن دقیق العیدؒ (م۷۰۲ھ) کا کہنا ہے کہ حدیث حسن میں صحت کی شرائط کمی اس وقت ہوتی ہے جب حسن منفرد ہو، لیکن وہ درجہ صحت کو پہنچتی ہو تو حسن کی متابعت میں شامل ہوتی ہے، کیونکہ حفظ واتقان جو اعلی درجہ کی صفات ہیں صدق جیسی کم درجہ کی صفت کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے نچلے درجے کی صفت کے لحاظ سے حسن اور اعلی درجہ کی صفات کی بناپر صحیح کہنا درست ہو گا۔ اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ہر صحیح حدیث حسن ہوتی ہے۔ (تدریب الراوی:۱/۱۸۷)(م)

[1] تدریب الراوی:۱/۱۸۷۔(م)

[2] محمد بن عبد اللہ، خطیب، عمری، ابو عبد اللہ، ولی الدین تبریزی، حدیث اور رجال کے بہت بڑے عالم تھے، ۷۴۱ھ کو وفات پائی۔ (الاعلام للزرکلی:۶/۲۳۴)(م)

معروف محدثینؒ کے عام اصطلاح کے مطابق نہیں، اس لیے کہ سنن اربعہ میں صحیح، حسن، ضعیف اور منکر ہر قسم کی روایات پائی جاتی ہیں[1]، اس وجہ سے علامہ ابن الصلاحؒ اور امام نوویؒ نے اس مخصوص اصطلاح کی نشاندہی کی ہے، اس لیے "مصابیح السنۃ" کے مطالعہ کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ اس مخصوص اصطلاح سے واقف ہو، بالخصوص اس وقت جب وہ کسی حدیث کو صحیح یا حسن قرار دے۔

۸۔ حسن احادیث کے مظان اور مواقع:

احادیث حسن کے مظان اور مواقع سے مراد وہ کتابیں ہیں، جن میں حسن احادیث پائی جاتی ہیں، محدثین کرام نے جس طرح صحیح احادیث پر مشتمل کتابیں مدون کی ہیں، اسی طرح حسن احادیث پر مشتمل کوئی مستقل کتاب تالیف نہیں کی فرمائی، البتہ کچھ کتابیں ایسی ضرور ہیں، جن میں کثیر تعداد میں حسن احادیث موجود ہیں، اس طرح کی بعض مشہور کتابیں یہ ہیں:

(الف)۔ جامع الترمذی: اس کا معروف نام "سنن الترمذی" ہے، یہ حدیث حسن کی معرفت میں اصل کا درجہ رکھتی ہے، امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں حسن کا لفظ بار بار استعمال کرکے اسے خوب شہرت دی ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی مخصوص

---

(۱) علامہ بغویؒ صحیحین میں موجودہ احادیث کو صحاح اور سنن میں موجودہ احادیث کو حسان کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، علامہ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) نے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ اصطلاح غیر معروف ہے اور کتب سنن حسن اور غیر حسن دونوں طرح کی احادیث موجود ہیں۔ امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) فرماتے ہیں۔

"وهذا اصطلاح لايعرف ولا هوصحيح، فقدتقدم ان هذه الكتب فيهاالحسن والضعيف والمنكر، فكيف تجعل كلهاحساناً؟"۔(الارشاد:۱۷۰)

"یہ اصطلاح غیر معروف ہے اور صحیح بھی نہیں، اس لیے کہ عرض کر چکے ہیں کہ ان کتابوں میں حسن، ضعیف اور منکر ہر طرح کی روایات موجود ہیں۔ سب کو حسن کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟"

یہ امام بغویؒ (م ۵۱۶ھ) کی مخصوص اصطلاح ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ اصطلاحات وضع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ امام بغویؒ (م۵۱۶ھ) کی اصطلاح جمہور محدثین کرام کے اصطلاح سے مختلف ہے۔ (م)

اصطلاح ''حسن صحیح'' وغیرہ کا استعمال اور مواقع ذکر مختلف نسخوں میں مختلف ہے، اس لیے علوم حدیث کے طالب علم پر یہ بات لازم ہے کہ وہ ''سنن ترمذی'' کا ایسا نسخہ مطالعہ میں رکھے، جو معتبر اور محقق ہو اور جس کا دیگر نسخوں کیساتھ تقابل اور مقارنہ کیا گیا ہو[1]۔

(ب)۔ سنن ابی داؤد: امام ابو داؤد رحمہ اللہ[2] نے اہل مکہ کی طرف جو خط بھیجا تھا انہوں نے اس میں اس بات کی تصریح کی تھی کہ میری کتاب میں صحیح اور صحیح سے ملتی جلتی اور قریب قریب احادیث مذکور ہیں اور جن احادیث میں شدید ضعیف ہے، ان کے ضعف اور سقم کو بیان کیا گیا ہے اور جن کے متعلق کوئی حکم مذکور نہیں تو وہ صالح کہلاتی ہیں[3]۔ لہذا اب ان اصول کے تناظر میں امام ابو داؤد کوئی ضعیف حدیث بیان کرے، لیکن اس کی ضعف کی تصریح نہ کریں اور قابل اعتماد محدثین کرامؒ نے اس کی تصحیح بھی نہ کی ہو تو وہ حدیث امام ابو داؤد کے نزدیک حسن ہوگی[4]۔

(ج)۔ سنن دار قطنی: امام دار قطنیؒ[5] نے اپنی سنن میں بہت سی حسن احادیث بیان کیے ہیں[6]۔

---

[1] مقدمہ ابن الصلاح:۳۶، تدریب الراوی:۱/۱۸۱۔(م)

[2] سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر ازدی سجستانی، ابو داؤد، ۲۰۲ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور میں محدثین کے امام تھے، سجستان کے باشندے تھے، حصولِ علم کے سلسلے میں دور دراز کے اسفار کیے، ان کی کتاب سنن ابی داؤد کتب ستہ میں سے ایک ہے، ان کی وفات بصرہ میں ۲۷۵ھ کو ہوئی۔ (تاریخ بغداد:۹/۵۵، وفیات الاعیان:۲/۴۰۴، الاعلام للزرکلی:۳/۱۲۲)(م)

[3] مقدمہ بن الصلاح:۳۶، النکت علی مقدمہ ابن الصلاح:۱/۴۳۲۔(م)

[4] مقدمہ بن الصلاح:۳۶، النکت علی مقدمہ ابن الصلاح:۱/۴۳۲۔(م)

[5] علی بن عمر بن احمد بن مہدی، ابو الحسن، دار قطنی، شافعی، ۳۰۶ھ کو دار القطن (بغداد کا ایک قصبہ ہے) میں پیدا ہوئے، اپنے دور میں حدیث اور علل حدیث کے بہت بڑے امام تھے، آپ نے سب سے پہلے قراءت پر کتاب لکھی اور اسے ابواب پر مرتب کیا، مصر کا سفر کیا اور پھر واپس بغداد لوٹ آئے اور وہیں ۳۸۵ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد:۱۲/۳۴، وفیات الاعیان:۳/۲۹۷، الاعلام للزرکلی:۴/۳۱۴)(م)

[6] مقدمہ ابن الصلاح:۳۶، المنہل الروی:۳۸، الارشاد:۲:۷۷۔(م)

۳۔ صحیح لغیرہ[1]

۱۔ صحیح لغیرہ کی تعریف:

صحیح لغیرہ وہ حسن لذاتہ حدیث ہے، جو کسی دوسری طریق سے مروی ہو، خواہ وہ طریق اس کی مانند ہو، یا اس سے اقوی ہو[2]۔ اس کو صحیح لغیرہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس پر صحت کا حکم پہلی سند کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسری سند کی وجہ سے لگتا ہے[3]۔

ریاضی اصول کے مطابق اس کو یوں لکھا جائے گا۔

حسن لذاتہ + حسن لذاتہ = صحیح لغیرہ

۲۔ صحیح لغیرہ کا مرتبہ:

اس کا مرتبہ حسن لذاتہ سے بلند ہے، لیکن صحیح لذاتہ سے کم ہے[4]۔

۳۔ صحیح لغیرہ کا مثال:

---

[1] نزهة النظر: ۸۷، توجیہ النظر إلی أصول الأثر: ۲ / ۱۸، توضیح الأفکار: ۲ / ۱۲۰، وقفو الأثر: ۵۰، قواعد التحدیث: ۱/ ۳۴.(م)

[2] دیکھئے: نزهة النظر: ۳۴۔(ط)

[3] صحیح لغیرہ پر تعدد طرق کی وجہ سے صحت کا حکم لگایا جاتا ہے، حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

”وإنّما يُحْكَمُ لهُ بالصِّحَّةِ عندَ تعدُّدِ الطُّرُقِ؛ لأنَّ للصُّورةِ المجموعةِ قُوَّةً تَجْبُرُ القَدْرَ الَّذي قَصَّرَ «الوصفين» بهِ ضَبْطُ راوِي الحَسَنِ عن راوي الصَّحيحِ، ومِن ثَمَّ تُطلَقُ [الصِّحَّةُ على الإِسنادِ الَّذي يكونُ حسناً لذاتِه لو تفرَّدَ إِذا تَعَدَّدَ.“ (نزهۃ النظر:۶۶)

”ہم تعدد طرق کی وجہ سے صحت کا حکم اس لیے لگاتے ہیں کہ مجموعی صورت ایسی قوت ہے جو اس کمی کو پورا کر تا دیتی ہے جو صحیح کے راوی کی نسبت حدیث حسن کے راوی کے ضبط میں پائی جاتی ہے اس طرح حسن لذاتہ کی متفرد اسناد اگر متعدد ہو جائیں تو اس پر صحت کا اطلاق ہو گا۔“ (م)

[4] صحیح لغیرہ دراصل حسن لذاتہ کی اعلی صورت ہے، حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے اس کی یوں تعریف کی ہے۔

=

صحیح لغیرہ کی مثال یہ حدیث ہے۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرٍو، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ». (۱)

”محمد بن عمرو ابو سلمہ سے روایت ہے کہ وہ سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اگر مجھے اپنی امت پر گراں باری کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں انہیں ہر نماز کیساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔“

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محمد بن عمرو بن علقمہ صدق اور تقوی میں بڑی شہرت کے حامل ہیں، لیکن حفظ واتقان میں ان کا مقام نمایاں نہیں، بلکہ بعض محدثین کرام نے انہیں سوء حفظ کے بناء پر ضعیف قرار دیا ہے، تاہم بعض حضرات نے صدق اور جلالت شان کے باعث ثقہ قرار دیا ہے، اس لحاظ سے یہ حدیث حسن ہے، لیکن یہی حدیث دوسرے طرق سے بھی مروی ہے جس کی وجہ سے سوء حفظ کا خدشہ ختم ہوا اور کثرت طرق نے اس معمولی سے نقص کو دور کر دیا اور یوں ہی یہ سند درست ہوئی اور یہ حدیث صحیح قرار پائی (۲)۔

= ”إِنْ وُجِدَ ما يَجْبُرُ ذلكَ القُصورَ؛ ككَثْرَةِ الطُّرُق؛ فهُو الصَّحيحُ «لذاته» أَيضاً، لكنْ لا لذاتِهِ.وحيثُ لا جُبْرانَ؛ فهُو الحسنُ لذاتِهِ.“ (نزہۃ النظر:۵۸)

اگر ان صفات کی کمی کثرت طرق سے پوری ہو گئی تو وہ صحیح لغیرہ ہو گی اور اگر کمی پوری نہ ہوئی تو وہ حسن لذاتہ ہو گی۔(م)

(۱) سنن الترمذي، كتاب الطهارة، باب ما جاء في السواک: ۱/ ۳۴-حدیث ۲۲. امام بخاری نے اسے ابو الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرہ کے طرق سے روایت کیا ہے۔(ط)

(۲) علوم الحدیث: ۳۱-۳۲۔(ط) تدریب الراوی: ۱۹۱۔(م)

۴۔ حسن لغیرہ[۱] کا بیان

۱۔ حسن لغیرہ کی تعریف:

حسن لغیرہ وہ ضعیف حدیث ہے، جس کے طرق متعدد ہوں اور اس کے ضعف کا سبب راوی کا فسق یا کذب نہ ہو[۲]۔

اس تعریف کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ ضعیف حدیث درجہ ذیل دو باتوں کے باعث حسن لغیرہ کا درجہ پالیتی ہے:۔

(الف)۔ یہ ضعیف حدیث اس طریق کے علاوہ کسی اور طریق، یا متعدد طرق سے مروی ہو، بشرطیکہ دوسرا طریق پہلے کی مانند ہو، یا اس سے اقوی ہو۔

(ب)۔ حدیث کی ضعف کا سبب راوی کا سوء حفظ ہو، یا سند کی انقطاع ہو، یا راوی کا مجہول ہونا[۳]۔

۲۔ حسن لغیرہ کی وجہ تسمیہ:

حسن لغیرہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ حدیث پہلی سند کی وجہ سے حسن نہیں بنی ہے بلکہ دیگر اسانید کی وجہ سے حسن بن چکی ہے[۴]۔ حدیث ضعیف کا حسن لغیرہ کے مرتبہ تک پہنچنے کو ان مساوات ریاضیہ کے ذریعے سمجھنا ممکن ہے۔

ضعیف + ضعیف = حسن لغیرہ

---

(۱) فتح المغیث بشرح ألفیۃ الحدیث:۱ / ۶۶، تدریب الراوي:۱ / ۱۰۵، الشذا الفیاح من علوم ابن الصلاح:۱ / ۱۲۷، نزھۃ النظر ۱۲۹، قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث:۱ / ۶۶.(م)

(۲) شرح نخبۃ الفکر:۵۴. (ط)

(۳) حاصل یہ ہے کہ اگر ضعیف حدیث کے راوی میں ضعف اس کی عدالت کی وجہ سے ہو تو یہ حدیث کسی بھی صورت میں قوی نہیں ہو سکتی، خواہ اس کی بے شمار اسانید ہی کیوں نہ ہوں اور اگر اس کے راوی میں کمزوری حفظ وضبط کی وجہ سے ہو تو پھر یہ حدیث کثرت طرق کی وجہ سے قوی ہو گی اور اس پر عمل جائز ہو گا۔(م)

(۴) چار قسم کی حدیثیں ہیں جن میں معمولی خرابی ہو متابعت کی وجہ سے حسن لغیرہ بن جاتی ہیں، وہ یہ ہیں: =

۳۔ حسن لغیرہ کا مرتبہ:

حسن لذاتہ کے مقابلہ میں حسن لغیرہ کا درجہ کم ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر حسن لذاتہ کا تعارض حسن لغیرہ کیساتھ آجائے تو حسن لذاتہ کو ترجیح دی جائے گی۔

۴۔ حسن لغیرہ کا حکم:

حسن لغیرہ حدیث مقبول اور قابل استدلال ہوتی ہے۔

۵۔ حسن لغیرہ کی مثال:

حسن لغیرہ کی مثال درج ذیل حدیث ہے، جس کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کر کے حسن قرار دیا ہے۔

عَنْ عَاصِمِ بْنِ عُبَيْدِ الله، قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ الله بْنَ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ امْرَأَةً مِنْ بَنِي فَزَارَةَ تَزَوَّجَتْ عَلَى نَعْلَيْنِ، فَقَالَ رَسُولُ الله ﷺ: «أَرَضِيتِ مِنْ نَفْسِكِ وَمَالِكِ بِنَعْلَيْنِ؟» قَالَتْ: نَعَمْ، قَالَ: فَأَجَازَهُ[1].

”شعبہ نے عاصم بن عبد اللہ سے انہوں نے عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ سے انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ بنی فزارہ کی ایک عورت نے صرف جوتے کو بطور مہر لے کر کسی سے نکاح کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ارشاد فرمایا۔ کیا تو اپنی جان اور مال کے بدلے میں جوتوں کے جوڑے پر رضامند ہو گئی؟ تو اسی عورت نے کہا جی ہاں! رسول اللہ ﷺ نے اس نکاح کو جائز قرار دیا۔“

= ۱۔ وہ حدیث جس کا کوئی راوی مستور یعنی مجہول الحال ہو جب اس کا کوئی معتبر متابع مل جائے تو وہ حن لغیرہ بن جاتی ہے۔

۲۔ وہ حدیث جس کے کسی راوی کی ضبط ناقص ہو جب اس کا کوئی معتبر متابع مل جائے تو وہ حسن لغیرہ بن جاتی ہے، خواہ وہ متابع اصل راوی سے اعلی درجہ کا ہو یا مساوی درجہ کا ہو۔ البتہ اگر کم درجہ کا ہو تو اس کی متابعت کا اعتبار نہ ہو گا۔

۳۔ وہ حدیث جس کی سند مرسل ہے جب اس کوئی معتبر متابع مل جائے تو وہ حسن لغیرہ بن جاتی ہے۔

۴۔ وہ حدیث جس کی سند میں تدلیس کی گئی ہو اور محذوف راوی کا کوئی پتہ نہ ہو جب اس کا کوئی معتبر متابع مل جائے تو وہ بھی حسن لغیرہ بن جائے گی۔ (التحدیث فی علوم الحدیث:۱۶۹)(م)

(۱) سنن الترمذي، أبواب النكاح، باب ما جاء في مهور النساء، حديث رقم ۱۱۱۳، ج۳، ص ۴۲۰، ۴۲۱. (ط)

امام ترمذی رحمہ اللہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں۔

"وَفِي البَاب عَنْ عُمَرَ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ، وَسَهْلِ بْنِ سَعْدٍ، وَأَبِي سَعِيدٍ، وَأَنَسٍ، وَعَائِشَةَ، وَجَابِرٍ، وَأَبِي حَدْرَدٍ الأَسْلَمِيِّ.(۱)"

"اس باب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سیدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ، سیدنا سہل بن سعد، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو حدُرد الاسلمی رضی اللہ عنہ سے احادیث مروی ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ اس روایت میں عاصم بن عبید اللہ سوء حفظ کی وجہ سے ضعیف ہے، تاہم امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا، اس لیے کہ یہ حدیث دیگر طرق سے مروی ہے(۲)۔

---

(۱) سنن الترمذی: ۳/ ۴۱۲۔ (م)

(۲) دیکھئے: تہذیب الکمال: ۲۲/ ۸۹، الکامل فی ضعفاء الرجال: ۶/ ۳۸۷، میزان الاعتدال: ۲/ ۳۵۳، دیوان الضعفاء للذہبی: ۲۰۳، لسان المیزان: ۹/ ۳۳۱۔ (م)

خبر واحد مقبول محتف بالقرائن[۱] کا بیان[۲]

ا۔ تمہید:

خبر مقبول کی اقسام بیان کرنے کے بعد اب ہم ایسے خبر مقبول کے متعلق گفتگو کرتے گفتگو کرتے ہیں، جو محتف بالقرائن ہو، محتف بالقرائن کا مطلب یہ ہے کہ خبر واحد مقبول کی مطلوبہ کی مطلوبہ شرائط سے زائد کچھ ایسے امور ہیں، جو خبر واحد کو محیط ہو اور جن کی وجہ سے اس کی مقبولیت میں مزید قوت اور اضافہ پیدا ہو اور اس بناء پر اسے دیگر ان مقبول احادیث پر فوقیت حاصل ہوں، جو اس قسم کی امتیازی حیثیت اور ترجیح سے خالی ہوں[۳]۔

---

[۱] مُحتَفّ "احْتَفَّ یحتفّ احتفافًا" باب افتعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اس کے معنی گِھر جانے کے ہیں، جب کسی چیز کے چاروں طرف دوسری چیزیں جمع ہو جائیں تو درمیانی چیز دوسرے مختلف چیزوں کے درمیان گِھر جاتی ہے اور "قرائن" قرینہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: اثر اور علامت کے جو کسی دوسری چیز کی نشان دہی کرے، جیسے دھواں اڑ رہا ہو، تو یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کہیں آگ لگی ہوتی ہے، اس طرح بعض ایسی علامات ونشانات ہوتے ہیں جو در حقیقت کسی خبر آحاد کی مطلوبہ شرائط سے کچھ زائد ہوتے ہیں، اگر کوئی ایسی خبر آحاد جو مقبول ہونے کے ضروری شرائط رکھنے کے علاوہ کچھ ایسے مزید قرائن بھی رکھتی ہو، جس سے اس کے اندر مزید قوت پیدا ہو گئی ہو تو اس خبر مقبول میں ایک طرح کا امتیاز پیدا ہو جاتا ہے اور یہ امتیاز ان اخبار آحاد میں نہیں ہو تا جو اس طرح کے قرائن سے خالی ہوں، اس لیے یہ امتیاز رکھنے والی خبر احاد کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہوتی ہے۔ (م)

[۲] نزہۃ النظر: ۲۰۱، الیواقیت والدرر شرح شرح نخبۃ الفکر: ۳۰۵، شرح نخبۃ الفکر للقاری: ۲۱۸، النکت علی کتاب ابن الصلاح: ۱/ ۳۷۷، تدریب الراوی: ۱/ ۱۴۳۔ (م)

[۳] اس بات پر محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ خبر متواتر لفظی ہو یا معنوی دونوں سے قطعی علم حاصل ہو تا ہے، لیکن متنازع فیہ بات یہ ہے کہ کیا صحیح خبر واحد سے ظنی علم حاصل ہو تا ہے یا قطعی؟ اکثر اہل علم، جمہور فقہاء حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور معتزلہ کی رائے یہ ہے کہ خبر واحد مفید علم قطعی نہیں، خواہ کوئی قرینہ موجود ہو یا نہ ہو۔ اس سے علم یقینی حاصل نہیں ہو تا۔ امام محمد بن محمد غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں۔ =

.

....

= " خَبَرُ الْوَاحِدِ لَا يُفِيدُ الْعِلْمَ، وَهُوَ مَعْلُومٌ بِالضَّرُورَةِ فَإِنَّا لَا نُصَدِّقُ بِكُلِّ مَا نَسْمَعُ، وَلَوْ صَدَّقْنَا وَقَدَّرْنَا تَعَارُضَ خَبَرَيْنِ فَكَيْفَ نُصَدِّقُ بِالضِّدَّيْنِ۔" (المستصفی:۱۱٦)
خبر واحد علم یقینی کا فائدہ نہیں دیتا اور یہ بات بالکل واضح ہے، کیونکہ ہم ہر سنی ہوئی بات کی تصدیق نہیں کر سکتے، اگر ہم نے تصدیق کی اور دو خبروں کا تعارض مانا تو ہم ضدین کی تصدیق کیسے کریں گے؟
علامہ عبد العلی انصاریؒ فواتح الرحموت (۳/ ۲۵۲) میں خبر واحد پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔
" الأكثر) من أهل الاصول ومنهم الأئمة الثلاثة (على أن خبر الواحد إن لم يكن) هذا الواحد المخبر (معصوما) نبيا (لا يفيد العلم مطلقا) سواء احتف بالقرائن أوّلا."
اکثر اصولیین اور ائمہ ثلاثہ کی رائے یہ ہے کہ خبر واحد اگر خبر دینے والا نبی نہیں تو یہ مطلقاً مفید علم نہیں، خواہ اس سے قرائن ملحق ہوں یا نہ ہوں۔
بعض اہل علم اور محدثین کرام کی رائے یہ ہے کہ خبر واحد مفید علم ہے، لیکن اس میں تفصیل ہے اور اس میں تین مذہب ہیں:
۱۔ خبر واحد مطلقاً قطعیت کا فائدہ دیتی ہے خواہ شیخین نے اس کی تخریج کی ہو یا نہ کی ہو۔ یہ علامہ ابن طاہر مقدسیؒ کا مذہب ہے۔ اور متقدمین میں امام احمد بن حنبلؒ، حارث بن اسد محاسبیؒ، حسین بن علی کرابیسی، ابو سلیمان اور یہ قول کے مطابق امام مالکؒ کی بھی یہ رائے ہے کہ خبر واحد قطعی ہے اور مفید علم یقینی ہے امام ابن حزمؒ کا بھی یہی نظریہ ہے۔
۲۔ خبر واحد مفید قطعیت ہے، بشرطیکہ اس کی تخریج شیخین یا ان میں سے کسی ایک نے کی ہو۔ یہ علامہ ابن الصلاحؒ کا مذہب ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ یہ استاذ ابو اسحاق اسفرائینی کا بھی نظریہ ہے۔ تاہم امام نوویؒ نے علامہ ابن الصلاحؒ کے اس نظریے پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ محققین اور اکثر اہل علم اس رائے کے خلاف ہیں، انہوں "الارشاد"، "التقریب" اور شرح مسلم میں اس کی تصریح کی ہے۔
۳۔ خبر واحد مفید قطعیت ہے بشرطیکہ کہ صحیحین میں ہو، یا مشہور ہو یا مسلسل بالائمہ ہو۔ یہ حافظ ابن حجرؒ کا مذہب ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ یہ امام الحرمین، امام غزالیؒ، امام رازیؒ، علامہ سیف الدین آمدیؒ اور علامہ ابن حاجب کا بھی نظریہ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: الاحکام فی اصول الاحکام:۱/ ۱۰۸، ۱۱۹، الحسامی:٦٧، قواعد التحدیث:۸۷، الکفایۃ فی علم الروایۃ:۱۸، مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸، التقیید والایضاح:۴۲، ۴۱، النکت علی کتاب ابن الصلاح:۱/ ۳۸۰، ارشاد طلاب الحقائق:۱٦۵، التقریب والتیسیر:۲۸، شرح النووی علی مسلم:۱/ ۲۰، نزہۃ النظر:۴۸۔ (م)

۲۔ خبر واحد مقبول محتف بالقرآئن کی اقسام وانواع:

خبر واحد مقبول محتف بالقرآئن کی متعدد اقسام وانواع میں جن زیادہ مشہور اقسام حسب ذیل ہیں:

(الف)۔ وہ اخبار آحاد جو بخاری اور مسلم میں موجود ہوں، لیکن تواتر کی حد تک نہ پہنچے ہوں، اس قسم کے اخبار درج ذیل قرائن کے حامل ہیں:۔

۱۔ علم الحدیث میں حضرات شیخینؒ کی جلالت اور مرتبہ ومقام۔

۲۔ صحیح احادیث کی تحقیق وتنقیح میں دیگر محدثین کرام رحمہم اللہ کے مقابلے میں ان کی امتیازی حیثیت۔

۳۔ اہل علم کی نگاہوں میں ان دونوں کتابوں کی جلالت شان اور قبولیت ہی افادہ علم کے لیے اس کثرت طرق سے اقوی ہے، جو حد تواتر کو نہیں پہنچ سکی[1]۔

---

[1] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ صحیحین کو علماء امت کی طرف سے تلقی بالقبول کا شرف حاصل ہے اور یہ صرف یہ تلقی بالقبول ہی ان طرق کثیرہ سے مفید علم ہونے میں اقوی ہے جو طرق حد تواتر سے کم ہوں۔ تاہم یہ افادہ اس وقت ہو گا کہ حفاظِ حدیث میں کسی نے اس روایت پر تنقید نہ کی ہو اور دو روایتوں کے مدلول ومفہوم میں ایسا اختلاف نہ ہو کہ خبر کی صداقت میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکے اور صحیحین کی وہ احادیث جن میں جرح وتعارض نہیں ان کی صحت کے تسلیم کرنے پر اجماع ہے۔ اور صحیحین کی احادیث کے مفید علم نظری ہونے پر جن حضرات نے تصریح کی ہے ان میں ابو اسحاق اسفرائینی، ابو عبد اللہ حمیدی اور ابو الفضل بن طاہر ہیں اور یہ احتمال ہے کہ صحیحین کی اس خصوصیت پر اجماع ہوا ہو کہ ان کی احادیث اصح ہیں۔ (نزہۃ النظر: ۵۲-۵۳)

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ حافظ ابن حجرؒ کا نظریہ ہے کہ خبر واحد مفید قطعیت ہے بشرطیکہ کہ صحیحین میں ہو، یا مشہور ہو یا مسلسل بالائمہ ہو۔ لیکن اکثر اہل علم، جمہور فقہاء حنفیہ اور شافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ صحیحین کی وہ روایت جو متواتر نہ ہوں تو یہ مفید علم ظنی ہیں، بلکہ وہ دیگر اخبار آحاد کی طرف ظنی ہیں اور ظنی ہونے میں صحیحین اور دیگر کتب احادیث ترمذی، ابن ماجہ، شرح معانی الآثار اور کتاب الآثار کی روایات یکساں ہیں۔ اس کی تصریح علامہ فارسیؒ نے جواہر الاصول (ص ۳۷) میں، علامہ ابن ہمامؒ نے التحریر (ص ۳۳۲-۳۳۳) میں، علامہ قاسم =

(ب)۔ وہ مشہور حدیث جو مختلف طرق سے مروی ہو اور جملہ طرق رواۃ کے ضعف اور علل سے محفوظ ہوں (۱)۔

(ج)۔ وہ حدیث جو ایسے اعلی درجہ کے حفاظ اور متقن رواۃ سے مروی ہو کہ کسی طبقے میں وہ غریب کے زمرے میں نہ آسکے (۲)۔ جیسے وہ حدیث جس کو امام احمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ سے روایت کریں اور امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک سے روایت کریں اور پھر یہ بھی ہو کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے امام احمد رحمہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے شخص نے بھی اسے روایت کیا ہو اور اس طرح امام مالک رحمہ اللہ

=بن قطلوبغاؒ نے القول المبتکر (ص:۴۲) میں، ملا علی قاریؒ نے شرح شرح نخبۃ الفکر (ص۲۱۸) میں، علامہ ابن امیر حاجؒ نے التقریر والتحریر (ج۲ص۲۷۰) میں، علامہ امیر بادشاہؒ نے تیسیر التحریر (ج۳ص۷۹-۷۸) میں، علامہ ابن نجیمؒ نے فتح الغفار (ص۲ج۸۲) میں، علامہ محب اللہ بہاریؒ نے مسلم الثبوت (ج۲ص۹۰) میں، علامہ بحر العلوم نے فواتح الرحموت (ج۲ص۱۵۱) میں، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مقدمۃ فتح الملہم (ج۱ص۲۲۵) میں، محقق العصر علامہ عبدالرشید نعمانیؒ نے ہامش دراسات اللبیب (ص۳۱۰-۳۳۱) اور علامہ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے ہامش الاجوبۃ الفاضلۃ (ص۲۰۴) میں کی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: دراسات فی اصول الحدیث: ۱۲۷-۱۳۵۔ (م)

(۱) حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

" ثانيها: الخبر المستفيض الوارد من وجوه كثيرة لا مطعن فيها يفيد العلم النظري للمتبحر في هذا الشأن." (النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح: ۱/۳۷۸)

دوسری قسم وہ خبر مستفیض ہے جو کئی طرق سے مروی ہو اور جن پر کوئی طعن نہ ہو تو یہ خبر اس فن کے متبحر کے لیے مفید علم نظری ہے۔ حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے "نزہۃ النظر" اور "النکت" میں متقدمین علماء استاذ ابو اسحاق اسفرائینی، استاذ ابو منصور تمیمی، استاذ ابو بکر بن فورک وغیرہ کے حوالے دیے ہیں۔ (النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح: ۱/۳۷۸)

(۲) حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) نے "النکت" میں اس بات کی وضاحت یوں کی ہے۔

" ثالثها: ما قدمنا نقله عن الأئمة في الخبر إذا تلقته الأمة بالقبول."

(النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح: ۱/۳۷۸)

تیسری قسم جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ائمہ حدیث سے نقل ہو اور اسے تلقی بالقبول کا شرف حاصل ہو۔ (م)

سے امام شافعی رحمہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے شخص نے بھی اسے روایت کیا ہو[1]۔

۳۔ خبر واحد مقبول محتف بالقرائن کا حکم:

خبر واحد مقبول بالقرآئن دوسری مقبول خبر واحد سے فائق اور راجح ہوتی ہے، یہی وجہ یہی وجہ ہے کہ اگر خبر واحد مقبول محتف بالقرآئن کا خبر واحد مقبول کیساتھ تعارض آجائے تو لا آجائے تولا محالہ خبر واحد محتف بالقرائن کو ترجیح دی جائے گی[2]۔

---

[1] حافظ بن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) اس کے بعد یوں رقم طراز ہیں: ایسی حدیث مفید علم نظری ہو گی، کیونکہ یہ رواۃ اپنی جلالت شان اور قابل قبول اوصاف کی بنا پر جم غفیر کے قائم مقام متصور ہوں گے اور یہ حدیث سامع کو افادہ علم نظری دیں گے اور جس شخص کو حدیث لوگوں کے اخبار سے ادنیٰ سے واقفیت ہو گی وہ کبھی اس روایت میں شک نہ کرے گا، مثلاً: امام مالکؒ نے اس کے سامنے کوئی حدیث بیان کی ہو کہ وہ سچ کہہ رہا ہے اور جب ان کیساتھ اسی درجے کا کوئی اور مل جائے اور سہو کا خدشہ بھی نہ ہو اس کی قوت میں اضافہ ہو جائے گا۔

(نزہۃ النظر: ۵۱)(م)

[2] یہ حافظ ابن حجرؒ کا نظریہ ہے کہ خبر واحد محتف بالقرائن مفید قطعیت ہے، جمہور فقہاء حنفیہ اور شافعیہ کا مذہب نہیں، اس کی تفصیل ما قبل گذر چکی ہے۔(م)

مقصد دوم
خبر مقبول کی معمول بہ اور غیر معمول بہ کے اعتبار سے تقسیم

خبر مقبول کی دو قسمیں ہیں [1]:۔

ا۔ معمول بہ ۲۔ غیر معمول بہ

خبر مقبول کی اس تقسیم پر علوم حدیث کی دو اہم انواع مبنی ہیں:

ا۔ محکم اور مختلف الحدیث ۲۔ ناسخ اور منسوخ

ا۔ محکم اور مختلف الحدیث [2]

ا۔ محکم کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ محکم لغوی تعریف:

لفظ محکم ”أحکم یحکم“ (باب افعال) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے جو ”أتقن“ کے معنی میں ہے، جس کا معنی مضبوط اور پختہ ہونے کے ہیں [3]۔

---

(۱) خبر مقبول کی پہلی تقسیم رواۃ کے اعتبار سے تھی اور یہ تقسیم معمول بہ اور غیر معمول بہ کے لحاظ سے کی گئی ہے، اس طرح چار قسمیں بنتی ہیں:۔

ا۔ محکم ۲۔ مختلف الحدیث ۳۔ ناسخ و منسوخ ۴۔ متوقف فیہ۔

یہ تقسیم حافظ ابن حجرؒ کی ہے، تاہم علامہ ابن الصلاحؒ اوران کے متبعین علامہ نوویؒ، علامہ بدر بن جماعۃؒ اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ نے اس مختلف اسلوب سے ذکر کیا ہے۔(م)

(۲) معرفۃ علوم الحدیث: ۱۲۲ - ۱۲۸، مقدمۃ ابن الصلاح:۳۸۹، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۷۱ - ۵۷۵، التقریب: ۱۵۹ - ۱۶۱، اختصار علوم الحدیث: ۱۷۴ - ۱۷۵، الشذا الفیاح: ۲/ ۴۷۱ - ۴۷۶، المقنع فی علوم الحدیث:۲/ ۴۸۰ - ۴۸۲، فتح المغیث: ۳/ ۷۵ - ۷۸، تدریب الراوي: ۲/ ۱۹۶ - ۲۰۲، وتوضیح الأفکار: ۲/ ۴۲۳ - ۴۲۶.(م)

(۳) لسان العرب:۱۲/۱۴۳۔(م)

(ب)۔ محکم کی اصطلاحی تعریف:

محکم وہ مقبول حدیث ہے کہ اس درجے کی دوسری حدیث اس کے معارض نہ ہو[(۱)]۔
اکثر احادیث محکم کے قبیل سے ہیں اور متعارض احادیث محکم کی بہ نسبت بہت کم ہیں۔

۲۔ مختلف الحدیث کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ مختلف الحدیث کی لغوی تعریف:

مختلف ''اختلاف'' (افتعال) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، ''اختلاف'' اتفاق کی ضد ہے اور مختلف الحدیث سے وہ احادیث مراد ہیں جو ہم تک پہنچیں اور ان میں بعض احادیث معنی اور مفہوم کے اعتبار سے بعض کے مخالف اور معارض ہوں[(۲)]۔

(ب)۔ مختلف الحدیث کی اصطلاحی تعریف:

وہ حدیث مقبول ہے کہ اس درجے کے دوسری حدیث اس کے معارض ہو، تاہم دونوں میں جمع اور تطبیق ممکن ہو[(۳)]۔

اصطلاحی تعریف کا مفہوم یہ ہے کہ وہ صحیح یا حسن حدیث جس کے معارض اس کے مانند مرتبہ اور قوت میں صحیح یا حسن حدیث آجائے اور بظاہر ان دونوں کے معنی میں تناقض ہو، لیکن محققین اہل علم اور ارباب بصیرت ان دونوں میں معقول تطبیق دے کر تعارض کو ختم کر دیں۔

۳۔ مختلف الحدیث کی مثال:

مختلف الحدیث کی مثال یہ حدیث ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَةَ».[(۴)]

---

(۱) شرح نخبۃ الفکر: ص۳۹. (ط)
(۲) المعجم الوسیط: ۲۵۱۔ (م)
(۳) شرح نخبۃ الفکر: ص۳۹. (ط)
(۴) صحیح بخاری (۵/۲۱۷۷، رقم ۵۴۳۸)، صحیح مسلم (۴/۱۷۴۷، رقم ۲۲۲۵)، مسند أحمد (۲/۸، رقم ۴۵۴۴). (م)

”کسی بیماری میں کوئی تعدی نہیں اور نہ ہی پرندوں کے ذریعے کوئی بدشگونی ہے۔“
جب کہ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

«فِرَّ مِنَ المَجْذُومِ[۱] فِرَارَكَ مِنَ الأَسَدِ».[۲]

”کوڑھی کے مریض سے اس طرح بھاگو جس طرح تم شیر سے بھاگتے ہو۔“

اب یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں، مگر بظاہر ان دونوں میں تعارض نظر آتا ہے اس لیے کہ پہلی حدیث میں بیماری کے متعدی ہونے کی نفی ہے اور جب کہ دوسری حدیث میں بیماری کے متعدی ہونے کا اثبات ہے، اب محدثین کرام رحمہم اللہ نے ان دونوں حدیثوں میں کئی طریقوں سے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، یہاں تطبیق کی وہ صورت بیان کرتے ہیں، جس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، جس کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے۔

ان دونوں حدیثوں میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ حدیث میں بیماری کی متعدی ہونے کی نفی وارد ہے، تاہم واقع اور نفس الامر میں بیماری متعدی نہیں ہوتی۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔

«لَا يُعْدِي شَيْءٌ شَيْئًا».[۳]

”کوئی چیز دوسری چیز تک متعدی نہیں ہوتی۔“

اس کی دوسری دلیل وہ واقعہ ہے کہ جس میں ایک دیہاتی شخص رسول اللہ ﷺ کو یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ایک خارشی اونٹ کو تندرست اونٹوں میں چھوڑ دیا جائے تو تندرست اونٹ بھی خارشی ہو جاتے ہیں، یہ سن کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

«فَمَنْ أَعْدَى الأَوَّلَ؟».[۴]

---

[۱] مجذوم کوڑھی کے مریض کو کہتے ہیں، اس مرض میں مریض کے اعضاء خراب ہو کر گرنے لگتے ہیں۔ (ط)

[۲] صحیح بخاري، کتاب الطب: ۱۰/ ۱۵۸، حدیث: ۵۷۰۷. (ط)

[۳] سنن الترمذي، کتاب القدر: ج۴، ص۴۵۰. مسند احمد میں بھی اس حدیث کی تخریج کی گئی ہے۔ (ط)

[۴] صحیح بخاري مع فتح الباري، کتاب الطب: ج۱۰، ص۱۷۱. اس حدیث کی امام مسلم، ابوداؤد اور امام احمد نے بھی تخریج کی ہے۔ (ط)

"اس پہلے اونٹ کو خارش کی بیماری کس نے لگائی تھی؟"

اس قول سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالی ہی نے دوسرے اونٹ خارش کی بیماری لگائی ہے، جس طرح پہلے اونٹ کو لگائی ہے اب رہی دوسری حدیث جس میں کوڑھی کے مریض سے بھاگنے کا حکم ہے، سو اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ حکم سد ذرائع کے طور پر ہے، یعنی یہ بات ممکن ہے کہ جو شخص مجذوم کیساتھ میل جول رکھتا ہو، اگر اتفاق سے تقدیر الہی کے طور پر اسے یہ بیماری لگ جائے تو وہ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ اسے یہ بیماری کوڑھی کیساتھ میل جول کی وجہ سے لگی ہے اور یوں وہ اسی غلط عقیدے کے درست ہونے کو تسلیم کرے اور اس طرح ایک غلط بات مان لینے کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جائے، لہذا امجذوم سے دور رہنے کا حکم ہے، تاکہ کوئی شخص اس اعتقاد فاسد میں مبتلا ہو کر گناہ گار نہ ہو[1]۔

۵۔ دفع تعارض کے اصول و قواعد[2]:

جس شخص کو دو مقبول متعارض احادیث نظر آئیں، اس پر کیا ذمہ داری عائد ہو گی؟ سو ایسے شخص کو درجہ ذیل لائحہ عمل اختیار کرنا ضروری ہے:

(الف)۔ اگر دونوں متعارض حدیثوں میں جمع اور تطبیق ممکن ہو تو تطبیق دے کر ان پر عمل کیا جائے گا۔

(ب)۔ لیکن اگر دونوں میں جمع اور تطبیق ممکن نہ ہو تو درج ذیل اصولوں کی روشنی میں تعارض کو

---

[1] دیکھئے نزہۃ النظر: ۴۷۔(م)

[2] ترجیح کی وجوہ اور اسباب بہت زیادہ ہیں، علامہ حازمیؒ نے اپنی کتاب "الاعتبار" میں اکثر وجوہ مہمہ کو مع امثلہ ذکر کی ہیں، علامہ حازمیؒ پچاس وجوہ ترجیح کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ "ومن ثم وجوہ کثیر لضربنا عن ذکرھا کیلا یطول بہ ھذا المختصر-" (الاعتبار:۱۳)۔

حافظ عراقیؒ نے اس پر اضافہ کیا ہے جس کی تعداد سو سے زیادہ ہے، البتہ انہوں نے تمام وجوہ کو سات صورتوں میں جمع فرما دیا، علامہ شوکانیؒ نے ان میں سے اہم وجوہ کا انتخاب کر کے ۸۹ وجوہ ترجیح کا ذکر کیا ہے، سند کے اعتبار سے ۴۲، متن کے اعتبار س ۲۸، دلالت کے اعتبار سے ۹ اور اسباب خارجیہ کے اعتبار سے ۱۰ کا ذکر کیا ہے۔(ارشاد الفحول:۲۷۶)

دفع کرنے کی کوشش کی جائے گی:

۱۔ اگر اس بات کا علم ہو کہ ان میں سے ایک حدیث ناسخ ہے اور دوسری منسوخ ہے تو منسوخ کو ترک کرکے ناسخ پر عمل کیا جائے۔

۲۔ لیکن اگر یہ معلوم نہ ہوسکے تو دوسری وجوہ ترجیح تلاش کی جائے، جس کی تعداد پچاس سے زائد بتلائی جاتی ہے، پھر راجح پر عمل کرے۔

۳۔ اگر ایک کو دوسرے پر ترجیح بھی نہ دی جاسکے (تاہم ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے) تو ہم دونوں پر عمل کرنے سے اس وقت تک احتراز کریں گے، جب تک کسی ایک کے لیے ترجیح ظاہر نہ ہوجائے[1]۔ *

۶۔ اس فن کی اہمیت اور افادیت:

متعارض احادیث میں جمع اور تطبیق کا فن علوم حدیث میں بے حد اہمیت کا حامل ہے، یہی وجہ ہے کہ اہل علم اس فن کی معرفت کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں، تاہم اس فن میں کمال اور مہارت صرف ان ائمہ کرام کو حاصل ہوتی ہے جو حدیث اور فقہ کے جامع ہوتے ہیں، یا پھر اس کے ماہر وہ اصولین علماء کرام ہوتے ہیں، جو اس فن کے بحر بے کنار میں غواصی کرکے قیمتی اور نایاب علمی موتی نکال لاتے ہیں، علم و عرفان اور فقاہت سے آراستہ یہی وہ طبقہ ہے، جنہیں

---

[1] دیکھئے: تدریب الراوی: ۲/ ۶۵۵۔ (م)

* مذکورہ اسلوب پر دفع تعارض شوافع کا مذہب ہے کہ پہلے جمع اور پھر ترجیح ہوگی جب کہ فقہائے حنفیہ کی دفع تعارض کی ترتیب یہ ہے کہ اگر دو یا زائد حدیثوں میں بظاہر تعارض ہو تو اس تعارض کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے دیکھا جائے گا کہ خود رسول اللہ ﷺ سے ان میں سے کسی ایک کے منسوخ ہونے کی تصریح کی حدیث میں وارد ہے یا نہیں؟ اگر کسی مرفوع میں نسخ کی تصریح ہو تو یہ نسخ منصوص ہے اور باتفاق علماء مقدم ہے، چنانچہ ناسخ پر عمل کیا جائے گا اور منسوخ کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اور اگر نسخ کا کوئی ثبوت نہیں تو پھر ترجیح کا اسلوب اختیار کیا جائے گا، اگر کسی روایت کے لیے کوئی مرجح ہے تو اسے ترجیح دی جائے گی اور مرجوح کو چھوڑ دیا جائے گا اور اگر ترجیح کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو پھر ممکن حد تک دونوں روایتوں میں جمع و تطبیق کی کوشش کی جائے گی۔ اور اگر بالفرض یہ بھی نہ ہوسکے تو پھر نسخ اجتہادی کی صورت کو اختیار کیا جائے گا اور اس کا بھی کوئی سراغ نہ مل سکے تو پھر تساقط کی صورت کو اختیار کیا جائے گا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: الاجوبة والاسئلة للامام الکھنوی: ۱۸۲-۱۹۵۔ (م)

متعارض احادیث کی جمع اور تطبیق میں کوئی دقت اور اشکال پیش نہیں آتا، اگر آتا بھی ہے تو ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے[1]۔

دلائل کے تعارض اور ان میں جمع اور تطبیق کے عمل نے اہل علم کے افکار اور اذہان کو ہمہ وقت مشغول رکھا، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ان حضرات کی علمی صلاحیت قابلیت، دقت فہم اور نکتہ رسی کا ظہور اور ارتقاء بھی اسی علم کے بدولت ہوا ہے جب کہ دوسری طرف اس پر خار وادی میں قدم رکھنے والے نا اہل قسم کے لوگوں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں، جن کی حیثیت اس میدان میں طفل مکتب اور علماء کرام کے بچھائے ہوئے علمی دستر خوان پر طفیلی سے زیادہ نہ تھی۔

۷۔ مختلف الحدیث پر مشہور و معروف تصانیف:

(الف)۔ اختلاف الحدیث، یہ امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ کی تالیف لطیف ہے، امام شافعی رحمہ اللہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

(ب)۔ تاویل مختلف الحدیث، از امام ابن قتیبہ عبد اللہ بن مسلم دینوری رحمہ اللہ۔

(ج)۔ مشکل الآثار، از امام ابو جعفر احمد بن سلامہ طحاوی رحمہ اللہ۔

---

[1] دیکھئے: تدریب الراوی: ۲/ ۶۵۳۔ (م)

۲۔ ناسخ اور منسوخ احادیث[1]

ا۔ نسخ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ نسخ کی لغوی تعریف: لغت میں ”نسخ“ کی دو معانی ہیں:

ا۔ ازالہ، مٹانا اور زائل کر دینا، عربی محاورہ ہے: ”نسخت الشمس الظل“ سورج نے سایہ کو زائل کر دیا۔

۲۔ نقل کرنا، جیسے عربی محاورہ ہے۔ ”نسخت الکتاب“ میں نے کتاب میں جو کچھ تھا اسے لکھ دیا۔ یہ محاورہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کتاب کو حرف بہ حرف نقل کیا جائے۔ اب ”نسخ“ کو ”نسخ“ اس لیے کہتے ہیں کہ ناسخ منسوخ کو زائل کر دیتا ہے، یا ناسخ منسوخ کو ایک اور حکم کی طرف منتقل کر دیتا ہے[2]۔

(ب)۔ نسخ کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں ”نسخ“ شارع کے اپنے پہلے حکم کو دوسرے حکم کے ذریعے زائل کر دینے کو کہتے ہیں، یعنی شارع نے پہلے کوئی حکم دیا پھر بعد میں دوسرا حکم دے کر پہلے حکم کو زائل کر دیا[3]۔

۲۔ فن ناسخ و منسوخ کی اہمیت، دشواری اور اس میدان کے معروف شہسوار:

علم حدیث میں ناسخ اور منسوخ کی معرفت انتہائی اہم ہے، تاہم مشکل اور دشوار ضرور ہے، معروف محدث امام شہاب الدین زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

---

(۱) معرفة علوم الحديث: ۸۵ - ۸۸، مقدمة ابن الصلاح: ۳۸۰، جامع الأصول: ۱/ ۱۴۵ - ۱۵۲، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۵۹ - ۵۶۵، التقريب: ۱۵۷ - ۱۵۸، اختصار علوم الحديث: ۱۶۹ - ۱۷۰، الشذا الفياح: ۲/ ۴۶۰ - ۴۶۶، المقنع في علوم الحديث: ۲/ ۴۵۰ - ۴۶۸، نزهة النظر: ۱۰۵ - ۱۰۶، فتح المغيث: ۳/ ۵۹ - ۶۶، تدريب الراوي: ۲/ ۱۸۹ - ۱۹۲، شرح السيوطي علَى ألفية العراقي: ۱۶۱، فتح الباقي: ۲/ ۲۸۹ - ۲۹۵، توضيح الأفكار: ۲/ ۴۱۶ - ۴۱۹. (م)

(۲) لسان العرب: ۳/ ۶۱، الصحاح: ۱/ ۴۳۳، تاج العروس: ۷/ ۳۳۵۔ (م)

(۳) علوم الحدیث، ص ۲۷۷. (ط)

"أَعْيَا الْفُقَهَاءَ وَأَعْجَزَهُمْ أَنْ يَعْرِفُوا نَاسِخَ حَدِيثِ رَسُولِ الله ﷺ مِنْ مَنْسُوخِهِ." [۱]

"ناسخ احادیث کو منسوخ سے الگ کرنے کے عمل نے فقہاء کرامؒ کو عاجز اور بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔"

ناسخ اور منسوخ کی معرفت اور اس میں مہارت حاصل کرنے والے فقہاء کرامؒ میں امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ سرفہرست ہیں، جن کو اس فن میں ید طولی اور بہت بڑی سبقت حاصل رہی ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کی تبحر علمی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ابن وارہؒ نامی محدث جب مصر سے حصول علم کے لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی خدمت میں زانوئے تلمذ طے کرنے کے لیے حاضر ہوئے، تو امام احمد رحمہ اللہ نے سب سے پہلے ان سے یہ سوال کیا۔ کیا تو نے امام شافعی رحمہ اللہ کی تمام کتابیں قلم بند کرلی ہیں؟ ابن وارہؒ نے کہا نہیں! یہ سن کر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا۔

"فَرَّطْتَ، مَا عَلِمْنَا الْمُجْمَلَ مِنَ الْمُفَسَّرِ، وَلَا نَاسِخَ حَدِيثِ رَسُولِ الله ﷺ مِنْ مَنْسُوخِهِ حَتَّى جَالَسْنَا الشَّافِعِيَّ". [۲]

" تم نے بہت بڑی کوتاہی کی ہے، ہمیں تو مجمل و مفسر اور ناسخ و منسوخ کا علم امام شافعی رحمہ اللہ کی مجلس میں ہی بیٹھ کر حاصل ہوا ہے۔"

۳۔ ناسخ و منسوخ کی معرفت کس طرح حاصل کی جائے؟

ناسخ اور منسوخ حدیث کی معرفت درج ذیل امور میں سے کسی ایک کیساتھ حاصل ہو سکتی ہے:

(الف)۔ خود رسول اللہ ﷺ نے کسی حدیث کے ناسخ یا منسوخ ہونے کی تصریح فرمائی ہو، جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

«نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الآخِرَةَ». [۳]

---

(۱) ناسخ الحدیث ومنسوخہ لابن شاہین:۳، الاعتبار للحازمی:۱۸، مقدمۃ ابن الصلاح:۳۸۰.(م)

(۲) حلیۃ الأولیاء:۹/ ۹۷، الاعتبار للحازمی:۳، مقدمۃ ابن الصلاح:۳۸۱.(م)

(۳) صحیح مسلم، کتاب الأضاحي، حدیث ۳۷.(ط)

”میں نے پہلے تمھیں قبروں کی زیارت سے روکا تھا، اب تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ قبروں کی زیارت کیا کرو۔ اس لیے کہ یہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔“

(ب)۔ کسی صحابی کے قول سے، جس میں نسخ کی صراحت ہو، جیسا کہ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ [۱] کا قول ہے۔

«كَانَ آخِرَ الْأَمْرَيْنِ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ تَرْكُ الْوُضُوءِ مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ». [۲]

”آگ پر پکی ہوئی چیزیں تناول کرنے کی وجہ سے وضوء کرنے یا نہ کرنے کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا آخری عمل یہ تھا کہ آپ ﷺ ایسی چیزوں تناول کرنے کے بعد وضوء نہیں فرماتے۔“

(ج)۔ تاریخ کی معرفت کے ذریعے سے، یعنی دونوں حدیثوں کا وقت معلوم ہو، تاکہ یہ فیصلہ کرنا آسان ہو کہ ان میں سے پہلے عمل کونسا ہے؟ جب کہ سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ [۳] کی مرفوع روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں ایک شخص کو پچھنا لگوانے دیکھا تو ارشاد فرمایا۔

«أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُومُ». [۴]

”پچھنا لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔“

---

[۱] سیدنا جابر بن عبد اللہ بن عمرو بن حرم خزرجی انصاری سلمی رضی اللہ عنہ، ۱۶ قبل از ہجری کو پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی ہیں، باپ بیٹا دونوں صحابی رسول ہیں، ۱۹ غزوات میں شریک ہوئے، آخری عمر میں مسجد نبوی میں ان کا حلقہ درس ہوتا تھا، صحیحین اور دیگر کتب احادیث میں ان سے ۱۵۴۰ روایات مروی ہیں۔ ۷۸ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:۱/۲۱۹، اسد الغابۃ:۱/۴۹۲، الاصابۃ:۱/۵۴۶، سیر اعلام النبلاء:۳/۱۸۹، الاعلام للزرکلی:۲/۱۰۴)(م)

[۲] أبو داود، کتاب الطھارۃ، حدیث ۱۹۲.(ط)

[۳] سیدنا شداد بن اوس بن ثابت خزرجی انصاری، ابو یعلی رضی اللہ عنہ، جلیل القدر صحابی ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے دور خلافت میں حمص کا امیر مقرر کیا تھا، جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو آپ اس منصب کو چھوڑ دیا، آپ انتہائی حلیم و دانا تھا، ان کی مرویات کی تعداد ۵۰ ہے، قدس میں ۵۸ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:۲/۶۹۴، اسد الغابۃ:۲/۶۱۳، الاصابۃ:۳/۲۵۸، سیر اعلام النبلاء:۲/۴۶۰، الاعلام للزرکلی:۳/۱۵۸)(م)

[۴] أبو داود کتاب الصوم، حدیث ۲۳۶۹.(ط)

یہ حدیث سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ [۱] کی اس مرفوع حدیث سے منسوخ ہے۔

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ، وَاحْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ». [۲]

”رسول اللہ ﷺ نے احرام اور روزہ کی حالت میں سینگی لگوائی۔“

سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بعض طرق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث فتح مکہ کی دور کی ہے۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث حجۃ الوداع کی زمانے کی ہے، اس لیے کہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے ظاہر ہے کہ فتح مکہ پہلے اور حجۃ الوداع بعد میں ہے تو بعد والا واقعہ پہلے واقعہ کے لیے ناسخ ہوگا [۳]*۔

(د)۔ اجماع کی دلالت سے۔ جیسے یہ حدیث ہے۔

«مَنْ شَرِبَ الخَمْرَ فَاجْلِدُوهُ، فَإِنْ عَادَ فِي الرَّابِعَةِ فَاقْتُلُوهُ». [۴]

”جو شخص شراب نوشی کرے اس کو کوڑے لگاؤ، حتی کہ اگر چوتھی مرتبہ شراب پیئے تو اسے قتل کردو۔“

---

[۱] سیدنا عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب قرشی ہاشمی، ابو العباس، ۳ قبل از ہجری کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی ہیں، رسول اللہ ﷺ کے چچازاد ہیں، حبر الامۃ اور ترجمان القرآن جیسے القاب سے نوازے گئے، صحیحین اور دیگر کتب احادیث میں ۱۶۶۰ احادیث ان سے منقول ہیں، طائف میں رہائش پذیر تھے اور وہیں ۶۸ھ کو وفات پائی۔ (اسد الغابۃ:۳/ ۲۹۱، الاصابۃ:۲/ ۳۲۰، سیر اعلام النبلاء:۳/ ۳۳۱، وفیات الاعیان:۳/ ۶۲، الاعلام:۴/ ۹۵)(م)

[۲] صحیح بخاري، کتاب الصوم:۴/ ۱۷۴، حدیث ۱۹۳۸. (ط)

[۳] مقدمۃ ابن الصلاح:۳۸۱۔ (م)

* حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ تاریخ سے نسخ کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ متاخر الاسلام کی روایت اگر متقدم الاسلام صحابی کی روایت سے متعارض ہو تو یہ نسخ کے لیے دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ اس نے کسی متقدم الاسلام صحابی سے حدیث سنی ہو اور نام کی فروگذاشت کی وجہ سے حدیث کو رسول اللہ ﷺ کی طرف براہ راست منسوب کر دیا ہو۔ تاہم اگر اس نے یہ تصریح کی ہو کہ یہ حدیث اس نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے تو پھر دلیل نسخ ہو سکتی ہے، بشرطیکہ اس کے پاس کوئی ایسی حدیث محفوظ نہ ہو جس کا تعلق اس کے اسلام لانے سے پہلے سے ہو۔ (نزہۃ النظر:۷۵)(م)

[۴] أبو داود، کتاب الحدود، حدیث ۴۴۸۴. (ط)

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے [1]۔

یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ اجماع نہ خود ناسخ ہوتا ہے اور نہ منسوخ، البتہ ناسخ کی طرف ضرور رہنمائی کرتا ہے [2]۔ *

---

[1] شرح مسلم:۱۱/۳۰۷، تدریب الراوی:۲/٦٤٦۔(م)

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کے متروک العمل ہونے کے متعلق فرماتے ہیں۔

"وَإِنَّمَا كَانَ هَذَا فِي أَوَّلِ الأَمْرِ ثُمَّ نُسِخَ بَعْدُ." (سنن الترمذی:۴/۴۸)

"یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا بعد میں منسوخ ہوا"۔

نیز فرماتے ہیں۔

" وَمِمَّا يُقَوِّي هَذَا مَا رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِنْ أَوْجُهٍ كَثِيرَةٍ أَنَّهُ قَالَ: " لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ: النَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالثَّيِّبُ الزَّانِي، وَالتَّارِكُ لِدِينِهِ."(سنن الترمذی:۴/۴۸)

اوراس کی تقویت اس حدیث سے ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے بہت سندوں سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان شخص جو شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اوراس کا رسول ہوں، کا خون حلال نہیں سوائے تین میں سے کسی ایک وجہ کی بناپر۔ جان کے بدلے جان، شادی شدہ زانی اور دین اسلام چھوڑنے والا انسان۔

قاضی اور مجتہد کے ناسخ و منسوخ کی معرفت ناگزیر ہے اس کے بغیر فیصلوں میں غلطی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، امام حازمیؒ نے لکھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک قاضی کے پاس سے گذرے تو پوچھا:

" أَتَعْرِفُ النَّاسِخَ مِنَ الْمَنْسُوخِ؟ قَالَ: لَا. قَالَ: " هَلَكْتَ وَأَهْلَكْتَ. " (الاعتبار للحازمی:۴)

"تم ناسخ اور منسوخ کے متعلق جانتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: تو ہلاک ہوا اور لوگوں کو بھی ہلاک کیا۔"

[2] مقدمۃ ابن الصلاح:۳۸۳، المستصفی: ۲ / ۱۱٦، البحر المحیط:۴ /۲۱۳، إرشاد الفحول:۱/۳۴۳.(م)

* احادیث میں وجوہ ترجیحات کے حوالے سے طویل مباحث ہیں، حافظ ابو بکر حازمی نے "الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار (۱۱-۲۷)" میں پچاس وجوہ بیان کی ہیں اور حافظ عراقیؒ (م۸۰٦ھ) نے "النکت علی ابن الصلاح" میں سو سے زیادہ بیان کی ہیں، علامہ سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) نے تدریب الراوی (۲/۱۷۸-۱۷۹) میں بھی ان ترجیحات کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد ان ترجیحات کی ایک نئی تقسیم بیان کی ہے اور انہیں سات اقسام میں محدود کیا ہے۔

۱۔ الترجیح بحال الراوی: راوی کی کثرت فقہ الراوی جیسی خصوصیات راوۃ کی کثرت یا فقہ الراوی جیسی خصوصیات کی بناپر ترجیح دینا۔

۲۔ الترجیح بالتحمل: جیسے تحدیث کو عرض پر اور عرض کو کتابت، مناولہ یا وجادہ پر ترجیح دینا۔ =

۴۔ناسخ و منسوخ پر مشہور و معروف تصانیف:

۱۔ الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار، از ابو بکر محمد بن موسی حازمی رحمہ اللہ[1]۔

۲۔ النّاسخ والمنسوخ، از امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ۔

۳۔ تجرید الأحادیث المنسوخۃ، از امام ابن الجوزی رحمہ اللہ[2]۔

= ۳۔ الترجیح بکیفیۃ الراوی: جیسے حکایتِ لفظی کو حکایت معنوی پر ترجیح دینا۔

۴۔ الترجیح بوقت الورود: جیسے مدنی راوی کی حدیث کو مکی راوی کی حدیث پر ترجیح دینا۔

۵۔ الترجیح بلفظ الخبر: جیسے عام کو خاص پر اور حقیقت کو مجاز پر ترجیح دینا۔

۶۔ الترجیح بالحکم: جیسے تحریم پر دلالت کرنے والی حدیث کو اباحت پر دلالت کرنے والی حدیث پر ترجیح دینا۔

۷۔ الترجیح بامر خاص: جیسے ایسی حدیث کی ترجیح جو ظاہر قرآن یا کسی دوسری حدیث کے موافق ہو۔(م)

(۱) محمد بن موسی بن عثمان ابن حازم، ابو بکر، زین الدین، حازمی، ۵۴۸ھ کو پیدا ہوئے، اصل ہمدان کے تھے، حدیث اور رجال کے بہت بڑے عالم تھے، حدیث کے متعلق کئی کتابیں لکھیں، ۵۸۴ھ بغداد میں وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲۱/۱۶۷، شذرات الذہب: ۲/۲۸۲، الاعلام للزرکلی: ۷/۱۱۷)(م)

(۲) عبد الرحمن بن علی بن محمد جوزی، قرشی بغدادی، ابو الفرج، ۵۰۸ھ کو بغداد میں پیدا ہوئے، اپنے دور میں حدیث، تاریخ، تفسیر اور رجال کے متبحر عالم تھے، تین سو کے لگ بھگ کتابیں لکھیں، بغداد کے قصبہ جوز کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے جوزی کہلائے، بغداد ہی میں ۵۹۷ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲۲/۲۵۲، شذرات الذہب: ۵/۱۳۷، الاعلام للزرکلی: ۳/۳۱۶)(م)

مطلب دوم

خبر مردود

مقصد اول: ضعیف کے متعلق

مقصد دوم: وہ خبر جو کسی راوی کے سقوط کی وجہ سے ضعیف ہو۔

مقصد سوم: وہ خبر جو کسی راوی میں طعن کی وجہ سے ضعیف ہو۔

خبر مردود کی تعریف، اقسام اور اس کے رد کے اسباب

ا۔ خبر مردود کی تعریف:

اصطلاح میں خبر مردود اس خبر کو کہتے ہیں، جس کے مضمون اور مدلول کو ترجیح حاصل نہ ہوسکے، اس لیے کہ اس میں کسی خبر کے مقبول ہونے کے لیے جو ضروری شرائط (جو صحیح کی بحث میں گذر چکے ہیں) ہیں، ان میں سے کوئی ایک یا ایک سے زائد شرائط مفقود ہوتی ہیں۔

۲۔ خبر مردود کی اقسام وانواع اور اس کے رد کے اسباب وعلل:

اہل علم نے خبر مردود کی متعدد اقسام اور انواع بیان کیے ہیں[۱] اور ہر ایک قسم کا ایک خاص نام تجویز کیا ہے، لیکن بعض قسمیں ایسی ہیں جن کا کوئی مستقل الگ نام اور عنوان نہیں، بلکہ انہیں عام نام ضعیف کیساتھ موسوم کیے گئے ہیں۔ کسی حدیث کو ناقابل قبول اور مسترد کرنے کے لیے متعدد اسباب اور علل ہیں، تاہم بالجملہ ان تمام اسباب کا مرجع درج ذیل دو سبب ہیں:

ا۔ اسناد میں سقوط ۲۔ راوی پر طعن

مذکورہ دونوں اسباب کے تحت متعدد اقسام اور انواع ہیں، جن پر انشاء اللہ مستقل تین مقاصد میں مفصل بحث کی جائے گی۔ اب ہم ان مقاصد میں من جملہ مقصد اول کو بیان کرتے ہیں، جو ضعیف کے مباحث پر مشتمل ہے، اصطلاح عام میں ضعیف مردود کا دوسرا نام اور عنوان ہے۔

---

[۱] بعض حضرات نے چالیس سے زائد اقسام بیان کی ہیں۔ (ط)

مقصد اول: حدیث ضعیف[1] کا بیان

ا۔ ضعیف کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ ضعیف کی لغوی تعریف:

لغت میں ضعیف "قوی" کے مقابلہ میں آتا ہے، ضعف حسی اور معنوی دونوں طرح کا ہوتا ہے، تاہم یہاں ضعف سے معنوی ضعف مراد ہے[2]۔

(ب)۔ ضعیف کی اصطلاحی تعریف:

ضعیف وہ حدیث ہے، جس میں حسن حدیث کے شرائط میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جائے[3]، معروف عالم علامہ عمر بن معمر بیقونی رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق کتاب "المنظومة............

---

(1) معرفة علوم الحديث: ٥٨، مقدمة ابن الصلاح: ١١، الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع: ٢/ ١٩٢، إرشاد طلاب الحقائق: ١/ ١٥٣، التقريب: ٤٩، الاقتراح: ١٧٧، المنهل الروي: ٣٨، الموقظة: ٣٣، اختصار علوم الحديث: ٤٤، المقنع في علوم الحديث: ١/ ١٠٣، فتح المغيث: ١/ ٩٣، وألفية السيوطي: ١٩ - ٢١، شرح السيوطي على ألفية العراقي ١٤١، فتح الباقي: ١/ ١١١، توضيح الأفكار: ١/ ٢٤٦، ظفر الأماني: ٢٠٦، قواعد التحديث: ١٠٨، توجيه النظر: ٢/ ٥٤٦.(م)

(2) تاج العروس: ٢٤/ ٤٨، لسان العرب: ٩/ ٢٠٣۔(م)

(3) علامہ ابن الصلاحؒ (م ٦٤٣ھ) نے ضعیف کی تعریف یوں کی ہے۔

"كُلُّ حديثٍ لَمْ يَجتمعْ فيهِ صفاتُ الحديثِ الصحيحِ، ولا صفاتُ الحديثِ الحسَنِ – المذكوراتُ فيما تقدَّمَ - فهو حديثٌ ضعيفٌ." (مقدمة ابن الصلاح: ١١٢)

"ضعیف ہر وہ حدیث ہے جس میں حدیث صحیح اور حدیثِ حسن کی مذکورہ صفات (عدالت، ضبط، اتصالِ سند، عدمِ شذوذ، عدمِ علت) جمع نہ ہوں۔"

حافظ بن حجرؒ (م ٨٥٢ھ) نے اس تعریف پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اگر حافظ ابن الصلاحؒ صرف حسن کی صفات کی نفی پر اکتفاء کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا! حافظ ابن حجرؒ (م ٨٥٢ھ) فرماتے ہیں کہ اگر ضعیف کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی مختصر بھی ہوتی اور اس پر کوئی اعتراض بھی وارد نہ ہوتا۔

"كل حديث لم يجتمع فيه صفات القبول-" (النكت على مقدمة ابن الصلاح: ١/ ٤٩١)

ضعیف ہر وہ حدیث ہے جس میں مقبول کی صفات نہ پائی جائیں۔(م)

البیقونیة[1]‘‘میں ضعیف کی تعریف یوں فرماتے ہیں۔

وكُلُّ ما عَنْ رُتبةِ الْحُسْنِ قَصُر فَهْوَ "الضعيفُ" وهوَ أقْسَاماً كُثُرْ

ترجمہ: ہر وہ حدیث جو حسن کے مرتبے تک پہنچے سے قاصر ہو وہ ضعیف ہے، جس کی متعدد اقسام ہیں۔

۲۔ ضعیف احادیث میں فرق مراتب:

جس طرح صحیح احادیث کے مراتب میں باہمی تفاوت پایا جاتا ہے تو اسی طرح ضعیف احادیث میں رواۃ کے ضعف کی شدت اور کمی کے اعتبار سے بھی تفاوت پایا جاتا ہے، لہذا بعض ضعیف، بعض اَضعف، بعض واہی قسم کے اور بعض منکر ہیں، لیکن ان سب میں سے بدترین قسم موضوع ہے۔[2]

۳۔ کمزور ترین اسانید:

صحیح حدیث کی بحث میں یہ بات گذر چکی ہے کہ بعض اہل علم نے کچھ خصوصیات اور مزایا کی بنیاد پر بعض سندوں کو ’’اصح الاسانید‘‘ قرار دیا ہے تو اسی طرح ضعیف حدیث کے ذیل میں بعض محدثین کرامؒ نے کچھ سندوں کو ’’ اوہی الاسانید‘‘ (کمزور ترین اسانید) کہا ہے، معروف امام حاکم نیسابوری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کی ہے اور کمزور ترین اسانید کی ایک خاص تعداد بتلائی ہے[3]، جن میں کچھ اسانید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعتبار سے ہیں اور بعض خاص علاقوں اور شہروں کے اعتبار سے ہیں۔

اب ہم ان کی امام حاکم نیسابوری رحمہ اللہ کی مایہ ناز کتاب ’’معرفۃ علوم الحدیث‘‘ سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں، جو درجہ ذیل ہیں:

(الف)۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک کمزور ترین سند یہ ہے:

---

[1] المنظومۃ البیقونیۃ: ۱۰۔(م)

[2] علوم الحدیث، معرفۃ الموضوع، ص۸۹.(ط) دیکھئے الارشاد: ۷۳، التقریب والتیسیر للنووی: ۵۔(م)

[3] معرفۃ علوم الحدیث، ص۷۱-۷۲.(ط)

صَدَقَةُ الدَّقِيقِيُّ، عَنْ فَرْقَدٍ السَّبَخِيِّ، عَنْ مُرَّةَ الطَّيِّبِ، عَنْ أَبِي بَكْر"[1].

(ب)۔ اہل شام کی کمزور ترین سند:

مُحَمَّدُ بْنُ قَيْسٍ الْمَصْلُوبُ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ زَحْرٍ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ زَيْدٍ، عَنِ الْقَاسِمِ، عَنْ أَبِي أُمَامَةَ.[2].

(ج)۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کمزور ترین سند:

السُّدِّيُّ الصَّغِيرُ مُحَمَّدُ بْنُ مَرْوَانَ، عَنِ الْكَلْبِيِّ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ.[3].

محدث جلیل حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس سند کے متعلق فرماتے ہیں۔

"هَذِهِ سِلْسِلَةُ الْكَذِبِ لَا سِلْسِلَةُ الذَّهَبِ"[4].

یہ سند سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) نہیں، بلکہ سلسلۃ الکذب (جھوٹ کا پلندہ) ہے۔

۴۔ ضعیف حدیث کی مثال:

ضعیف حدیث کی مثال وہ حدیث ہے، جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے حکیم اثرم کے طریق سے روایت کیا ہے کہ حکیم اثرم ابو تمیمہ ہجیمی سے وہ سیدنا ابو ہریرۃ[5] رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

«مَنْ أَتَى حَائِضًا، أَوِ امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا، أَوْ كَاهِنًا، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث، ص ۷۱-۷۲. (ط)

[2] معرفۃ علوم الحدیث، ص ۷۱-۷۲. (ط)

[3] تدریب الراوی: ۱/۱۹۸۔

[4] تدریب الراوي: ج ۱ ص ۱۸۱. (ط)

[5] عبد الرحمن بن صخر دوسی، ابو ہریرہ، ۲۱ قبل از ہجری کو پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی رسول ہیں، غزوہ خیبر کے موقع سن ۷ھ میں اسلام لائے، آپ اور آپ کے والد کے نام میں محدثین ومؤرخین کا شدید اختلاف ہے، ایک جمع غفیر کے نزدیک ان کا نام عبد الرحمن بن صخر ہے، قبیلہ دوس سے تعلق تھا، آپ کی مرویات کی تعداد ۵۳۷۴ ہے، ایک زمانے تک مدینہ اور بحرین کے والی رہے اور مدینہ منورہ میں ہی ۵۹ھ کو وفات پائی۔ (اسد الغابۃ: ۳/۴۵۷، سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۵۷۸، الاصابۃ: ۷/۳۴۸، الاعلام للزرکلی: ۳/۳۰۸)(م)

مُحَمَّدٍ». (۱)

”جس نے حالت حیض میں بیوی کیساتھ صحبت کی یا بیوی کے مقعد میں عمل جنسی کیا اور یا کسی کاہن کے پاس گیا تو اس نے محمد ﷺ پر نازل شدہ شریعت کو جھٹلا دیا۔“

امام ترمذیؒ اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

”لَا نَعْرِفُ هَذَا الحَدِيثَ إِلَّا مِنْ حَدِيثِ حَكِيمٍ الأَثْرَمِ عَنْ أَبِي تَمِيمَةَ الهُجَيْمِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ. “(۲)

”ہم اس حدیث کو "حَكِيم الأَثْرَمِ عَنْ أَبِي تَمِيمَةَ الهُجَيْمِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ" کے طریق ہی سے جانتے ہیں۔“

نیز رقم طراز ہیں۔

"وَضَعَّفَ مُحَمَّدٌ هَذَا الحَدِيثَ مِنْ قِبَلِ إِسْنَادِهِ."(۳).

”امام بخاری رحمہ اللہ نے اسناد کے اعتبار سے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔“

میری رائے یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سند کی اس لیے تضعیف کی ہے کہ اس میں حکیم اثرم ہے، جس کو محدثین کرام رحمہم اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

محدث جلیل حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق ”تقریب التہذیب“میں اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

”فيه لين.“ (۴)

”یہ کمزور راوی ہے۔“

۵۔ ضعیف حدیث کا حکم:

محدثین کرام اور دیگر اہل علم کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ضعیف احادیث اور جن کی سندوں میں

---

(۱) سنن الترمذی:۱/ ۲۴۲، رقم:۱۳۵۔(م)

(۲) سنن الترمذی:۱/ ۲۴۳۔(م)

(۳) ترمذي بمع شرح، ج۱ص۴۱۹-۴۲۰.(ط)

(۴) تقریب التہذیب:۱۷۷، رقم الترجمہ:۱۴۸۱۔(م)

تساہل ہے ان کا ضعف بیان کیے بغیر روایت کرنا دو شرطوں کیساتھ جائز ہے (بخلاف موضوع احادیث کے کہ ان کو روایت کرنا ان کے موضوع ہونے کی وضاحت بغیر جائز نہیں) اور وہ دو شرطیں یہ ہیں۔

(الف)۔ ضعیف احادیث کا تعلق عقائد کیساتھ نہ ہو، جیسے صفات باری تعالی۔

(ب)۔ ضعیف احادیث ایسے احکام شرعیہ سے نہ ہو، جن کا تعلق حلال و حرام کیساتھ ہو[1]۔

یعنی وعظ و نصیحت ترغیب و ترہیب اور قصص و اخبار وغیرہ میں ضعیف احادیث کی روایت کرنا جائز ہے، امام محدث جلیل سفیان ثوری رحمہ اللہ [2]، امام عبد الرحمن بن مہدی [3] رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ضعیف احادیث کے روایت کرنے میں تساہل منقول ہے [4]۔

یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ جب کبھی اس قسم کی حدیث کو سند کے بغیر روایت کرنا پڑ جائے تو یہ نہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث اس طرح روایت کی گئی ہے، یا یہ حدیث ہم تک اس طرح پہنچی ہے، تاکہ ضعیف حدیث جاننے کے باوجود اس کی نسبت یقین اور قطعیت کیساتھ رسول اللہ ﷺ کی طرف نہ ہو جائے [5]۔

٦۔ ضعیف حدیث پر عمل کا حکم:

---

[1] شرح التبصرة والتذکرة للعراقی: ١/ ١٠١. (م)

[2] سفیان بن سعید بن مسروق ثوری، ابو عبد اللہ، امیر المؤمنین فی الحدیث، ٩٧ھ کو کوفہ میں پیدا ہوئے، حفظ واتقان میں ضرب المثل تھے، قبیلہ ثور بن عبد مناۃ سے تعلق ہونے کی وجہ سے ثوری کہلائے، اپنے دور میں بہت بڑے محدث، فقیہ، مجتہد اور متقی تھے، ١٤٤ھ کو کوفہ سے حرمین منتقل ہوئے، ایک وقت تک یہی رہے پھر بصرہ منتقل ہوئے اور وہیں ١٦١ھ میں وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ٦/ ٣٧١، التاریخ الکبیر: ٤/ ٩٤، سیر اعلام النبلاء: ٧/ ٢٩٩، وفیات الاعیان: ١/ ٢٥، الاعلام للزرکلی: ٣/ ١٠٤)

[3] عبد الرحمن بن مہدی بن حسان عنبری بصری لؤلؤی، ابو سعید، ١٣٥ھ کو بصرہ میں پیدا ہوئے، حدیث اور رجال کے امام تھے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عبد الرحمن بن مہدی بے نظیر عالم تھے، بغداد میں درس حدیث دیتے تھے، ١٩٨ھ کو بصرہ ہی میں وفات پائی۔ (التاریخ الکبیر: ٥/ ٢٥٤، تذکرة الحفاظ: ١/ ٣٢٩، سیر اعلام النبلاء: ٩/ ١٩٢، الاعلام للزرکلی: ٣/ ٣٣٩)(م)

[4] دیکھئے: علوم الحدیث ص ٩٩، الکفایة: باب التشدد في أحادیث الأحکام والتجوُّز في فضائل الأعمال: ١٣٣-١٣٤. (ط)

[5] أصول الحدیث ومصطلحه: ٣٥٣-٣٥٤. (م)

ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے، جمہور محدثین کرام رحمہم اللہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف احادیث پر عمل کرنا جائز ہے، تاہم اس کے لیے تین شرائط ہیں، جن کی وضاحت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یوں کی ہے[1]۔

(الف)۔ ضعیف حدیث کا ضعف شدید نہ ہو۔

(ب)۔ وہ حدیث کسی ایسے اصل اور شرعی قاعدے کے تحت آتی ہو، جس پر عمل ہو رہا ہے۔

(ج)۔ ضعیف حدیث پر عمل کرتے وقت یہ اعتقاد نہ ہو کہ یہ عمل شریعت سے ثابت ہے، بلکہ یہ اعتقاد ہو کہ احتیاط کا یہی تقاضا ہے[2]۔

---

[1] دیکھئے: تدریب الراوي ج۱، ص۲۹۸-۲۹۹، فتح المغیث ج۱، ص۲۶۸. (ط)

[2] ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے متعلق محدثین کی مختلف آراء ہیں: ایک رائے یہ ہے کہ ضعیف حدیث مطلقاً قابل عمل ہے، ایک قول یہ ہے کہ فضائل اعمال میں چند شروط کیساتھ قابل عمل ہے اور ایک مذہب یہ ہے کہ مطلقاً نا قابل عمل ہے، تفصیل حسب ذیل ہے:

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ حدیث ضعیف مطلقاً قابل عمل ہے اور اسے تمام دینی امور میں قبول کیا جائے گا، بشرطیکہ اس کے سوا کوئی اور حدیث موجود نہ ہو جو صالح للعمل ہو۔ یہ امام احمدؒ اور امام ابو داوُدؒ کی رائے ہے، ان کے پیش نظر یہ اصول ہے کہ ضعیف حدیث میں اصابت کا احتمال ہوتا ہے اس لیے اگر اس کے معارض کوئی شئ نہیں تو اس کی اصابت کا پہلو قوی ہو جاتا ہے، بعض اہل علم کہتے ہیں کہ ان حضرات کے نزدیک ضعیف سے حسن مراد ہے، اس لیے کہ ان کے زمانے میں حدیث کی صرف دو ہی قسمیں ہوتی تھیں: صحیح اور ضعیف۔ اور جو حدیث صحیح کے درجہ سے گر جاتی تو اسے بھی ضعیف کے زمرے میں شامل کر دیتے۔ حافظ ابن قیمؒ (م ۷۵۱ھ) امام احمدؒ کی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وَهُوَ الَّذِي رَجَّحَهُ عَلَى الْقِيَاسِ، وَلَيْسَ الْمُرَادُ بِالضَّعِيفِ عِنْدَهُ الْبَاطِلَ وَلَا الْمُنْكَرَ وَلَا مَا فِي رِوَايَتِهِ مُتَّهَمٌ بِحَيْثُ لَا يَسُوغُ الذَّهَابُ إِلَيْهِ فَالْعَمَلُ بِهِ؛ بَلْ الْحَدِيثُ الضَّعِيفُ عِنْدَهُ قَسِيمُ الصَّحِيحِ وَقِسْمٌ مِنْ أَقْسَامِ الْحَسَنِ، وَلَمْ يَكُنْ يُقَسِّمُ الْحَدِيثَ إِلَى صَحِيحٍ وَحَسَنٍ وَضَعِيفٍ، بَلْ إِلَى صَحِيحٍ وَضَعِيفٍ، وَلِلضَّعِيفِ عِنْدَهُ مَرَاتِبُ، فَإِذَا لَمْ يَجِدْ فِي الْبَابِ أَثَرًا يَدْفَعُهُ وَلَا قَوْلَ صَاحِبٍ، وَلَا إِجْمَاعَ عَلَى خِلَافِهِ كَانَ الْعَمَلُ بِهِ عِنْدَهُ أَوْلَى مِنْ الْقِيَاسِ وَلَيْسَ أَحَدٌ =

= مِنْ الْأَئِمَّةِ إِلَّا وَهُوَ مُوَافِقُهُ عَلَى هَذَا الْأَصْلِ مِنْ حَيْثُ الْجُمْلَةُ، فَإِنَّهُ مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ إِلَّا وَقَدْ قَدَّمَ الْحَدِيثَ الضَّعِيفَ عَلَى الْقِيَاسِ. " (اعلام الموقعین عن رب العالمین:۱/۲۵-۲۶)

"امام احمدؒ ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک ضعیف حدیث سے مراد نہ باطل ہے، نہ منکر اور نہ ہی وہ روایات ہیں جن میں متہم بالکذب راوی موجود ہوں، بلکہ ان کے نزدیک ضعیف صحیح کی قسیم اور حسن کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، اس وقت حدیث کو صحیح، حسن اور ضعیف میں تقسیم نہیں کیا جاتا تھا بلکہ فقط صحیح اور ضعیف میں تقسیم کیا جاتا تھا اور ضعیف کے ان کے نزدیک مراتب ہوتے تھے، اگر اس باب میں کوئی اثر اور کوئی صحابی کا قول نہ ملتا اور اس کے خلاف کوئی اجماع بھی موجود نہ ہو تا تو ان کے نزدیک اس پر عمل کرنا قیاس سے اولی تھا، ائمہ میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس اصول سے من حیث الجملہ موافقت نہ رکھتا ہو، چونکہ آپ بھی ان ائمہ میں سے ایک تھے، لہذا آپ بھی ضعیف حدیث کو قیاس پر مقدم رکھتے تھے۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ(م۷۲۸ھ) نے "منہاج السنۃ(۲/۱۹۱)" میں، علامہ ابراہیم بن موسی غرناطی شاطبیؒ (۷۹۰ھ) نے "الاعتصام(۲/۱۶)" میں، حافظ زین الدین عراقیؒ(م۸۰۶ھ) نے مقدمۃ ابن الصلاح کی شرح "التقیید والایضاح(۱۴۴)" میں، علامہ ابن علانؒ نے "شرح الاذکار للنووی(۱/۸۶)" اور بعض متاخرین نے ان ہی حضرات کی اتباع میں یہی بات کہی ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک ضعیف سے حسن مراد ہے، لیکن یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ حسن کی اصطلاح امام ترمذیؒ کی ایجاد نہیں، بلکہ یہ اصطلاح متقدمین امام علی بن مدینیؒ(م۲۳۴ھ)، امام احمد بن حنبلؒ(م۲۴۱ھ)، امام مالک بن انسؒ(م۱۷۹ھ)، امام محمد بن ادریس شافعیؒ (م۲۰۴ھ) اور امام یحیی بن معینؒ (م۲۳۴ھ) وغیرہ کے ہاں بھی مستعمل تھی۔

جمہور علماء کے نزدیک فضائل اعمال، جیسے مستحبات و مکروہات وغیرہ میں ضعیف حدیث پر عمل جائز ہے، امام نوویؒ(م۶۷۶ھ) نے اس پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

" قال العلماءُ من المحدّثين والفقهاء وغيرهم: يجوز ويُستحبّ العمل في الفضائل والترغيب والترهيب بالحديث الضعيف ما لم يكن موضوعاً. وأما الأحكام، كالحلال والحرام والبيع والنكاح والطلاق وغير ذلك؛ فلا يُعْمَل فيها إلا بالحديث الصحيح أو الحسن إلا أن يكون في احتياطٍ في شيء من ذلك، كما إذا وردَ حديثٌ ضعيفٌ بكراهة بعض البيوع أو الأنكحة، فإن المستحبَّ أن يتنزّه عنه، ولكن لا يجب. "(الاذکار:۳۶)

"محدثین، فقہاء اور اہل علم فرماتے ہیں کہ فضائل اور ترغیب وترہیب میں حدیث ضعیف پر عمل جائز اور مستحب ہے، بشرطیکہ وہ موضوع نہ ہو، جہاں تک حلال وحرام، بیع اور نکاح وطلاق وغیرہ جیسے =

۷۔ ضعیف احادیث پر مشہور و معروف تصانیف:

وہ مشہور تصانیف جس میں ضعیف احادیث بکثرت پائی جاتی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں:

(الف)۔ وہ کتابیں جو صرف ضعفاء پر لکھی گئیں ہیں، جیسے امام ابن حبان رحمہ اللہ کی کتاب "الضعفاء" ہے اور امام ذہبیؒ کی "میزان الاعتدال" ہے، ان دونوں کتابوں میں ان کے مؤلفین نے ان ضعیف احادیث کی مثالیں ذکر کی ہیں، جو اپنے رواۃ کی وجہ سے ضعیف ہیں۔

(ب)۔ وہ کتابیں جن میں ضعیف احادیث کی کسی خاص نوع کو جمع کیا گیا ہے، جیسے وہ کتابیں جن میں مراسیل، معلل اور مدرج وغیرہ احادیث مذکور ہیں، چند کتب یہ ہیں:

= احکام کا تعلق ہے تو ان میں حدیث صحیح اور حسن کے بغیر عمل نہیں کیا جائے گا، الا یہ کہ اس میں کسی معاملے میں احتیاط مطلوب ہو، جیسے اگر بعض بیوع اور نکاحوں کی کراہت کے بارے میں کوئی ضعیف حدیث ہو تو مستحب یہ ہے کہ اس سے بچا جائے لیکن واجب نہیں۔"

علامہ شہاب الدین ابن حجر ہیتمیؒ (م ۹۷۴ھ) نے فضائل اعمال کے سلسلے میں حدیث ضعیف پر عمل کے لیے دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وقد اتفق العلماء على جواز العمل بالحديث الضعيف في فضائل الأعمال) لأنه إن كان صحيحًا في نفس الأمر. فقد أعطي حقه من العمل به، وإلَّا.. لم يترتب على العمل به مفسدة تحليلٍ ولا تحريم، ولا ضياع حقٍّ للغير." (الفتح المبین بشرح الاربعین:۱۰۹)

"فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کے جواز پر اہل علم کا اتفاق ہے اس لیے کہ اگر یہ حقیقت میں صحیح ہے تو اس پر عمل کرنے سے اس کا حق ملا اور اگر صحیح نہیں ہے تو اس پر عمل کرنے سے حلال اور حرام بنانے اور دوسرے کے حق کو ضائع کرنے کا خطرہ نہیں ہے۔"

حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے سلسلے میں یہ رائے محتاط اور معتدل متصور ہوتی ہے اور اکثر اہل علم کا یہی موقف ہے۔

بعض محدثین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل مطلقاً ناجائز ہے، خواہ حلال و حرام ہوں یا فضائل اعمال۔ یہ رائے قاضی ابو بکر بن العربیؒ (م ۵۴۳ھ)، امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ)، امام مسلمؒ (م ۲۶۱ھ)، یحیی بن معینؒ (م ۲۳۳ھ)، ابن حزمؒ (م ۴۵۶ھ)، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ)، خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) اور علامہ شوکانیؒ (م ۱۲۵۰ھ) وغیرہ حضرات کا ہے۔ علامہ عبد الحی لکھنویؒ (م ۱۳۰۴ھ) کا دعوی ہے کہ یہ مذہب ضعیف ہے۔ دیکھئے: الاجوبۃ الفاضلۃ:۵۳، مقالات الکوثری:۴۵، تدریب الراوی:۱/ ۳۵۱، قواعد التحدیث:۱۱۳۔ (م)

۱۔ کتاب المراسیل، از امام ابو داؤد سجستانی رحمہ اللہ۔

۲۔ کتاب العلل، از امام دار قطنی رحمہ اللہ۔ [۱]

---

(۱) تدریب الراوی: ۱/ ۱۹۹۔ (م)

مقصد دوم:
سند میں سقوط کی وجہ سے خبر مردود[1] کا بیان

۱۔ سند سے سقوط کا مفہوم:

سند سے سقوط کا مفہوم یہ ہے کہ ایک یا اکثر رواۃ کا سند میں ذکر نہ ہونے کی وجہ سے اسناد کا تسلسل ٹوٹ جائے، خواہ یہ عمداً ہو یا سہواً ہو اور یہ سقوط سند کے شروع سے ہو، یا آخر سے ہو، یا درمیان سے ہو چاہے، سقوط ظاہری ہو، یا خفی ہو، بہر حال ان تمام صورتوں کو سقوط سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ سقوط کی اقسام وانواع:

سند سے سقوط اپنے ظہور اور خفاء کے اعتبار سے دو قسموں پر ہے:

(الف)۔ سقوط ظاہری: یہ وہ سقوط ہے، جس کا علم محدثین کرام اور علوم حدیث میں مشغول رہنے والے سب لوگوں کو ہوتا ہے، اس کی معرفت یوں حاصل ہوتی ہے کہ راوی اور اس کے شیخ کے درمیان ملاقات ثابت نہیں ہوتی اور یہ عدم ملاقات یا اس وجہ سے ہوتی ہے کہ راوی نے اپنے شیخ کا زمانہ نہیں پایا۔ یا زمانہ تو پایا ہے، لیکن اپنے شیخ سے ملاقات نہ ہو۔ اور نہ ہی اس راوی کو اپنے شیخ سے اذن روایت حاصل ہو، اور نہ ہی اس کے پاس "وجادہ"[2] (کوئی تحریر) ہو، اسی وجہ سے

---

[1] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) خبر مردود کی تعریف یوں بیان فرماتے ہیں۔

"وهو الذی لم یرجح صدق المخبربه۔" (نزہۃ النظر: ۴۷)

"خبر مردود وہ ہے جس میں خبر دینے والے کی صداقت راجح نہیں۔"

خبر مقبول میں چونکہ صدق راوی راجح ہوتا ہے اس لیے خبر مردود کے لیے اس کا مرجوح ہونا ضروری ہے۔ (م)

[2] اجازت کبھی راوی کو اس شیخ سے بھی حاصل ہو جاتی ہے جس سے ملاقات نہ ہوئی ہو، اس میں شیخ یہ کہتا ہے کہ میں نے اپنی روایات کی اجازت اپنے دور کے تمام طلبہ حدیث کو دے دی۔ اور وِجادہ اس کو کہتے ہیں کہ راوی کو کسی شیخ کی کتاب ملے جس کے خط کو وہ جانتا ہو تو وہ راوی اس کتاب کے مرویات کو روایت کرے۔ اجازہ اور وجادہ پر تفصیلی گفتگو طرق تحمل اور صیغ اداء کے مباحث میں آئے گی۔ (ط)

بحث و تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ رواۃ کے تاریخی احوال، تاریخ پیدائش، وفیات، طالب علمی کا زمانہ اور علمی اسفار سے آگاہ ہوں۔

محدثین کرام نے مقام سقوط اور ساقط رواۃ کی تعداد کے اعتبار سے سقوط ظاہری کی درج ذیل چار اقسام اور انواع ذکر کی ہیں:

۱۔ معلق ۲۔ مرسل ۳۔ معضل ۴۔ منقطع

(ب)۔ سقوط خفی: یہ وہ سقوط ہے، جس کا ادراک ان محدثین کرام رحمہم اللہ کو ہوتا ہے، جو طرق حدیث اور علل اسانید سے اچھی طرح مطلع ہونے کیساتھ اس فن میں مہارت تامہ اور وسیع تجربہ رکھتے ہوں[1]۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ مدلس ۲۔ مرسل خفی

ذیل میں مذکورہ چھ اقسام پر علی الترتیب مفصل بحث کی جائے گی ملاحظہ ہوں۔

---

(۱) نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۱۰۱۔ (م)

(الف)۔ سقوط ظاہری کے اقسام وانواع:

ا۔حدیث معلق

ا۔ معلق کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ معلق کی لغوی تعریف:

معلق ''علق یُعلق'' سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، عربی محاورہ ہے:''علق الشیء بالشیء'' اس نے ایک شیء کو دوسری شیء کیساتھ مربوط کر دیا، یعنی ایک چیز کیساتھ جوڑ دیا، وابستہ کر دیا اور ٹکایا۔ اس طرح کے سند کو معلق اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اوپر کی جانب سے متصل اور نیچے کی جانب سے منقطع ہوتی ہے، گویا کہ چھت کیساتھ اس کو لٹکا دیا گیا ہے[۱]۔

(ب)۔ معلق اصطلاحی تعریف:

وہ حدیث ہے، جس کے مبدا اسناد سے ایک یا ایک سے زائد راوی پے درپے حذف ہوں۔[۲]

۲۔ تعریف کی تشریح:

مبدا اسناد سے مراد سند کی وہ نچلی جانب ہے جو ہماری طرف ہے، جو مؤلف کتاب کا شیخ ہے اس کو اول سند بھی کہتے ہیں اور اسے مبدا اسناد اس لیے کہتے ہیں کہ حدیث کی قراءت کا آغاز یہی سے کیا جاتا ہے[۳]۔

۳۔ معلق کی چند صورتیں:

---

[۱] المعجم الوسیط:۲/ ۶۲۲۔(م)

[۲] علوم الحدیث، ص ۲۴.(ط)

[۳] معلق اور معضل میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے، کیونکہ معلق کی تعریف میں ہے کہ دو یا زیادہ راوی ساقط ہوں تو یہ معلق کی بعض صورتوں میں پائی جاتی ہے اور چونکہ معلق میں یہ قید ہے کہ مصنف کا تصرف ابتداءِ سند میں ہوتا ہے اس لیے یہ معضل سے مختلف ہے، کیونکہ وہ اس سے اعم ہے، یعنی جب ابتداء سند سے پے درپے دو راوی ساقط ہوں تو یہ معلق بھی ہے اور معضل بھی ہے۔ اگر ابتداء سند سے ایک راوی ساقط ہو تو یہ معلق ہے، لیکن معضل نہیں۔ اور اگر درمیان سند سے پے درپے دو راوی ساقط ہوں تو یہ معضل ہے معلق نہیں۔(نزہۃ النظر:۷۷)(م)

معلق کی متعدد صورتیں ہیں، چند یہ ہیں:

(الف)۔ معلق کی ایک صورت یہ ہے کہ ساری سند کو حذف کر دیا جائے مثلا یوں کہا جائے۔ "قال رسول اللہ ﷺ كذا" رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

(ب)۔ معلق کی دوسری صورت یہ ہے کہ صحابی رضی اللہ عنہ یا صحابی رضی اللہ عنہ اور تابعی کے نام کو چھوڑ کر باقی ساری سند کو حذف کر دیا جائے[1]۔ *

۴۔ حدیث معلق کی مثال:

حدیث معلق کی مثال وہ حدیث ہے، جو امام بخاری رحمہ اللہ نے "بَابُ مَا يُذْكَرُ فِي الفَخِذِ" کے مقدمہ میں ذکر کی ہے، امام بخاریؒ فرماتے ہیں۔

"وَقَالَ أَبُو مُوسَى: «غَطَّى النَّبِيُّ ﷺ رُكْبَتَيْهِ حِينَ دَخَلَ عُثْمَانُ»".[2]

"سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ[3] جب حجرہ مبارکہ میں تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی رانوں کو ڈھانک لیا۔"

اب یہ حدیث معلق ہے اس لیے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صرف صحابی سیدنا ابو موسی اشعری

---

(۱) شرح النخبۃ ص ۴۲. (ط)

* معلق کی ایک صورت یہ ہے کہ مصنف اس شخص کا نام حذف کر دے جس سے اس نے حدیث سنی ہے اور اس سے اوپر والے راوی سے روایت منسوب کر دے، اگر اوپر والا شخص مصنف کا شیخ ہے تو اس کے معلق ہونے میں اختلاف ہے: صحیح قول یہ ہے کہ اگر استقراء (استقراء سے مراد راوی کی سیرت اور اس کی مرویات کا مطالعہ ہے) یا نص (نص سے مراد ائمہ حدیث میں کسی امام کا بیان ہے) سے یہ معلوم ہو جائے کہ مصنف مدلس ہے تو حدیث مدلس ہو گی ورنہ معلق ہو گی۔ (نزہۃ النظر: ۹۷) (م)

(۲) صحیح بخاري، کتاب الصلاۃ ج ۱ ص ۹۰. (ط)

(۳) سیدنا عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہ، امیر المؤمنین، ذوالنورین رضی اللہ عنہ: ۴۷ قبل از ہجری مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی ہیں، خلیفہ سوم اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، آپ کا تعلق اس معززین قریش سے ہے جن کی وجہ سے اسلام کو ترقی ملی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے وفات کے بعد ۲۳ھ میں آپ کو خلیفہ نامزد کیا گیا، آپ کے دور خلافت میں ارمینہ، قوقاز، خراسان، کرمان، سجستان، افریقیہ اور قبرص وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے، آپ سے ۱۴۶ احادیث مروی ہیں، مدینہ منورہ میں ۳۵ھ میں آپ کو شہید کیا گیا۔ (الاستیعاب: ۳/ ۱۰۳۷، اسد الغابۃ: ۳/ ۵۷۸، الاصابۃ: ۴/ ۳۷۷، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۲۱۰) (م)

رضی اللہ عنہ[۱] کو چھوڑ کر باقی ساری سند حذف کر دی۔

۵۔ حدیث معلق کا حکم:

معلق حدیث نا قابل قبول اور مردود ہوتی ہے، کیونکہ اس میں صحت حدیث کی ایک شرط اتصال سند مفقود ہوتی ہے، اس طور پر کہ یہاں سند سے ایک یا ایک سے زائد رواۃ کو حذف کیا جاتا ہے۔ نیز اس میں محذوف راوی کے متعلق ہمیں کوئی علم بھی نہیں ہوتا[۲]۔

۶۔ صحیحین کی تعلیقات کا حکم:

یہ حکم کہ حدیثِ معلق نا قابل قبول ہوتی ہے مطلقِ حدیث معلق کا ہے، تاہم اگر حدیث معلق کسی ایسی کتاب میں پائی جائے، جس میں احادیث صحیحہ کے جمع کرنے کا التزام کیا گیا ہو، جیسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم تو اس قسم معلق احادیث کا حکم خاص ہوتا ہے، جس کا حکم ما قبل صحیح حدیث کے ذیل میں گذر چکا ہے، تاہم یاد دہانی کے لیے دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو۔

(الف)۔ وہ معلق حدیث جو صیغہ جزم اور قطعیت کیساتھ منقول ہو، جیسے ''قَالَ، ذَکَر، حَکی'' وغیرہ تو ایسی صورت میں یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ جس راوی کی طرف اس حدیث کی روایت کی نسبت جارہی ہے، تو اس کی روایت کی بناء پر اس حدیث صحیح کے ہونے کا حکم لگا دیا گیا ہے۔

(ب)۔ وہ معلق حدیث جو صیغہ تمریض (غیر یقینی الفاظ) کیساتھ منقول ہو، جیسے: ''قِیل، ذُکر، حُکی'' وغیرہ تو ایسی صورت میں یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ جس راوی کی طرف اس حدیث کی نسبت کی جارہی ہے، اس روایت کی بناء پر اس حدیث پر صحیح ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے

---

[۱] سیدنا عبداللہ بن قیس بن سلیم بن حضار ابن حرب، ابو موسی رضی اللہ عنہ: قحطان کے قبیلہ اشعر سے تعلق تھا، ۲۱ قبل از ہجری کو زبید (یمن) میں پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی رسول ہیں، پھر مکہ مکرمہ تشریف لائے اور حبشہ کی طرف ہجرت کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں زبید اور عدن کا عامل مقرر کیا تھا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں بصرہ کو گورنر نامزد کیا تھا، ان کے دور میں اصبہان اور اہواز فتح ہوئے، آپ سے ۳۵۵ احادیث مروی ہیں، زندگی کے آخری ایام کوفہ میں گزارے اور وہیں ۴۴ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب: ۳/ ۹۷۹، اسد الغابۃ: ۳/ ۳۶۴، الاصابۃ: ۴/ ۱۸۱، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۱۱۴)(م)

[۲] نزہۃ النظر: ۹۷۔ (م)

گا، بلکہ اس میں صحیح، حسن اور ضعیف تینوں طرح کی حدیثیں ہوں گی، لیکن اس میں انتہائی ضعیف اور واہی قسم کی احادیث نہیں ہو گی، کیونکہ یہ حدیث ایسی کتاب میں مندرج ہے جس کو صحیح کیساتھ موسوم کیا گیا ہے[۱]۔

باقی رہی یہ بات کہ صحیح حدیث کو غیر صحیح سے کیسے الگ کیا جائے گا؟ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ زیر بحث حدیث کی تحقیق اور چھان بین کی جائے اور پھر جو نتیجہ سامنے آئے تو اس کے مطابق اس پر حکم لگایا جائے[۲]۔

---

[۱] علوم الحدیث، ص ۲۴-۲۵. (ط)

[۲] اہل علم نے صحیح بخاری کی تعلیقات پر گفتگو کی ہے اور ان کی متصل اسانید ذکر کی ہیں، اس پر سب سے بہتر کام حافظ ابن حجرؒ نے "تعلیق التعلیق" کے نام سے کیا ہے۔ (ط)

۲۔ حدیث مرسل [۱]

۱۔ مرسل کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

(الف)۔ مرسل کی لغوی تعریف:

مرسل ''أرسل'' باب افعال سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کا معنی ''چھوڑا ہوا'' ہے، گویا ارسال کرنے والے نے اسناد کو چھوڑ دیا ہے اور اسے کسی معین راوی کیساتھ مقید ہی نہیں کیا[۲]۔

(ب)۔ مرسل کی اصطلاحی تعریف:

مرسل وہ حدیث ہے، جس کی سند کے آخر سے تابعی[۳] سے اوپر کا راوی ساقط ہو[۴]۔

۲۔ اصطلاحی تعریف کی تشریح:

مرسل اس حدیث کو کہتے ہیں، جس کی سند سے تابعی کے بعد کا راوی ساقط ہو اور ظاہر بات ہے کہ تابعی سے اوپر کا راوی صحابی رضی اللہ عنہ ہی ہوتا ہے[۵]۔

۳۔ ارسال کی صورت:

---

(۱) معرفة علوم الحديث: ۲۵، مقدمة ابن الصلاح: ۱۲۶، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۶۷ - ۱۷۹، الاقتراح: ۱۹۲، التقريب: ۵۴ - ۵۷، والمنهل الروي: ۴۲، الموقظة: ۳۸، اختصار علوم الحديث: ۴۷، المقنع في علوم الحديث: ۱/ ۱۲۹، شرح التبصرة والتذكرة: ۱/ ۲۵۶، نزهة النظر: ۱۰۹، فتح المغيث: ۱/ ۱۲۸، ألفية السيوطي: ۲۵ - ۲۹، شرح السيوطي على ألفية العراقي: ۱۵۹، فتح الباقي: ۱/ ۱۴۴، توضيح الأفكار: ۱/ ۲۸۳، ظفر الأماني: ۳۴۳، قواعد التحديث: ۱۳۳. (م)

(۲) لسان العرب: ۱۶/ ۲۸۵، المعجم الوسيط: ۱/ ۳۴۴۔ (م)

(۳) تابعی وہ ہے جس نے حالتِ اسلام میں صحابی سے ملاقات کی ہو اور حالت اسلام ہی میں وفات پائی ہو۔ (ط)

(۴) نزهة النظر ص ۴۳. (ط)

(۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ مرسل وہ روایت ہے جس کی سند میں صحابی کا واسطہ ہو اور صحابی کے سقوط کی صورت میں تابعی براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرے۔ گویا ایک تابعی بھی جب قول رسول یا فعل رسول کو کسی صحابی کا حوالہ دیے بغیر بیان کرے تو وہ روایت مرسل ہو گی۔ (م)

محدثین کرام نے ارسال کی یہ صورت بیان کی ہے کہ تابعی خواہ مرتبہ میں چھوٹا ہو، یا بڑا ہو یہ کہے۔"قال رسول اللہ ﷺ كذا"(رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا) یا" فعل كذا" (رسول اللہ ﷺ نے یوں کیا) یا"فعل بحضرته كذا" (آپ ﷺ کی موجودگی میں یہ ہوا) وغیرہ[1]۔

۴۔حدیث مرسل کی مثال:

حدیث مرسل کی مثال وہ روایت ہے، جو امام مسلم نے اپنی صحیح کی"كتاب البيوع" میں ذکر کی ہے۔

"حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ رَافِعٍ، حَدَّثَنَا حُجَيْنُ بْنُ الْمُثَنَّى، حَدَّثَنَا اللَّيْثُ، عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، «أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْمُزَابَنَةِ ". [2]

"مجھے معمر بن رافع نے وہ فرماتے ہیں ہمیں حجین نے، وہ فرماتے ہیں ہمیں لیث نے، انہوں نے ابن شہاب زہری، انہوں نے تابعی جلیل سعید بن مسیب ؒ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ (یعنی درختوں پر گئے ہوئے پھل فروخت کرنے سے) منع فرمایا۔"

اب حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ[3] جلیل القدر تابعی ہیں، انہوں نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے، لیکن اپنے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان واسطہ ذکر نہیں کیا، اس طرح انہوں نے اس حدیث کی سند کے آخری راوی کو ساقط کر دیا ہے، جو تابعی کے بعد ہے، واضح رہے کہ اس سقوط کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ اس میں صحابی کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ اور اس بات کا بھی

---

(۱) نزہۃ النظر:۹۹۔(م)

(۲) مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم بیع الرطب بالتمر إلا في العرايا:۳/ ۱۱۶۸، حدیث ۵۹.(ط)

(۳) سعید بن مسیب بن حزن بن ابی اہب، ۱۳ھ کو پیدا ہوئے، جلیل القدر تابعی ہیں، مدینہ منورہ کے سات بڑے فقہاء میں سے شمار کیے جاتے ہیں، محدث، فقیہ اور عابدہ زائد تھے، زیتون کے تاجر تھے، کسی سے کوئی وظیفہ نہیں لیتے تھے، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کے سب سے بڑے حافظ تھے، ۹۴ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد:۵/ ۱۹، حلیۃ الاولیاء:۲/ ۱۶۱، الاعلام للزرکلی:۳/ ۱۰۲)(م)

احتمال ہوتا ہے کہ صحابی رضی اللہ عنہ کیساتھ تابعی کو بھی ساقط کر دیا جائے۔[1]

۵۔ فقہاء کرامؒ اور اصولیین کے نزدیک مرسل حدیث:

ما قبل میں ہم نے مرسل کی جو تعریف میں ذکر کی ہے، یہ محدثین کرام کے نزدیک ہے، تاہم فقہاء کرامؒ اور اصولیین کے نزدیک مرسل کا مفہوم اس سے عام ہے، ان کی نظر میں منقطع مرسل ہے، خواہ اس کے انقطاع کا سبب کچھ بھی ہو، یعنی چاہے انقطاع سند کے اول میں ہو۔ یا درمیان میں ہو، یا آخر میں ہو، ایک راوی ساقط ہو، یا زیادہ، پے درپے ساقط ہوں، یا متفرق ساقط ہوں اور یہی مذہب خطیب بغدادی رحمہ اللہ کا بھی ہے[2]۔

۶۔ حدیث مرسل کا حکم:

حدیث مرسل اصل میں ضعیف اور ناقابل قبول ہوتی ہے، کیونکہ اس میں صحت حدیث کے شرائط میں سے من جملہ ایک شرط اتصال سند مفقود ہوتی ہے۔ نیز دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ

---

(۱) مذکورہ تفصیل محدثین کرامؒ کے مذہب کے مطابق ہے، محدثین کرامؒ کے ہاں قبول روایت کی پہلی اور بنیادی شرط اتصالِ سند ہے، جس روایت میں کہیں بھی راوی ساقط ہو، جیسے ارسال، انقطاع، اعضال وغیرہ تو یہ روایت کی صحت کو متاثر کر دیتی ہے، تاہم فقہائے حنفیہ کا شرطِ اتصال کے متحقق ہونے اور نہ ہونے میں محدثین کرامؒ کیساتھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں بات بھی یاد رکھیں کہ ائمہ احنافؒ کے نزدیک مرسل روایات کا ان تمام صورتوں پر اطلاق ہوگا جہاں بھی انقطاع پایا جائے گا، اس اعتبار سے محدثین کرامؒ کی مراسیل، معضلات، منقطعات اور معلقات سب فقہائے احناف کے نزدیک مراسیل میں شامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہائے احناف نے اپنی تصانیف میں صحت روایات کو پرکھنے کے لیے انقطاع ظاہر اور انقطاع باطن کی تقسیم کی ہے، انقطاع ظاہر کو ارسال سے تعبیر کرتے ہیں اور انقطاع باطن میں درایتی اصولوں (خلافِ کتاب اللہ، خلاف سنت اور خلاف عموم بلویٰ وغیرہ) کو شامل کرتے ہیں۔

(کنز الاصول:۱۷۱، کشف الاسرار:۳/۵)

فقہائے حنفیہ کے نزدیک ارسال کی بعض صورتوں میں روایت معتبر ہے، جس کی تفصیل یہ ہے: فقہائے حنفیہ کے نزدیک حدیث مرسل دو صورتوں میں مقبول ہے: پہلی صورت یہ ہے کہ اگر حدیثِ مرسل قرونِ ثلاثہ کا ہے تو مقبول ہے کہ تابعی یا تبع تابعی نے ارسال کیا ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اگر مرسل قرونِ ثلاثہ کی نہیں تو پھر دو شرطوں کیساتھ مقبول ہوگی: پہلی شرط یہ ہے کہ مرسِل ثقہ ہو۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ مرسِل ہمیشہ ثقہ سے ہی ارسال کرتا ہو، یعنی اس کی عادت یہ ہو کہ جب بھی راوی حذف کرتا تو ثقہ راوی ہی حذف کرتا ہے۔ (قواعد فی علوم الحدیث:۱۴۶)(م)

(۲) مقدمۃ شرح مسلم للنووی:۱/۵۴۔(م)

اس میں ساقط راوی کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ عین ممکن ہے کہ وہ صحابی نہ ہ بلکہ تابعی ہو تو ایسی صورت میں اس کے ضعیف ہونے کا قوی احتمال ہوتا ہے۔

لیکن محدثین عظامؒ اور فقہاء کرامؒ کا حدیث مرسل کے حکم اور اس سے استدلال کرنے میں اختلاف ہے[١]، اس لیے کہ انقطاع کی یہ قسم سند میں کسی بھی دوسرے انقطاع سے مختلف ہوتی ہے، کیونکہ اس انقطاع میں غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ ساقط ہونے والا راوی صحابی رضی اللہ عنہ ہے اور اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عادل ہیں۔ اس لیے ان کی عدم معرفت صحت حدیث کے لیے مضر نہیں[٢]۔

---

[١] مرسل روایات کے قابل حجت ہونے کی دو بڑی دلیلیں ہیں: ایک یہ کہ صحابہ کرام اور تابعین حضرات نے مرسل روایات کو قبول کیا ہے اور دوسری دلیل عقل ہے، علامہ سیف الدین آمدیؒ (م ٦٣١ھ) نے ان دو دلیلوں کی وضاحت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"مختار قول یہ ہے کہ ثقہ راوی کی مراسیل مطلقاً قابل قبول ہیں، اس کی دلیل اجماع اور عقل دونوں ہیں، جہاں تک اجماع کا تعلق ہے تو صحابہ اور تابعین عادل راوی کی مراسیل کی قبولیت پر متفق ہیں، صحابہ کرام نے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایات کو قبول کیا، اس کے باوجود کہ وہ کثیر الروایت تھے اور اپنی کم عمری کی وجہ سے صرف چار حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی، ایسے ہی سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ہم جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ سب کا سب ہم نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سنا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ تو ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوتا ہے اور کچھ ہمارے دیگر ساتھی صحابہ نے بتایا ہوتا ہے اور تابعین کا معمول روایات میں ارسال کا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک دفعہ اعمشؒ نے ابراہیم نخعیؒ سے کہا کہ آپ میرے سامنے حدیث پوری سند کیساتھ بیان کیا کرو، تو انہوں نے جواب دیا کہ جب میں "حدثنی فلان عن عبداللہ" کہوں تو ایسی روایت میں نے ایک جماعت سے لی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ امام شعبیؒ اور سعید بن مسیبؒ کا ارسال تو محدثین کے ہاں مشہور ہے اور کچھ دیگر حضرات کا ارسال بھی صحابہ اور تابعین کے ہاں معروف تھا اور انہوں نے کبھی اسے ناپسند نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قبولیت ارسال کے متعلق صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے۔ اور مرسل کی حجیت پر عقلی دلیل یہ ہے کہ جب ایک عادل و ثقہ یقین کیساتھ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا تو اس کی روایت قابل قبول ہے، اس لیے کہ وہ علم و یقین کے بغیر یہ کہنے کی جرات نہیں کرے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے فرمایا ہے!!" دیکھئے: الاحکام فی اصول الاحکام: ٢/ ١٢٣-١٢٥۔ (م)

[٢] محدثین کرامؒ اور فقہاء عظامؒ کی تعریفات کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے سامنے اہمیت کے مختلف دائرے ہیں، چونکہ محدثین کے ہاں اصل اہمیت اتصالِ سند ہے، صحت و ضعف کے پیمانوں سے ناپتے ہوئے محدثین نے رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث کا ذکر کیا ہے اور جو روایات اس معیار پر پوری نہیں اترتیں ان کی حیثیت =

الغرض مجموعی طور پر حدیث مرسل کے متعلق علماء کرام کے تین اقوال ہیں:

(الف)۔ جمہور محدثینؒ، اکثر اصولیین اور فقہاء کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حدیث مرسل ضعیف اور ناقابل قبول ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ محذوف راوی کا حال معلوم نہیں ہوتا، جس سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید وہ صحابی رضی اللہ عنہ نہ ہو[1]۔

(ب)۔ امام ابو حنیفہؒ[2]، امام مالکؒ، اور امام احمد بن حنبلؒ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ حدیث صحیح اور قابل حجت ہے، بشرطیکہ ارسال کرنے والا خود بھی ثقہ ہو، اور جس کو سند سے ساقط کر رہا ہو وہ بھی ثقہ ہو۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ ثقہ تابعی کے متعلق یہ بات یقینی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق تب "قال رسول اللہ ﷺ" کہے گا کہ جب اس نے کسی ثقہ راوی سے سنا ہو[3]۔

(ج)۔ امام شافعیؒ اور بعض اہل علم کا مذہب یہ ہے کہ حدیث مرسل چند شرائط کیساتھ مقبول ہے اور یہ شرائط درج ذیل چار ہیں، جن میں اول الذکر تینوں کا تعلق ارسال کرنے والے راوی کیساتھ ہے، جب کہ مؤخر الذکر شرط کا تعلق حدیث مرسل سے ہے۔

۱۔ ارسال کرنے والا اکابر تابعینؒ میں سے ہو۔

= متعین کر کے آنے والی نسلوں کے لیے حدیث سے استفادہ کی راہیں متعین کی ہیں جب کہ فقہاء اور اصولیین کے سامنے استنباط احکام جیسے اہم قانونی و معاشرتی مسئلہ تھے، لہٰذا انہوں نے عدالت کی شرط پر اس روایت کو قبول کرنے کی راہ اختیار کی جس میں انقطاع واقع ہو قرون ثلاثہ گو مشہود بالخیر ہیں ان کی روایات کا وزن مسلم ہے لیکن بعد کے اصحاب حدیث بھی عدالت کی شرط کیساتھ قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ اہمیت کے اسی فرق نے اصطلاحوں کے معانی کا اختلاف بھی پیدا کیا ہے۔ (اصول الحدیث: ۱/ ۳۱۲)(م)

[1] تدریب الراوی: ۱/ ۲۲۲۔(م)

[2] نعمان بن ثابت تیمی، کوفی، ابو حنیفہ: ۸۰ھ میں کوفہ پیدا ہوئے، فقہ حنفی کے مؤسس وبانی ہیں، عظیم فقیہ و مجتہد تھے، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں، صغار صحابہ کے زمانے میں پیدا ہوئے، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ جب کوفہ تشریف لائے تو ان کی ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ان کے مشہور تلامذہ میں امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفر بن ہذیلؒ اور امام حسن بن زیادؒ ہیں۔ ۱۵۰ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ (تاریخ بغداد: ۱۳/ ۳۲۳، وفیات الاعیان: ۵/ ۴۱۵، النجوم الزاہرۃ: ۲/ ۱۲، سیر اعلام النبلاء: ۶/ ۳۹۰، الاعلام للزرکلی: ۸/ ۳۶)

[3] تدریب الراوی: ۱/ ۲۲۳۔(م)

۲۔ جس سے اس نے ارسال کیا ہے اگر اس کا نام لے تو اسے ثقہ قرار دیا جاسکتا ہے، یعنی جب اس سے ساقط راوی کے متعلق سوال کیا جائے تو وہ کسی ثقہ اور معتمد شخص کا نام بتلائے دے۔

۳۔ جب مرسل حدیث کی روایت میں دوسرے ثقہ حفاظ شریک ہو جائیں تو وہ اس کے خلاف روایت نہ کریں، یعنی ارسال کرنے والے کا ضبط ایسا تام ہو کہ حدیث مرسل میں شریک دوسرا ضابط راوی اس کے موافق روایت کرے۔

۴۔ مذکورہ بالا تینوں شرطوں کیساتھ درج ذیل شرائط میں سے ایک شرط بھی پائی جائے۔

(الف)۔ یہ حدیث کسی دوسرے طریق سے "مسند" مروی ہو۔

(ب)۔ یا یہ مرسل حدیث ایک دوسرے طریق سے مروی ہو، لیکن دونوں کے رجال مختلف ہوں۔

(ج)۔ یا یہ مرسل حدیث کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے قول کے موافق ہو۔

(د)۔ یا اکثر اہل علم اس مرسل حدیث کے مقتضی کے مطابق فتوی دیتے ہوں[1]۔[2]

---

[1] دیکھئے الرسالۃ للإمام للشافعي:۴۶۱.(ط)

[2] فقہائے حنفیہ کے نزدیک مرسل کی کیا حیثیت ہے اور اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ اس کے متعلق مختصراً عرض کیا جاتا ہے: مرسل کی حجیت اور دائرہ استدلال کو فقہائے احناف میں امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ (م ۳۸۴ھ) نے خوب بسط و تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

"ہمارے اصحاب کے ہاں صحابہ و تابعین کی مراسیل قابل حجت ہیں اور تبع تابعین کے متعلق بھی میری یہی رائے ہے، بشرطیکہ وہ ثقہ اور عادل راویوں سے ارسال کرنے میں مشہور ہوں۔ جہاں تک قرن رابع کے رواۃ کا ارسال ہے تو میرے فہم کے مطابق ہمارے بعض شیوخ ان کی مراسیل کو قبول نہ کرنے کی رائے رکھتے ہیں، اس لیے کہ وہ ایسے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف براہ راست نسبت کرتے ہیں جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی ہے کہ ان میں جھوٹ عام ہو گا۔ میں ابو بکر جصاص کہتا ہوں کہ جب اکثریت اہل زمانہ کی فساد اور جھوٹ میں ملوث ہے تو پھر اس میں براہ راست نسبت والی روایت کو قبول نہ کیا جائے الا یہ کہ ہم اس راوی کی عدالت، سچائی اور امانت =

....:...

= سے واقف ہوں اور میں نے ابو الحسن کرخیؒ کو تمام زمانہ کے مراسیل کے درمیان فرق کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ باقی رہے عیسیٰ بن ابان تو وہ کہتے ہیں کہ پس جو ہمارے زمانہ میں کسی روایت کو رسول اللہ ﷺ سے مرسل بیان کرے گا، اگر اس کا تعلق ائمہ دین میں سے ہے اور یقیناً اس نے اہل علم سے اس کو روایت کیا ہو گا، اس کی مرسل مقبول ہے جیسا کہ اس کی مسند مقبول ہے اور جس راوی کی مسند اہل علم نے قبول کی ہے اور جب کہ اس کی مرسل کو نہیں لیا تو ہمارے نزدیک اس راوی کی مرسل موقوف ہے۔"

امام ابو بکر جصاصؒ کی عبارت درج ذیل چار نکات پر مشتمل ہے:

۱۔ امام عیسیٰ بن ابانؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرون ثلاثہ کے عادل راویوں کی روایت مقبول ہے اور قرون ثلاثہ کے بعد رواۃ کو دیکھا جائے گا اگر وہ جرح وتعدیل سے واقف ہیں تو ان کی مرسل روایات کو قبول کیا جائے گا اور اگر وہ واقف نہ ہوں تو ان کی روایات ناقابل قبول ہوں گی۔ (کشف الاسرار: ۲/۴۱)

۲۔ امام ابو الحسن کرخیؒ کی رائے یہ ہے کہ عادل راوی کی مرسل روایت کو قبول کرنا چاہیے، خواہ راوی کا تعلق قرون ثلاثہ سے ہو یا مابعد کے زمانہ سے ہو۔ یہ نظریہ ابو الیسر بزدویؒ، علامہ نسفیؒ اور علامہ آمدیؒ کا بھی ہے اور علامہ ابن نجیمؒ نے اس کو راجح قرار دیا ہے۔ (معرفۃ الحجج الشرعیۃ: ۱۲۷، کشف الاسرار: ۲/۴۱، الاحکام: ۲/۱۳۷، فتح الغفار: ۲/۹۶)

۳۔ امام ابو جصاصؒ کا مذہب یہ ہے کہ قرون ثلاثہ کے مراسیل معتبر ہیں، بشرطیکہ راوی کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ وہ ثقہ عادل کے علاوہ سے بھی روایت بیان کرتا ہے، البتہ قرون ثلاثہ کے بعد کے راویوں کا ارسال اس وقت تک معتبر نہیں ہو گا جب تک کہ ہمیں علم نہ ہو جائے کہ راوی صرف عادل اور ثقہ سے بیان کرتا ہے۔ اس رائے کو امام شمس الائمہ سرخسیؒ نے پسند کیا ہے۔ (الفصول فی الاصول: ۲/۳۰، اصول السرخسی: ۱/۳۶۳)

۴۔ بعض فقہائے حنفیہ کی یہ رائے ہے کہ قرون ثلاثہ کے بعد کی مراسیل مطلقاً معتبر نہیں۔ اس رائے کو امام ابو بکر جصاصؒ نے بعض شیوخ سے نقل کیا ہے۔ (الفصول فی الاصول: ۳/۱۴۵)

مذکورہ آراء سے امام ابن ہمامؒ کی رائے مختلف ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"إنه يقبل المرسل إذا اكان المرسِل إماما من أئمة الدين سواء كان من القرون الثلاثة أوبعدها."

(التحریر فی اصول الفقہ: ۲۴۴)

"ہر ایسی خبرِ مرسل کو قبول کیا جائے گا جس کو ائمہ دین میں سے کسی نے ارسال کیا ہو، خواہ اس کا تعلق قرون ثلاثہ سے ہو یا مابعد کے زمانہ سے ہو۔"

یہی رائے علامہ ابن حاجب مالکیؒ اور امام غزالیؒ کی بھی ہے اور بعض متاخرین حنفیہ کا بھی اسی کی طرف رجحان ہے۔ (التقریر والتخبیر: ۲/۲۸۹، تیسیر التحریر: ۳/۱۰۲، مسلم الثبوت: ۲/۱۳۵، مقدمۃ فتح الملہم: ۱/۸۱)

امام بزدویؒ نے مراسیل کی مختلف صورتوں کا حکم بیان کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے:

"ارسال کی پہلی صورت بالاتفاق حجت اور مقبول ہے، اس لیے کہ کم عمر اور کم صحبت صحابہ کرام دوسرے صحابہ کرام =

جب مذکورہ بالا شرائط حدیث مرسل میں متحقق ہو تو اس سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ یہ مرسل حدیث اور اس کی مؤیّد دوسری مرسل حدیث کا مخرج صحیح ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ دونوں احادیث صحیح ہیں، لہذا اب اگر ایک طریق سے کوئی دوسری صحیح حدیث ان دونوں مرسل حدیثوں کے معارض ہو جائے اور ان کی تطبیق مشکل ہو تو ہم ان دونوں کو تعدد طرق کی وجہ سے صحیح پر ترجیح دیں گے ۔الغرض مذکورہ عبارت کا ماحصل درج ذیل مساوات ریاضیہ کے ذریعہ سے یوں سمجھ سکتے ہیں:

۱۔ حدیث مرسل + حدیث مسند = صحیح
۲۔ حدیث مرسل + حدیث مرسل = صحیح
۳۔ حدیث مرسل + قول صحابی = صحیح
۴۔ حدیث مرسل + اکثر علماء کا فتوی = صحیح

۷۔ صحابی رضی اللہ عنہ کی مرسل حدیث:

وہ مرسل حدیث ہے کہ جس کے متعلق صحابی نے یہ خبر دی ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے، یا رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے، لیکن صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے نہ خود سنا ہو۔ اور نہ ہی مشاہدہ کیا ہو، جس کی بظاہر یہ وجوہات ہو سکتی ہیں کہ وہ صحابی رضی اللہ عنہ کم عمر تھے یا بعد میں مسلمان ہوئے اور یا اس موقع پر موجود نہ تھے اور اسی نوعیت کی بہت سی احادیث ہیں، جن کو کم عمر صحابہ جیسے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے[1]۔

= سے روایت نقل کرتے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف براہ راست نسبت کرتے اور اس طرح کی روایات قابل اعتبار ہیں، اس لیے کہ اس میں اگرچہ ارسال کا احتمال موجود ہے، تاہم جس صحابی کی صحبت پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے تو اب اس کا روایت نقل کرنا اس کے براہ راست سماع پر محمول ہو گا، مگر یہ کہ وہ خود اس کی تصریح کرے کہ اس نے کسی دوسرے راوی سے سنا ہے۔
باقی رہا قرنِ ثانی اور قرن ثالث کا ارسال! تو وہ بھی ہمارے ہاں حجت ہے اور مسند روایت سے بڑھ کر ہے، عیسی بن ابانؒ سے ایسے ہی منقول ہے۔ اور قرنِ ثانی اور قرنِ ثالث کے بعد کے ارسال میں اختلاف ہے، بعض مشائخ کا کہنا ہے کہ ہر عادل کا ارسال قبول کیا جائے گا اور بعض دیگر مشائخ کی رائے یہ ہے کہ اس زمانہ کا ارسال قبول نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس زمانے میں فسق پایا جاتا ہے، اس لیے راوی کا وضاحت ضروری ہے، تاہم اگر راوی کی عادت یہ ہے کہ وہ مراسیل کو ثقہ سے روایت کرتا ہے تو پھر وضاحت کی ضرورت نہیں۔" (کنز الاصول:۱۷۱-۱۷۳)
خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمہور اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مراسیل صحابہ حجت و قابل استدلال ہیں اور تابعین و تبع تابعین کے مراسیل بھی قابل اعتبار ہیں، بشرطیکہ کہ مرسِل ثقہ ہو اور اس کے متعلق یہ علم ہو کہ وہ ثقہ راوی سے روایت کرتا ہے۔(م)

[1] تدریب الراوی:۱/ ۲۲۲۔(م)

۸۔مرسل صحابی کا حکم:

جمہور محدثین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ صحابی رضی اللہ عنہم کی مرسل حدیث صحیح اور قابل حجت و استدلال ہے، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تابعین سے روایت کرنا نادر الوجود ہے، البتہ جہاں تابعین سے روایت کی ہے تو اس کی تصریح فرمائی ہے، لیکن جہاں روایت بیان کرتے وقت صراحت نہیں کی اور یوں فرمایا۔"قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم" تو اس میں اصل یہ ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ سے سنا ہوگا اور یہ بات ماقبل گذر چکی ہے کہ سلسلہ اسناد سے کسی صحابی کو حذف کرنا صحت حدیث میں چنداں مضر نہیں[1]۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ صحابی کی مرسل حدیث کا بھی وہی حکم ہے جو غیر صحابی کی مرسل کا حکم ہے، لیکن یہ قول صرف ضعیف نہیں، بلکہ مردود اور ناقابل قبول بھی ہے[2]۔

۹۔مرسل احادیث پر مشہور و معروف تصانیف:

(الف)۔المراسیل از امام ابو داؤد رحمہ اللہ.

(ب)۔المراسیل از امام ابن ابی حاتم[3] رحمہ اللہ.

(ج)۔جامع التحصیل لاحکام المراسیل از حافظ صلاح الدین علائی رحمہ اللہ[4].

---

(۱) المستصفی:۱/۳۴۰، التقریر والتحبیر: ۴/۲۴۶، المدخل إلی مذهب الإمام أحمد:۱ /۱۰۳، شرح التلویح علی التوضیح: ۲ / ۱۵، شرح الکوکب المنیر:۲ / ۵۸۱، التقریب والتیسیر لمعرفة سنن البشیر النذیر:۱/۳، قواعد التحدیث: ۱/ ۱۱۹، فتح المغیث بشرح ألفیة الحدیث:۱ / ۱۲۶.(م)

(۲) تدریب الراوی:۱/۲۲۲،المجموع شرح المهذب: ۱/ ۶۲.(م)

(۳) عبد الرحمن بن محمد ابو حاتم ابن ادریس بن منذر تمیمی، حنظلی، رازی، ابو محمد:"رای"میں ۲۴۰ھ کو پیدا ہوئے ،حدیث، تاریخ، جرح و تعدیل، علل الحدیث اور رجال کے چوٹی کے عالم تھے، اپنے عظیم والد ابو حاتم رازیؒ سے کسب فیض کیا، اور ان کے ہمراہ شام، مصر، اصبہان، اسکندریہ اور بغداد کے اسفار کیے، جرح و تعدیل اور علل الحدیث پر قیمتی کتابیں تصنیف کیں۔۳۲۷ھ کو وفات پائی۔(تذکرۃ الحفاظ:۳/۸۲۹الاعلام:۳/۳۲۴)(م)

(۴) المجموع شرح المهذب:۱/۶۲.(ط)

صلاح الدین ابو سعید خلیل بن کیکلدی علائی ،اپنے وقت کے بہت بڑے حافظ اور محقق تھے،۶۹۴ھ کو دمشق میں پیدا ہوئے اور ۷۶۱ھ کو قدس میں وفات پائی۔(ط)

۳۔ حدیثِ معضل [1]

ا۔ حدیثِ معضل کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

معضل "أعضل" (بابِ افعال) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے جس کے معانی کسی کو عاجز کر دینا، مشکل میں ڈال دینا اور تھکا دینا ہے [2]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

معضل وہ حدیث ہے جس کی سند سے دو یا دو سے زائد رواۃ پے در پے ساقط ہوں [3]۔

۲۔ حدیثِ معضل کی مثال:

حدیث معضل کی مثال وہ حدیث ہے جس کو امام حاکم نیسابوریؒ نے معرفۃ علوم الحدیث میں اپنی سند کیساتھ قعنبی سے روایت کی ہے۔

"عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ، وَكِسْوَتُهُ بِالْمَعْرُوفِ، وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا يُطِيقُ.»" [4]

"امام مالکؒ سے روایت ہے انہیں خبر پہنچی ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنے غلام کو لباس و طعام اپنی استطاعت کے مطابق دو۔ اور اس کی طاقت سے زیادہ کام مت لو۔"

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث: ۳۶، مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۳۵، الإرشاد ۱ / ۱۸۳، التقریب: ۵۹، الاقتراح: ۱۹۲، المنهل الروي: ۴۷، الموقظة: ۴۰، اختصار علوم الحدیث: ۵۱، المقنع في علوم الحدیث: ۱ / ۱۴۵، شرح التبصرة والتذکرة ۱ / ۲۷۳، نزهة النظر: ۱۱۲، فتح المغیث: ۱ / ۱۴۹، ألفیة السیوطي: ۲۴، شرح السیوطي علی ألفیة العراقي: ۱۶۳، فتح الباقي: ۱ / ۱۵۸، توضیح الأفكار: ۱ / ۳۲۳، ظفر الأماني: ۳۵۵، قواعد التحدیث: ۱۳۰. (م)

[2] لسان العرب: ۱۱ / ۴۵۲، تدریب الراوی: ۱ / ۲۴۰۔ (م)

[3] علوم الحدیث ص ۵۹، نخبۃ الفکر ص ۴۴. (ط)

[4] مؤطا مالک: ۲ / ۹۸۰، رقم: ۴۰۔ (م)

امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث امام مالک رحمہ اللہ سے معضل ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں اسے یوں نقل کیا ہے[۱]۔

یہ حدیث اس لیے معضل ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے درمیان پے کے درمیان پے درپے دوراوی ساقط ہیں[۲]۔

ہمیں مؤطا امام مالک کے علاوہ دوسرے مصادر سے معلوم ہوا کہ اس حدیث کی سند سے دوراوی گر چکے ہیں اس کی اصل سند یوں ہے:" عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَجْلَانَ، عَنْ أَبِيهِ،........

---

[۱] معرفۃ علوم الحدیث ص۴۶.(ط)

[۲] امام حاکم نیسابوریؒ (م ۴۰۵ھ) معضل کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" فَقَدْ ذَكَرَ إِمَامُ الْحَدِيثِ عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ الْمَدِينِيُّ، فَمَنْ بَعْدَهُ مِنْ أَئِمَّتِنَا أَنَّ الْمُعْضَلَ مِنَ الرِّوَايَاتِ أَنْ يَكُونَ بَيْنَ الْمُرْسِلِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ أَكْثَرُ مِنْ رَجُلٍ، وَأَنَّهُ غَيْرُ الْمُرْسَلِ، فَإِنَّ الْمَرَاسِيلَ لِلتَّابِعِينَ دُونَ غَيْرِهِمْ." (معرفۃ علوم الحدیث:۳۶)

"امام المحدثین علی ابن المدینیؒ اوراس کے بعد کے ہمارے بعض ائمہ نے ذکر کیاہے کہ معضل وہ روایت ہے جس کی سند میں رسول اللہ ﷺ سے ارسال کرنے والے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک سے زائد راوی ساقط ہوں اور یہ مرسل سے الگ نوع ہے کیونکہ مراسیل کا تعلق صرف تابعین سے ہے۔"

حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں اس کی مثال ایسے ہے جیسے تبع تابعی کہے:" قال رسول اللہ ﷺ " یا تابعی سے نیچے کا کوئی راوی رسول اللہ ﷺ، سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ یا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرے اور درمیان کے واسطوں کا ذکر نہ کرے۔(مقدمۃ ابن الصلاح:۱۳۶)

مزید حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں۔

" قلتُ: وقولُ المصَنِّفينَ مِنَ الفقهاءِ وغيرِهِم: قالَ رسولُ اللهِ ﷺ: كذاوكذا ونحو ذلكَ، كُلُّهُ مِنْ قَبيلِ المعضلِ؛ لِمَا تقدَّمَ. وسمَّاهُ الخطيبُ أبو بكرٍ الحافظُ في بعضِ كلامِهِ مُرْسلاً، وذلكَ عَلَى مَذهَبِ مَنْ يُسَمِّي كُلَّ مَا لا يتَّصِلُ مُرسلاً كَماسبقَ." (مقدمۃ ابن الصلاح:۱۳۸)

"میں ابن الصلاح کہتاہوں کہ فقہاء اور دیگر مصنفین کے قول: قال رسول اللہ ﷺ کذا وکذا" اوراسی طرح کے دیگر کلمات کی حیثیت معضل کی ہے، حافظ ابو بکر خطیبؒ نے اپنے کسی کلام میں اسے مرسل کہاہے اور یہ اس شخص کی رائے کے مطابق ہے جو یہ کہتاہے کہ ہر وہ خبر جو متصل نہیں مرسل ہے۔(م)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ..." (۱)

۳۔ حدیث معضل کا حکم:

محدثین کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ معضل ضعیف حدیث ہوتی ہے، یہ مرسل اور منقطع سے بھی ضعف میں گئی گزری ہوتی ہے (۲) کیونکہ اس کی سند سے ایک سے زائد راوی حذف ہوتے ہیں۔

۴۔ حدیث معضل کا بعض صورتوں میں معلّق کیساتھ اشتراک:

حدیث معضل اور حدیث معلّق میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے ایک صورت میں دونوں جمع ہوتے ہیں اور دو صورتوں میں جمع نہیں ہو سکتے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(الف)۔ حدیث معضل معلّق کیساتھ ایک صورت میں جمع ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب سند کی ابتداء سے دو راوی پے درپے ساقط ہوں تو اس صورت میں بیک وقت ایک حدیث معضل بھی ہے اور معلّق بھی ہے۔

(ب)۔ دو صورتوں میں معضل اور معلّق جمع نہیں ہو سکتے۔

۱۔ جب سند کے درمیان سے دو راوی پے درپے ساقط ہوں تو یہ حدیث معضل ہے، معلّق نہیں۔

۲۔ جب سند کے ابتداء سے ایک راوی ساقط ہو تو یہ معلّق ہے، معضل نہیں (۳)۔

۵۔ معضل احادیث کے مظان ومواقع:

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ معضل، منقطع اور مرسل احادیث درج ذیل کتابوں میں پائی جاتی ہیں (۴):

---

(۱) معرفة علوم الحديث ص ۴۷. (ط)

(۲) الكفاية: ص ۲۱، تدريب الراوي: ج ۱، ص ۲۹۵. (ط)

(۳) نزہۃ النظر: ۷۷۔ (م)

(۴) تدريب الراوي ج ۱، ص ۲۱۴. (ط)

(الف)۔ "کتاب السنن" از امام سعید بن منصورؒ[1]۔
(ب)۔ "مؤلفات ابن ابی الدنیا"[2]۔

---

(۱) سعید بن منصور بن شعبہ خراسانی، مروزی، طالقانی، بلخی، ابو عثمان، جوزجان میں پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم محدث، مفسر اور حافظ حدیث تھے، حصولِ علم کے سلسلے میں اطراف عالم (خراسان، حجاز مقدس، عراق، مصر، شام، جزیرہ وغیرہ) کے دور دراز اسفار کیے، مکہ مکرمہ میں رہائش اختیار کی، مکہ معظمہ ہی میں ۲۲۷ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۵ / ۵۰۲، التاریخ الکبیر: ۳ / ۵۱٦، سیر اعلام النبلاء: ۱۰ / ۵۸٦، شذرات الذہب: ۲ / ٦۲) (م)
(۲) عبد اللہ بن محمد بن عبید بن سفیان، ابن ابی الدنیا، قرشی، اموی، بغدادی، ابو بکر، بغداد میں ۲۰۸ھ کو پیدا ہوئے، بہت بڑے محدث، ادیب، خطیب، واعظ اور متقی تھے، سینکڑوں کتابوں کے مصنف ہیں، عظیم واعظ تھے جب چاہتے لوگوں کو سحر انگیز وعظ سے رُولاتے اور جب چاہیے ہنسا دیتے، بغداد ہی میں ۲۸۱ھ ہی کو وفات پائی۔ (الجرح و التعدیل: ۵ / ۱٦۳، تذکرۃ الحفاظ: ۲ / ٦۷۷، سیر اعلام النبلاء: ۱۳ / ۳۹۷، النجوم الزاہرۃ: ۳ / ۸٦، الاعلام للزرکلی: ۴ / ۱۱۸)(م)

۴۔ حدیث منقطع (۱)

۱۔ منقطع کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

منقطع "انقطاع" (باب انفعال) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، یہ اتصال کی ضد ہے، جس کے معانی "کٹ کر الگ ہو جانا" کے ہے [۲]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

منقطع وہ حدیث ہے، جس کی سند متّصل نہ ہو، خواہ اس کی انقطاع کی جو بھی صورت ہو [۳]۔

۲۔ اصطلاحی تعریف کا مفہوم:

ہر وہ حدیث جس کی سند میں کسی بھی جگہ انقطاع ہو تو وہ منقطع کہلاتی ہے، خواہ یہ انقطاع سند کی شروع میں ہو یا درمیان میں یا آخر میں ہو [۴]، لہٰذا اس تعریف کی بناء پر مرسل، معلّق اور معضل تینوں منقطع کی تعریف میں داخل ہو جاتی ہیں، لیکن اصول حدیث کے متاخرین علماء نے

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۲۷ - ۲۹، مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۳۲، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۸۰ - ۱۸۲، التقریب: ۵۸، الاقتراح: ۱۹۲ - ۱۹۳، المنهل الروي: ۴۶ - ۴۷، الموقظۃ: ۴۰، اختصار علوم الحدیث: ۵۰ - ۵۱، المقنع فی علوم الحدیث: ۱/ ۱۴۱، شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۱/ ۲۷۳، نزهۃ النظر: ۱۱۲، فتح المغیث: ۱/ ۱۴۹، ألفیۃ السیوطي: ۲۴، شرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي: ۱۶۳، فتح الباقي: ۱/ ۱۵۸، توضیح الأفکار: ۱/ ۳۲۳، ظفر الأماني: ۳۵۴ - ۳۵۵، قواعد التحدیث: ۱۳۰. (م)

(۲) لسان العرب: ۸/ ۲۷۶۔ (م)

(۳) التقریب مع التدریب، النوع العاشر: المنقطع، ج۱، ص۲۰۷. (ط)

(۴) منقطع کی تعریف میں محدثین کا اختلاف ہے، متقدمین کے ہاں اس اصطلاح میں توسع ہے جب کہ متاخرین نے اسے محدود کیا ہے، متقدمین کے نزدیک انقطاع عدم اتصال کا نام ہے، اس اعتبار سے یہ ایک عام قسم ہے جو مرسل، معلق، معضل اور مدلس وغیرہ سب کو شامل ہے، حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) اور امام محیی الدین نوویؒ (م۶۷۶ھ) اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"الصَّحِيحُ الَّذِي ذَهَبَ إِلَيْهِ الْفُقَهَاءُ، وَالْخَطِيبُ، وَابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ وَغَيْرُهُمْ مِنَ الْمُحَدِّثِينَ أَنَّ =

منقطع کی ایسی تعریف کی ہے، جس پر مرسل، معلّق اور معضل کی تعریف منطبق نہیں ہوتی اور منقطع کی یہی تعریف متقدمین حضرات کے تعریفات سے بھی معلوم ہوتی ہے [1]۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

" وَأَكْثَرُ مَا يُسْتَعْمَلُ فِي رِوَايَةِ مَنْ دُونَ التَّابِعِيِّ، عَنِ الصَّحَابِيِّ كَمَالِكٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہم. [2]"

منقطع کا اطلاق اکثر اس روایت پر ہوتا ہے جس کو تابعی سے نیچے کے لوگ صحابی سے روایت کریں، جیسے امام مالکؒ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرے۔

= الْمُنْقَطِعَ مَا لَمْ يَتَّصِلْ إِسْنَادُهُ عَلَى أَيِّ وَجْهٍ كَانَ الانْقِطَاعُ."

(ارشاد طلاب الحقائق:١/ ١٨٠، مقدمۃ ابن الصلاح:٥٨)

حافظ ابن کثیرؒ (م ٧٧٤ھ) اور حافظ بدرالدین ابن جماعہؒ (م ٧١١ھ) نے بھی اسی طرح کہا ہے، امام حاکم نیسابوریؒ (٤٠٥ھ) فرماتے ہیں کہ منقطع مرسل سے مختلف ہے اور حفاظ حدیث میں ایسے لوگ کم پائے جاتے ہیں جو ان دونوں کے درمیان فرق کرتے ہیں۔

(اختصار علوم الحدیث:٥٩، المنہل الروی:٤٦، معرفۃ علوم الحدیث:٢٧)

خطیب بغدادیؒ (م ٤٦٣ھ) نے منقطع کے متعلق ایک اور قول بھی نقل کیا ہے۔

" وَقَالَ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ: الْمُنْقَطِعُ مَا رُوِيَ عَنِ التَّابِعِيِّ وَمَنْ دُونَهُ مَوْقُوفًا عَلَيْهِ مِنْ قَوْلِهِ أَوْ فِعْلِهِ." (الکفایۃ:٢١)

"بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ منقطع وہ حدیث ہے جو تابعی یا اس کے نیچے کے راوی سے موقوفاً مروی ہو۔" (م)

[1] متاخرین کے نزدیک منقطع ایک خاص قسم ہے، ان کے نزدیک یہ وہ حدیث ہے جس کے راویوں میں ایک راوی صحابی سے نیچے ایک یا متعدد مواضع سے ساقط ہو، لیکن کسی جگہ پر بھی سقوط ایک سے زیادہ نہ ہو اور سقوط ابتداءِ سند میں نہ ہو۔ (منہج النقد فی علوم الحدیث:٣٢٨)

متاخرین کی یہ تعریف مانع ہے کیونکہ ایک راوی کے سقوط کی شرط سے معضل اور قبل الصحابی کی شرط سے مرسل خارج ہو جائے گی اور ابتداء سند میں عدم سقوط کی شرط سے معلق نکل جائے گی، اس اعتبار سے منقطع ایک منفرد نوع ہو گی۔ (م)

[2] التقریب مع التدریب ج١، ص٢٠٨. (ط)

۳۔ متاخرین علمائے حدیث کے نزدیک منقطع:

متأخرین علمائے حدیث کے نزدیک منقطع وہ حدیث ہے جس کی سند متصل نہ ہو، تاہم اس پر مرسل، معلّق اور معضل کی تعریف صادق نہ آئے، گویا کہ منقطع ایک ایسا عام نام ہے جو انقطاع سند کی ہر صورت کو شامل ہے[1]، لیکن اس سے تین صورتیں مستثنیٰ ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

(الف)۔ سند کے اول سے راوی ساقط ہو۔

(ب)۔ آخر سے راوی ساقط ہو۔

(ج)۔ سند میں کسی بھی جگہ دو راوی پے در پے ساقط ہوں۔

معروف محدث حافظ ابن حجرؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "نخبۃ الفکر" اور اس کی شرح "نزہۃ النظر" میں بھی متأخرین علمائے حدیث کے مذہب کو اختیار کیا ہے[2]۔

۴۔ حدیث منقطع کی مثال:

حدیث منقطع کی مثال وہ حدیث ہے جو عبد الرزاق[3] نے سفیان ثوری سے روایت کی ہے جس کی سند یہ ہے:

---

[1] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) منقطع کی تعریف بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔
"راوی کا سقوط کبھی اس قدر واضح ہوتا ہے کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور کبھی یہ ایسا پوشیدہ ہوتا ہے کہ اس کا علم صرف ان حفاظ حدیث ہی کو ہو سکتا ہے جو طرق حدیث اور اسانید و علل سے خوب واقف ہیں، واضح سقوط کا ادراک راوی اور مروی عنہ کی عدم ملاقات کی معرفت پر ہے، مثلاً: راوی مروی عنہ کا معاصر نہ ہو اور اگر معاصر ہو تو دونوں میں ملاقات ثابت نہ ہو اور اسے اجازت و وجادت حاصل نہ ہو۔ ان امور کا تعلق تاریخ سے ہے، بلاشبہ رواۃ کی پیدائش، وفات، تحصیل علم کا زمانہ، طلب حدیث کے لیے مختلف اسفار وغیرہ کا تذکرہ کتب تاریخ ہی میں ہوتا ہے اس لیے محدثین کے نزدیک علم تاریخ بنیادی اہمیت کا حامل ہے، اس علم کے ذریعے کئی رواۃ کے روایت عن الشیوخ کے دعوے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔" (نزہۃ النظر: ۸۱، اصول الحدیث: ۱/ ۳۹۵) (م)

[2] شرح نخبۃ الفکر: ص ۴۴. (ط)

[3] عبد الرزاق بن ہمام بن نافع حمیری، ابو بکر صنعانی، ۱۲۶ کو پیدا ہوئے، حدیث اور تفسیر کے مایہ ناز عالم تھے، تقریباً سترہ ہزار احادیث زبانی یاد تھیں، صنعاء (یمن) کے باشندے تھے، سفیان بن عیینہؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام یحیی بن معینؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے اساطین علم کے شیخ تھے، مصنف عبد الرزاق آپ کی علمی عظیم یادگار ہے۔ ۲۱۱ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۵/ ۵۴۸، وفیات الاعیان: ۳/ ۲۱۶، سیر اعلام النبلاء: ۹/ ۵۶۳، الاعلام: ۳/ ۳۵۳)

"عَنِ الثَّوْرِيِّ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ زَيْدِ بْنِ يُثَيْعٍ عَنْ حُذَيْفَةَ مَرْفُوْعاً: إِنْ وَلَّيْتُمُوهَا أَبَا بَكْرٍ فَقَوِيٌّ أَمِينٌ.[1]"

"سفیان ثوری، اَبو اسحاق سے، وہ زید بن یثیع سے وہ سیّدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا نقل کرتے ہیں کہ اگر تم سیّدنا اَبو بکر صدیق رضی اللہ عنہ[2] کو خلیفہ نامزد کرتے ہو تو وہ قوی اور امین ہے اور ہر اعتبار سے موزون ہے۔"

اس حدیث کی سند کے درمیان ایک راوی شریک، سفیان ثوری اور اَبو اسحاق کے درمیان سے ساقط ہوا ہے، اس لیے کہ یہ حدیث سفیان ثوریؒ نے اَبو اسحاقؒ سے بلا واسطہ نہیں سنی، بلکہ شریک سے سنی ہے اور شریک نے اَبو اسحاق سے سنی ہے، اب اس انقطاع پر مرسل، معلّق اور معضل میں سے کسی کی تعریف صادق نہیں آتی، لیکن یہ منقطع ہے[3]۔

۵۔ حدیث منقطع کا حکم

محدثین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حدیث منقطع ضعیف ہے، اس لیے کہ اس میں حدیث مقبول کے من جملہ شرائط میں سے ایک شرط اتصال سند مفقود ہوتا ہے، نیز اس میں محذوف راوی کا حال معلوم نہیں ہوتا۔

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص ۳۶، احمد، بزار اور طبرانی نے اس کی تخریج کی ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۷۶. (ط)

(۲) سیدنا عبد اللہ بن ابی قحافہ عثمان بن عامر ابن کعب تیمی قرشی، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، مکہ مکرمہ میں ۵۱ قبل از ہجری پیدا ہوئے، بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا، جلیل القدر صحابی اور پہلے خلیفہ راشد ہیں، آپ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ کے والد، والدہ، بیوی اور اولاد سب صحابہ ہیں، زمانہ جاہلیت میں نہ بت پرستی کی اور نہ ہی شراب نوشی کی، ان کی مدت خلافت ۲ سال ۳ ماہ ۵ دن ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے بعد آپ نے مرتدین اور مانعین زکوۃ کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ آپ سے ۱۴۲ احادیث مروی ہیں، مدینہ منورہ میں ۱۳ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب: ۳/۹۶۳، اسد الغابۃ: ۳/۳۱۰، الاصابۃ: ۴/۱۴۵، الاعلام للزرکلی: ۴/۱۰۲)(م)

(۳) معرفۃ علوم الحدیث: ۲۸۔ (م)

(ب)۔ سقوط خفی کی اقسام وانواع:

۱۔ حدیث مدلَّس [۱]

۱۔حدیث مدلّس کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مدلَّس ''تدلیس''(مصدر باب تفعیل)سے اسم مفعول کا صیغہ ہے،اور لغت میں ''تدلیس'' گاہک سے سامان کے عیب چھپانے کو کہتے ہیں،اور تدلیس اصل میں ''دَلَسَ'' سے مشتق ہے جس کا معنی ''اندھیرا اور بھانک تاریکی'' ہے،جیسا کہ قاموس میں ہے [۲]،چونکہ تدلیس کرنے والا بھی حدیث کے عیوب کو چھپا کر مخاطب پر معاملہ تاریک کر دیتا ہے،اس قسم حدیث کو ''مدلَّس'' اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی سند کا معاملہ تاریک میں پڑا ہوتا ہے [۳]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں تدلیس،سند کے عیب کو چھپا کر اس کے ظاہر کو بنا سنوار کر کے پیش کرنے کو کہتے ہیں [۴]۔

۲۔اصطلاحی تعریف کا مفہوم:

مدلِّس اسناد کے عیب انقطاع سند کو چھپا لیتا ہے، چنانچہ مدلِّس اپنے شیخ کو سند سے ساقط کر کے شیخ الشیخ سے روایت کرتا ہے،پھر اس ''اسقاط'' کو چھپانے کے لیے مختلف صیغے اختیار کرتا

---

[۱] معرفة علوم الحديث:۱۰۳، الكفاية: ۳۵۵، مقدمة ابن الصلاح:۱۵۶، جامع الأصول: ۱/ ۱٦۷، إرشاد طلاب الحقائق:۱/ ۲۰۵، التقريب:٦۳، الاقتراح:۲۰۹، المنهل الروي:۷۲، الموقظة: ۴۷، اختصار علوم الحديث:۵۳، المقنع في الحديث: ۱/ ۱۵۴، شرح التبصرة والتذكرة: ۱/ ۳۰۳، نزهة النظر:۱۱۳، فتح المغيث:۱/ ۱٦۹، ألفية السيوطي:۳۳، شرح السيوطي على ألفية العراقي:۱۷۳، فتح الباقي: ۱/ ۱۷۹، توضيح الأفكار: ۱/ ۳۴٦، ظفر الأماني:۳۷۳، قواعد التحديث:۱۳۲.(م)

[۲] قاموس ج ۲، ص ۲۲۴.(ط)

[۳] لسان العرب:٦/ ۸٦،لقط الدرر:٦۷،نزهة النظر:۸۲۔(م)

[۴] بيان الوهم والإيهام لأبي الحسن بن القطان.(ط)

ہے اور ظاہرِ سند کو اس انداز میں پیش کر دیتا ہے کہ بظاہر دیکھنے والے کو یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ سند بالکل متصل ہے اور اس میں کسی قسم کا انقطاع اور سقوط نہیں۔

۲۔ تدلیس کی اقسام وانواع:

تدلیس کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

ا۔ تدلیس الاسناد ۲۔ تدلیس الشیوخ

ا۔ تدلیس الاسناد:

محدثین کرام نے تدلیس کی مختلف اور متنوع تعریفیں بیان کی ہیں، تاہم میری نظر میں سب سے زیادہ صحیح اور لطیف تعریف وہ ہے جو امام أبو احمد بن عمرو بزار رحمہ اللہ[1] اور امام أبو الحسن بن قطان[2] نے بیان فرمائی ہے، جو یہ ہے۔

(الف)۔ تدلیس الاسناد کی تعریف:

تدلیس الاسناد یہ ہے کہ راوی اس شیخ سے جس سے پہلے کچھ احادیث سماعت کی ہوں ایسی حدیث روایت کرے جو اس سے نہ سنی ہو اور یہ بھی نہ بتلائے کہ میں نے اس سے یہ حدیث نہیں سنی[3]۔[4]

(ب)۔ اس تعریف کا مفہوم:

---

[1] احمد بن عمرو بن عبد الخالق، ابو بکر بزار، بصرہ کے باشندے تھے، اپنے دور کے بہت بڑے محدث تھے، آخری عمر میں اصبہان، بغداد اور شام میں درس حدیث دیا۔ مسند بزار آپ کی علمی شاہکار ہے، رملہ میں ۲۹۲ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد: ۴/ ۳۳۴، تذکرۃ الحفاظ ۲/ ۶۵۳، سیر اعلام النبلاء: ۱۳/ ۵۵۴، الاعلام: ۱/ ۱۸۹)(م)

[2] علی بن محمد بن عبد الملک کتامی حمیری فاسی، ابو الحسن ابن القطان، قرطبی، ۵۶۲ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محدث اور ناقد تھے، ایک زمانے تک مراکش میں رہے، مراکش میں طلبہ کے منظور نظر تھے، ایک عرصے کے لیے مراکش کو خیر باد کہا اور پھر دوبارہ لوٹ آئے، ایک زمانے تک نے سجلماسہ کے قاضی رہے اور وہیں ۶۴۸ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۴/ ۷/ ۱۴۰، سیر اعلام النبلاء: ۲۲/ ۳۰۶، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۳۳۱)(م)

[3] شرح ألفیۃ العراقي ج۱، ص۱۸۰، منقول از بزار وابو الحسن قطان. (ط)

[4] تدلیس کی یہی تعریف فقہائے حنفیہ میں سے امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ (م ۳۸۴ھ) نے "الفصول فی الاصول: ۲/ ۶۱" میں اور علامہ عبد العزیز بخاری رحمہ اللہ (م ۷۳۰ھ) نے "کشف الاسرار: ۳/ ۱۴۶" میں کی ہے، فقہائے حنفیہ اور محدثین کرام رحمہم اللہ کی تدلیس کی تعریف میں بنیادی کوئی فرق نہیں، تاہم فقہائے حنفیہ تدلیس الاسناد کو تدلیس =

اس تعریف کا مفہوم یہ ہے کہ تدلیس الاسناد کا مطلب یہ ہے کہ ایک شیخ سے راوی نے بعض احادیث سنی ہوں، تاہم یہ حدیث جس میں اس نے تدلیس کی ہے، یہ اس سے نہیں سنی، بلکہ یہ حدیث اس نے کسی دوسرے شیخ سے سنی ہو، اب راوی اس شیخ کو جس سے حدیث تھی اسناد سے ساقط کر کے اس پہلے شیخ سے جس سے یہ حدیث نہیں سنی تھی ایسے الفاظ کیساتھ روایت کرتا ہے جس میں سماع کا احتمال ہے جیسے ''قَالَ'' یا ''عَنْ'' وغیرہ سے روایت کرتا ہے جس سے راوی دوسروں کو یہ تاثر دیتا ہے، کہ اس نے یہ روایت پہلے شیخ سے سنی ہے، لیکن یہ راوی اس بات کی تصریح نہیں کرتا کہ میں نے یہ حدیث پہلے شیخ سے سنی ہے، لہٰذا ''سَمِعْتُ'' (میں نے سنا) یا ''حَدَّثَنِیْ'' (مجھ سے اس نے بیان کیا ہے) وغیرہ الفاظ استعمال نہیں کرتا، تاکہ اس کا شمار کہیں جھوٹے رواۃ میں نہ ہو۔

واضح رہے کہ مدلس جن شیوخ کو سند سے ساقط کرتا ہے وہ ایک یا ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں[1]۔

(ج)۔ تدلیس اور ارسال خفی میں فرق:

امام ابو الحسن ابن قطانؒ تدلیس الاسناد کی تعریف کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

'' تدلیس اور ارسال میں فرق یہ ہے کہ ارسال میں راوی اس شخص سے روایت کرتا ہے، جس

= ہی کہتے ہیں اور تدلیس الشیوخ کو تلبیس کہتے ہیں۔ دیکھئے: کنزالاصول:۱۹۸، اصول السرخسی:۲/۱۰، کشف الاسرار:۲/۸۴، فتح الغفار:۲/۱۰۸۔

واضح رہے کہ فقہائے احناف کے نزدیک تدلیس اور ارسال میں کوئی فرق نہیں اور نہ ہی فقہائے احناف کے نزدیک تدلیس کرنا سبب ردہے اور نہ ہی مدلِس کے حق میں جرح ہے، کیونکہ تدلیس موہم ارسال ہے اور ارسال فقہائے حنفیہ کے ہاں سبب جرح نہیں۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ جب ارسال سبب جرح نہیں تو جو چیز موہم ارسال ہو وہ کیسے سبب جرح ہو گی؟! تدلیس اور ارسال سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ اور سلیمان بن مہران اعمشؒ جیسے اساطین علم نے کیا ہے اور اس کی بنیادی طور پر دو وجہیں تھیں: ایک یہ کہ انہوں نے اختصار کو ملحوظ نظر رکھا، تاکہ سامعین کو مختصر الفاظ میں حدیث سنادیں۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ارسال اور تدلیس اس لیے کی کہ انہوں یقینی طور پر علم تھا کہ حدیث رسول ہے، ان حضرات کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ وہ علو اسناد کی برتری کو ظاہر کریں۔ دیکھئے: الفصول فی الاصول:۲/۶۱، کنزالوصول:۱۹۸، اصول السرخسی:۲/۹-۱۰۔(م)

[1] دیکھئے: معرفۃ علوم الحدیث:۱۰۵۔(م)

سے اس کی سماع ثابت نہ ہو"۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ مدلس اور ارسال خفی کرنے والے میں سے ایک اپنے ایک اپنے شیخ سے وہ روایت کرتا ہے جس کی سماعت اسے حاصل نہ ہو اور نقل روایت میں ایسے میں ایسے الفاظ لاتا ہے جس میں سماع کا احتمال ہوتا ہے، تاہم مدلس نے اس حدیث کے علاوہ دیگر علاوہ دیگر احادیث بھی اپنے شیخ سے سنی ہوتی ہیں، مگر ارسالِ خفی کرنے والے راوی کی اس شیخ اس شیخ سے سماع ثابت ہی نہیں ہوتا، نہ تو ان احادیث میں جن میں ارسال کیا اور نہ اس کے علاوہ کے علاوہ دیگر احادیث میں جس میں ارسال کیا ہی نہیں، البتہ وہ اس شیخ کا معاصر ہوتا ہے یا اس ہے یا اس سے ملاقات کی ہوتی ہے[1]۔

(د)۔ تدلیس الاسناد کی مثال:

تدلیس الاسناد کی مثال وہ حدیث ہے جس کو امام حاکم نیسابوریؒ نے علی بن خشرم[2] سے روایت کیا ہے، جو یہ ہے:

" قَالَ: قَالَ لَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنِ الزُّهْرِيِّ، فَقِيلَ لَهُ: سَمِعْتَهُ مِنَ الزُّهْرِيِّ، فَقَالَ: لَا، وَلَا مِمَّنْ سَمِعَهُ مِنَ الزُّهْرِيِّ، حَدَّثَنِي عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ.[3]"

علی بن خشرمؒ کہتے ہیں کہ ہم سے سفیان بن عیینہؒ نے زہریؒ سے روایت کرتے ہوئے کہا: جب سفیان بن عیینہؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے خود زہری سے سنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں، بلکہ میں نے اس شخص سے بھی نہیں سنی جس سے زہری نے سنا تھا مجھ سے تو عبد الرزاق نے بیان کیا، انہوں نے معمر سے اور انہوں نے زہری سے سن کر کہا۔

---

(۱) تدریب الراوی: ۱/۲۵۶۔ (م)

(۲) علی بن خشرم بن عبد الرحمن بن عطاء بن ہلال مروزی، ۱۶۰ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے بڑے محدث اور عالم تھے، بشر حافی کے بھانجے تھے، امام وکیعؒ اور ان کے ہم عصروں سے کسب فیض کیا، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ اور ابن خزیمہؒ وغیرہ جیسے اسلاطین علم ان کے شاگرد رہے، ۲۷۵ھ کو وفات پائی۔ (الجرح والتعدیل: ۶/۱۸۴، سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۵۵۲، تہذیب التہذیب: ۷/۳۱۶) (م)

(۳) معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۳۰. (ط)

اس مثال میں سفیان بن عیینہؒ[۱] نے اپنے اور زہریؒ کے درمیان دو راویوں کو ساقط کر دیا۔[۲]

۵۔ تدلیس التسویہ:

تدلیس کی یہ قسم دراصل تدلیس الاسناد کی انواع میں سے من جملہ ایک نوع ہے۔

(الف)۔ تدلیس التسویہ کی تعریف:

راوی کی وہ روایت جس کو وہ اپنے شیخ سے روایت کرے پھر ضعیف راوی کو ایسے ثقہ راویوں کے درمیان سے ساقط کر دے جن کی آپس میں ملاقات ہوئی ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک راوی اپنے شیخ یعنی ثقہ راوی سے روایت کرتا ہے، لیکن یہ شیخ جس راوی سے روایت کرتا ہے وہ ضعیف ہے، البتہ وہ ضعیف خود ثقہ راوی سے روایت کرتا ہے اور ان دونوں ثقہ راویوں کی آپس میں ملاقات بھی ہوتی ہے، پھر وہ مدلس جس نے ثقہ شیخ اول سے روایت لی ہے وہ سند کے درمیان سے ضعیف راوی کو ساقط کر دیتا ہے، پھر وہ اپنی روایت کی اسناد میں ثقہ کو ثقہ ثانی سے ایک محتمل لفظ کے ذریعے جوڑ دیتا ہے جس سے وہ راویوں کے پورے سلسلے کو ثقہ بنا دیتا ہے۔ یہ تدلیس کی بدترین قسم ہے اس لیے کہ ثقہ اول کبھی تدلیس میں معروف نہیں ہوتا اور جو شخص سند کا سرسری واقف ہوتا ہے وہ سند کی ظاہری صورت کو دیکھ کر اس حدیث کی صحت کا فیصلہ کر لیتا ہے جس میں ایک بڑا دھوکہ پنہاں ہوتا ہے[۳]۔

(ب)۔ تدلیس التسویہ کے عمل میں مشہور نام:

۱۔ بقیۃ بن الولید[۴]:

---

[۱] سفیان بن عیینہ بن میمون ہلالی کوفی مکی، ابو محمد، محدث حرمِ مکی، کوفہ میں ۱۰۷ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محدث، مفسر، حافظ اور متبحر عالم تھے، امام شافعیؒ کا قول ہے کہ اگر امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز مقدس میں علم نہ رہتا، آپ نے ستر حج کیے تھے، مکہ معظمہ میں رہائش پذیر تھے اور وہیں ۱۹۸ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۸ / ۴۵۴، تاریخ بغداد: ۹ / ۱۷۴، تذکرۃ الحفاظ: ۱ / ۲۶۲، سیر اعلام النبلاء: ۸ / ۴۵۴، الاعلام: ۳ / ۱۰۵)(م)

[۲] تدریب الراوی: ۱ / ۲۵۷۔ (م)

[۳] الکفایہ: ۳۶۴، ارشاد طلاب الحقائق: ۱ / ۲۰۵۔ (م)

[۴] بقیہ بن ولید بن صائد، حمیری، کلاعی، ابو یحمد، حمص سے تعلق تھا، حافظ حدیث اور اپنے زمانے میں محدثِ شام تھے، ظرافت و ہوشیاری میں ضرب المثل تھے، متبحر عالم تھے، لیکن ضعفاء سے بکثرت روایت کرنے کی وجہ سے مطعون ہوئے، امام شعبہؒ، امام اوزاعیؒ، عبد اللہ بن مبارکؒ، امام وکیعؒ اور اسحاق بن راہویہؒ جیسے اساطین اور جبال علم ان =

ابو مسہر [۱] کہتے ہیں۔

" أحاديث بقية ليست نقية، فكن منها على تقية." [۲]

"بقیہ کی روایت کردہ احادیث صاف ستھری نہیں ہوتیں، اس لیے ان سے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔"

۲۔ ولید بن مسلم [۳]۔ *

(ج)۔ تدلیس التسویہ کی مثال:

ابن ابی حاتمؒ اپنی کتاب "العلل" میں روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا ہے، یہ کہہ کر اس نے اس حدیث کا ذکر کیا جس کو اسحاق بن راہویہ نے بقیہ سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابو وہب اسدی نے نافع سے اور انہوں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث روایت کی۔

= سے روایت کرتے ہیں۔۸۷ سال کی عمر میں ۱۹۷ھ کو وفات پائی۔(الجرح والتعدیل:۲/۴۳۴، الکامل لابن عدی:۱/۴۴، سیر اعلام النبلاء:۸/۵۱۸، الاعلام للزرکلی:۲/۶۰)(م)

[۱] عبد الاعلی بن مسہر، ابو مسہر، دمشقی، شام کے مشہور عالم وفقیہ تھے، علم حدیث کے ائمہ میں سے تھے، خلق قرآن کے عقیدے کے انکار کی وجہ سے خلیفہ وقت کے ہاتھوں آزمائش دوچار ہوئے، (۲۱۰ھ) کو وفات پائی۔(تاریخ بغداد: ۱۱/۷۲/۲، تذکرۃ الحفاظ:۱/۳۸۱، تہذیب التہذیب:۶/۹۸)(م)

[۲] میزان الاعتدال ج۱- ص ۳۳۲.(ط)

[۳] ولید بن مسلم، ابو العباس، دمشق کے باشندے تھے، اہل عصر اہل علم سے استفادہ کیا اور درس و تدریس کا حلقہ قائم کیا، صاحب تصانیف علماء میں سے ہیں، ثقہ، حافظ تھے، لیکن تدلیس کرتے تھے۔(۱۹۵ھ) کو وفات پائی۔ (الجرح والتعدیل:۹/۱۶، تذکرۃ الحفاظ:۱/۳۰۲، تہذیب التہذیب:۱۱/۱۵۱)(م)

* ولید بن مسلم کے بارے میں ابو مسہر سے منقول ہے:

" كَانَ يُحَدِّثُ بِأَحَادِيثِ الْأَوْزَاعِيِّ مِنَ الْكَذَّابِينَ، ثُمَّ يُدَلِّسُهَا عَنْهُمْ." (تدریب الراوی:۱/۲۵۸)

"ولید بن مسلم امام اوزاعی کی احادیث کذابوں سے روایت کرتے اور پھر ان میں تدلیس کرتے۔"

حافظ بن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) ولید بن مسلم کے متعلق فرماتے ہیں۔

" ثقة لكنه كثير التدليس والتسوية." (تقریب التہذیب:۵۸۴، میزان الاعتدال:۴/۳۴۸)

"ولید ثقہ ہیں، لیکن تدلیس و تسویہ کا بکثرت ارتکاب کرتے ہیں۔" (م)

" «لَا تَحْمَدُوا إِسْلَامَ الْمَرْءِ حَتَّى تَعْرِفُوا عُقْدَةَ رَأْيِهِ». "(۱)
"تم کسی شخص کے اسلام کی اس وقت تک تعریف نہ کروجب تک اس کی رائے کی قوت نہ معلوم کرلو۔"

میرے والد نے کہا: اس حدیث کا معاملہ ایسا ہے کہ بہت کم لوگ اس کو سمجھ سکتے ہیں، اس حدیث کو ثقہ (عبید اللہ بن عمر) نے ضعیف اسحاق بن ابو فروہ سے انہوں نے ثقہ سے انہوں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے۔

عبید اللہ بن عمرو ثقہ ہے، اسحاق بن ابی فروہ ضعیف ہے، نافع ثقہ ہے۔

عبید اللہ بن عمرو کی کنیت ابو وہب ہے اوران کا تعلق اسدی قبیلہ سے ہے، بقیہ نے اس کی کنیت بیان کی ہے اوراسے بنو اسد کی طرف منسوب کر دیا ہے تا کہ اسے کوئی سمجھ نہ سکے، پھر انہوں نے اسحاق بن ابو فروہ کو حذف کر دیا تا کہ اس کی طرف ذہن نہ جائے۔

۵۔ تدلیس الشیوخ:

(الف)۔ تدلیس الشیوخ کی تعریف:

تدلیس الشیوخ یہ ہے کہ راوی کسی ایسے شیخ سے روایت کرے جس سے اس نے حدیث سنی ہو پھر اس شخص کو ایسے نام، کنیت، نسب سے یاد کرے جو غیر معروف ہو، تا کہ اس کو پہچانا نہ جاسکے(۲)۔

۷۔ تعریف کی تشریح:

ایک مدلس راوی اپنے شیخ سے اس حدیث کو روایت کرے جو اس نے شیخ سے سنی ہے، اس میں نہ توکسی راوی کو ساقط کیا ہو اور نہ ہی شیوخ کی تدلیس میں حذف پایا جاتا ہو، لیکن راوی اپنے شیخ کے نام یا نسبت یا صفت کو صیغہ راز میں رکھے، اس کی مثال یہ ہے:

۱۔ نام شیخ: محمود بن طحان

۲۔ کنیت: ابو حفص

---

(۱) شرح الألفية للعراقي ج۱، ص۱۹۰، تدريب الراوي ج۱، ص۲۲۵. (ط)

(۲) علوم الحديث ص٦٦. (ط)

۳۔ نسبت: طحان

۴۔ صفت: سفید ریش۔

اب اگر کوئی مدلس آکر یوں کہے کہ مجھے بیان کیا: ابن احمد نے یا ابو سہیل نے یا محمود حلبی نے یا سفید ریش نے۔ تو یہ جملہ امور اس شیخ پر منطبق ہو رہے ہیں اور یہ اس لیے کہ:

۱۔ نام کے اعتبار سے تو شیخ محمود واقعۃً ابن احمد ہے۔

۲۔ کنیت کے اعتبار سے تو وہ ابو سہیل ہیں، اس لیے کہ سہیل شیخ کا ایک بیٹا ہے۔

۳۔ نسبت کے اعتبار سے وہ حلبی ہیں، اس لیے کہ وہ حلب کے باشندے ہیں۔

۴۔ صفت کے اعتبار سے وہ سفید ریش بزرگ ہیں، لیکن شیخ ان ناموں کیساتھ لوگوں میں مشہور نہیں جو مدلس نے بیان کیے، تو اب شیخ کا مذکورہ غیر معروف ناموں کیساتھ تذکرہ کرنا ایک قسم کا خفاء اور تدلیس ہے اور یہ وہ اس لیے کر رہا ہے کہ شیخ کو کوئی پہچان نہ سکے، اس لیے کہ شیخ میں کوئی عیب ہے، مثلاً ضعیف ہے، یا کم عمر ہے وغیرہ۔

(ب)۔ تدلیس الشیوخ کی مثال:

فن قراءت کے ائمہ میں سے ابو بکر بن مجاہدؒ[1] کا قول ہے:

"حدثنا عبد الله بن أبي عبد الله."

"ہم سے بیان کیا عبد اللہ بن ابو عبد اللہ نے۔"

اس سے ان کی مراد ابو بکر بن ابو داؤد سجستانی[2] ہیں۔

---

[1] احمد بن موسی بن عباس تمیمی، ابو بکر بن مجاہد، ۲۴۵ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور میں حدیث، نحو اور علم قراءت کے بہت بڑے عالم تھے، اصل بغداد کے تھے، بڑے ذہین وفطین تھے، علم قراءت پر متعدد کتابیں لکھیں، ۳۲۴ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد:۵/۱۴۴، سیر اعلام النبلاء:۱۵/۲۷۲، النجوم الزاہرۃ:۳/۲۵۸، شذرات الذہب:۲/۳۰۲، الاعلام للزرکلی:۱/۲۶۱)(م)

[2] عبد اللہ بن سلیمان بن اشعث ازدی سجستانی، ابو بکر بن ابی داؤد، سجستان میں ۲۳۰ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے نابغہ روزگار محدث اور حافظ حدیث تھے، اپنے والد کیساتھ حرمین، مصر، شام، ثغور اور عراق وغیرہ کے دور دراز کے علمی اسفار کیے اور مصر اور شام کے اسفار کیں اپنے والد کیساتھ بعض شیوخ میں شریک رہے، بغداد میں ۳۱۶ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ الاسلام للذہبی:۷/۳۰۵، ہدیۃ العارفین:۱/۴۴۴، الاعلام:۴/۹۱)(م)

۸۔ تدلیس کا حکم:

(الف)۔ اہل علم نے تدلیس کی شدید مذمت کی ہے اس لیے کہ یہ مکروہ اور انتہائی مذموم عمل ہے [1]۔

---

[1] تدلیس اپنی تمام فروع کیساتھ ایک ناپسندیدہ عمل ہے، اکثر محدثین نے اس کی مذمت کی ہے، خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) فرماتے ہیں۔

" التَّدْلِيسُ لِلْحَدِيثِ مَكْرُوهٌ عِنْدَ أَكْثَرِ أَهْلِ الْعِلْمِ ، وَقَدْ عَظَّمَ بَعْضُهُمُ الشَّأْنَ فِي ذَمِّهِ، وَتَبَجَّحَ بَعْضُهُمْ بِالْبَرَاءَةِ مِنْهُ." (الکفایۃ:۳۵۵)

"اکثر اہل علم کے نزدیک حدیث میں تدلیس ناپسندیدہ عمل ہے، بعض نے تو اس کی بہت مذمت کی ہے اور بعض نے اس سے براءت کا اعلان کیا ہے۔"

حافظ سلیمان بن داؤد المنقری (م۲۳۶ھ) سے معرفۃ علوم الحدیث (۱۰۳) میں منقول ہے۔

" التَّدْلِيسُ وَالْغِشُّ وَالْغُرُورُ، وَالْخِدَاعُ، وَالْكَذِبُ يُحْشَرُ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فِي نَفَاذٍ وَاحِدٍ."

"تدلیس، بددیانتی، دھوکہ، فریب اور جھوٹ یہ سب اس دن ایک ہی جگہ میں اٹھائے جائیں گے جب سب پوشیدہ راز کھل جائیں گے۔"

امام حاکم نیسابوریؒ (م۴۰۵ھ) نے نقل کیا ہے کہ محدث جلیل عبداللہ بن مبارکؒ (م۱۸۲ھ) کی مجلس میں مدلس کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے اس کے متعلق سخت کلمات کہے اور یہ شعر پڑھا۔

" دَلَّسَ لِلنَّاسِ أَحَادِيثَهُ   وَاللهُ لَا يَقْبَلُ تَدْلِيسًا" (معرفۃ علوم الحدیث:۱۰۳)

"وہ مدلس لوگوں کے لیے احادیث میں تدلیس کرتا ہے اور اللہ تعالی تدلیس کو قبول نہیں کرتا۔"

غندہ محمد بن جعفر (م۱۹۳ھ) نے امام شعبہؒ (م۱۶۰ھ) سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

" وَلَأَنْ أَسْقُطَ مِنَ السَّمَاءِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أُدَلِّسَ." (الکفایۃ:۳۵۵)

"تدلیس کرنے کے بجائے آسمان سے گرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔"

امام شعبہ بن الحجاجؒ (م۱۶۰ھ) سے یہ بھی منقول ہے۔

" لَأَنْ أَزْنِيَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أُدَلِّسَ." (الکفایۃ:۳۵۶)

"میرے نزدیک زنا تدلیس سے قابل ترجیح عمل ہوگا۔"

حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"وهذا مِنْ شُعبَةَ إفراطٌ محمولٌ على المبالغةِ في الزَّجْرِ عنهُ والتَّنْفِيرِ. " (مقدمۃ ابن الصلاح:۱۵۹، الکفایۃ :۳۵۶، مقدمۃ الجرح والتعدیل:۱/۱۷۳)

"شعبہؒ کا یہ قول افراط پر مبنی ہے جو تدلیس سے روکنے اور نفرت دلانے کے مبالغہ پر محمول کیا جاتا ہے۔"

مذکورہ اقوال کے علاوہ دیگر اقوال بھی محدثین سے منقول ہیں، جن میں انہوں نے تدلیس کی شدید مذمت بیان کی ہے۔

(م)

امام شعبہ رحمہ اللہ[1] نے اس عمل کی بہت سخت مذمت کی ہے، اس سلسلے میں ان کے متعدد اقوال ہیں: ایک یہ ہے:

"التَّدْلِيسُ أَخُو الْكَذِبِ."[2]

"تدلیس کرنا جھوٹ بولنے کے مترادف ہے۔"

(ب)۔ تدلیس التسویہ: تدلیس الاسناد سے بھی زیادہ ناپسندیدہ عمل ہے، حافظ عراقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"وَهُوَ قَادِحٌ فِيمَنْ تَعَمَّدَ فِعْلَهُ."[3]

"یہ اس شخص کے حق میں جو اس کا عادی ہو زہر قاتل ہے۔"

(ج)۔ تدلیس الشیوخ: اس کی قباحت تدلیس الاسناد سے کچھ کم ہے، اس لیے کہ اس میں مدلس نے کسی راوی کو ساقط نہیں کیا، البتہ اس نے اپنے فعل سے اس راوی کو ضائع کر دیا ہے جس سے روایت کی گئی ہے اور سامع کے لیے اس راوی کی شناخت دشوار کر دی، پھر قباحت کا درجہ بھی اس پر آمادہ کرنے والے اسباب کے اعتبار سے مختلف ہو گا[4]۔

۹۔ تدلیس پر آمادہ کرنے والے اسباب:

تدلیس الشیوخ پر آمادہ کرنے والے اسباب درج ذیل چار ہیں:

ا۔ شیخ کا ضعیف اور غیر ثقہ ہونا۔

---

[1] شعبہ بن حجاج بن ورد عتکی ازدی، واسطی بصری، ابو بسطام، واسط میں ۸۲ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم محدث، حافظ حدیث، ادیب، اور امیر المؤمنین فی الحدیث تھے، عراق میں محدثین کے سرخیل تھے، امام اوزاعی رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کے معاصر تھے، ایوب سختیانی، سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک اور محمد بن جعفر غندر جیسے اساطین اور جبال علم ان کے شاگرد تھے، بصرہ میں رہائش تھی اور وہیں ۱۶۰ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۷/ ۲۸۰، تاریخ بغداد: ۹/ ۲۵۵، سیر اعلام النبلاء: ۷/ ۲۰۲، الاعلام للزرکلی: ۳/ ۱۶۴)(م)

[2] تدریب الراوی: ۱/ ۲۶۲۔(م)

[3] تدریب الراوی: ۱/ ۲۵۹۔(م)

[4] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۶۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۲۱۲، فتح المغیث: ۱/ ۱۷۶، المنہل الروی: ۷۳، اختصار علوم الحدیث: ۴۶، تدریب الراوی: ۱/ ۲۶۴، توضیح الافکار: ۱/ ۳۵۶۔(م)

۲۔ شیخ کی وفات اتنی تاخیر سے ہونا کہ اس مدلس کے علاوہ ایک بڑی جماعت بھی شیخ سے سماع میں شریک ہوئی ہو۔
۳۔ شیخ کا کم عمر ہونا، اس طرح کہ جو اس سے روایت کرے ان سے بھی کم عمر ہو۔
۴۔ شیخ سے کثرت روایت، جس کے باعث مدلس ایک ہی انداز میں شیخ کا بار بار نام لینا پسند نہیں کرتا[1]۔

(ب)۔ تدلیس اسناد پر آمادہ کرنے والے پانچ اسباب ہیں:
۱۔ علوِ اسناد کا تاثر دینا۔
۲۔ جس شیخ سے بہت ہی احادیث سنی ہوں ان میں سے کچھ کا بھول جانا۔
۳۔۴۔۵۔ تدلیس الشیوخ کے ابتدائی تین اسباب[2]۔

۱۰۔ مدلس کی مذمت کے اسباب:

مدلس کی مذمت کے اسباب درج ذیل تین ہیں:
(الف)۔ راوی کا ایسے شخص سے سماع کا تاثر دینا جس سے اس نے کچھ سنا نہیں۔
(ب)۔ بیان وضاحت سے ہٹ کر احتمال پیدا کرنے کی راہ اختیار کرنا۔
(ج)۔ راوی کو اس حقیقت کا علم ہونا کہ وہ جس شیخ سے تدلیس کر رہا ہے اگر اس کا نام لے لیا تو اسے پسند نہیں کیا جائے گا[3]۔

۱۱۔ مدلس کی روایت کا حکم:

مدلس کی روایت کے قبول وعدم قبول کے متعلق محدثین کرام کے متعدد اقوال ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور دو قول ہیں:

---

(۱) النکت للزرکشی: ۲/ ۱۳۰۔(م)

(۲) وہ اسباب یہ ہیں: ۱۔ شیخ کا ضعیف یا غیر ثقہ ہونا۔ ۲۔ اس کی وفات کے مؤخر ہونے کے سبب سے کم درجے اور چھوٹی جماعت کا شریک روایت ہونا۔ ۳۔ شیخ کی صغر سنی یا کم عمر کا ہونا۔(م)

(۳) دیکھئے: الکفایۃ ص۳۵۸.(ط)

۱۔ مدلس کی روایت مطلقاً مردود اور نا قابل قبول ہے اگر چہ وہ سماع کی تصریح کرے، اس لیے کہ تدلیس بذات خود ایک جرح ہے۔ یہ قول نا قابلِ قبول ہے۔

۲۔ صحیح قول یہ ہے کہ اس کی روایت کے متعلق فیصلہ کرنے سے پہلے دیکھا جائے گا کہ:

(الف)۔ اگر مدلس سماع کی صراحت کر دے تو اس کی روایت قبول ہو گی، یعنی اگر وہ ''سمعتُ'' یا اس طرح کا کوئی لفظ کہے تو اس کی روایت قبول ہو گی۔

(ب)۔ اگر سماع کی صراحت نہ کرے تو اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، یعنی اگر وہ ''عَن'' یا اس جیسا کوئی لفظ کہے تو اس کی روایت قبول نہ ہو گی[1]۔ *

۱۲۔ تدلیس کی معرفت کیسے ہو گی؟

تدلیس کو درج ذیل دو طریقوں میں سے کسی ایک سے پہچانا جائے گا:

(الف)۔ مدلس سے دریافت کیا جائے تو وہ خود بیان کر دے جیسا کہ سفیان بن عیینہ کیساتھ ہوا۔

---

[1] علوم الحدیث ص ۶۷-۶۸. (ط)

* حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے مدلسین کو درج ذیل پانچ طبقات میں تقسیم کیا ہے:

طبقہ اولی: جنہوں نے شاذ و نادر تدلیس کی ہے، جیسے یحیی بن سعید انصاری۔ ایسے روایوں کی تعداد ۳۳ ہے۔

طبقہ ثانیہ: وہ کبار محدثین جنہوں نے نسبتاً کم تدلیس کی ہو، جیسے سفیان ثوری، یا صرف ثقہ سے تدلیس کی ہو، جیسے سفیان بن عیینہ۔ ان کی بھی تعداد ۳۳ ہے۔

طبقہ ثالثہ: جنہوں نے بکثرت تدلیس کی ہے، جیسے ابو زبیر محمد بن مسلم۔ ان کی تعداد ۵۰ ہے۔

طبقہ رابعہ: جنہوں نے ضعفاء اور مجاہیل سے تدلیس کی ہے، جیسے بقیہ بن ولید۔ ان کی تعداد ۱۲ ہے۔

طبقہ خامسہ: جو تدلیس کے علاوہ دیگر اسباب کی وجہ سے ضعیف ہوں، جیسے عبد اللہ بن لہیعہ۔ ان کی تعداد ۲۴ ہے۔

پہلے اور دوسرے طبقے کے مدلسین کی تدلیس قابل قبول ہے، تیسرے اور چوتھے طبقے کے مدلسین کی روایات سماع کی تصریح ہو تو قابل قبول ہوں گی، ورنہ نہیں۔ تیسرے طبقے کی روایات کو بعض لوگوں نے مطلق قابل قبول مانا ہے۔ پانچویں طبقے کے مدلسین کے روایات تصریح سماع کے باوجود بھی قابل قبول نہیں، الا یہ راوی کا ضعف خفیف ہو اور محدثین نے اس کی توثیق ہو تو پھر مقبول ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: تعریف اہل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس۔ (م)

(ب)۔ احادیث پر عمیق نظر رکھنے والے محدثین میں سے کوئی محدث بحث و تحقیق کے ذریعے راوی کی تدلیس کی تصریح کر دے۔

۱۳۔ تدلیس اور مدلسین کے موضوع پر مشہور و معروف تصانیف:

اس موضوع پر بہت سی تصانیف موجود ہیں، جن میں زیادہ مشہور یہ ہیں:

(الف)۔ خطیب بغدادیؒ کی تین تصانیف ہیں، جن میں ایک "التبیین لاسماء المدلسین" جو صرف مدلسین کے اسماء پر مشتمل ہے[۱]۔ دوسری دو کتابیں تدلیس کی انواع پر مشتمل ہیں[۲]۔

(ب)۔ "التبیین لاسماء المدلسین"، از امام برھان الدین حلبی[۳] (یہ رسالہ مطبوع ہے)۔

(ج)۔ تعریف اہل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس، از امام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (یہ رسالہ مطبوع ہے)۔[۴]

---

[۱] الکفایۃ ص۳۶۱. (ط)

[۲] الکفایۃ ص۳۵۷. (ط)

[۳] ابراہیم بن خلیل طرابلسی حلبی، ابوالوفاء، برہان الدین حلبی اور سبط ابن العجمی کے ناموں سے مشہور ہیں، حلب میں ۷۵۳ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم شافعی المسلک عالم تھے، حصول علم کے سلسلے میں دمشق، فلسطین، مصر اور حجاز مقدس کے اسفار کیے، حدیث اور رجال کے بہت بڑے نابغہ روزگار عالم تھے، حلب ہی میں ۸۴۱ھ کو وفات پائی۔ (البدر الطالع:۱/۲۸، کنوز الذہب فی تاریخ حلب:۱/۲۸، الضوء اللامع:۱/۱۳۸، دیوان الاسلام:۱/۲۲۱، الاعلام للزرکلی:۱/۶۵)(م)

[۴] مدلسین پر معاصر عالم شیخ حماد بن محمد انصاری نے "اتحاف ذوی الرسوخ بمن رمی بالتدلیس من الشیوخ" اور "التدلیس والمدلسون" کے نام سے دو بہترین کتابیں لکھیں ہیں۔ جس میں انہوں نے علامہ برہان الدین حلبیؒ (م۸۴۱ھ)، حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) اور علامہ سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) کے کتابوں کو جمع کر کے از سرے نو ترتیب دی ہے۔ (م)

٢۔ مرسل خفی[١]

ا۔ مرسلِ خفی کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مرسل "ارسال" (باب افعال) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کے معانی ہیں "ڈھیلا ہیں"ڈھیلا چھوڑ دینا" گویا کہ ارسال کرنے والے نے حدیث کی سند کو ڈھیلا چھوڑ دیا، اور اسے اسے متصل ذکر نہیں کیا[٢]، اور لفظ "خفی" (پوشیدہ) یہ "جلی" کا ضد ہے، اور اس کو ارسال خفی اس لیے کہتے ہیں کہ ارسال کی یہ نوع غیر ظاہر ہوتی ہے جس کو بحث و تحقیق اور نظر و فکر کے بعد معلوم کیا جا سکتا ہے[٣]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

مرسل خفی وہ حدیث ہے، جس کو راوی ایسے شخص سے روایت کرے، جس سے اس نے ملاقات کی ہو یا اس کا معاصر ہو، لیکن اس سے سماع ثابت نہ ہو، تاہم ایسے الفاظ سے روایت کرے، جس میں سماع کا احتمال ہو[٤]۔

٢۔ مرسل خفی کی مثال:

مرسل خفی کی مثال وہ حدیث ہے جس کو امام ابن ماجہ[٥] نے عمر بن عبد العزیزؒ کے

---

(١) فتح المغیث بشرح ألفیۃ الحدیث:٢ /٣٢٧، ارشاد طلاب الحقائق:٢ /٥٨١، نزھۃ النظر في توضیح نخبۃ الفکر:١٠٤ شرح نخبۃ الفکر للقاری:٤٣٣۔(م)

(٢) لسان العرب:١٦ /٢٨٥، المعجم الوسیط:١ /٣٤٤۔(م)

(٣) المعجم الوسیط:١ /٢٤٧۔(م)

(٤) شرح ألفیۃ العراقی:١ / ١٨٠.(ط)

(٥) محمد بن یزید ربعی (بفتح الباء والراء) قزوینی، ابو عبد اللہ، ابن ماجہ، ٢٠٩ کو پیدا ہوئے، اپنے دور میں عظیم محدث، مفسر، مؤرخ اور حافظ حدیث تھے، حصول علم کے سلسلے میں بصرہ، بغداد، شام، مصر، حجاز مقدس اور رای کے اسفار کیے، ٢٧٣ھ میں وفات پائی۔ (وفیات الاعیان:٤ /٢٧٩، النجوم الزاہرۃ:٣ /٧٠، سیر اعلام النبلاء:١٣ /٢٧٧، الاعلام للزرکلی:٧ /١٤٤)(م)

طریق سے کی ہے، انہوں نے سیدنا عقبہ بن عامرؓ سے مرفوعًا روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«رَحِمَ اللهُ حَارِسَ الْحَرَسِ».[1]

''محافظوں کی حفاظت کرنے والے پر اللہ تعالی رحم فرمائے۔''

یہ حدیث اس لیے مرسل ہے کہ عمر بن عبد العزیزؒ[2] کی سیدنا عقبہ بن عامرؓ[3] سے ملاقات ثابت نہیں، جیسا کہ امام جمال الدین مزیؒ[4] نے تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف میں کہا ہے[5]۔

۳۔ مرسل خفی کو کس طرح پہچانا جائے؟

ارسال خفی کو درج ذیل تین طریقوں میں سے کسی ایک کے ذریعے سے پہچانا جا سکتا ہے۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، ج۲ص ۹۲۵ رقم الحدیث ۲۷۶۹. (ط)

(۲) عمر بن عبد العزیز بن مروان بن حکم اموی، قرشی، ابو حفص، مدینہ منورہ میں ۶۱ھ کو پیدا ہوئے، نیک صالح اور عادل خلیفہ تھے، ولید نے مدینہ منورہ کا امیر مقرر کیا، پھر سلیمان ابن عبد الملک نے شام کا گورنر نامزد کیا، سلیمان بن عبد الملک نے عہد ۹۹ھ میں انہیں خلافت سپرد کی گئی، تھوڑے عرصے تقریباً ڈھائی سال خلیفہ رہے، سمعان (شام) میں ۱۰۱ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۵/ ۳۳۰، الجرح والتعدیل: ۶/ ۱۲۲، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۱۸، سیر اعلام النبلاء: ۵/ ۱۱۴، الاعلام للزرکلی: ۵/ ۵۰)(م)

(۳) عقبہ بن عامر بن عبس بن مالک جہنی، رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی رسول ہیں، جنگ صفین میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کیساتھ تھے اور سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کیساتھ فتح مصر میں بھی شریک تھے، ۴۴ھ کو مصر کے گورنر مقرر ہوئے، ۴۷ھ کو معزول ہوئے، جامعین قرآن میں سے ایک آپ بھی ہیں، ان کی مرویات کی تعداد ۵۵ ہے، قاہرہ (مصر) میں ۵۸ھ کو وفات پائی ۔(الاستیعاب: ۳/ ۱۰۷۳، اسد الغابۃ: ۵/ ۴۱، الاصابۃ: ۴/ ۴۳۹، سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۴۶۷، الاعلام: ۴/ ۲۴۰)(م)

(۴) یوسف بن عبد الرحمن بن یوسف، ابو حجاج، جمال الدین ابن زکی، ابو محمد قضاعی کلبی مزی، حلب میں ۶۵۴ھ کو پیدا ہوئے، حدیث، رجال، جرح و تعدیل اور لغت کے نابغہ روزگار عالم تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، امام شمس الدین ذہبیؒ، حافظ ابن کثیرؒ، ابن سید الناس یعُمریؒ، تقی الدین سبکیؒ، علم الدین برزالیؒ، ابن عبد الہادیؒ، علاء الدین مغلطایؒ اور تقی الدین ابن رافع سلامیؒ جیسے اساطین وجبال علم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے، دمشق میں ۷۴۲ھ کو وفات پائی۔ (معجم الشیوخ للذہبی: ۲/ ۳۸۹، اعیان العصر: ۵/ ۶۴۴، النجوم الزاہرۃ: ۹/ ۳۱۹، شذرات الذہب: ۶/ ۱۲۴، الاعلام للزرکلی: ۸/ ۲۳۶)(م)

(۵) دیکھئے: تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف: ۷/ ۳۱۴۔ (م)

(الف)۔ کوئی ماہر محدث اور امام فن اس بات کی تصریح کرے کہ راوی نے جس شیخ سے روایت کی ہے، اس شیخ سے ملاقات نہیں کی۔ یا اس راوی نے شیخ سے مطلقاً کچھ سنا ہی نہیں [1]۔
(ب)۔ راوی خود اس بات کی صراحت کرے کہ اس کی شیخ سے ملاقات ثابت نہیں یا اس بات کا اعتراف کرے کہ اس کی شیخ سے سماع ثابت نہیں [2]۔
(ج)۔ حدیث مرسل کا کسی دوسرے طریق سے اسی طور پر مروی ہونا کہ راوی اور اس کے شیخ کے درمیان کوئی اور راوی مذکور ہو [3]۔ اس تیسری صورت کے متعلق محدثین کرام کا اختلاف

---

(۱) جیسے مذکورہ روایت میں عمر بن عبد العزیزؒ کی سیدنا عقبہ بن عامرؓ سے ملاقات ثابت نہیں، جیسا کہ امام جمال الدین مزیؒ نے کہا ہے۔ تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف:۷/۳۱۴۔ (م)

(۲) جیسے ابوعبیدہ بن عبد اللہ بن مسعود اپنے والد سے سماع کی نفی کرتے ہیں، امام ترمذیؒ (م۲۷۹ھ) نے یہ تصریح نقل کی ہے:

" حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ، قَالَ: سَأَلْتُ أَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ هَلْ تَذْكُرُ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ قَالَ: لَا. " (سنن الترمذی:۱/۲۵)

"شعبہ بن عمرو بن مرہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: میں نے ابوعبیدہ بن عبد اللہ سے پوچھا کہ تمہیں عبد اللہ سے کوئی شئ یاد ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں!"

امام ترمذیؒ (م۲۷۹ھ) نے بھی عدم سماع کی تصریح کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

" وَأَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ، لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِيهِ. " (سنن الترمذی:۱/۲۵)

"ابوعبیدہ بن عبد اللہ بن مسعود کی اپنے والد سے سماع ثابت نہیں۔" (م)

(۳) جیسے اس روایت میں ہے:

" عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنْ الثَّوْرِيِّ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ زَيْدِ بْنِ يُثَيْعٍ ، عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنْ وَلَّيْتُمُوهَا أَبَا بَكْرٍ فَقَوِيٌّ أَمِينٌ. " (معرفۃ علوم الحدیث:۲۸)

"عبد الرزاق نے سفیان ثوری سے انہوں نے ابو اسحاق سے انہوں نے زید بن یثیع سے اور انہوں نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کہ اگر ہم نے یہ منصب ابو بکر کو دیا تو قوی بھی ہے اور امین بھی۔" =

ہے، کیونکہ یہ ایک مستقل قسم ہے، جس کا نام "المزید فی متصل الاسانید" ہے[۱]۔

۴۔ مرسل خفی کا حکم:

مرسل خفی ضعیف حدیث ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ منقطع کی ایک قسم ہے، لہٰذا جب اس کا انقطاع ظاہر ہو جائے تو اس کا حکم حدیث منقطع کا ہوگا۔

۵۔ مرسل خفی پر معروف تصانیف:

التفصیل لمبهم المراسیل ، از خطیب بغدادیؒ[۲]۔

=حاکم نیسابوریؒ (م ۴۰۵ھ) فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دو جگہ انقطاع ہے اس لیے کہ عبدالرزاق سے مروی ہے کہ نعمان بن ابی شیبہ نے سفیان ثوری سے اور سفیان ثوری نے شریک سے اور اس نے ابواسحاق سے روایت کیا۔ (معرفۃ علوم الحدیث: ۲۸) (م)

[۱] یہ آخری فرق ذرا مشکل ہے، کیونکہ اس میں بات کا امکان ہے کہ ایسی حدیث مرسل خفی کے بجائے مزید فی متصل الاسانید ہو، اس لیے کہ ہمارا انحصار دلیل خارجی کے بجائے اسناد میں دوراویوں کے درمیان واسطہ پیدا ہونے کی وجہ سے معلوم ہوا، اسی لیے اس کا امکان ہے کہ دوراوی آپس میں ملے ہوں اور راوی محذوف سے اوپر والے راوی نے سنا ہو اور اس طرح ان دونوں سے سند متصل ہوگئی ہو اور اضافہ کی روایت مزید فی متصل الاسانید کے قبیل سے ہو۔ ڈاکٹر نورالدین عتر حفظہ اللہ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"ہمارے نزدیک اس اشکال کا حل ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ مزید فی متصل الاسانید کے محذوف اسناد میں دو متوالی راویوں کے مابین تاریخی طور پر سماع کے ثبوت کا جائزہ لیں گے، لیکن مرسل خفی میں ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں جو یہ ثابت کرے کہ ان راویوں کے درمیان جن میں سے ایک دوسرے سے ارسال کرتا ہے سماع واقع ہوا ہے۔ دوسرے فرق کا تعلق روایت کے الفاظ سے ہے، کیونکہ مزید فی متصل الاسانید کے سلسلے میں حدیث کے رواۃ کے لیے خالی اسناد کے اوپر کے راوی سے سماع کا ثبوت اس صریح اضافہ سے ہوتا ہے جو موجود ہے، جہاں مرسل خفی کی روایت کے الفاظ کا تعلق ہے تو وہ ناقص اسناد میں سماع کو ثابت نہی کرتے۔ لہٰذا جب روایت میں زائد واسطہ آئے گا تو فیصلہ اس کے مطابق ہوگا۔" (منہج النقد فی علوم الحدیث: ۳۶۰، اصول الحدیث: ۱/ ۴۴۱)

حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) مرسل خفی کے بحث کے آخر میں رقم طراز ہیں۔

"مزید فی متصل الاسانید کے حتمال کے لیے یہ کافی نہیں کہ بعض طرق میں دوراویوں کے درمیان ایک سے زائد راوی ہو۔ اس صورت میں اتصال وانقطاع کے تعارض کے احتمال پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔" (نزہۃ النظر: ۱۰۳) (م)

[۲] دیکھیے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۹۴، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۴۴۴۔ (م)

حدیث منقطع کے ملحقات
معنعن[1] اور مؤنن کا بیان

۱۔ تمہید:

ما قبل صفحات میں حدیث مردود کی اُن چھ قسموں کا مفصل تعارف پیش کیا گیا، جس کے مردود اور قابل قبول ہونے کا سبب انقطاعِ سند تھا، تاہم حدیث معنعن اور حدیث مؤنن کے متعلق محدثین کرامؒ کا اختلاف ہے کہ یہ منقطع کی قسم ہے یا متصل کی؟ تو اسی وجہ سے میں نے ان دونوں قسموں کو سقوطِ سند کے باعث مردود روایات کیساتھ ملحق کر دیا ہے۔

۲۔ حدیث معنعن کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

معنعن ''عَنْعَنْ'' (بروزن فعلل رباعی مجرد) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کے معانی ہیں: ''عَنْ، عَنْ'' کہنا[2]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

راوی کا ''فلانٌ عَنْ فلانٍ'' کہہ کر روایت کرنا، یعنی وہ حدیث جو ''عَنْ'' سے روایت کی جائے[3]۔ *

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۱۳۹، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:۱/۱۸۷، فتح المغیث للسخاوی:۱/۲۹۶۔(م)

(۲) توضیح الافکار:۱/۲۹۹، تحریر علوم الحدیث لابن الجدیع:۱/۱۶۵۔(م)

(۳) علوم الحدیث، ص۶۱. (ط)

* حدیث معنعن وہ حدیث ہے جس کی سند میں ''فلان عن فلان'' ہو اور اس میں حدیث بیان کرنے یا سننے کی تصریح نہ ہو۔ علامہ ابو الفضل عراقیؒ (م۸۰۶ھ) فرماتے ہیں۔

''العنعنة مصدر، عنعن الحديث اذا رواه بعن من غير بيان للتحديث والاخبار والسماع-''
(فتح المغیث للعراقی:۱/۱۸۷، فتح المغیث للسخاوی:۱/۲۹۶)

''عنعنہ'' مصدر ہے، ''عنعنۃ الحدیث'' کا مطلب یہ ہے جب راوی ''عن'' سے روایت کرے اور اس میں تحدیث، اخبار اور سماع کی وضاحت نہ ہو۔'' (م)

۳۔ حدیث معنعن کی مثال:

حدیث معنعن کی مثال سنن ابن ماجہ کی یہ روایت ہے:

"حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، حَدَّثَنَا مُعَاوِيَةُ بْنُ هِشَامٍ، حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى مَيَامِنِ الصُّفُوفِ".[۱]

امام ابن ماجہ فرماتے ہیں، ہمیں عثمان بن ابی شیبہ نے، وہ فرماتے ہیں ہمیں معاویہ بن ہشام نے، وہ فرماتے ہیں ہمیں سفیان نے اسامہ بن زید سے، انہوں نے عثمان بن عروہ سے، انہوں نے عروہ سے، انہوں نے ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، کہ اللہ تعالی اور اس کے فرشتے نماز کی صفوں میں دائیں جانب والوں پر رحمت بھیجتے ہیں۔

۴۔ حدیث "معنعن" متصل ہے یا منقطع؟

محدثین کرام کا اس بات میں اختلاف ہے کہ حدیث معنعن متصل ہو گی یا منقطع؟ معروف دو قول ہیں:

(الف)۔ حدیث معنعن اس وقت تک منقطع شمار ہو گی، جب تک اتصال واضح نہ ہو[۲]۔

(ب)۔ جمہور محدثین، فقہاء اور اصولیین حضرات فرماتے ہیں، کہ حدیث معنعن چند شرائط کیساتھ متصل ہے، جن میں سے دو شرطوں پر سب کا اتفاق ہے اور باقی شرائط مختلف فیہ ہے اور امام مسلمؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ ان دو شرطوں پر اکتفاء کیا جائے۔

۱۔ معنعن حدیث کا راوی مدلّس نہ ہو۔

۲۔ دونوں کی ملاقات ممکن ہو، یعنی راوی "عن" کے ذریعے جس سے روایت کر رہا ہے، اس کیساتھ اس کی ملاقات ممکن ہو۔ حدیث معنعن کو اتصال پر محمول کرنے کے لیے مذکورہ بالا دو

---

[۱] سنن ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة والسنة فيها ج۱، ص۳۲۱ رقم الحدیث / ۱۰۰۵. (ط)

[۲] مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۳۹۔ (م)

شرطیں متفق علیہ ہیں، اور یہی مذہب جمہور محدثین کا مختار کردہ اور معمول بہ ہے، [۱] لیکن ان دو سے زائد شرائط مختلف فیہ ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ امام بخاریؒ، امام علی بن مدینیؒ اور بعض محققین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مذکورہ دو شرطوں کے علاوہ ملاقات کا ہونا بھی شرط ہے [۲]۔

۲۔ علامہ ابو مظفر سمعانیؒ [۳] کے نزدیک طول مصاحبت بھی شرط ہے [۴]۔

۳۔ علامہ ابو عمرو دانی [۵] فرماتے ہیں کہ راوی جس شیخ سے "عن" کے ذریعے کر رہا ہے اسے جانتا بھی ہو [۶]۔

۵۔ حدیث مؤنن کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مؤنّن "أنّن" (باب تفعیل) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، اس کا معنی ہے، اس نے "أنَّ أنَّ" کہا [۷]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

---

[۱] مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۳۹۔ (م)

[۲] تدریب الراوی: ۱/ ۲۴۵۔ (م)

[۳] فخر الدین عبد الرحیم بن ابی سعد عبد الکریم بن محمد ابن منصور، ابو المظفر، سمعانی مروزی شافعی، مرو میں ۵۳۷ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محدث، حافظ اور ناقد رجال تھے، حصول علم کے سلسلے میں دور دراز کے اسفار کیے، حافظ محمد بن موسی حازمی، علم الدین برزالی، ابن الصلاحؒ اور ابن نجاز جیسے اساطین علم و عرفان نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔ ۶۱۸ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲۲/ ۱۰۷، شذرات الذہب: ۵/ ۷۵) (م)

[۴] مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۴۴، تدریب الراوی: ۱/ ۲۴۵۔ (م)

[۵] عثمان بن سعید بن عثمان، ابو عمرو دانی، ابن صیرفی، ۳۷۱ھ کو پیدا ہوئے، حدیث اور علم قراءت کے بہت بڑے عالم تھے، بنو امیہ کے موالی میں سے تھے، حصول علم کے سلسلے میں مغرب سے مشرق تک کے سفر کیے اور آخر میں اندلس آئے اور وہیں ۴۴۴ھ کو وفات پائی۔ (النجوم الزاہرۃ: ۵/ ۵۴، غایۃ النہایۃ: ۱/ ۵۰۳، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۲۰۶) (م)

[۶] مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۴۴، تدریب الراوی: ۱/ ۲۴۵۔ (م)

[۷] شرح علل الترمذی: ۱/ ۱۹۵، قواعد التحدیث: ۱۲۳، علوم الحدیث، صبحی صالح: ۲۲۴۔ (م)

راوی کا "حدثنا فلان أنَّ فلانا قال" کہنا ہے، یعنی وہ حدیث جو "أنَّ" کے لفظ کے ساتھ روایت کی جاتے اور اس میں دو راویوں کے درمیان لفظِ "أنَّ" آتا ہو[۱]۔

٦۔ حدیث "مؤنّن" کا حکم:

حدیث "مؤنّن" متصل ہو گی یا منقطع؟ اس کے متعلق محدثین کرام کے دو قول ہیں:

(الف)۔ امام احمد بن حنبل اور بعض محدثین کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حدیث "مؤنّن" اس وقت تک منقطع شمار ہو گی، جب تک اتصال ظاہر نہ ہو، لیکن یہ قول غیر معتمد ہے۔

(ب)۔ جمہور محدثین فرماتے ہیں کہ "مؤنّن" بالکل "معنعن" کی طرح ہے اور مطلق "مؤنّن" روایت کو مذکوہ شرائط کے تناظر میں اتصال اور سماع پر محمول کیا جائے گا، اگر مذکورہ شروط پائے گئے تو "مؤنّن" منقطع شمار ہو گی[۲]۔

---

[۱] فتح المغیث: ۱/ ۱۵۳، شرح اختصار علوم الحدیث: ۱/ ۱۵۱، قواعد التحدیث: ۸۳. (م)

[۲] علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ (م ٤٦٣ھ) نے جمہور اہل علم کی رائے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ "أنَّ" اور "عَن" سب مساوی ہیں۔ مزید فرماتے ہیں۔

"وأنَّهُ لا اعتبارَ بالحروفِ والألفاظِ، وإنَّما هوَ باللِّقاءِ والمجالَسَةِ والسَّماعِ والمشاهدةِ- يعني: معَ السلامةِ مِنَ التدليسِ - فإذا كانَ سماعُ بعضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ صحيحاً، كانَ حديثُ بعضِهِمْ عَنْ بَعْضٍ بأيِّ لفظٍ وَرَدَ: محمولاً على الاتِّصالِ حَتَّى يَتَبَيَّنَ فيهِ الانقطاعُ." (مقدمۃ ابن الصلاح: ۱٤۱)

"حروف اور الفاظ معتبر نہیں ہیں جو چیز مطلوب ہے وہ ملاقات، مجلس اور مشاہدہ ہیں، بشرطیکہ راوی تدلیس سے محفوظ ہو۔ اگر ایک دوسرے سے سماع ثابت ہے تو حدیث کسی لفظ کے ساتھ بھی وارد ہو اتصال پر محمول ہو گی جب تک اس میں انقطاع واضح ہو جائے۔"

علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ (م ٤٦٣ھ) نے ابو بکر دیجیؒ (م ۳۱۰ھ) سے نقل کیا ہے کہ حرف "أنَّ" انقطاع پر محمول ہو گا حتی کہ کسی اور جہت سے اس حدیث کے بارے میں سماع ثابت نہ ہو۔ علامہ عبد البر اندلسیؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ بے معنی بات ہے اس لیے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہا گر سند صحابی سے متصل ہو تو الفاظ کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خواہ "قال: قال رسول اللهﷺ"۔ یا" أن رسول اللهﷺ قال:" ہو۔ یا "عن رسول اللهﷺ أنه قال:" ہو۔ یا "سمعت رسول اللهﷺ يقول:" یہ سب متصل ہیں۔ (مقدمۃ ابن الصلاح: ۱٤۱)(م)

مقصد سوم

اس حدیث کا بیان جو راوی میں طعن کے سبب سے مردود ہو۔

۱۔ راوی میں طعن کا مفہوم:

راوی میں طعن سے مراد اس پر زبانی تنقید ہے اور اس کے عدالت و تقوی اور ضبط و حفظ کے پہلو پر کلام اور گفتگو کر کے اسے مجروح قرار دینا ہے۔

۲۔ راوی میں طعن کے اسباب و علل:

راوی میں طعن کے دس اسباب ہیں جن میں پانچ کا تعلق عدالت و ثقاہت کیساتھ ہے اور پانچ کا تعلق حفظ و ضبط کیساتھ ہے۔

(الف)۔ وہ اسباب جن کا تعلق عدالت کیساتھ ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ کذب

۲۔ تہمت

۳۔ فسق

۴۔ بدعت

۵۔ جہالت (جہالت عین)

(ب)۔ وہ اسباب جن کا تعلق حفظ اور ضبط کیساتھ ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ فحش غلطی

۲۔ حافظہ کی خرابی

۳۔ غفلت

۴۔ اوہام

۵۔ ثقہ رواۃ کی مخالفت۔

اب ہم مذکورہ اسباب طعن میں سے کسی ایک سبب سے مردود ہونے والے احادیث کی اقسام وانواع کو ترتیب کیساتھ بیان کریں گے، اور ان اقسام کا آغاز سب سے زیادہ سخت سبب طعن ''کذب'' سے کیا جارہا ہے، جس پر سب سے بڑھ کر تنقید ہوتی ہے۔

موضوع[1]

جب راوی میں طعن کا سبب رسول اللہ ﷺ پر دروغ گوئی ہو تو ایسے راوی کی حدیث موضوع کہتے ہیں[2]۔

۱۔ حدیث موضوع کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

موضوع "وضع الشيء" سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کے معانی ہیں: کسی شئ کا مرتبہ گرانا اور گھٹانا، اور موضوع حدیث کو موضوع اس لیے کہتے ہیں، کہ یہ اپنے مرتبہ سے گر جاتی ہے[3]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

وہ گھڑا ہوا جھوٹ، جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہو[4]۔

۲۔ حدیث موضوع کا مرتبہ:

حدیث موضوع احادیث کی بدترین اور قبیح قسم ہے، بلکہ بعض اہل علم نے اسے مستقل قسم قرار دیا ہے اور اس کو ضعیف احادیث کی انواع میں شمار ہی نہیں کیا[5]۔

۳۔ موضوع حدیث کے بیان کرنے کا حکم:

---

(۱) الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع: ۲/ ۹۸، مقدمہ ابن الصلاح: ۲۰۱، جامع الأصول: ۱/ ۱۳۵، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۲۵۸ - ۲٦۵، التقریب: ۸۰ - ۸۵، الاقتراح: ۲۳۱، المنهل الروي: ۵۳، الخلاصة في معرفة الحديث: ۷٦، الموقظة: ۳٦، اختصار علوم الحديث: ۷۸، نزهة النظر: ۱۰۵، فتح المغيث: ۱/ ۲۳۴، ألفية السيوطي: ۷۹ - ۹۳، شرح السيوطي على ألفية العراقي: ۲۱۵، فتح الباقي: ۱/ ۲٦۱، توضيح الأفكار: ۲/ ٦۸، ظفر الأماني: ۴۱۲، قواعد التحديث: ۱۵۰. (م)

(۲) نزهة النظر: ۱۰۵۔ (م)

(۳) لسان العرب: ۸/ ۳۹٦، القاموس: ۳/ ۹۴، مادہ: وضع۔ (م)

(۴) تدريب الراوي، ۱/ ۲۷۴. (ط)

(۵) دیکھئے: مقدمہ ابن الصلاح: ۲۰۱، النکت للزرکشی: ۲/ ۲۵۳، التقیید والایضاح: ۱۳۰، النکت لابن حجر: ۲/ ۸۳۸۔ (م)

اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس شخص کو کسی حدیث کے موضوع ہونے کا علم ہو ، خواہ وضع کا تعلق کسی بھی مسئلہ سے ہو تو اسے موضوع ہونے کی تصریح کیے بغیر بیان کرنا جائز نہیں[1]، صحیح مسلم میں حدیث ہے:

"مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِين."[2]

"جس شخص نے میری طرف نسبت کر کے جان بوجھ کر کوئی جھوٹی حدیث بیان کی، تو اب ایک جھوٹوں میں سے ایک ہے"[3]۔

۴۔ وضاعین (حدیث گھڑنے والے) کے ہتھکنڈے:

ان وضاعین نے احادیث گھڑنے کے لیے دو طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے:

(الف)۔ یا تو ان وضاعین نے اپنی طرف سے ایک حدیث بنالی پھر اس کے لیے ایک سند گھڑ لی اور اس جعلی سند سے اسے روایت کرنے لگے۔

(ب)۔ یا ان لوگوں نے بعض صلحاء اور حکماء حضرات کا کوئی قول لے لیا، پھر اس کی خود سند تیار کر لی اور اسے بطور حدیث روایت کرنے لگے[4]۔

۵۔ موضوع حدیث کی معرفت کے ذرائع:

موضوع حدیث کی معرفت کے بنیادی طور پر دو طریقے ہیں:

ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کی سند کا علمی اور تحقیقی جائزہ لیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے متن پر محد ثانہ نگاہ ڈالی جائے، تاہم سند کا تحقیقی جائزہ لیے بغیر درج ذیل چند امور سے موضوع حدیث کو پہچانا جا سکتا ہے۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۰۱، نزہۃ النظر: ۱۰۹۔ (م)

(۲) مقدمة مسلم بشرح النووي ج۱، ص ۶۲. (ط)

(۳) مقدمة مسلم بشرح النووي ج۱، ص ۶۲. (ط)

(۴) نزہۃ النظر: ۱۰۸۔ (م)

(الف)۔ جعل ساز اپنی جعل سازی کا خود اعتراف کرے جیسے ابو عصمہ بن ابی مریم[۱] نے اسی کا اقرار کیا تھا کہ اس نے قرآن مجید کی ایک ایک سورت کے فضائل پر احادیث گھڑ کر حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہیں[۲]۔

(ب)۔ یا راوی کا ایسا بیان جو اقرار و اعتراف کا درجہ رکھتا ہو، مثلاً راوی کسی شخص سے روایت کرتا ہے، پھر جب اس سے شیخ کی تاریخ پیدائش پوچھی جاتی ہے تو وہ ایسی تاریخ بتاتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل شیخ کی وفات ہو چکی ہوتی ہے اورر یہ حدیث اس کے علاوہ کسی اور نے بھی روایت نہ کی ہو[۳]۔

---

(۱) نوح بن یزید بن مریم بن جعونہ، مروزی قریشی، مرہ کے قاضی تھے، علوم و فنون پر دسترس حاصل ہونے کی وجہ سے جامع کے نام سے مشہور تھے، مرجئ اور روایت حدیث میں مطعون تھے، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ احادیث وضع کرتا تھا، امام حاکمؒ کہتے ہیں کہ یہ جامع تھا اور ہر چیز سے اسے کافی حصہ ملا تھا، مگر سچ بولنے میں اسے کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ (میزان الاعتدال:۴/۲۷۹، التاریخ الکبیر:۷/۳۹۶، المدخل الی الصحیح:۲۱۷-۲۱۸)(م)

(۲) حاکم نیسابوریؒ (م ۴۰۵ھ) سے منقول ہے کہ ابو عصمہ نوح ابن ابی مریم سے پوچھا گیا کہ قرآنی سورتوں کے فضائل کے سلسلے میں عکرمہ عن ابن عباس کی احادیث کہاں سے آئیں جب کہ عکرمہ کے ہاں یہ احادیث نہیں؟ تو اس نے کہا:

”إِنِّي رَأَيْتُ النَّاسَ قَدْ أَعْرَضُوا عَنِ الْقُرْآنِ واشْتَغَلُوا بِفِقْهِ أَبِي حَنِيْفَةَ، ومَغَازِي مُحَمَّدِ بنِ إسْحَاقَ، فَوَضَعْتُ هذهِ الأَحَادِيْثَ حِسْبَةً.“ (مقدمۃ ابن الصلاح:۲۰۷، المدخل الی الاکلیل:۴۸)

”میں نے دیکھا کہ لوگوں نے قرآن سے اعراض کر لیا ہے اور امام ابو حنیفہؒ کی فقہ اور محمد بن اسحاقؒ کے سیرت و مغازی سے زیادہ شغف رکھنے لگتے ہیں تو میں نے نیکی کے جذبہ سے یہ احادیث وضع کی ہیں۔“ (م)

(۳) اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو مامون بن احمد ہروی کا ہے کہ اس کے سامنے ذکر ہو رہا تھا کہ حسن بصریؒ کی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع کیا یا نہیں؟ تو اس نے اسی وقت رسول اللہ ﷺ تک سند کو بیان کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حسن نے ابو ہریرہ سے سماع کیا ہے۔ (میزان الاعتدال:۳/۴۲۹)

اس کی ایک اور مثال یہ ہے جس کو عفیر بن معدان کلاعی نے بیان کیا ہے:

”قَدِمَ عَلَيْنَا عُمَرُ بْنُ مُوسَى حِمْصَ فَاجْتَمَعْنَا إِلَيْهِ فِي الْمَسْجِدِ ، فَجَعَلَ يَقُولُ حَدَّثَنَا شَيْخُكُمُ الصَّالِحُ ، حَدَّثَنَا شَيْخُكُمُ الصَّالِحُ، فَلَمَّا أَكْثَرَ ، قُلْتُ لَهُ: مَنْ شَيْخُنَا هَذَا الصَّالِحُ؟ سَمِّهِ لَنَا نَعْرِفُهُ ، قَالَ: فَقَالَ خَالِدُ بْنُ مَعْدَانَ ، قُلْتُ لَهُ: فِي أَيِّ سَنَةٍ لَقِيتَهُ؟ قَالَ: لَقِيتُهُ سَنَةَ ثَمَانٍ =

(ج)۔ یا خود راوی میں جعل سازی کا کوئی قرینہ ہو، مثلاً راوی رافضی ہو اور حدیث اہل بیت کے فضائل میں ہو[1]۔

(د)۔ یا خود روایت میں موضوع ہونے کا کوئی قرینہ موجود ہو۔ مثلاً ایسی روایت کے الفاظ رکیک اور غیر معیاری ہوں یا عقل انسانی اور حس و مشاہدہ کے خلاف ہو، اور یا قرآن کے صریح نصوص کے خلاف ہو[2]۔

٦۔ وضع کے علل و دواعی اور وضاعین کی اقسام:

وضع حدیث کے متعدد دواعی اور محرکات ہیں، جنہوں نے ان جعل سازوں کو اس جرم پر ابھارا، تاہم ان میں چند معروف اور نمایاں اسباب درج ذیل ہیں:

(الف)۔ تقرّب الی اللہ: اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی خاطر لوگوں کو نیکیوں پر آمادہ کرنے کے لیے اور منکرات سے ڈرانے کے لیے احادیث وضع کرنا، یہ جعل سازوں اور احادیث گھڑنے والوں کی وہ نامراد جماعت ہے جو بزعم خود زہد و تقوی کے علمبردار ہیں، لیکن در حقیقت یہ بدترین

= وَمِائَةٍ ، قُلْتُ: فَأَيْنَ لَقِيتَهُ؟ قَالَ: لَقِيتُهُ فِي غَزَاةِ أَرْمِينِيَّةَ ، قَالَ: فَقُلْتُ لَهُ: اتَّقِ اللّٰهَ يَا شَيْخُ، وَلَا تَكْذِبْ، مَاتَ خَالِدُ بْنُ مَعْدَانَ فِي سَنَةِ أَرْبَعٍ وَمِائَةٍ، وَأَنْتَ تَزْعُمُ أَنَّكَ لَقِيتَهُ بَعْدَ مَوْتِهِ بِأَرْبَعِ سِنِينَ، وَأَزِيدُكَ أُخْرَى إِنَّهُ لَمْ يَغْزُ أَرْمِينِيَّةَ قَطُّ، كَانَ يَغْزُو الرُّومَ." (الکفایۃ:۱۱۹)

"ہمارے ہاں حمص میں عمرو بن موسی آئے تو ہم سب لوگ اس کے لیے مسجد میں جمع ہو گئے اور انہوں نے کہنا شروع کیا: ہم سے تمہارے شیخ صالح نے حدیث بیان کی، جب اس نے کثرت سے ایسا کہنا شرع کیا تو میں کہا کہ یہ ہمارے صالح شیخ کون ہیں؟ اس کا نام لیجئے تا کہ ہم پہچان سکیں۔ اس پر اس نے کہا: خالد بن معدان! میں نے کہا کہ تم اس سے کس برس میں ملے تھے؟ کہنے لگا: ۱۰۸ھ میں۔ میں نے کہا کہ کہاں ملے تھے؟ اس نے کہا کہ آرمینہ کی مہم میں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے شیخ! خدا کا خوف کرو اور جھوٹ نہ بولو! خالد بن معدان ۱۰۴ھ میں فوت ہو گیا اور تمہارا دعویٰ ہے کہ اس کی وفات کے چار برس بعد تمہاری اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ نیز خالد بن معدان تو آرمینہ کی جنگ میں شریک نہیں ہوئے، بلکہ وہ روم کے جنگ میں شریک ہوئے تھے۔" (م)

(۱) تدریب الراوی: ۱/ ۳۲۶۔ (م)

(۲) نزہۃ النظر: ۱۰۷، تدریب الراوی: ۱/ ۳۲۶۔ (م)

وضاعین ہیں، اس لیے کہ لوگ ان کی ظاہری ثقاہت وتقوی اور زہد وعبادت پر اعتماد کرکے ان کی گھڑی ہوئی احادیث قبول کر لیتے ہیں، ان وضاعین میں ایک میسرہ بن عبد ربہ [1] وضاع بھی ہیں ،امام ابن حبانؒ نے "کتاب الضعفاء [2]" میں عبد الرحمن بن مہدی سے نقل کرتے ہیں میں نے میسرہ بن عبد ربہ سے پوچھا کہ تم اس طرح کی احادیث کہاں سے لاتے ہوں ؟ کہ جو شخص یہ پڑھے گا تو اس کا یہ اجر ہے، تو اس نے جواب دیا کہ لوگوں نیکی اور تلاوت کی طرف رغبت دلانے کے لیے میں نے خود یہ احادیث گھڑی ہیں [3]۔ *

(ب)۔ مذہب کی حمایت اور تائید: اپنے مذہب کی تائید اور نصرت کے لیے احادیث وضع کرنا، یہ مجرمانہ عمل اسی وقت شروع ہوا جب مسلمانوں میں باہمی اختلافات کے بعد سیاسی فرقے پیدا

---

(۱) میسرۃ بن عبد ربہ فارسی بصری، امام حبانؒ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ رواۃ سے موضوعات روایت کرتا ہے اور احادیث وضع کرتا تھا۔ امام ابوداوُدؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے خود وضع احادیث کا اقرار کیا ہے، امام دار قطنیؒ کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کو جھوٹا کیا گیا ہے۔ تفصیلی جرح کے لیے دیکھئے: میزان الاعتدال:۴/ ۲۳۰، لسان المیزان:۸/ ۲۲۴، التاریخ الکبیر:۷/ ۱۶۲۰، تاریخ الاسلام:۴/ ۷۵۳۔(م)

(۲) الضعفاء:۴/ ۲۶۴، المجروحین من المحدثین:۲/ ۲۳، تدریب الراوی:۱/ ۳۳۳۔(م)

(۳) تدریب الراوي ج۱، ص۲۸۳.(ط)

* بعض صوفیاء اور عبادوزہاد فضائل اعمال اور ترغیب وترہیب کے احادیث وضع کرتے ہیں، امام مسلم بیشاپوریؒ (م۱۶۱ھ) نے امام یحیی بن سعید قطانؒ (م۱۹۸ھ) کا قول نقل کیا ہے۔

" «لَمْ نَرَ الصَّالِحِينَ فِي شَيْءٍ أَكْذَبَ مِنْهُمْ فِي الْحَدِيثِ»." (مقدمہ صحیح مسلم:۱/ ۱۷)

"ہم نے حدیث کے بیان کرنے میں نیک لوگوں سے زیادہ جھوٹا کسی کو نہیں دیکھا۔"

امام مسلم نیشاپوریؒ (م۱۶۱ھ) اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کی زبان پر غیر ارادی طور پر جھوٹ جاری ہوجاتا ہے، امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا مشغلہ علم حدیث تو ہوتا نہیں، اس لیے وہ روایات میں غلطی اور جھوٹ کا شکار ہوجاتے ہیں۔

(مقدمہ صحیح مسلم:۱/ ۱۸، شرح علل الترمذی:۱/ ۹۳، شرح النووی علی مسلم:۱/ ۹۴)(م)

ہوئے، مثلاً خوارج[۱] اور شیعہ[۲] وغیرہ، ہر ایک فرقے نے ایسے احادیث وضع کرڈالیں، جس سے ان کی مذہب کو قوت حاصل ہوتی تھی..............................

---

[۱] خوارج فرق اسلامیہ میں ایک فرقہ ہے، سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سامنے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق جو تجویز جنگ صفین میں پیش کی تھی، اس سے خوارج کے نام سے ایک علیحدہ باغی فرقہ پیدا ہوا۔ باغیوں کا پڑاؤ نہروان کی نہر کے کنارے تھا ان کے کوفے سے باہر نکلنے کی وجہ سے اس فرقے کا نام خوارج پڑ گیا۔ خوارج کا عقیدہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور اصحاب تحکیم کافر سمجھتے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے غیر اللہ کو حاکم تسلیم کیا تھا۔ ان کا ایک بڑا عقیدہ یہ بھی ہے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتے ہیں۔ خوارج کے ایک غالی فرقے کا کہنا ہے کہ جو کوئی اس طرح کافر ہو جائے وہ اسلام کے دائرے میں دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا اور اسے ارتداد کے جرم میں بیوی بچوں سمیت قتل کر دینا چاہیے۔ خوارج اپنے علاوہ عام مسلمانوں کو مرتد سمجھتے ہیں۔ (التبصیر فی الدین للاسفر ایینی:۴۵)(م)

[۲] شیعہ کا لغوی معنی پیروکار اور اتباع کے ہے اور فقہاء ومتکلمین کی اصطلاح میں ان لوگوں کو شیعہ کہتے ہیں جو اپنے آپ کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اولاد کے متبع کہتے ہیں، بالاجماع ان کا مذہب یہ ہے کہ امامت ایسے مصالح عامہ میں سے نہیں ہے کہ اس کا تعیین عام امت کے ہاتھ ہو، بلکہ امامت دین کا رکن اور اساس اسلام ہے، نبی پر واجب ہے کہ عام امت کے واسطے امام مقرر کرے اور امام کبائر وصغائر سے معصوم ہوتا ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین اور امام مقرر کیا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے جانشینوں کو امام کہتے ہیں، چوتھے امام زین العابدین تک شیعانِ علی متفق رہے مگر ان کی وفات پر شیعوں کے دو گروہ بن گئے، جنہوں نے امام زین العابدین کے بیٹے کو محمد باقر کو امام مانا وہ امامیہ کہلائے اور جنہوں نے ان کے دوسرے بیٹے زید کی تقلید کی وہ زیدیہ کہلائے، مگر اکثرت امامیوں کی تھی۔ چھٹے امام جعفر صادقؒ کی وفات پر امامیوں کے بھی دو گروہ بن گئے جس گروہ نے ان کے بیٹے اسماعیل کو (جو والد کی حیات ہی میں وفات پا گئے تھے) امام مانا وہ اسماعیلی کہلایا۔ لیکن جنہوں نے حضرت موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کیا وہ اثنا عشری کہلائے، کیونکہ یہ بارہ اماموں کو مانتے ہیں۔ آخری امام محمد مہدی تھے جو شیعہ عقائد کے مطابق بچپن ہی میں ایک غار میں غائب ہو گئے اور قیامت کے قریب ظہور پذیر ہوں گے۔ شیعوں کے کئی فرقے ہیں، لیکن دور حاضر کے تمام شیعہ اثنا عشرہ امامیہ ہیں۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن خلدون:۱/۱۹۷، مکالمہ بن المذاہب:۲۱۱۔

واضح رہے کہ لفظ شیعہ کا مفہوم حضرات متقدمین کے نزدیک اور ہے اور حضرات متاخرین کے نزدیک اور ہے، عوام تو درکنار بعض خواص بھی اس فرق سے ناواقف ہیں! متاخرین کی اصطلاح کو متقدمین کی اصطلاح پر منطبق کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

" فالتشيع في عرف المتقدمين هو اعتقاد تفضيل علي على عثمان، وأن عليا كان مصيبا في =

جیسے روافض (۱) کی یہ من گھڑت حدیث ہے:

”عَلِيٌّ خَيْرُ الْبَشَرِ مَنْ شَكَّ فِيْهِ فَقَدْ كَفَرَ.“ (۲)

=حروبه وأن مخالفه مخطئ مع تقديم الشيخين وتفضيلهما...وأما التشيع في عرف المتأخرين فهو الرفض المحض فلا تقبل رواية الرافضي الغالي ولا كرامة.“ (تہذیب التہذیب:۱/۹۴)

”متقدمین کے عرف واصطلاح میں تشیع کا مفہوم یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو صرف سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دی جائے اور یہ کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی جنگوں میں حق بجانب تھے اور ان کے مخالف خطاء پر تھے اور وہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی تقدیم و تفضیل کے قائل تھے۔ اور متاخرین کے عرف واصطلاح میں تشیع کا مفہوم خالص رفض ہے نہ تو غالی رافضی کی روایت قبول کی جاسکتی ہے اور نہ اس کی عزت کی جاسکتی ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ متقدمین جن شیعہ روایوں سے روایت نقل کرتے تھے وہ تمام اصول و فروع میں اہل سنت والجماعت سے متفق تھے، صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا عثمان پر فضیلت دیتے تھے جب کہ اہل سنت کے ہاں اتنا نظریہ بھی اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت ہے۔ اور وہ شیعہ تو برملا تفضیل شیخین کے قائل تھے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے والوں مثلاً سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کو مخطی کہتے تھے، نہ کہ کافر و مرتد! آج اس نظریہ کے شیعہ کہاں ہیں؟! آج کے شیعوں کے بے شمار عقائد کفریہ و شرکیہ ہیں۔ (م)

(۱) روافض سب سے پہلے وہ کہلائے جنہوں نے خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خلیفہ دوم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا، بعض کہتے ہیں کہ یہ لقب کوفہ کے ان زیدیوں کو ملا جنہوں نے زید بن علی رضی اللہ عنہ کو اس پر چھوڑ دیا تھا کہ انہوں نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت نہیں کی تھی۔ بعض کے نزدیک عبد اللہ بن سبا کے ساتھی سب سے پہلے رافضی کہلائے۔ امام عامر بن شرحبیل شعبیؒ فرماتے ہیں کہ روافض یہود و نصاری سے بَتر ہیں، اس لیے کہ یہودی حضرت موسی علیہ السلام کے اصحاب کو اور نصاری حضرت عیسی علیہ السلام کے اصحاب کو سب سے بہترین سمجھتے ہیں اور جب کہ روافض رسول اللہ ﷺ کے اصحاب پر طرح طرح کے الزامات لگا کر انہیں مطعون کرتے ہیں! (التبصیر فی الدین للاسفر ایینی:۴۱-۴۲)

جمہور امت نے روافض کی تکفیر کی ہے اور اس کی بنیادی تین وجہیں ذکر کی ہیں: روافض کی تکفیر کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تحریف کے قائل ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ روافض چند صحابہ کے علاوہ باقی تمام صحابہ کرام کی تکفیر کرتے ہیں۔ روافض کی تکفیر کی تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ حضرات کو معصوم اور ان کی امامت کو منصوص مانتے ہیں۔

مزید تفصیل کے لیے یہ کتابیں دیکھئے: منہاج السنۃ، از شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، رد روافض، از مجدد الف ثانیؒ، تحفہ اثنا عشرہ، از شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، ہدایۃ الشیعہ، از علامہ رشید احمد گنگوہیؒ، ایرانی انقلاب، از مولانا منظور احمد نعمانیؒ، ارشاد الشیعہ، از شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ۔ (م)

(۲) دیکھئے: الموضوعات لابن الجوزی:۳۴۸، الاباطیل والمناکیر للجورقانی:۱/۳۱۳، اللآلی المصنوعہ للسیوطی: ۲/۳۰۰، تنزیہ الشریعہ لابن عراق:۱/۳۵۳۔ (م)

"علی رضی اللہ عنہ سب انسانوں میں بہتر ہیں، جو اس میں شک کرے گا وہ کافر ہے۔"[1]

(ج)۔ اسلام پر طعنہ زنی: اسلام پر طعنہ زنی کرنے کے لیے احادیث وضع کرنا، یہ زندیق[2] قسم لوگوں کا وہ گروہ ہے، جو کھلم کھلا اسلام کو نقصان دینے سے عاجز رہے، اس لیے انہوں نے وضع حدیث کا مکروہ طریقہ اختیار کیا اور اسلام کو بدنام کرنے کے لیے بے شمار حدیثیں گھڑ لیں، ان زندیقوں میں محمد بن سعید شامی[3] بھی ہے جس کو زندیقیت کی جرم کے پاداش میں سولی پر ٹکا دیا گیا تھا، اسی بدبخت نے مدعیان نبوت کے لیے راہ ہموار کرنے کے لیے حُمید کے واسطے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے:

---

[1] اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مامون بن احمد ہروی سے کسی نے کہا کہ خراسان میں تو امام شافعیؒ کے مقلدین روز بروز بڑھ رہے ہیں! تو اس نے فوراً حدیث وضع کرتے ہوئے کہا کہ: میں نے احمد بن عبداللہ سے سنا، اس نے عبداللہ بن معدان ازدی سے اور اس نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے۔

" «يَكُونُ فِي أُمَّتِي رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ مُحَمَّدُ بْنُ إِدْرِيسَ، أَضَرُّ عَلَى أُمَّتِي مِنْ إِبْلِيسَ، وَيَكُونُ فِي أُمَّتِي رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ أَبُو حَنِيفَةَ، هُوَ سِرَاجُ أُمَّتِي» . " (میزان الاعتدال:۳/۴۳۰، لسان المیزان:۵/۷)

"میری امت میں ایک شخص ہوگا جس کا نام محمد بن ادریس شافعی ہوگا جو میری امت کے لیے ابلیس سے بھی زیادہ نقصان دہ ہوگا کہ اس امت میں ایک دوسرا شخص ابو حنیفہ ہوگا جو میری امت کا چراغ ہوگا!"

اس شخص نے دیگر احادیث بھی وضع کی ہیں۔ دیکھئے: میزان الاعتدال:۳/۴۲۹۔ (م)

[2] زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا اعتراف کرنے کے باوجود کافرانہ عقائد رکھتا ہے، فقہ اسلامی میں یہ اصطلاح اس فاسد العقیدہ بدعتی کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کی تعلیم حکومت کے خطرہ بن جائے، بعض نے کہا کہ زندیق ثنویت کا قائل ہے جو دو خالقوں (یزدان واہرمن) کو مانتا ہے، زندیق اللہ تعالی اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اگر ایمان ظاہر بھی کرے تو درحقیقت باطن میں کافر ہوتا ہے، امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ زندقہ میں خدا کے وجود سے انکار پایا جاتا ہے۔ (کشاف اصطلاحات الفنون:۱/۹۳۱، القاموس الفقہی:۱۶۰) (م)

[3] محمد بن سعید شامی مصلوب، دمشق کے باشندے تھے، اس پر زندیقیت کا الزام لگا کر صولی پر لٹکایا گیا، امام احمدؒ اور سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ یہ کذاب ہے، حاکم کہتے ہیں کہ احادیث گھڑتا تھا۔ دار قطنی کہتے ہیں کہ متروک ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں کہ یہ وضع حدیث میں مشہور ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: میزان الاعتدال:۳/۵۶۱، الکامل فی ضعفاء الرجال:۷/۳۱۹۔ (م)

«أَنَا خَاتِمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ».[1]
”میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں، مگر جب اللہ چاہے۔“

اللہ تعالی کا بے حد کرم واحسان ہے، کہ اللہ تعالی نے فن جرح وتعدیل کے ماہرین اور ایسے نقاد محدثین پیدا کیے جنہوں نے صحیح کو سقیم سے اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کر کے رکھا دیا[2]۔

(د)۔ امراء اور سلاطین کا تقرب حاصل کرنا: ضعیف الایمان لوگوں نے حکام وقت کے خوشامدی اور غیر شرعی رجحانات اور ناجائز امور کو سند جواز فراہم کرنے کے لیے احادیث وضع کیے، جیسے

---

(1) تدریب الراوي ج١، ص٢٨٤. (ط)

(2) اللہ تعالی بے ایسے ناقدین اور بلند پا حفاظ ومحدثین پیدا کیے، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی کماحقہ حفاظت کی، اللہ تعالی نے نفوس قدسیہ کو ایسا ذوق وملکہ عطا فرمایا تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی حدیث پڑھی جاتی تو وہ یہ فیصلہ کر لیتے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے یا نہیں؟ یہ ایک وجدانی ذوق ہے جو اللہ تعالی ناقدین محدثین کو عطا فرماتے ہیں، امام حاکم نیسابوریؒ (م٤٠٥ھ) اور خطیب بغدادیؒ (م٤٦٣ھ) نے جلیل القدر تابعی ربیع بن خثیم کا قول نقل کیا ہے۔

” «إِنَّ مِنَ الْحَدِيثِ حَدِيثًا لَهُ ضَوْءٌ كَضَوْءِ النَّهَارِ نَعْرِفُهُ ، وَإِنَّ مِنَ الْحَدِيثِ حَدِيثًا لَهُ ظُلْمَةٌ كَظُلْمَةِ اللَّيْلِ نُنْكِرُهُ».“ (الکفایۃ:٤٣١، معرفۃ علوم الحدیث:٤٢٨)

”احادیث میں سے ایک حدیث ایسی ہوتی ہے جو روشن دن کی طرح چمکدار ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم اسے پہچان لیتے ہیں اور احادیث میں سے ایک حدیث ایسی ہوتی ہے جو رات کی تاریکی طرح سیاہ ہوتی ہے وہ ہمیں نامانوس لگتی ہے۔“

علامہ سیوطیؒ (م٩١١ھ) تدریب الراوی (١/٣٢٥) میں علامہ ابن الجوزیؒ (م٥٩٧ھ) کا قول نقل کرتے ہیں۔

” الْحَدِيثُ الْمُنْكَرُ يَقْشَعِرُّ لَهُ جَلْدُ الطَّالِبِ لِلْعِلْمِ، وَيَنْفِرُ مِنْهُ قَلْبُهُ فِي الْغَالِبِ.“

”منکر اور موضوع حدیث کی وجہ سے طالبِ حدیث کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات اس کا دل اس حدیث سے نامانوسیت محسوس کرتا ہے۔

شیخ الاسلام صالح بن عمر بن رسلان بلقینیؒ (م٨٦٨ھ) فرماتے ہیں۔

” وَشَاهِدُ هَذَا أَنَّ إِنْسَانًا لَوْ خَدَمَ إِنْسَانًا سِنِينَ، وَعَرَفَ مَا يُحِبُّ، وَمَا يَكْرَهُ، فَادَّعَى إِنْسَانٌ أَنَّهُ كَانَ =

کیے، جیسے غیاث بن ابراہیم کوفی[۱] کا قصہ ہے، ایک دفعہ غیاث بن ابرہیم کوفی امیر المؤمنین مہدی[۲] سے ملنے گیا، اتفاق سے خلیفہ مہدی کبوتر بازی میں مشغول تھا، غیاث نے موقع غنیمت سمجھ کر فوراً اسند متصل کیساتھ ایک حدیث گھڑلی، کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

«لَا سَبْقَ إِلَّا فِي نَصْلٍ، أَوْ خُفٍّ، أَوْ حَافِرٍ أَوْ جَنَاحٍ»[۳].

مقابلہ جائز نہیں مگر شمشیر زنی، نیزہ بازی، اونٹوں کی دوڑ، گھوڑا دوڑ، یا کبوتر بازی میں۔

= يَكْرَهُ شَيْئًا، يَعْلَمُ ذَلِكَ أَنَّهُ يُحِبُّهُ، فَبِمُجَرَّدِ سَمَاعِهِ يُبَادِرُ إِلَى تَكْذِيبِهِ.“ (تدریب الراوی:۱/۳۲۵)

”اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک انسان اگر دو سال تک کسی دوسرے انسان کی خدمت کرے اور اس کی پسند و ناپسند کو جان جائے۔ اب اس انسان کے بارے میں کوئی شخص دعویٰ کرے کہ وہ کسی ایسی چیز کو ناپسند کرتا ہے جس کے بارے میں اسے علم ہے کہ وہ اسے پسند کرتا ہے تو مطلق سماع ہی اسے فوری تکذیب پر آمادہ کرے گا۔“

امام ابن عُلیہؒ اور اسحاق بن ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک زندیق کو پکڑوا کر اس کی گردن اڑانے کا حکم دیا، اس پر اس نے وجہ پوچھی۔ جس کے جواب میں ہارون الرشید نے کہا کہ میں اللہ کے بندوں کو تیرے شر سے بچانے کے لیے یہ اقدام کر رہا ہوں! وہ زندیق کہنے لگا: تم ان چار ہزار موضوع روایات کا کیا کرو گے جو میں نے حرام و حلال کے متعلق گھڑی ہیں؟ ان میں ایک حرف بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں! ہارون الرشید نے کہا: اللہ کے دشمن! تمہیں امام ابو اسحاق فزاری اور امام عبد اللہ بن مبارکؒ جیسے اساطین علم کو نہیں جانتے؟! وہ تیری وضع کردہ روایات کو صحیح روایات سے اس طرح حرفاً حرفاً نکال باہر پھینکیں گے جس طرح گوندے ہوئے آٹے سے بال کو نکالا جاتا ہے۔ دیکھئے: تذکرۃ الحفاظ:۱/۲۷۳، تہذیب التہذیب:۱/۱۳۷۔ (م)

(۱) غیاث بن ابراہیم نخعی کوفی، ابو عبد الرحمن، حفص بن غیاث کے چچازاد تھے، امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ غیاث بن ابراہیم متروک الحدیث ہیں، محدثین نے ان کی روایات کو ناقابل اعتبار سمجھا ہے۔ امام یحیی بن معینؒ کہتے ہیں کہ غیاث بہت بڑا جھوٹا ہے اور غیر ثقہ راوی ہے۔ خالد بن ہیاج کہتے ہیں کہ میں سے اپنے والد سے سنا کہ غیاث بن ابراہیم اتنا جھوٹا ہے کہ اگر اس کے سر پر کوئی کوا اڑ جائے تو اس کے بارے میں بھی حدیث وضع کر دیتا۔ دیکھئے: الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم:۷/۵۷، تاریخ بغداد:۱۴/۲۷۶، میزان الاعتدال:۳/۳۳۷، لسان المیزان:۶/۳۱۱۔ (م)

(۲) محمد بن عبد اللہ بن محمد ہاشمی، ۱۲۷ کو پیدا ہوئے، عباسی دور کے خلیفہ تھے، عباسی خاندان کے مشہور خلیفہ ابو منصور کے صاحبزادے تھے، ۱۶۹ھ کو وفات پائی۔ (المنتظم فی تاریخ الملوک والامم:۷/۳۳۶، المعرفۃ والتاریخ: ۱/۱۲۵، البدایہ والنہایۃ:۱۰/۲۱۳)(م)

(۳) تدریب الراوی:۱/۳۳۷۔ (م)

اس روایت میں غیاث درباری نے خلیفہ مہدی کی خوشامدی اور چاپلوسی کی خاطر "أَوْ جَنَاحٍ" کے الفاظ بڑھادیے، لیکن مہدی اس کی چال کو سمجھ گیا اور کبوتروں کو ذبح کرنے کا حکم دیا اور کہنے لگا، میں نے ہی اس کو یہ حدیث وضع کرنے پر آمادہ کیا تھا، یعنی میری خوشامدی ہی اس حدیث گھڑنے کا سبب بنا، اور مہدی نے اسی خوشامد اور چاپلوسی جعل ساز کو اپنے دربار سے نکال دیا ، اور اس کے خواہش کے برعکس اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا، یعنی وہ خلیفہ کا قرب حاصل کرنے آیا ، لیکن اسی دربار سے دُھتکارا گیا[1]۔

(ھ)۔ طلب معاش اور شکم سیری: بعض بے ضمیر قسم کے لوگوں نے طلب معاش اور شکم سیری کی خاطر مختلف احادیث وضع کرتے اور لوگوں کو عجیب وغریب کہانیاں سناسنا کر چند دام کمالیتے ، اور لوگوں ان کے من گھڑت واقعات سن کر لطف اندوز ہوتے، اس میدان میں ابوسعید مدائنی کو بڑی شہرت ملی[2]۔

(ز)۔ شہرت طلبی: بعض وضاعین شہرت اور نام ونمود کی خاطر ایسی عجوبہ روزگار احادیث وضع کرلیتے، جن کا شیوخ احادیث کے پاس کوئی وجود نہ ہوتا، ایسی حدیثوں میں غرابت کا عنصر قائم

---

(۱) یہ واقعہ دیکھئے: تنزہ الشریعۃ:۱۴، میزان الاعتدال:۳/ ۲۴۱، المدخل للحاکم:۲۲۔(م)

(۲) واعظ اور قصہ گوحضرات لوگوں کی توجہ مبذول کرانے اوران سے مال وزر بٹورنے کے لیے عجیب وغریب قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ علامہ ابن قتیبہؒ (م۲۷۶ھ) ان پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"الْقُصَّاصُ عَلَى قَدِيمِ الْأَيَّامِ، فَإِنَّهُمْ يُمِيلُونَ وُجُوهَ الْعَوَامِّ إِلَيْهِمْ وَيَسْتَدِرُّونَ مَا عِنْدَهُمْ: بِالْمَنَاكِيرِ، وَالْغَرِيبِ، وَالْأَكَاذِيبِ مِنَ الْأَحَادِيثِ. وَمِنْ شَأْنِ الْعَوَامِّ، الْقُعُودُ عِنْدَ الْقَاصِّ، مَا كَانَ حَدِيثُهُ عَجِيبًا، خَارِجًا عَنْ فِطَرِ الْعُقُولِ، أَوْ كَانَ رَقِيقًا يُحْزِنُ الْقُلُوبَ، وَيَسْتَغْزِرُ الْعُيُونَ. فَإِذَا ذَكَرَ الْجَنَّةَ، قَالَ فِيهَا الْحَوْرَاءُ مِنْ مِسْكٍ، أَوْ زَعْفَرَانٍ، وَعَجِيزَتُهَا مِيلٌ فِي مِيلٍ. وَيُبَوِّئُ اللهُ تَعَالَى وَلِيَّهُ قَصْرًا مِنْ لُؤْلُؤَةٍ بَيْضَاءَ، فِيهِ سَبْعُونَ أَلْفَ مَقْصُورَةٍ، فِي كُلِّ مَقْصُورَةٍ سَبْعُونَ أَلْفَ قُبَّةٍ ... فِي كُلِّ قُبَّةٍ سَبْعُونَ أَلْفَ فِرَاشٍ عَلَى كُلِّ فِرَاشٍ سَبْعُونَ أَلْفَ كَذَا، فَلَا يَزَالُ فِي سَبْعِينَ أَلْفَ كَذَا، وَسَبْعِينَ أَلْفًا؛ كَأَنَّهُ يَرَى أَنَّهُ لَا يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ الْعَدَدُ فَوْقَ السَّبْعِينَ وَلَا دونهَا. وَيَقُولُ: لَأَصْغَرُ مَنْ فِي الْجَنَّةِ مَنْزِلَةً عِنْدَ اللهِ، مَنْ يُعْطِيهِ =

رکھنے کے لیے اسناد میں تغیر و تبدیل کر دیا جاتا تھا، تاکہ سامعین میں شوق ورغبت پیدا ہو۔ اس میدان میں ابن ابی حیہ [۱] اور حماد نصیبی [۲] کا نام جانا پہچانا ہے [۳]۔

= اللهُ تَعَالَى مِثْلَ الدُّنْيَا كَذَا وَكَذَا ضِعْفًا، وَكُلَّمَا كَانَ مِنْ هَذَا أَكْثَرَ، كَانَ الْعَجَبُ أَكْثَرَ، وَالْقُعُودُ عِنْدَهُ أَطْوَلَ، وَالْأَيْدِي بِالْعَطَاءِ إِلَيْهِ أَسْرَعَ. " (تاویل مختلف الحدیث:۴۰۵)

"واضعین حدیث میں قصہ گولوگ پیش پیش ہیں، جولوگوں کو امم سابقہ کے واقعات سناتے ہیں اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اوران نے مال ومتاع بٹورتے ہیں اور عوام کا حال یہ ہے کہ وہ قصہ گو کے پاس بیٹھتے ہیں تاکہ ایسی بات سنیں جو عجیب ہو اور عقل سے بعید ہو، یا اتنی رقت انگیز ہو کہ دل غمگین ہو جائیں اور آنکھیں پر نم ہوں۔ اور جب وہ جنت کا تذکرہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں: اس میں کستوری اور زعفران کی حوریں ہوں گی اور اس کا راستہ میلوں لمبا ہو گا اور اللہ تعالی اپنے ولی کے لیے موتیوں کا محل بنائے گا، اس میں ستر ہزار کمرے ہوں گے، ہر کمرے میں ستر ہزار رقبے ہوں گے۔ ہمیشہ سات ہزار کی بات اور اس عدد سے کم یا زیادہ کی بات نہ ہو گی، جب کبھی اس سے زیادہ کی بات ہو گی تو زیادہ تعجب انگیزی ہو گی اور اتنا ہی زیادہ لوگ بیٹھیں گے اور نذرانہ کے لیے اتنا ہی جلدی ہاتھ بڑھیں گیں۔"(م)

(۱) یحیی بن ابی حیہ، ابوجناب کلبی۔ ضعیف اور متکلم فیہ راوی ہیں، امام یحیی بن سعید قطان فرماتے ہیں کہ میں ابن ابی حیہ سے روایت کرنا جائز نہیں سمجھتا۔ امام نسائی اور دار قطنی کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، ابوزرعہ کہتے ہیں کہ صدوق مدلس ہے، فلاس کہتے ہیں کہ متروک ہے۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال:۹/ ۵۰، تہذیب التہذیب: ۱۱/ ۲۰۱، میزان الاعتدال :۴/ ۳۷۱)

(۲) حماد بن عمرو نصیبی، جوزجانی کہتے ہیں کہ حماد بن عمرو نصیبی جھوٹا تھا۔ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ منکر الحدیث تھا۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں حماد بن عمرو متروک الحدیث تھے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ احادیث گھڑتا تھا۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال: ۳/ ۱۰، دیوان الضعفاء:۱۰۱، میزان الاعتدال:۱/ ۵۹۸، لسان المیزان:۳/ ۲۷۴)(م)

(۳) تدریب الراوی ج۱، ص۲۸۶. (ط)

بعض لوگوں اپنی بزرگی اور شرافت کو چمکانے کے لیے جعلی احادیث وضع کرتے ہیں، جیسے رتن ہندی جو چھٹی صدی ہجری میں پیدا ہوتا تھا اور وہ کہا کرتا تھا۔

"كنت في زفاف فاطمة وجماعة من الصّحابة، وكان ثمّ من يغنّي شيئا فطابت قلوبنا و رقصنا، فلما كان الغد سألنا رسول الله ﷺ عن ليلتنا، فدعا لنا ولم ينكر علينا فعلنا، وقال: =

۷۔ وضع حدیث میں فرقہ کرامیہ (۱) کے مذاہب:

کرامیہ مبتدعین کا ایک فرقہ ہے، ان کا نظریہ یہ ہے کہ صرف ترغیب وترہیب کے لیے احادیث گھڑنا جائز ہے، (۲) ان کی دلیل یہ حدیث ہے: "«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا»."
"جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا۔"

اس حدیث کے بعض طرق میں "لِيُضِلَّ بِهِ النَّاسَ" کا اضافہ بھی ہے، لیکن محققین

= «اخشوشنوا وامشوا حفاة تروا الله جهرة»." (الاصابة:۱/۴۳۶، لسان المیزان:۲/۴۵۵، تذکرۃ الموضوعات للفتنی:۱۰۳-۱۰۴)

"میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شب عروسی میں دوسرے صحابہ کیساتھ موجود تھا، رات کو کسی نے مجلس سرور وغنا شروع کی، ہمارے دل ہمارے قبضہ میں نہ رہے اور ہم نے ساری رات رقص میں گزار دی۔ صبح کو رسول اللہ ﷺ نے ہم نے پوچھا: ہم نے انہیں رات کا سارا ماجرا سنایا۔ آپ ﷺ نے ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہمارے حق میں دعا کی اور فرمایا: موٹے کپڑے پہنا کرو اور ننگے پاؤں چلا کرو تو اللہ کو ظاہر باہر دیکھوگے!"

یہ اس رتن ہندی کذاب ودجال کا گھڑا ہوا جھوٹا قصہ ہے، رتن ہندی نہ صحابی بھی تھا اور نہ ہی کوئی نیک انسان! بلکہ وہ ایک کذاب ودجال اور بے ایمان تھا۔ دیکھئے: میزان الاعتدال:۲/۴۵۔

مذکورہ اغراض کے علاوہ بعض دیگر وجوہات بھی ہیں، مثلاً بعض وعناد کی وجہ سے حدیث وضع کرنا، اپنی تجارت کو چمکانے کے لیے حدیث گھڑنا اور ذاتی مفاد کے لیے حدیث وضع کرنا وغیرہ۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: منہج النقد فی علوم الحدیث:۳۰۲-۳۰۷، معرفہ علوم الحدیث، ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف:۲۴۳-۲۴۸۔(م)

(۱) کرامیہ محمد بن کرام کے پیرو ہیں، یہ لوگ غرجستان، نیشاپور اور ان کے گردونواح میں بکثرت موجود ہیں، یہ اللہ تعالی کے صفات کے قائل ہونے کیساتھ تجسیم وتشبیہ بھی قائل ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی عرش پر بطور استقرار جلوہ افروز ہے، بعض کرامیہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالی عرش کے بعض حصوں پر جلوہ فرما ہے، جب کہ بعض کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی عرش پر ایسے متمکن ہے کہ عرش اس سے بھر گیا۔ کرامیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی کی ذات میں (العیاذ باللہ!) بہت سے حوادث موجود ہیں، جیسے ماکان ومایکون کی خبر دینا، قصص وواقعات، وعد ووعید وغیرہ۔(التبصیر فی الدین للاسفرائینی:۱۱۱، الفرق بین الفرق:۲۰۲)(م)

(۲) امام محمد بن محمد غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں۔

"وَهَذَا من نزغات الشَّيْطَان فَفِي الصدْق مندوحة عَن الْكَذِب وَفِيمَا ذكر الله وَرَسُوله غنية عَن الاختراع فِي الْوَعْظ." (تنزیہ الشریعہ:۱/۱۲)

"یہ شیطانی وساوس ہیں اور صداقت کے ہوتے ہوئے جھوٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالی اور اس کے =

حفاظ حدیث کے نزدیک یہ اضافہ ثابت نہیں، بلکہ یہ ان کا خود ساختہ اور خانہ زاد ایجاد ہے۔
بعض وضاعین یہ کہتے ہے:

"إِنَّمَا نَكْذِبُ لَهُ لَا عَلَيْهِ."

ہم رسول اللہ ﷺ کی نصرت وحمایت میں جھوٹ بولتے ہے، آپ ﷺ کے مخالفت میں نہیں بولتے ہے، لیکن ان جعل سازو کا یہ استدلال انتہائی شرمناک اور گھٹیا ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت بیضاء کی اشاعت وترویج کے لیے ایسے جھوٹوں اور دجالوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

فرقہ کرامیہ کا یہ بے بنیاد نظریہ اجماع امت کے بالکل متصادم ہے، امام الحرمین ابو مسعد جوینیؒ[1] وضاعین حدیث کی تکفیر کی ہے، اور انہی یقینی طور پر کافر قرار دیا ہے[2]۔

۸۔ بعض تفاسیر میں موضوع احادیث:

=رسول ﷺ کے سچے ارشادات کافی ہیں، جو روایتیں گھڑ لینے سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔"(م)

[1] عبد اللہ بن یوسف بن محمد بن حیویہ جوینی، ابو محمد، جوین (نیشاپور کا قصبہ ہے) میں پیدا ہوئے، عظیم مفسر، لغوی اور فقیہ تھے، نیشاپور میں رہائش پذیر تھے اور وہیں ۴۳۸ھ کو وفات پائی۔ (الانساب:۳/۳۸۵، سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۶۱۷، شذرات الذہب:۳/۲۶۱، الاعلام للزرکلی:۴/۱۴۶)(م)

[2] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کرامیہ اور متصوفہ کے نظریہ کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"وهو خطأٌ مِن فاعلِهِ، نشأَ عَن جهلٍ، لأنَّ التَّرغيبَ والتَّرهيبَ مِن جُمْلة الأحكامِ الشَّرعيَّةِ، واتَّفقوا على أَنَّ تعمُّدَ الكذبِ على النبيِّ صلَّى اللهُ عليهِ وسلَّمَ مِن الكَبائِرِ، وبالَغَ أبو محمد الجُوَيْنِيُّ فكَفَّرَ مَن تعمَّدَ الكذبَ على النبيِّ ﷺ." (نزہۃ النظر:۱۱۲)

"یہ غلط نقطہ نظر ہے جو جہالت پر مبنی ہے اس لیے ترغیب وترہیب بھی احکام شرعیہ میں سے ہے اور اس پر علماء کا تفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کرنا کبائر میں سے ہے، امام ابو محمد جوینی نے تو یہ یہاں تک کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر عمداً جھوٹ گھڑنے والا کافر ہے۔"

علامہ ابن عراق کنانیؒ (م ۹۶۳ھ) فرماتے ہیں کہ حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) نے ابو الفضل ہمدانیؒ (م ۲۸۴ھ) سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ابو محمد جوینیؒ کی تاکید کی ہے۔

امام شمس الدین ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) نے "الکبائر" میں کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر قصداً جھوٹ گھڑنا کفر ہے۔ دیکھئے: تنزیہ الشریعہ:۱/۱۲۔(م)

بعض مفسرین نے اس غلطی کا ارتکاب کیا کہ انہوں نے اپنی تفاسیر میں موضوع احادیث روایت کی ہیں، اور ان کے موضوع ہونے پر کوئی تنبیہ نہیں فرمائی بالخصوص وہ احادیث جو قرآن مجید کی ایک ایک سورت کے عنوان پر سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ [1] سے روایت کر کے بیان کی گئی ہیں ،ان میں چند مفسرین یہ ہے:

۱۔ ثعلبی [2]

۲۔ واحدی [3]

---

[1] سیدنا ابی بن کعب بن قیس بن عبید، ابو منذر رضی اللہ عنہ، جلیل القدر صحابی رسول ہیں، خزرج کے قبیلہ بنی نجار سے تعلق تھا، اسلام لانے سے پہلے آپ یہود کے جید عالم تھے اور یہودی مذہب سے خوف آگاہ تھے، جب مشرف باسلام ہوئے تو کاتب وحی مقرر ہوئے، غزوہ بدر، احد، خندق اور دیگر تمام غزوات میں شریک ہوئے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے جمع قرآن کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا، آپ کی مرویات کی تعداد ۱۶۴ ہے۔ مدینہ منورہ میں ۲۱ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:۱/ ۶۵، اسد الغابۃ:۱/ ۱۶۸، الاصابۃ:۱/ ۱۸۰، الاعلام:۱/ ۸۲)(م)

[2] علی بن احمد بن محمد بن علی بن مَتُّویہ، نیشاپوری، شافعی، ابو الحسن واحدی، بہت بڑے مفسر اور ادیب تھے، آپ کے آباء واجداد تاجر تھے اور اصل میں ساوہ (جورای اور ہمذان کے درمیان واقع ہے) کے باشندے تھے، امام ذہبیؒ نے اس کو امام التاویل کے لقب سے نوازا ہے۔ انہوں نے "البسیط، الوسیط، الوجیز" کے نام سے تین تفسیریں لکھیں، امام غزالیؒ نے ان کی اتباع میں اپنی تین کتابیں ان ہی ناموں سے موسوم کیں۔ نیشاپور میں ۴۶۸ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء:۱۸/ ۳۳۹، وفیات الاعیان:۲/ ۲۲۳، النجوم الزاہرۃ:۵/ ۱۰۴، الاعلام:۴/ ۲۵۵)(م)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م۷۲۸ھ) فرماتے ہیں کہ واحدی ثعلبی کے خوشہ چین ہیں، عربیت میں ثعلبی سے فائق ہیں، لیکن اتباع سلف سے کوسوں دور ہیں۔ (مجموع الفتاوی:۱۳/ ۱۵۸)(م)

[3] احمد بن محمد بن ابراہیم ثعلبی، ابو اسحاق، مشہور مفسر، لغوی اور مؤرخ ہیں، نیشاپور کے باشندے تھے۔ ان کی مشہور تفسیر "الکشف والبیان فی تفسیر" علمی حلقوں میں متداول ہے۔ ۴۲۷ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء:۱۷/ ۴۳۵، طبقات المفسرین للسیوطی:۲۸، وفیات الاعیان:۱/ ۷۹، الاعلام للزرکلی:۱/ ۲۱۲)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م۷۲۸ھ) ان کی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "ثعلبی متدین اور نیک آدمی تھے، لیکن حاطب لیل تھے، تفسیر کے متعلق انہیں جو کچھ ملتا اسے بلاخوف وخطر نقل کر دیتے، صحیح ا، ضعیف اور موضوع کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔" (مجموع الفتاوی:۱۳/ ۱۵۸)(م)

۳۔ زمخشری[1]

۴۔ بیضاوی[2]

۵۔ شوکانی[3]۔

۹۔موضوعات پر معروف تصانیف:

(الف)۔ کتاب الموضوعات، یہ امام ابن جوزیؒ کی تالیف ہے، اس کا شمار فن کے قدیم ترین تصانیف میں ہوتا ہے، تاہم امام ابن جوزی بعض احادیث پر وضع کا حکم لگانے میں متساہل ہیں، اس لیے متاخرین علماء نے اس پر تنقید کی ہے اور ان پر تعاقب کیا۔

(ب)۔ اللآلئ المصنوعة في الأحاديث الموضوعة: یہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی تصنیف لطیف ہے، یہ کتاب دراصل امام ابن الجوزیؒ کی کتاب الموضوعات کا اختصار ہے، اس میں امام ابن الجوزیؒ پر تعاقب اور کچھ احادیث کا اضافہ ہے۔

---

[1] محمود بن عمر بن محمد بن احمد خوارزمی، زمخشری، جاراللہ، ابوالقاسم، زمخشر (جو خوارزم کا ایک قصبہ ہے) میں ۴۶۷ھ کو پیدا ہوئے، طویل عرصے تک مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے "جاراللہ" کہلائے، تفسیر، لغت، بلاغت، ادب وعربیت کے امام تھے، حصول علم کے سلسلہ میں طویل اسفار کیے اور آخر میں جرجانیہ (خوارزم) لوٹ آئے اور وہیں ۵۳۸ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲۰/ ۱۵۱، وفیات الاعیان: ۵/ ۲۹۷، تذکرۃ الحفاظ: ۴/ ۱۲۸۳، الاعلام للزرکلی: ۷/ ۱۷۸)(م)

[2] عبداللہ بن عمر بن محمد بن علی شیرازی شافعی، ابوسعید، یا ابوالخیر، ناصر الدین بیضاوی، بیضاء (شیراز کا ایک قصبہ ہے) میں پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم مفسر، لغوی، منطقی، متکلم، عابد وزاہد اور متبحر عالم تھے، ایک عرصے تک شیراز کے قاضی رہے، ان کی تفسیر دراصل "کشاف" کی تلخیص واختصار ہے، اس لیے اسے "مختصر الکشاف فی التفسیر" بھی کہتے ہیں۔ تبریز میں ۶۸۵ھ کو وفات پائی۔ (البدایہ اولنہایۃ: ۱۳/ ۳۰۹، طبقات المفسرین للداوٗدی: ۱/ ۲۴۸، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۱۱۰)(م)

[3] محمد بن علی بن محمد بن عبداللہ شوکانی، شوکان جو خولان (یمن کا ایک شہر ہے) میں ۱۱۷۳ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور میں عظیم مفسر، محدث، نحوی اور اصولی تھے، صنعاء میں رہائش پذیر تھے، ۱۲۲۹ھ میں تیس سال کی عمر میں صنعاء کے حاکم نامزد ہوئے، تقلید ائمہ کو حرام سمجھتے تھے۔ ۱۱۴ کتابوں کے مصنف تھے۔ اور صنعاء ہی میں ۱۲۵۰ کو وفات پائی۔ (البدر الطالع: ۲/ ۲۱۴، ایضاح المکنون: ۲/ ۱۱، ہدیۃ العارفین: ۲/ ۳۶۵ الاعلام للزرکلی: ۶/ ۲۹۸)(م)

(ج)۔ تنزيه الشريعة المرفوعة عن الأحاديث الشنيعة الموضوعة: یہ علامہ ابن عراق کنانیؒ[1] تالیف ہے، یہ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کی نہایت مفید اور جامع تلخیص ہے[2]۔

---

[1] علی بن محمد بن علی بن عبد الرحمن، ابن عراق، کنانی، نور الدین، دمشق میں ۹۰۷ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے بہت بڑے فقیہ، محدث اور صوفی تھے، حجاز مقدس کا سفر کیا اور مدینہ منورہ میں امامت کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور وہیں ۹۶۳ھ میں وفات پائی۔ (شذرات الذہب: ۸/۳۳۷، الاعلام للزرکلی: ۵/۱۲)(م)

[2] موضوعات پر مزید تصانیف یہ ہیں:

التذكرة في الأحاديث الموضوعات، از محمد بن قيسراني (م ۵۰۷ھ).

الأباطيل والمناكير والصحاح والمشاهير از جوز قانیؒ (م ۵۴۳ھ).

موضوعات الصاغاني، از علامہ صاغانیؒ (م ۶۵۰ھ).

الدر الملتقط في تبيين الغلط ونفي اللغط از علامہ صاغانیؒ (م ۶۵۰ھ).

مختصر الأباطيل والموضوعات، از امام ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ).

المنار المنيف في الصحيح والضعيف، از حافظ ابن قیمؒ (م ۷۵۱ھ).

الموضوعات في الإحياء، از علامہ عراقیؒ (م ۸۰۶ھ).

تحذير الخواص من أكاذيب القصاص، از جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ).

تذكرة الموضوعات، از علامہ محمد بن طاہر فتنی ہندیؒ (م ۹۸۶ھ).

الأسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة، از ملا علی قاریؒ (م ۱۰۱۴ھ).

المصنوع في معرفة الحديث الموضوع، از ملا علی قاریؒ (م ۱۰۱۴ھ).

الآثار المرفوعة في الأحاديث الموضوعة، از علامہ عبد الحی الکنوی (م ۱۳۰۴ھ). (م)

۲۔حدیث متروک (۱)

جب راوی میں طعن کا سبب ”تہمت کذب“(جھوٹ کی تہمت)ہو تو ایسی حدیث کو محدثین کرام کے اصطلاح میں متروک کہتے ہیں (۲)، تہمت کذب راوی من جملہ اسباب جرح میں دوسرا سبب ہے، جس کا تعلق عدالت کیساتھ ہے۔

ا۔متروک حدیث کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

متروک ”التَّرك“ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، عرب انڈے کے اس خول کو جس سے بچہ نکل چکا ہو ”التَّرِيكة“ کہتے ہیں، جس کا معنی ہے، ایسی چھوڑی ہوئی چیز جس کا کوئی فائدہ نہ ہو (۳)۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

متروک وہ حدیث ہے جس کی سند میں کوئی راوی متہم بالکذب (جس پر جھوٹ کی تہمت ہو) ہو (۴)۔

۲۔راوی متہم بالکذب ہونے کے اسباب وعلل:

راوی درج ذیل دوسببوں میں سے کسی ایک سبب کی بنیاد پر راوی متہم بالکذب بن جاتا ہے:
(الف)۔ یہ حدیث اس راوی کے علاوہ کسی سے مروی نہ ہو اور قواعد معلومہ کے بھی خلاف ہو (۵)۔

---

(۱) خبر مردود کی اس قسم کو حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے اس سے پہلے حافظ ابن الصلاحؒ اور علامہ نوویؒ نے اسے ذکر نہیں کیا ہے۔ (ط)

(۲) نزہۃ النظر:۱۱۲۔(م)

(۳) القاموس ج۳ص۳۰۶.(ط)لسان العرب:۱۰/۴۰۵۔(م)

(۴) نزہۃ النظر:۴۸۔(ط)

(۵) قواعد معلومہ سے مراد وہ عام قواعد ہیں، جن کا علماء نے نصوص عامہ سے استنباط کیا ہو۔ جیسے یہ قاعدہ ہے:”الأصل براءة الذمة“۔(ط)

(ب)۔ راوی اپنی روزمرہ گفتگو میں جھوٹ بولنے میں معروف ہو، لیکن حدیث نبوی میں اس کا جھوٹ ثابت نہ ہو[1]۔

۳۔ حدیث متروک کی مثال:

عمرو بن شمر جعفی[2] کوفی کی یہ روایت ہے:

"عَنْ جَابِرٍ عَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ عَنْ عَلِيٍّ، وَعَمَّارٍ كَانَ النَّبِيَّ ﷺ: كَانَ يَقْنُتُ فِي الْفَجْرِ، وَيُكَبِّرُ يَوْمَ عَرَفَةَ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ، وَيَقْطَعُ صَلَاةَ الْعَصْرِ آخِرَ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ."[3]

"عمرو بن شمر جعفی جابر سے وہ ابو طفیل سے وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ[4] اور سیدنا عمار رضی اللہ عنہ[5] سے روایت کرتے ہیں، یہ دونوں صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں قنوت پڑھتے تھے اور عرفہ کے

---

(1) نزہۃ النظر: ۱۰۶۔ (م)

(2) عمرو بن شمر جعفی کوفی شیعی، ابو عبد اللہ۔ امام جوزجانیؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں یہ گمراہ وکذاب تھا۔ امام بخاریؒ اور امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں یہ منکر الحدیث تھا۔ امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ عمرو بن شمر رافضی تھا، صحابہ کرام کو گالیاں دیتا تھا اور ثقات کے نام سے موضوعات نقل کرتا تھا۔ دیکھئے: احوال الرجال: ۵۶، میزان الاعتدال: ۳/ ۲٦۸، الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ٦/ ۲۳۹، المجروحین لابن حبان: ۲/ ۴۱۔ (م)

(3) سنن دار قطنی (۲/ ۳۸۹، رقم: ۱۷۳۴) میں یہ حدیث ان الفاظ کیساتھ مروی ہے:

"عَنْ جَابِرٍ عَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ عَنْ عَلِيٍّ وَعَمَّارٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ" كَانَ يَجْهَرُ فِي الْمَكْتُوبَاتِ بِـ {بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ} [الفاتحة: ١]، وَكَانَ يَقْنُتُ فِي الْفَجْرِ، وَكَانَ يُكَبِّرُ يَوْمَ عَرَفَةَ صَلَاةَ الْغَدَاةِ، وَيَقْطَعُهَا صَلَاةَ الْعَصْرِ آخِرَ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ." (م)۔

(4) سیدنا علی بن ابی طالب بن عبد المطلب ہاشمی، قریشی، ابو الحسن، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ، ۲۳ قبل از ہجری کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، رسول اللہ ﷺ کے چچازاد اور داماد تھے، چوتھے خلیفہ راشد، سابقون الاولون اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے سایہ عاطفت میں پلے بڑھے۔ ۳۵ھ کو خلیفہ نامزد ہوئے، ۴۰ھ میں عبد الرحمن بن ملجم نامی خارجی نے انہیں شہید کیا۔

(الاستیعاب: ۳/ ۱۰۸۹، اسد الغابہ: ۴/ ۸۷، الاصابہ: ۴/ ۴٦۴، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۲۹۵) (م)

(5) عمار بن یاسر بن عامر کنانی مذحجی عنسی قحطانی، ابو یقظان رضی اللہ عنہ، ۵۷ قبل از ہجری پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی تھے، سابقون الاولون میں سے تھے، مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، غزوہ بدر، احد، خندق اور بیعۃ =

دن فجر کی نماز سے ہی تکبیر پڑھتے تھے اور ایام تشریق کے آخری اور نماز عصر کیساتھ تکبیرات کہنا بند کر دیتے تھے۔"

اس حدیث کی سند میں عمرو بن شمر جعفی کوفی ہے، اس کے متعلق امام نسائیؒ[1]، امام دار قطنیؒ اور دیگر محدثین کرام فرماتے ہیں کہ یہ متروک ہے۔[2]

۴۔حدیث متروک کا مرتبہ:

یہ بات ما قبل بیان ہو چکی ہے، کہ ضعف حدیث کی بدترین قسم موضوع ہے، اس کے بعد متروک کا درجہ ہے، پھر منکر، پھر معلل، پھر مدرج، پھر مقلوب اور پھر مضطرب ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اسی طرح ترتیب بیان کی ہے[3]۔*

= الرضوان شریک ہوئے، ان سے ٦٢ احادیث مروی ہیں۔ان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مدینہ میں مسجد قباء تعمیر کی، سیدنا عمرؓ کے دور خلافت میں کوفہ کے امیر رہے، جنگ جمل اور جنگ صفین میں سیدنا علیؓ کے ہمنوا تھے، ۹۳ سال کی عمر میں جنگ صفین شہید ہوئے۔ (الاستیعاب:۳/۱۱۳۵، اسد الغابہ:۴/۱۲۲، الاصابہ: ۴/۳۷۳، الاعلام للزرکلی:۵/۳۶)(م)

[1] احمد بن علی بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار، ابو عبد الرحمن، نسائیؒ، ۲۱۶ھ کو پیدا ہوئے، اصل میں نساء (خراسان) کے تھے، اپنے دور کے عظیم محدث، ناقد رجال اور حافظ حدیث تھے، حصول علم کے سلسلے میں دور دراز کے علمی اسفار کیے، مصر میں رہائش پذیر ہوئے، وہاں کے مشایخ نے ان کیساتھ حسد شروع کیا اور انہیں رملہ (فلسطین) جانے پر مجبور کیا، یہاں کسی نے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بارے میں ان سے سوال کیا تو یہ خاموش ہوئے، اس پر لوگوں نے بہت مارا، جس کی وجہ سے بیمار ہوئے اور ۳۰۳ھ میں وفات پائی۔ (وفیات الاعیان:۱/۷۷، تذکرۃ الحفاظ:۲/۶۲۸، الاعلام للزرکلی:۱/۱۷۱)(م)

[2] میزان الاعتدال ج۳، ص۲۶۸. (ط)

[3] تدریب الراوی:۱/۲۹۵، نزہۃ النظر:۴۶۔(ط)

* متروک کے لیے مطروح کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے، علامہ طاہر الجزائریؒ (م۱۳۳۸ھ) کہتے ہیں ممکن ہے کہ متروک کا دوسرا نام مطروح ہو۔لیکن بعض کے نزدیک یہ مستقل قسم ہے، ڈاکٹر نورالدین عترحفظہ اللہ نے اس رائے کو امام ذہبیؒ (م۷۴۸ھ) کی طرف منسوب کیاہے۔ دیکھئے: توجیہ النظر فی اصول الاثر:۲۵۳، منہج النقد فی علوم الحدیث:۳۰۰۔(م)

۳۔ حدیث منکر[1]

جب راوی میں طعن کا سبب فحش غلطی یا کثرت غفلت یا فسق ہو تو ایسی حدیث کو منکر کہتے ہیں اور یہ راوی میں طعن کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں سبب ہے[2]۔

ا۔ منکر کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

منکر "انکار" (افعال) مصدر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، اور انکار اقرار کی ضد ہے۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام نے "منکر" کی متعدد تعریفیں کی ہیں، جن میں درج ذیل دو تعریفیں زیادہ مشہور ہیں:

ا۔ منکر وہ حدیث ہے، جس کی سند میں ایک راوی ایسا ہو جو فحش غلطی یا کثرت غفلت یا علانیہ طور پر فسق میں مبتلاء ہو۔

یہ تعریف حافظ ابن حجرؒ نے بعض اہل علم سے نقل کی ہے[3] اور عمرو بن معمر بیقونیؒ نے بھی اپنے منظوم قصیدہ[4] میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

"والمُنْكَرُ" الفَردُ بهِ رَاوٍ غَدَا   تَعْدِيلُهُ لا يحْمِلُ التَّفَرُّدَا

ترجمہ: اور منکر وہ حدیث ہے، جس کا راوی متفرد ہو اور اس کی تعدیل اس کے تفرد کا تحمل

---

(۱) مقدمة ابن الصلاح:۱۶۹، إرشاد طلاب الحقائق:/ ۲۱۹، التقريب:۶۹، الاقتراح: ۱۹۸، المنهل الروي:۵۱، الموقظة:۴۲، اختصار علوم الحديث:۵۸، المقنع في علوم الحديث: ۱/ ۱۷۹، شرح التبصرة والتذكرة: ۱/ ۳۲۹، نزهة النظر:۲۱۴، فتح المغيث:۱/ ۱۹۰، ألفية السيوطي:۳۹، شرح السيوطي على ألفية العراقي:۱۷۹، فتح الباقي:۱/ ۱۹۷، توضيح الأفكار:۲/ ۳، ظفر الأماني:۳۵۶، قواعد التحديث:۱۳۱.(م)

(۲) نزهة النظر:۲۲۵۔(م)

(۳) نزهة النظر:۲۲۵۔(م)

(۴) شرح البيقونية للعثيمين:۸۔(م)

نہ کرسکے [1]۔

۲۔ منکر وہ حدیث ہے جس کا راوی ضعیف ہونے کے باوجود ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو [2]۔

یہ تعریف حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کی ہے اور اس کو معتمد قرار دیا ہے، کیونکہ اس تعریف میں ایک قید اول الذکر تعریف سے زیادہ ہے اور وہ یہ ہے، ضعیف راوی کی ضعف کے باوجود ثقہ رواۃ کی مخالفت کرنا۔

۲۔ منکر اور شاذ میں فرق:

منکر اور شاذ میں فرق ہے:

(الف)۔ شاذ وہ حدیث ہے کہ اس کا راوی ثقہ اور مقبول [3] ہو، لیکن یہ اپنے سے اعلیٰ درجہ کے ثقات کا مخالفت کرتا ہو۔

(ب)۔ منکر وہ حدیث ہے کہ اس کا راوی خود ضعیف ہونے کے باوجود ثقہ رواۃ کی مخالفت کرتا

---

[1] بعض محدثین نے منکر کی اصطلاح کے استعمال میں وسعت اختیار کی اور اس سے مراد راوی کا تفرد کیا، مخالفت ہو یا نہ ہو اور خواہ متفرد ثقہ بھی ہو، یہ تعبیر کئی صورتوں پر مشتمل ہے اور ہر صورت کے لیے محدثین نے "منکر" کی اصطلاح استعمال کی ہے، حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) نے تفرد کے مطلق استعمال کے سلسلے میں حافظ ابو بکر بردیجیؒ (م ۳۰۱ھ) کے حوالے سے منکر کی تعریف ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

"أَنَّهُ: الحديثُ الذي ينفردُ بِهِ الرجلُ ولا يُعْرَفُ مَتْنُهُ مِنْ غيرِ روايتِهِ، لا مِنَ الوجهِ الذي رواهُ منهُ، ولا مِنْ وجهٍ آخرَ. "(مقدمۃ ابن الصلاح:۱۶۹)

"وہ حدیث جس میں راوی منفرد ہو اور اس کی روایت کے بغیر اس کا متن معروف نہ ہو، نہ اس روایت کے طریق سے اور نہ اس کے علاوہ کسی اور طریق سے معروف ہو۔"

اس کے بعد حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ تفرد پر منکر یا شاذ ہونے کا حکم بہت سے محدثین نے لگایا ہے۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۷۰۔

[2] نزہۃ النظر: ۲۱۴، تدریب الراوی: ۱/ ۲۸۰۔ (م)

[3] مقبول سے مراد وہ مفہوم ہے جو صحیح اور حسن دونوں حدیثوں کے راوی کو شامل ہے، یعنی عادل اور قوی حافظہ والا یا عادل جس کا حافظہ کمزور نہ ہو۔ (م)

ہو[۱]۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شاذ اور منکر دوموں مخالفت ثقات کی شرط میں باہم مشترک ہیں، تاہم اس بات میں مختلف ہیں کہ شاذ کا راوی مقبول ہوتا ہے اور جبکہ منکر کا راوی ضعیف ہوتا ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص شاذ اور منکر دونوں کو ایک قرار دے تو یہ اس کی غفلت اور لاپرواہی ہے[۲]۔

۳۔حدیث منکر کی مثال:

ماقبل دو تعریفیں بیان ہوئیں، لہذا اب ہر تعریف کے مطابق الگ الگ مثال پیش کی جاتی ہے۔

(الف)۔ پہلی تعریف کے مطابق مثال:

پہلی تعریف کے مطابق حدیث منکر کی مثال وہ حدیث ہے جو سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں ابوذکیر یحیی بن معمر بن قیس سے مروی ہے، جو یہ ہے:

”عَنْ هِشَامَ بْنَ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَائِشَةَ مَرْفُوْعاً:"كُلُوا الْبَلَحَ بِالتَّمْرِ، فَإِنَّ ابْنَ آدَمَ إِذَا أَكَلَهُ غَضِبَ الشَّيْطَانُ." [۳]

”ابوذکیر یحیی بن معمر بن قیس، ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے والد سے، انہوں نے سیدہ عائشہؓ سے مرفوعًا روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، کچے کھجور کو خشک کھجور کیساتھ ملا

---

[۱] نزہۃ النظر:۸۷، تدریب الراوی:۱/۲۷۹۔(م)

[۲] نزہۃ النظر:۷۳۔ حافظ ابن حجرؒ کا اشارہ علامہ ابن الصلاحؒ کی طرف ہے، جنہوں نے منکر اور شاذ کو ایک قرار دیا ہے۔علوم الحدیث:۸۰۔(ط)

[۳] سنن ابن ماجہ، کتاب الأطعمة، باب أکل البلح والتمر:۲/ ۱۱۰۵، حدیث ۳۳۳۰.(ط)

مذکورہ الفاظ امام نسائیؒ کے ”السنن الکبری:۶/ ۲۵۰، رقم:۶۶۹۰“ کے ہیں، سنن ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں:” عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: "كُلُوا الْبَلَحَ بِالتَّمْرِ، كُلُوا الْخَلَقَ بِالْجَدِيدِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَغْضَبُ وَيَقُولُ: بَقِيَ ابْنُ آدَمَ حَتَّى أَكَلَ الْخَلَقَ بِالْجَدِيدِ." “ (م)

کر کھاؤ، اس لیے کہ ابن آدم جب کچے کھجور کو خشک کیساتھ ملا کر کھاتا ہے تو شیطان سے بھڑک اٹھتا ہے۔"

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے، اس لیے کہ ابو ذکیر اس میں متفرد ہے اور ابو ذکیر قابل اعتبار ہے، امام مسلمؒ نے متابعات میں اس سے روایت کی ہے[۱]، تاہم اس درجہ کا نہیں جن کا تفرد قابل قبول ہو[۲]۔

(ب)۔ دوسری تعریف کی مثال:

اس تعریف کی مثال وہ حدیث ہے جو ابن ابی حاتمؒ نے حبیب بن حبیب زیات سے روایت کی ہے جو یہ ہے:

عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنِ الْعَيْزَارِ بْنِ حُرَيْثٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَقَامَ الصَّلَاةَ، وَآتَى الزَّكَاةَ، وَحَجَّ، وَصَامَ، وَقَرَى الضَّيْفَ دَخَلَ الْجَنَّةَ».[۳]

"حبیب بن حبیب زیات نے ابو اسحاق سے انہوں نے عیزار بن حریث سے انہوں سیدنا ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، جس نے نماز قائم کی، زکوۃ ادا کی، بیت اللہ کا حج کیا، رروزہ رکھا اور مہمان نوازی کی تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔"

امام ابو حاتمؒ[۴] فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے اس لیے کہ اس حدیث کو حبیب زیات کے علاوہ دوسرے ثقہ رواۃ نے ابو اسحاق سے موقوفاً روایت کیا ہے اور یہی بات درست معلوم

---

(۱) دیکھیے: المقنع في علوم الحدیث:۱/ ۱۸۶، محاسن الاصطلاح:۱۸۱، التقیید والإیضاح:۱۰۹، خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال۴۲۸.(م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح:۱۷۳، تدریب الراوی:۱/۲۷۸، توجیہ النظر للجزائری:۱/۵۱۷۔(م)

(۳) المعجم الکبیر:۱۲/۱۳۶، الکامل لابن عدی:۵۳۲، طبقات المحدثین لابن حبان:۳/۳۰۶۔(م)

(۴) محمد بن ادریس بن منذر بن داؤد بن مہران حنظلی، ابو حاتم، رای میں ۱۹۵ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم محدث ،حافظ اور ناقد رجال تھے، امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے معاصر ہیں، حصول علم کے سلسلے میں عراق، شام، مصر، بغداد اور بلاد روم کے اسفار کیے۔ ان کے مشاہیر تلامذہ میں ان کے صاحبزادے ابو محمد بن عبد الرحمن ابن ابی حاتم رازیؒ، ابوزرعہ رازیؒ، ابوزرعہ دمشقیؒ، ابو بکر بن ابی الدنیاؒ، امام ابو داؤدؒ اور امام نسائیؒ وغیرہ ہیں۔ =

ہوتی ہے[1]۔

۴۔ حدیث منکر کا مرتبہ:

حدیث منکر کی مذکورہ دونوں تعریفوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے، کہ منکر ضعیف حدیث کی ان اقسام میں سے ہے، جن میں شدید ضعف پایا جاتا ہے؛اس لیے کہ یہ یا تو ایسے شخص کی روایت ہے جو فحش غلط یا کثرت غفلت یا فسق میں ملوث ہے یا پھر ایسے ضعیف راوی کی روایت ہے کہ جو ضعیف ہونے کے باوجود ثقات کی مخالفت کرتا ہو، اور یہ بات ظاہر ہے کہ ان دونوں قسموں میں ضعف شدید پایا جاتا ہے، اس وجہ سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شدت ضعف کی بنا پر منکر کا درجہ متروک کے بعد ہے۔

= بغداد میں ۲۷۷ھ کو وفات پائی۔ (الجرح والتعدیل:۱/۳۴۹، تاریخ بغداد:۲/۷۳، تذکرۃ الحفاظ:۲/ ۵٦٧، سیر اعلام النبلاء:۱۳/ ۲۴۷، الاعلام للزرکلی:٦/ ۲۷)(م)

(۱) تدریب الراوی:۱/ ۲۴۰۔(ط)

۴۔ حدیث معروف[۱]

حدیث معروف کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

معروف "عَرَفَ يَعْرِفُ" (باب ضرب) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

معروف وہ حدیث ہے جس کو ثقہ راوی اس حدیث کے خلاف روایت کرے جس کو ضعیف راوی نے روایت کیا ہو[۲]۔

اس معنی کے اعتبار سے معروف "منکر" کے مقابل ہے، اس تعریف کو حافظ ابن حجرؒ نے معتمد قرار دیا[۳]۔

۲۔ حدیث معروف کی مثال:

حدیث معروف کی مثال وہ حدیث ہے جو ماقبل حدیث منکر کی دوسری تعریف کے ضمن میں گزر چکی ہے، جو یہ ہے:

"«مَنْ أَقَامَ الصَّلَاةَ، وَآتَى الزَّكَاةَ، وَحَجَّ، وَصَامَ، وَقَرَى الضَّيْفَ دَخَلَ الْجَنَّةَ».[٤]"

"جس نے نماز قائم کی، زکوۃ ادا کی، بیت اللہ کا حج کیا، روزہ رکھا اور مہمان نوازی کی تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔"

---

(۱) یہاں معروف کا ذکر اس لیے نہیں ہوا کہ یہ مردود کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، بلکہ اس کا ذکر صرف اس کے مد مقابل (منکر) کی مناسبت سے ہوا ہے۔ ورنہ معروف تو مقبول کی قسموں میں سے ایک قسم ہے جس کو استدلال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، یہ بات اہل علم کے ہاں معروف ہے۔ (ط)

(۲) نزہۃ النظر: ۳۷۔ (ط)

(۳) نزہۃ النظر: ۲۱۴۔ (م)

(۴) المعجم الکبیر: ۱۲/۱۳۶، الکامل لابن عدی: ۵۳۲، طبقات المحدثین لابن حبان: ۳/۳۰۶۔ (م)

لیکن یہ حدیث معروف کی مثال اس صورت میں ہے، جس صورت میں یہ ثقہ راویوں کی واسطہ سے سیدنا ابن عباسؓ سے موقوفاً مروی ہے، یعنی یہ سیدنا ابن عباسؓ کا کلام ہے، رسول اللہ ﷺ کا کلام نہیں، لہذا یہ حبیب کی مرفوع روایت کے برعکس ہے، کیونکہ ابن ابی حاتمؒ نے حبیب کی مرفوع حدیث کی روایت کے بعد فرمایا: یہ حدیث منکر ہے۔ اس لیے حبیب کے علاوہ دوسرے ثقہ رواۃ نے اسے ابواسحاق سے موقوفاً روایت کیا ہے، اور یہی بات مشہور ہے[1]۔

---

(۱) نزہۃ النظر: ۲۱۴، تدریب الراوی: ۱/ ۲۸۰۔ (م)

۵۔حدیث شاذ[(۱)] اور محفوظ[(۲)]

ا۔شاذ کی تعریف:

(الف)۔لغوی تعریف:

شاذ ''شَذَّ يَشُذُّ'' سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، جس کے معانی ہیں: جدا ہونا، الگ تھلگ ہونا، لہٰذا شاذ کا معنی جماعت سے الگ ہونے والا ہے[(۳)]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

وہ حدیث ہے، جس کو ایک مقبول راوی اس حدیث کے خلاف روایت کرے، جس کو اس سے زیادہ مقبول راوی نے روایت کیا ہو[(۴)]۔

۲۔اصطلاحی تعریف کا مفہوم:

مقبول سے وہ عادل راوی مراد ہے، جس کا ضبط تام ہو یا وہ عادل راوی مراد ہے جس کا ضبط کمزور ہو، اور اس سے زیادہ مقبول راوی سے مراد وہ راوی ہے، جو قوت ضبط یا کثرت عدد یا دیگر ترجیحات کی بنیاد پر راوی سے زیادہ راجح ہو۔

---

(۱) معرفة علوم الحديث:۱۱۹، مقدمة ابن الصلاح:۱۶۳، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۲۱۳، التقريب:۶۷، الاقتراح: ۱۹۷، المنهل الروي: ۵۰، الخلاصة فی علم الحديث: ۶۹، الموقظة: ۴۲، اختصار علوم الحديث: ۵۶، المقنع فی علوم الحديث: ۱/ ۱۶۵، شرح التبصرة والتذكرة: ۱/ ۳۲۰، نزهة النظر: ۲۱۴، فتح المغيث: ۱/ ۱۸۵، ألفية السيوطي: ۳۹، شرح السيوطي على ألفية العراقي: ۱۷۷، فتح الباقي: ۱/ ۱۹۲، توضيح الأفكار: ۱/ ۳۷۷، ظفر الأماني: ۳۵۶، قواعد التحديث: ۱۳۰. (م)

(۲) اکثر اہل علم نے شاذ کو مستقل طور پر ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے شاذ اور محفوظ کو ایک جگہ ذکر کیا ہے اور چونکہ مصنف بھی حافظ ابن حجرؒ کے منہج کے تابع ہیں، اس لیے انہوں نے بھی دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ (م)

(۳) لسان العرب: ۳/ ۴۹۰۔ (م)

(۴) نزهة النظر: ۳۷۔ (ط)

واضح رہے کہ شاذ کی تعریف میں اہل علم کے متعدد اقوال ہے[1]، تاہم مذکورہ تعریف حافظ ابن حجرؒ کی اختیار کردہ ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

---

[1] شاذ کی تعریف کے سلسلے میں چند اقوال یہ ہیں:
حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) نے یونس بن عبد الاعلی کے واسطے سے امام شافعیؒ (م۲۰۴ھ) سے نقل کیا ہے:
" لیسَ الشاذُّ مِنَ الحدیثِ أنْ یروِيَ الثِّقَةُ ما لا یرويَ غیرُهُ، إنَّما الشاذُّ: أنْ یرويَ الثِّقَةُ حدیثاً یخالِفُ ما روَی الناسُ. " (مقدمۃ ابن الصلاح:۱۶۳، معرفۃ علوم الحدیث:۱۱۹، الکفایۃ:۱۴۱)
"شاذ حدیث یہ نہیں کہ ثقہ راوی ایسی حدیث روایت کرے جو دوسرے نہیں کرتے، بلکہ شاذ یہ ہے کہ ثقہ راوی وہ حدیث بیان کرے جو لوگوں کی روایت کردہ حدیث کے مخالف ہو۔"
حافظ ابویعلی خلیلیؒ (م۴۴۶ھ) نے امام شافعیؒ (۲۰۴ھ) اور حجازی علماء کی ایک جماعت سے اس تعریف کو نقل کرنے کے کہا ہے:
" الذي علیهِ حُفَّاظُ الحدیثِ أنَّ الشاذَّ ما لیسَ لهُ إلاَّ إسنادٌ واحدٌ یَشذُّ بذلكَ شیخٌ، ثقةً كانَ أو غیرَ ثقةٍ، فما كانَ عَنْ غیرِ ثقةٍ فمتروكٌ لا یُقبَلُ، وما كانَ عَنْ ثقةٍ یُتَوَقَّفُ فیهِ ولا یُحْتَجُّ بهِ." (مقدمۃ ابن الصلاح:۱۶۳)
"حفاظِ حدیث کا مسلک یہ ہے کہ شاذ وہ ہے جس کی صرف ایک سند ہو اور شیخ اس کے سبب متفرد ہو وہ ثقہ ہو یا غیر ثقہ ہو۔ جو روایت غیر ثقہ سے ہو گی وہ متروک ہو گی اور اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور جو ثقہ سے ہو گی وہ متوقف فیہ ہو گی اور قابل حجت نہ ہو گی۔"
حاکم نیسابوریؒ (م۴۰۵ھ) نے شاذ کی تعریف یوں کی ہے۔
" أنَّ الشاذَّ هوَ الحدیثُ الذي ینفَرِدُ بهِ ثقةٌ مِنَ الثِّقاتِ ولیسَ لهُ أصلٌ بمُتابِعٍ لذلكَ الثقةِ. "(مقدمۃ ابن الصلاح:۱۶۴، معرفۃ علوم الحدیث:۱۱۹)
"شاذ وہ حدیث ہے جس میں ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ راویوں سے متفرد ہوتا ہے اور اس ثقہ کے لیے اس حدیث کا کوئی متابع نہیں ہوتا۔"
حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ جہاں تک امام شافعیؒ (م۲۰۴ھ) کی بیان کردہ شاذ کا تعلق ہے تو اس کے متعلق کوئی اشکال نہیں کہ وہ غیر مقبول ہے، لیکن خلیلی اور حاکم کی تعریفوں میں ایک نوع اشکال ہے کہ اگر راوی عادل حافظ اور ضابط حدیث میں متفرد ہو تو اسے کس طرح غیر مقبول کہا جا سکتا ہے، جیسے حدیث "انما الاعمال بالنیات" ہے یہ حدیث فرد ہے اس کی روایت میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ متفرد ہیں، ان سے علقمہ بن وقاص، ان سے محمد بن ابراہیم اور ان سے یحیی بن سعید روایت کر رہے ہیں۔ (مقدمۃ ابن الصلاح:۱۶۶)(م)

"إنه المعتمد فی تعریف الشاذ بحسب الاصطلاح"[1]۔

"عام اصطلاح کے اعتبار سے شاذ کی یہی تعریف معتمد ہے۔"

۳۔ شذوذ کہاں واقع ہوتے ہیں؟

شذوذ سند اور متن دونوں میں واقع ہوتے ہیں، اس اعتبار سے شاذ کی دو قسمیں بن جاتی ہیں:

ا۔ شاذ السند ۲۔ شاذ المتن

(الف)۔ شاذ السند کی مثال:

اس کی مثال وہ حدیث ہے، جو امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے سفیان بن عیینہؒ کے طریق سے روایت کی ہے، جو یہ ہے:

"عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ، عَنْ عَوْسَجَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ «أَنَّ رَجُلًا تُوُفِّيَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَلَمْ يَدَعْ وَارِثًا إِلَّا مَوْلًى هُوَ أَعْتَقَهُ»."[2]

"سفیان بن عیینہ، عمرو بن دینار سے، وہ عوسجہ سے وہ سیدنا ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص کا انتقال ہوا اور اس کے آقا کے علاوہ اور کوئی وارث نہ تھا۔

اب سفیان بن عیینہؒ نے اس روایت کو موصولاً ذکر کیا ہے، اور ابن جریجؒ[3] اور دیگر حضرات

---

[1] نزہۃ النظر: ۷۳۔ (ط)

[2] سنن أبي داود، کتاب الفرائض، حدیث ۲۹۰۵. (ط)

[3] عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج، ابو الولید، ابو خالد، فقیہ حرم مکی، مکہ معظمہ میں ۸۰ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور میں اہل حجاز کے امام تھے، اصل میں روم کے باشندے تھے، امام ذہبیؒ (م ۱۵۰ھ) فرماتے ہیں کہ ابن جریج ثقہ تھے، لیکن تدلیس کرتے تھے۔ امام اوزاعیؒ، لیث بن سعدؒ، سفیان ثوریؒ، سفیان ابن عیینہؒ، اسماعیل ابن علیہؒ، ہمام بن یحییٰؒ، یحیی بن سعید قطانؒ، وکیع بن جراحؒ، عبد الرزاق بن ہمامؒ اور عبید اللہ بن موسیٰؒ وغیرہ اساطین علم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔ مکہ معظمہ میں ۱۵۰ھ کو وفات پائی۔ (الجرح والتعدیل: ۵/ ۳۵۶، وفیات الاعیان: ۳/ ۱۶۳، سیر اعلام النبلاء: ۶/ ۳۲۵، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۶۹، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۱۶۰)(م)

نے بھی سفیان بن عیینہؒ کی متابعت میں اس روایت کو موصولاً روایت کیا ہے، لیکن حماد بن زید[۱] نے ان حضرات کے بر خلاف اس حدیث کو عمرو بن دینار[۲] سے بواسطہ عوسجہ کے مرسلاً روایت کیاہے، جس میں انہوں نے سیدنا ابن عباسؓ کا تذکرہ نہیں کیا ہے[۳]۔

اس وجہ سے امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ محفوظ روایت سفیان بن عیینہؒ کی ہے[۴]۔

اب دیکھئے حماد بن زید اگر چہ عادل اور ضابط ہیں، لیکن امام ابو حاتمؒ نے ان کے مقابلے میں ان حضرات کی روایت کو ترجیح دی ہے جو تعداد میں ان سے زیادہ ہیں[۵]۔

(ب)۔ شاذ المتن کی مثال:

اس کی مثال وہ حدیث ہے جو امام ابو داؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے عبد الواحد بن زیاد سے روایت کی ہے، جو یہ ہے:

"عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مَرْفُوعًا: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَلْيَضْطَجِعْ عَنْ يَمِينِهِ»."[۶]

---

[۱] حماد بن زید بن درہم ازدی جہضمی، بصری، ابو اسماعیل، بصرہ میں ۹۸ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور میں عراق کے شیخ، حافظ اور قاری تھے، اصل میں سجستان کے تھے، چار ہزار احادیث کے حافظ تھے، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام ابو داؤدؒ، امام ابن ماجہؒ اور امام نسائیؒ نے ان سے روایات لی ہیں۔ بصرہ ہی میں ۱۷۹ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد:۷/۲۸٦، الجرح والتعدیل:۱/۱۷٦، تہذیب الاسماء واللغات:۱/۱٦۷، سیر اعلام النبلاء:۷/٤٥٦)(م)

[۲] عمرو بن دینار جمحی، ابو محمد اثرم، صنعاء میں ٤٦ھ کو پیدا ہوئے، عظیم فقیہ اور محدث تھے، اپنے دور میں مکہ معظمہ کے مفتی تھے، سیدنا ابن عباسؓ، سیدنا جابر بن عبد اللہؓ، سیدنا ابن عمرؓ، سیدنا انس بن مالکؓ وغیرہ صحابہ کرام سے سماع ثابت ہے، امام شعبہ بن حجاجؒ (م۱٦۰ھ) فرماتے ہیں کہ میں نے حدیث میں ان سے بڑھ کر ثقہ نہیں دیکھا۔ امام نسائیؒ (م۳۰۳ھ) فرماتے ہیں کہ عمرو بن دینار ثقہ تھے، مکہ معظمہ میں ۱۲٦ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد:۵/٤۷۹، الجرح والتعدیل:٦/۲۳۱، التاریخ الکبیر:٦/۳۲۸، سیر اعلام النبلاء:۵/۳۰۰)(م)

[۳] نزہۃ النظر:۲۱۲، تدریب الراوی:۱/۲۷۰۔(م)

[۴] نزہۃ النظر:۲۱۲، تدریب الراوی:۱/۲۷۰۔(م)

[۵] نزہۃ النظر:۲۱۲، تدریب الراوی:۱/۲۷۰۔(م)

[٦] سنن أبي داود، کتاب الصلاۃ، حدیث ۱۲٦۱، سنن الترمذي، کتاب الصلاۃ، حدیث ٤۲۰.(ط)

”عبد الواحد بن زیاد نے اعمش سے، انہوں نے ابو صالح[1] سے انہوں نے ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، جب تم میں سے کوئی فجر کی نماز پڑھ لے تو کچھ دیر اپنے پہلو پر لیٹ جائے۔“

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں عبد الواحد بن زیاد[2] نے متعدد ثقہ رواۃ کی مخالفت کی ہے، اس لیے کہ دیگر رواۃ نے اسے رسول اللہ ﷺ کا فعل بنا کر روایت کیا ہے، جب کہ عبد الواحد نے اسے رسول اللہ ﷺ کا قول سمجھ کر روایت کیا ہے، لہٰذا عبد الواحد اعمش[3] کے ثقہ تلامذہ میں سے ہیں، لیکن وہ اس روایت میں متفرد ہیں[4]۔

۴۔ حدیث محفوظ

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ محفوظ وہ حدیث ہے جو شاذ کے بالمقابل ہو

---

(۱) ذکوان ابو صالح سمان زیات مدنی، مولی جویریہ بنت احمس غطفانی، کتب ستہ کے راوی ہیں، جلیل القدر تابعی ہیں، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، سیدنا عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں، امام ابن معینؒ نے ان کی توثیق کی ہے، ابوزرعہ، ساجی اور عجلی کہتے ہیں کہ ابو صالح ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے، ۱۰۱ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب:۳/۲۱۹، تقریب التہذیب:۲۰۳)(م)

(۲) عبد الواحد بن زیاد عبدی، ابو بشر بصری، عثمان دارمیؒ کہتے ہیں کہ عبد الواحد ثقہ ہے، ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ عبد الواحد ثقہ اور کثیر الحدیث ہے، ابوزرعہؒ اور ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ عبد الواحد ثقہ ہے، امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ اور حسن الحدیث ہے، دار قطنی فرماتے ہیں کہ ثقہ ہے، ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ۱۷۷ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال:۱۸/۴۵۰، تہذیب التہذیب:۶/۴۳۵، خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال:۱/۲۴۷)

(۳) سلیمان بن مہران اسدی، ابو محمد اعمش، تابعی، ۶۱ھ کو پیدا ہوئے، اصل میں رای کے تھے، کوفہ میں پلے پڑھے، تفسیر، حدیث، رجال اور فرائض کے بہت بڑے عالم تھے، تیرہ سو کے لگ بھگ روایات نقل کی ہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت ہے۔ امام شعبہ بن حجاجؒ، شریک بن عبد اللہ نخعیؒ، عبد اللہ بن مبارکؒ، سفیان بن ثوریؒ اور سفیان بن عیینہؒ جیسے اساطین علم ان کے تلامذہ ہیں۔ امام ذہبیؒ (م۷۴۸ھ) فرماتے ہیں کہ اعمش علم و عمل کے درخشاں ستارے تھے، کوفہ میں ۱۴۸ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال:۱۲/۷۶، تہذیب التہذیب:۴/۲۲۲، تذہیب تہذیب الکمال:۴/۱۷۱)(م)

(۴) تدریب الراوی:۱/۲۷۰۔(م)

اب اس کی تعریف یوں ہو گی:

محفوظ وہ حدیث ہے جس کو ایک سے زائد ثقہ رواۃ کسی ایک ثقہ راوی کے خلاف روایت کریں۔

۴۔حدیث محفوظ کی مثال:

حدیث محفوظ کی مثال مذکورہ بالا روایات ہیں جو حدیث شاذ میں بطور مثال مذکور ہیں، تاہم ان میں وہ احادیث مثالیں بنیں گی جو اوثق طریق سے مروی ہوں۔

۵۔شاذ اور محفوظ کا حکم:

یہ بات مسلم ہے کہ حدیث شاذ مردود ہے اور حدیث محفوظ مقبول ہوتا ہے۔

۶۔ حدیث معلل[1]

جب راوی میں طعن کا سبب وہم ہو تو اس حدیث کو معلل کہتے ہیں اور وہم طعن کے اسباب میں سے من جملہ چھٹا سبب ہے[2]۔

ا۔ معلل کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

معلل در اصل "أَعَلَّه بِكَذَا" (باب افعال) سے خلاف القیاس اسم مفعول کا صیغہ ہے، صرفی قواعد کی رُو سے اس کا اسم مفعول "مُعَلٌّ" آتا ہے اور یہی فصیح لغت ہے، تاہم محدثین کرام کا حدیث کی اس قسم کو "معلل" سے تعبیر کرنا غیر مشہور لغت ہے[3] اور بعض حضرات نے اس لفظ کو "معلول" سے تعبیر کیا ہے لیکن یہ تعبیر اہل عربیت اور اہل لغت کی نظر میں بہت ضعیف اور غیر فصیح ہے[4]۔ *

---

(1) معرفة علوم الحدیث: ۱۱۲، مقدمة ابن الصلاح: ۱۸۶، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۲۳۴ - ۲۴۸، التقریب: ۷۵ - ۷۷، المنهل الروي: ۵۲، الموقظة: ۵۱، اختصار علوم الحدیث: ۶۳، شرح التبصرة والتذکرة: ۱/ ۳۶۳، نزهة النظر: ۱۲۳، فتح المغیث: ۱/ ۲۰۹، ألفیة السیوطي: ۵۵ - ۶۶، شرح السیوطي علی ألفیة العراقي: ۱۹۲، فتح الباقي: ۱/ ۲۲۴، توضیح الأفکار: ۲/ ۲۵، ظفر الأماني: ۳۶۳، قواعد التحدیث: ۱۳۱. (م)

(2) اگر قرائن سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ راوی نے مرسل یا منقطع کو متصل بیان کیا ہے، یا ایک حدیث کا دوسری حدیث میں اندراج کیا ہے یا ضعیف کو ثقہ سے بدل دیا ہے تو اس کی حدیث معلل ہو گی۔ نزهة النظر: ۱۱۰۔ (م)

(3) اس لیے کہ "معلل"، "علله" سے اسم مفعول ہے، "علله" کے معنی ہیں: بہلا دیا۔ اور "تعلیل الام ولدها" کا معنی ہے: ماں نے اپنے بچے کو بہلا دیا۔ (ط)

(4) اس لیے کہ رباعی سے اسم مفعول "مفعول" کے وزن پر نہیں آتا۔ علوم الحدیث: ۸۱۔ (ط)

* معلل حدیث کے لیے معلول اور معل کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے، علامہ سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) نے "معل" کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے اور امام نوویؒ (م ۶۷۶ھ) نے معلول کو لحن قرار دیا ہے۔ معلول کی اصطلاح امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ، ابن عدیؒ، دار قطنیؒ، ابو یعلیؒ، خلیلیؒ اور حاکمؒ وغیرہ نے استعمال کی ہے۔ بعض حضرات نے "معلول" کی اصطلاح کو لغت کے اعتبار سے ناپسند کیا ہے اس =

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

معلل وہ حدیث ہے جس میں کسی ایسی علت کا پتہ چلے جو حدیث کی صحت میں قادح اور اثر انداز ہو، اگرچہ بظاہر وہ حدیث علل سے سالم نظر آتی ہو[1]*۔

۲۔علت کی تعریف:

علت اس مخفی باریک نقص کو کہتے ہیں جو حدیث کی صحت کو مجروح کر دے[2]۔

علت کی مذکورہ تعریف سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ محدثین کرامؒ کے نزدیک علت میں دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

= لیے کہ یہ "عل" سے اسم مفعول ہے جس کے معنی دوسری مرتبہ پلانا ہے۔ دیکھئے: مقدمہ ابن الصلاح:۱۸۶، معرفۃ علوم الحدیث:۱۱۹، فتح المغیث للسخاوی:۱/۴۱۱، تدریب الراوی:۱/۲۱۰۔(م)

[1] علوم الحدیث:۹۰۔(ط)

* امام حاکم نیسابوریؒ(م۴۰۵ھ)علل الحدیث پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وَعِلَّةُ الْحَدِيثِ يَكْثُرُ فِي أَحَادِيثِ الثِّقَاتِ أَنْ يُحَدِّثُوا بِحَدِيثٍ لَهُ عِلَّةٌ، فَيَخْفَى عَلَيْهِمْ عِلْمُهُ، فَيَصِيرُ الْحَدِيثُ مَعْلُولًا." (معرفۃ علوم الحدیث:۱۱۲)

"اور ثقہ راویوں کی احادیث میں علۃ الحدیث بکثرت پائی جاتی ہے وہ ایک حدیث بیان کرتے ہیں اور اس میں علت کی معرفت مخفی ہوتی ہے لہذا حدیث معلول ہو جاتی ہے۔"

دوسری جگہ رقم طراز ہیں۔

" فَإِنَّ الْمَعْلُولَ مَا يُوقَفُ عَلَى عِلَّتِهِ، أَنَّهُ دَخَّلَ حَدِيثًا فِي حَدِيثٍ، أَوْ وَهِمَ فِيهِ رَاوٍ أَوْ أَرْسَلَهُ وَاحِدٌ، فَوَصَلَهُ وَاهِمٌ." (معرفۃ علوم الحدیث:۱۱۹)

"معلول وہ ہے جس کی علت کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ راوی نے ایک حدیث دوسری حدیث میں داخل کر دی ہے یا اس میں راوی کو وہم ہوا ہو، یا ایک راوی نے مرسل بیان کی ہو اور واہم نے اسے موصول بیان کر دیا ہو۔"

حافظ سخاویؒ(م۹۰۲ھ)نے معلل کی تعریف یوں کی ہے۔

" فَالْمُعَلَّلُ أَوِ الْمَعْلُولُ: خَبَرٌ ظَاهِرُهُ السَّلَامَةُ اطُّلِعَ فِيهِ بَعْدَ التَّفْتِيشِ عَلَى قَادِحٍ."

(فتح المغیث:۱/۲۷۶)

"معلل یا معلول وہ خبر ہے جو ظاہری طور پر محفوظ ہے لیکن تفتیش کے بعد نقصان دہ سبب کا پتہ چلے۔" (م)

[2] علوم الحدیث:۹۰۔(ط)

(الف)۔ ایک یہ کہ اس علت میں غموض اور خفاء ہو۔
(ب)۔ دوسری یہ کہ حدیث کی صحت پر اثر انداز ہو۔
اگر ان دونوں شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے مثلاً علت بالکل ظاہر ہو یا ظاہر نہ ہو، لیکن حدیث کی صحت پر اثر انداز بھی نہ ہو تو ان صورتوں میں اسے اصطلاحی علت نہیں کہا جائے گا۔

۳۔ علت کا اطلاق غیر اصطلاحی مفہوم پر:

بسا اوقات علت کا اطلاق اس کے غیر اصطلاحی معنی پر بھی ہوتا ہے، ماقبل عبارت میں ہم نے علت کی جو تعریف ذکر کی ہے محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں علت سے یہی مراد ہے، لیکن کبھی کبھی اس کا اطلاق ایسے طعن پر ہوتا ہے، جو حدیث پر اثر انداز ہو، اگرچہ یہ طعن مخفی یا قادح نہ ہو، ذیل میں اسکے دو مواقع ذکر کیے جاتے ہیں:
(الف)۔ پہلی قسم: راوی کے کذب یا غفلت یا سوء حفظ وغیرہ کو علت سے موسوم کر دینا، جیسے امام ترمذیؒ نے نسخ کو بھی علت قرار دیا ہے۔
(ب)۔ دوسری قسم: ایسی مخالفت کو علت کہہ دینا جو حدیث کی صحت پر اثر انداز نہ ہو، مثلاً ایک راوی کسی حدیث کو مرسل روایت کرے جب کہ دوسرے ثقہ راوی اسے موصول روایت کرتے ہوں، اسی وجہ سے بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ ”بعض صحیح احادیث ایسی ہیں جو صحیح ہونے کیساتھ معلل بھی ہیں۔“[1]

---

[1] محدثین کرام نے کسی حدیث کے معلل ہونے کے مختلف اسباب وانواع بیان کیے ہیں، مثلاً مرسل و منقطع کو متصل بنا دینا، مرفوع کو موقوف قرار دے دینا، حدیث میں ادراج کرنا یا ثقہ کو وہم پیش آنا جو حدیث کے کے لیے باعث ضعف بنے، امام حاکم نیسابوریؒ (م ۴۰۵ھ) نے اس پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
” وَإِنَّمَا يُعَلَّلُ الْحَدِيثُ مِنْ أَوْجُهٍ لَيْسَ لِلْجَرْحِ فِيهَا مَدْخَلٌ، فَإِنَّ حَدِيثَ الْمَجْرُوحِ سَاقِطٌ وَاهٍ.“
(معرفۃ علوم الحدیث: ۱۱۲)
”بلاشبہ حدیث کئی وجوہ سے معلل ہو جاتی ہے جن میں جرح کو دخل نہیں، کیونکہ مجروح حدیث ساقط اور ناقابل اعتبار ہے۔“
=

۴۔ علل الحدیث کی جلالت و دقت اور اس کے ماہرین:

علل حدیث کی معرفت حدیث کے نہایت دقیق و عویص علوم میں سے ہے، اس لیے کہ حدیث کی ایسے مخفی اور باریک علل تک رسائی ان ہی لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو علوم حدیث کی باریکیوں پر وسیع و عمیق نظر رکھتے ہوں اور ایک عرصہ دراز اس تجربہ میں گزار چکے ہوں۔

یہ مرتبہ و مقام ان علماء کرام کو حاصل ہوتا ہے جو ضبط، حفظ، تجربہ اور روشن ذہانت کے بلند مقام پر فائز ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس وسیع و عمیق وادی میں قدم رکھنے کی جرأت اور جسارت کرنے والے علماء انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، مثلاً امام علی بن مدینیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ، امام ابوحاتم رازیؒ اور امام دار قطنیؒ وغیرہ [1]۔

= حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) علت کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علت کا اطلاق مذکورہ اسباب کے علاوہ حدیث کے ان اسباب قادحہ پر بھی ہوتا ہے جو حدیث کو صحت کی حالت سے نکال کر اسے ضعف کی حالت میں لے آتے ہیں جو اس پر عمل کرنے سے مانع اور لفظ علت کا اصل مقتضی ہے، اسی لیے علل الحدیث کی کتابوں میں کذب، غفلت، سوءِ حفظ اور اسی طرح کی دیگر صفات جرح کی وجہ سے جرح کا ذکر پاتے ہیں۔

امام ترمذیؒ نے نسخ کو علل الحدیث کی ایک علت قرار دیا ہے، پھر کچھ لوگوں نے تو علت کا اطلاق اس پر بھی کیا ہے جو اختلاف کے اسباب میں قادح نہیں ہے، جیسے اس شخص کا ارسال جس نے وہ مرسل بیان کی جس کو ثقہ وضابط راوی نے مسند بیان کیا ہو حتی کہ صحیح کی اقسام بیان کرتے ہوئے صحیح معلول کو بھی ایک قسم قرار دیا یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض لوگوں نے کہا کہ صحیح، شاذ صحیح کی ایک قسم ہے۔" دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۹۰۔ (م)

[1] علل الحدیث ایک مشکل اور عمیق علم ہے، حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں۔

" اعْلَمْ أَنَّ معرفةَ علَلِ الحديثِ مِنْ أجلِّ علومِ الحديثِ وأدقِّها وأشرفِها، وإنَّما يَضْطَلِعُ بذلكَ أهلُ الحِفْظِ والخِبْرَةِ والفَهْمِ الثَّاقِبِ." (مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۸۷)

"واضح رہے کہ علل حدیث کی معرفت علوم حدیث میں ایک دقیق اور اشرف علم ہے اور اس کی معرفت صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صاحبِ بصیرت ہوں اور جن کا فہم ثاقب ہو۔"

اس موضوع پر بہت کم لوگوں نے گفتگو کی ہے، حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ علل حدیث پر امام علی بن مدینیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، یعقوب بن شیبہؒ، ابوحاتمؒ، ابوزرعہؒ اور دار قطنیؒ وغیرہ۔ دیکھئے: نزہۃ النظر: ۱۱۰۔ (م)

۵۔ تعلیل کس قسم کی سند پر اثر انداز ہو سکتی ہے؟

تعلیل اس سند پر اثر انداز ہوتی ہے جس میں بظاہر جملہ شرائط صحت موجود ہوں، اس ہوں، اس لیے کہ جو حدیث پہلے ہی سے ضعیف ہو اس کے علل پر مزید بحث و تحقیق کی ضرورت ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ خود مردود اور غیر معمول بہ ہوتی ہے[۱]۔

۶۔ علت کی ادراک کے لیے کس امور سے مدد لی جائے؟

درج ذیل امور کے ذریعے سے علت کو معلوم کرنے میں مدد مل سکتی ہے:

(الف)۔ راوی کا تفرد۔

(ب)۔ دوسرے راویوں کی روایت کا اس کی روایت سے مختلف ہونا۔

(ج)۔ کچھ دیگر قرائن جو مذکورہ بالا دونوں صورتوں کو شامل ہوں۔[۲]

مندرجہ بالا امور کی روشنی میں اس فن کا ماہر عالم روایت حدیث میں راوی کی طرف سے واقع ہونے والے وہم سے آگاہ ہو جاتا ہے، یعنی اسے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ راوی نے موصول حدیث مرسل روایت کر دی یا موقوف کو مرفوع بنا دیا، یا ایک حدیث میں دوسری حدیث کے الفاظ شامل کر دیئے یا اس قسم کا کوئی اور وہم پیش آگیا ہے، اس حقیقت کا علم اس کے ذہن پر اس قدر غالب آجاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں حدیث پر عدم صحت کا حکم لگا دیتا ہے[۳]۔

۷۔ حدیث معلل کی معرفت کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

حدیث معلل کی معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ اس حدیث کے جملہ طرق جمع کر لیا جائے، پھر رواۃ کے اختلاف پر خوب غور و حوض کیا جائے اور پھر ان کے حفظ اور ضبط کا بھی موازنہ کیا جائے کہ کس کا ضبط تام اور کس کا ضبط ناقص ہے؟ اس کے بعد حدیث معلول پر حسب تحقیق

---

[۱] تدریب الراوی: ۱/ ۲۹۵۔ (م)

[۲] ان امور کی تفصیل حدیث معلل کی معرفت کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ کے ذیل میں ملاحظہ ہو۔ (م)

[۳] تدریب الراوی: ۱/ ۲۹۵۔ (م)

حکم لگایا جائے[1]۔

---

[1] محدثین کرامؒ نے علل حدیث کی معرفت کے لیے کچھ امور ذکر کیے ہیں، جن سے علل حدیث کی معرفت میں مدد ملتی ہے۔ وہ امور یہ ہیں:

ا۔ جمع روایات:

محدث ایک حدیث کے تمام روایات کو جمع کرے اور پھر سند اور متن کے اعتبار سے ان کا موازنہ کرے، اسی طرح ان کے اتفاق واختلاف سے علت کا بھی پتہ چل جائے گا اوران قرائن کا بھی علم ہو جائے گا جو اس علت سے متعلق ہیں۔ یہ طریقہ آسان بھی ہے اور کثرت سے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

۲۔ اسناد کا موازنہ:

علت کو معلوم کرنے کے لیے دوسرا طریقہ اسانید کا موازنہ ہے، اسناد میں راویوں کے اسلوب کا دیگر اسانید کے طریق سے موازنہ ہے۔ اس طرح ایک اسناد کا تفرد واضح ہو جائے گا، کیونکہ دیگر اسانید میں وارد رواۃ کے معروف طریقے فرق کو ظاہر کر دیں گے، اس طریق سے وہ مخفی علت بھی ظاہر ہو جائے گی، جس کو عام حالات میں متعین کرنا مشکل ہوتا ہے۔

۳۔ ناقدین حدیث کا فیصلہ:

علت حدیث یا قدح حدیث میں معروف ناقدین حدیث میں سے کسی امام کا فیصلہ موجود ہو، کیونکہ یہ حضرات ان امور دقیقہ پر گہری نظر رکھنے والے صاحبِ بصیرت لوگ ہیں، حافظ ابن حجرؒ(م ۸۵۲ھ) کے بقول یہ چند گنے چنے لوگ ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں۔

”وقد تَقْصُرُ عبارةُ المعلِّلِ عن إقامةِ الحجةِ على دعواه، كالصيرفيّ في نَقْد الدينار والدرهم.“

”کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معلل کی عبارت اس کے دعوی پر دلیل قائم کرنے سے قاصر ہوتی ہے، جیسے صراف درہم ودینار کی پرکھ میں کھوٹ کو پہچانتا ہے لیکن نشاندہی نہیں کر سکتے!“

امام عبد الرحمن بن مہدیؒ(م ۱۹۸ھ) سے جب پوچھا گیا کہ تمہارے اس دعوی پر کیا دلیل ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور یہ صحیح نہیں؟ تو انہوں نے کہا:

” أَرَأَيْتَ لَوْ أَتَيْتَ النَّاقِدَ، فَأَرَيْتَهُ دَرَاهِمَكَ، فَقَالَ: هَذَا جَيِّدٌ، وَهَذَا بَهْرَجٌ، أَكُنْتَ تَسْأَلُ، عَنْ مَنْ ذَلِكَ، أَوْ تُسَلِّمُ لَهُ الْأَمْرَ؟ قَالَ: بَلْ أُسَلِّمُ لَهُ الْأَمْرَ، قَالَ: فَهَذَا كَذَلِكَ، لِطُولِ الْمُجَالَسَةِ وَالْمُنَاظَرَةِ وَالْخِبْرَةِ. “

(تدریب الراوی: ۱/۲۹۶)

”اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ کہ تم صراف کے پاس جاؤ اور اسے اپنے درہم دیکھاؤ اور پھر وہ یہ کہے کہ یہ عمدہ ہے اور یہ کھوٹا ہے! کیا تم اس سے پوچھو گے کہ اس نے یہ کیسے معلوم کیا، یا معاملہ اس پر چھوڑ دو گے؟ اس نے کہا کہ میں معاملہ اس پر چھوڑ دوں گا۔ عبد الرحمن بن مہدی نے کہا کہ یہ بھی اسی طرح کا معاملہ ہے۔ =

۸۔ علت کہاں واقع ہوتی ہے؟

(الف)۔ علت اکثر سند میں واقع ہوتی ہے، مثلاً کسی سند میں موقوف یا مرسل ہونے کی علت۔

(ب)۔ علت متن میں بھی ہوتی ہے، تاہم ایسا بہت کم ہوتا ہے، مثلاً نماز میں ''بسم اللہ'' کی قرأت کی نفی والی حدیث[1]۔

۹۔ کیا ''علۃ فی السند'' متن پر اثر انداز ہوتی ہے؟

= یہ سب کچھ طویل علمی نشستوں، بحث و تمحیص اور معرفت سے حاصل ہوتا ہے۔''

محدث کو حدیث کی علت معلوم ہو جاتی ہے لیکن وہ بعض اوقات بیان نہیں کر سکتا، حافظ شمس الدین سخاویؒ (۹۰۲ھ) عبد الرحمن بن مہدیؒ (م۱۹۸ھ) کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

'' وَقَالَ ابْنُ مَهْدِيٍّ: هِيَ إِلْهَامٌ، لَوْ قُلْتَ لِلْقَيِّمِ بِالْعِلَلِ: مِنْ أَيْنَ لَكَ هَذَا؟ لَمْ تَكُنْ لَهُ حُجَّةٌ، يَعْنِي يُعَبِّرُ بِهَا غَالِبًا، وَإِلَّا فَفِي نَفْسِهِ حُجَجٌ لِلْقَوْلِ وَلِلدَّفْعِ. '' (فتح المغیث:۱/۱۸۸)

''عبد الرحمن بن مہدی فرماتے ہیں کہ یہ الہام ہے اگر تم علل دریافت کرنے والے سے کہو کہ تمہیں یہ علم کہاں سے حاصل ہوا؟ تو اس کے پاس دلیل نہیں ہوگی، یعنی وہ غالب گمان کی تعبیر کرتا ہے، ورنہ اس کے ذہن میں قبول ورد کے دلائل موجود ہوتے ہیں۔''

امام ابن ابی حاتمؒ (م۳۲۷ھ) نے عبد الرحمن بن مہدیؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

'' إنكارُنَا الحديثَ عِنْد الجُهَّالِ كِهَانةٌ. '' (علل الحدیث:۱/۳۸۹)

''جہلاء کے سامنے ہمارا انکارِ حدیث کہانت کے مترادف ہے۔''

حافظ زین الدین ابن رجب حنبلیؒ (م۷۹۵ھ) علل حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''حذاق النقاد من الحفاظ لكثرة ممارستهم للحديث، ومعرفتهم بالرجال واحاديث كل واحد منهم، لهم فهم خاص (يفهمون) به أن هذا الحديث يشبه حديث فلان، ولا يشبه حديث فلان فيعللون الأحاديث بذلك.'' (شرح علل الترمذی:۲/۸۶۱)

''حفاظ حدیث میں سے ناقدین حضرات کو کثرتِ ممارسے، رجال کی معرفت اور ان میں ہر ایک حدیث کے بارے میں علک کی وجہ سے خاص فہم حاصل ہوتا ہے جس سے انہیں سمجھ آجاتی ہے کہ یہ حدیث فلاں شخص کی حدیث کے مشابہ ہے اور فلاں شخص کی حدیث کے مشابہ نہیں، اس طریق پر وہ احادیث کو معلل قرار دیتے ہیں۔''

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ علل الحدیث ایک دقیق علم ہے اور اس کی معرفت کا ایک وجدانی کیفیت ہے جو اس فن کے جہابذہ اور ماہرین کو حاصل ہوتا ہے۔(م)

[1] مقدمۃ ابن الصلاح:۱۹۰، تدریب الراوی:۱/۲۹۷۔(م)

(الف)۔ کبھی اسناد کی علت متن کو بھی مجروح کر دیتی ہے، مثلاً کوئی حدیث موصولاً مروی ہو، لیکن تحقیق کے بعد مرسل قرار دی جائے تو اس علت ارسال کی وجہ سے متن بھی غیر مقبول بن جاتا ہے۔

(ب)۔ کبھی اسناد کی علت صرف سند کو مجروح کر دیتی ہے، لیکن متن صحیح رہتا ہے، اس کی مثال یعلی بن عبید [۱] کی یہ روایت ہے:

"عَنِ الثَّوْرِيِّ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوعاً: «الْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ»." [۲]

"یعلی بن عبید، سفیان ثوری سے، انہوں نے عمرو بن دینار سے، انہوں نے سیدنا ابن عمرؓ سے مرفوعا روایت کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، کہ بائع اور مشتری کو اختیار ہے۔"

اب اس روایت میں یعلی بن عبید کو سفیان ثوری کے شیخ کے متعلق وہم ہوا ہے، انہوں نے عبد اللہ بن دینار [۳] کی جگہ عمرو بن دینار کا نام لیا ہے، لیکن اس کے باوجود متن بالکل صحیح ہے، اگرچہ سند میں غلطی کی علت پائی گئی ہے، کیونکہ عمرو بن دینار اور عبد اللہ بن دینار دونوں ثقہ ہیں اور ثقہ کو ثقہ سے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اگرچہ سند میں ایک قسم ....

---

(۱) یعلی بن عبید بن امیہ ایادی، حنفی کوفی، کتب ستہ کے راوی ہیں، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ یعلی بن عبید ثقہ ہے، عثمان دارمی کہتے ہیں کہ یعلی ثقہ ہے، لیکن سفیان سے روایت کرنے میں ضعیف ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ ثقہ ہے اور ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے، احمد بن یونس کہتے ہیں کہ میں نے یعلی نے بہتر کوئی نہیں دیکھا۔ ۲۰۹ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۳۲/ ۳۸۹، تہذیب التہذیب: ۱۱/ ۴۰۳، ثقات ابن حبان: ۷/ ۶۵۳)(م)

(۲) المعجم الکبیر: ۱۲/ ۴۴۸، رقم: ۱۳۶۲۹۔ (م)

(۳) عبد اللہ بن دینار عدوی، ابو عبد الرحمن مدنی مولی ابن عمر، جلیل القدر تابعی ہیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا انس رضی اللہ عنہ، سلیمان بن یسار، نافع مولی ابن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ حضرات سے روایت کرتے ہیں، کتب ستہ کے راوی ہیں، امام ابن معین، ابوزرعہ، ابو حاتم، عجلی، محمد بن سعد اور امام نسائی فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن دینار ثقہ ہے۔ ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ۲۲۷ھ کو وفات پائی۔

(تہذیب الکمال: ۱۷/ ۲۰۸، تہذیب التہذیب: ۵/ ۲۰۱، تقریب التہذیب: ۳۰۲)(م)

غلطی واقع ہو چکی ہے[۱]۔

۱۰۔ علل الحدیث پر معروف تصانیف:

(الف)۔ کتاب العلل، از امام علی بن مدینی: (م: ۲۳۴ھ)
(ب)۔ علل الحدیث، از امام ابن ابی حاتمؒ (م: ۳۲۷ھ)
(ج)۔ العلل و معرفۃ الرجال، از امام احمد بن حنبلؒ (م: ۲۴۱ھ)
(د)۔ العلل الکبیر، العلل الصغیر، از امام ابو عیسی ترمذیؒ (م: ۲۷۹ھ)
(ھ)۔ العلل الواردۃ فی الحدیث النبویۃ، از امام دار قطنیؒ (م: ۳۱۱ھ) یہ فن کی سب سے جامع اور وسیع کتاب ہے[۲]۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۸۹، النکت للزرکشی: ۲/ ۲۱۱، تدریب الراوی: ۱/ ۲۹۷، المنہل الروی: ۶۷، التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۱/ ۲۳۰۔ (م)

(۲) علل الحدیث پر دیگر کتابیں یہ ہیں:
۱۔ التاریخ والعلل، از یحیی بن معینؒ (م ۲۳۳ھ)۔
۲۔ علل الحدیث و معرفۃ الرجال، از علی ابن مدینیؒ (م ۲۳۴ھ)
۳۔ العلل الصغیر، از امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ)
۴۔ العلل، از ابو بکر اثرمؒ (۲۶۱ھ)
۵۔ المسند المعلل، از خالد بن احمد سدوسیؒ (م ۲۶۹ھ)
۶۔ العلل المتناہیۃ فی الاحادیث الواہیۃ، از عبد الرحمن ابن الجوزیؒ (۵۹۷ھ)۔ (م)

۷۔ مخالفت ثقات

جب راوی میں طعن کا سبب ثقہ رواۃ سے اختلاف ہو (جو کہ طعن راوی کا ساتواں سبب ہے) تو اس اختلاف کی وجہ سے علوم حدیث کی حسب ذیل پانچ اقسام معرض وجود میں آتی ہیں:

۱۔ مدرج ۲۔ مقلوب ۳۔ مزید فی متصل الاسانید ۴۔ مضطرب ۵۔ مصحف۔

مذکورہ اقسام کی اجمالی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ اگر سیاق اسناد میں تبدیلی کی وجہ سے ثقہ راویوں سے اختلاف ہو یا موقوف حدیث کیساتھ ملا دیا گیا ہو تو ایسی حدیث کو مدرج کہا جائے گا۔

۲۔ ثقہ رواۃ سے اختلاف کی وجہ اسناد میں تقدیم یا تاخیر ہو تو ایسے حدیث کو مقلوب کہا جائے گا۔

۳۔ اگر اختلاف ایک راوی کی اضافہ کی وجہ سے ہو تو اسے مزید فی متصل الاسانید کہا جائے گا۔

۴۔ اگر اختلاف کی صورت یہ ہو کہ ایک راوی کی جگہ دوسرے راوی کا نام لیا گیا ہو یا متن میں ایسا تعارض ہو جس کیلئے کوئی وجہ ترجیح نہ ہو تو اسے مضطرب کہا جائے گا۔

۵۔ اگر اختلاف کی صورت یہ ہو کہ محض الفاظ میں تبدیلی واقع ہو چکی ہو اور اسناد اپنی ترتیب پر باقی ہو تو ایسی حدیث کو مصحف کہتے ہیں[۱]۔

اب ذیل میں ان پانچوں عنوانات پر مفصل بحث کی جارہی ہے۔

---

[۱] نزہۃ النظر: ۴۸-۴۹۔ (ط)

۱۔ حدیث مدرج[۱]

۱۔ مدرج کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مدرج ''ادراج''(باب افعال) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، عربی محاورہ ہے: ''أدرجت الشيء في الشيء.'' ''میں نے ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کر دیا اور رکھ دیا۔'' مدرج کا معنی ہے: ''جس میں کچھ ملا دیا گیا ہو۔''[۲]

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

مدرج وہ حدیث ہے، جس کی سند کے سیاق اور ترتیب کو بدل دیا گیا ہو یا متن حدیث میں بغیر فصل کے ایسے الفاظ داخل کر دیئے گئے ہوں جو اس کا حصہ نہ ہو[۳]۔ *

۲۔ مدرج کی اقسام وانواع:

مدرج کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ مدرج الاسناد ۲۔ مدرج المتن

---

(۱) معرفة علوم الحدیث:۳۹، مقدمة ابن الصلاح:۱۹۴، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۲۵۴ - ۲۵۷، التقریب:۷۹ - ۸۰، الاقتراح:۲۲۳، المنهل الروي:۵۳، الموقظة:۵۳، اختصار علوم الحدیث:۷۳، المقنع في علوم الحدیث:۱/ ۲۲۷، نزهة النظر:۱۲۴، شرح التبصرة والتذكرة: ۱/ ۳۹۵، ألفية السیوطي:۷۳ - ۷۹، شرح السیوطي علی ألفية العراقي:۲۰۱، فتح الباقي: ۱/ ۲۴۶، توضیح الأفكار: ۲/ ۵۰، ظفر الأماني:۲۴۸، قواعد التحدیث:۱۲۴.(م)

(۲) لسان العرب:۲/ ۲۶۹۔(م)

(۳) نزهة النظر:۴۸۔(ط)

* مدرج کی مذکورہ دو تعریفیں کی گئی ہیں، پہلی تعریف مدرج الاسناد کی ہے اور دوسری تعریف مدرج المتن کی ہے، علوم الحدیث کی کتابوں میں مدرج کی یہی دو تعریفیں کی گئی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ تعریفیں جامع مانع نہیں، کیونکہ یہ یا تو مدرج الاسناد کی ہیں اور یا مدرج المتن کی ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ احمد شاکرؒ کی تعریف جامع مانع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہیں:

''الحدیث المدرج: ما كانت فيه زيادة ليست منه-''(الباعث الحثیث:۶۱)

''مدرج وہ حدیث ہے جس میں ایسا اضافہ ہو جو اس کی اصل میں نہ ہو۔'' (م)

(الف)۔ مدرج الاسناد کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس کی سند کے سیاق وترتیب کو بدل دیا گیا ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ راوی ایک سند بیان کر رہا ہو، اسی اثناء میں کوئی ایسی بات پیش آجائے جس کی وجہ سے اسے اپنی طرف سے کوئی بات کرنی پڑ جائے، تاہم سننے والوں میں سے کسی کا یہ خیال آجائے کہ یہ بھی سند کا حصہ ہے، پھر یہ سامع جب کبھی روایت کرنے لگے تو اس وقت وہ زائد بات بھی سند میں شامل کردے[1]۔

۲۔ مدرج الاسناد کی مثال:

مدرج الاسناد کی مثال ثابت بن موسیٰ زاہد کا وہ قصہ ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

---

[1] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے نزہۃ النظر میں مدرج الاسناد کی درج ذیل چار قسمیں ذکر کی ہیں:

پہلی قسم: چند رواۃ نے ایک حدیث کو مختلف اسانید سے ذکر کیا، پھر ایک راوی نے ان سب کو ایک شخص کی اسناد پر متفق کر کے بذریعہ اس اسناد کے اس حدیث کو ان سے روایت کیا اور اسانید کے اختلاف کو ذکر نہ کیا، جیسے سنن ترمذی میں روایت ہے:

"عَنْ بُنْدَارٍ، عَنِ ابْنِ مَهْدِيٍّ، عَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ، عَنْ وَاصِلٍ، وَمَنْصُورٍ، وَالْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ، عَنْ عَمْرِو بْنِ شُرَحْبِيلَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قُلْتُ: «يَا رَسُولَ اللهِ أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ» ؟"

اس حدیث کے متعلق واصل اور منصور اور اعمش کے جدا جدا استاد تھے اس لیے کہ واصل کے اسناد میں عمرو بن شرحبیل نہیں بخلاف اسناد منصور واعمش کہ اس میں ان کا بھی ذکر ہے لیکن راوی سفیان نے واصل کو منصور داعمش کی اسناد پر متفق کر کے تینوں سے حدیث مذکور روایت کی اور اسانید میں جو اختلاف تھا اسے فروگذاشت کر دیا۔

دوسری قسم: ایک راوی کے نزدیک ایک متن کا ایک حصہ ایک اسناد سے ثابت تھا اور دوسرا حصہ دوسرے اسناد سے، لیکن اس کے شاگرد نے دونوں حصوں کو اس سے بذریعہ ایک ہی اسناد کے روایت کر دیا، جیسے نسائی میں روایت ہے:

" عَنْ سُفْيَانَ بْنِ عُيَيْنَةَ، عَنْ عَاصِمِ بْنِ كُلَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ فِي صِفَةِ صَلَاةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ فِيهِ: «ثُمَّ جِئْتُهُمْ بَعْدَ ذَلِكَ فِي زَمَانٍ فِيهِ بَرْدٌ شَدِيدٌ، فَرَأَيْتُ النَّاسَ عَلَيْهِمْ جُلُّ الثِّيَابِ تَحَرَّكُ أَيْدِيهِمْ تَحْتَ الثِّيَابِ» ."اس روایت میں =

"«مَنْ كَثُرَتْ صَلَاتُهُ بِاللَّيْلِ حَسُنَ وَجْهُهُ بِالنَّهَارِ»." (۱)

"جو شخص رات کے وقت زیادہ نمازیں پڑھے گا تو دن کے وقت اس کا چہرہ خوبصورت اور منور ہو گا۔"

اس قصے کا پس منظر یہ ہے کہ ایک مرتبہ ثابت بن موسی (۲) قاضی شریک بن عبد اللہ (۳) سے ملاقات کے لیے آئے، جب وہ مجلس میں داخل ہوئے تو قاضی صاحب حدیث کی املاء کراتے

= " ثُمَّ جِئْتُهُمْ بَعْدَ ذَلِكَ فِي زَمَانٍ... "عاصم کے نزدیک اس اسناد سے نہیں بلکہ ایک دوسرے اسناد سے ثابت تھا مگر اس کے شاگرد سفیان نے اسے اول متن کے ساتھ ملا کر اس کے مجموعہ گو بایں اسناد عاصم سے روایت کر دیا۔

یا یہ کہ راوی نے ایک متن ایک حصہ اپنے شیخ سے اور دوسرا حصہ بالواسطہ اس سے شیخ سے سنا تھا مگر بوقت روایت اس کے شاگرد نے دونوں حصے سے ملا کر دونوں کو شیخ سے روایت کر دیا۔

تیسری قسم: ایک راوی کے نزدیک دو مختلف متن دو مختلف اسناد سے ثابت تھے مگر اس کے شاگرد نے دونوں ملا کر اس مجموعہ کو ایک اسناد کے ساتھ اسے روایت کر دیا۔ یا ایک متن کے ساتھ دوسرے متن کا ایک حصہ ملا کر اس مجموعہ کو اس متن کے اسناد سے روایت کیا، جیسے روایت ہے:

"عنْ سَعِيدُ بْنُ أَبِي مَرْيَمَ عَنْ مَالِكٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا تَنَافَسُوا»." اس روایت میں "وَلَا تَنَافَسُوا" اس کا متن نہیں بلکہ دوسرے متن کا حصہ تھا مگر امام مالکؒ کے شاگرد نے اس کو اس متن کے ساتھ ملا کر اس مجموعہ کو اس متن کے اسناد سے روایت کر دی۔

چوتھی قسم: شیخ نے ایک اسناد بیان کیا اور اس سے پہلے اس کا متن بیان کرے کسی ضرورت سے اس نے کوئی کام کیا، شاگرد بایں خیال کہ یہ کلام اس اسناد کا متن ہے، اس اسناد سے اس کلام کو اس سے روایت کرنے لگا۔ دیکھئے: نزہۃ النظر: ۱۱۱۔ (م)

(۱) سنن ابن ماجہ، باب قیام اللیل ج۱، ص ۴۲۲ رقم الحدیث / ۱۳۳۳. (ط)

(۲) ثابت بن موسی بن عبد الرحمن بن سلمہ ضبی، ابویزید کوفی، عابد زاہد تھے، ضعیف الحدیث تھے، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ یہ کذاب ہے، ابو حاتم کہتے ہیں کہ ضعیف ہے، ۲۲۹ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۴ /۲۷۷، المجروحین لابن حبان: ۱ /۲۰۷، الکاشف للذہبی: ۱ /۱۷۲) (م)

(۳) شریک ابن عبد اللہ نخعی کوفی قاضی، ابوعبد اللہ، امام یحیی بن سعیدؒ نے انہیں ضعیف قرار دیا۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ شریک کی روایات کسی کام کے نہیں۔ جوزجانی کہتے ہیں کہ مضطرب الحدیث اوران کا حافظہ خراب تھا۔ دار قطنی فرماتے ہیں کہ شریک قوی راوی نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جب سے کوفہ کے قاضی بنے تو ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، کثیر الخطاء تھے، عادل فاضل، نیک صالح تھے، اہل بدعت سے سخت متنفر تھے۔

(میزان الاعتدال: ۲ /۲۷۰، تقریب التہذیب: ۲۷۷)(م)

ہوئے کہہ رہے تھے:

"حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ أَبِي سُفْيَانَ عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ".

قاضی صاحب یہ جملہ املاء کرنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہے تاکہ مستملی[1] اسے لکھ لے، اتنے میں ان کی نظر ثابت بن موسیٰ پر پڑی، تو ان کے خوبصورت اور نورانی چہرہ کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھے: "«مَنْ كَثُرَتْ صَلَاتُهُ بِاللَّيْلِ حَسُنَ وَجْهُهُ بِالنَّهَارِ»"۔ قاضی صاحب کی اس جملہ سے مراد ثابت بن موسیٰ تھے، جن کے زہد وورع کو دیکھ کر انہوں نے یہ جملہ کہا تھا، لیکن ثابت بن موسی نے یہ خیال کر لیا کہ یہ کلمات اس متن کے ہیں، جس کی سند شریک بن عبد اللہ املاء کروارہے تھے اس کے بعد پھر یہ ہوا کہ ثابت بن عبد اللہ اس جملہ کو اس سند کیساتھ بطور حدیث بیان کرتے رہے[2]۔

(ب)۔ مدرج المتن:

(ا)۔ مدرج المتن کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس میں فصل کے بغیر ایسے الفاظ شامل ہوں جو متن کا حصہ نہ ہوں[3]۔

(٢)۔ مدرج المتن کی اقسام وانواع:

مدرج المتن کی تین قسمیں ہیں:

(الف)۔ ادراج حدیث کے اول میں ہو، اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا ہے، تاہم وسط حدیث میں ادراج کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔

(ب)۔ ادراج حدیث کے درمیان میں ہو، یہ اول کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا ہے۔

(ج)۔ ادراج حدیث کے آخر میں ہو، زیادہ تر یہی ہوتا ہے[4]۔

---

[1] مستملی وہ شخص ہے جو شیخ کی بیان کردہ الفاظ کو بلند آواز میں سننے والوں تک پہنچادے جب کہ شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ (ط)

[2] تدریب الراوی: ١/ ٣٣٩۔ (م)

[3] نزہۃ النظر: ١١١، النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح: ٢/ ٨٠٢۔ (م)

[4] تدريب الراوي ج١، ص٢٧٠. (ط)

(۳)۔ مدرج المتن کی مثالیں:

(الف)۔ پہلی قسم: اولِ حدیث میں ادراج کی مثال:

آغاز حدیث میں ادراج کا سبب یہ ہوتا ہے کہ کبھی راوی کوئی مسئلہ بیان کرتا ہے، پھر اس کے لیے دلیل کے طور پر کوئی حدیث پیش کرتا ہے توبسا اوقات بغیر کسی فصل کے وہ حدیث بیان کرتا دیتا ہے، جس کی وجہ سے سامع یہ خیال کرلیتا ہے کہ یہ پورا کلام ہی حدیث ہے جیسے خطیب بغدادیؒ نے ابو قطن اور شبابہ سے روایت کی ہے، انہوں نے شعبہ بن حجاج سے، انہوں نے معمر بن زیاد سے، انہوں نے سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"«أَسْبِغُوا الْوُضُوءَ، وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»."

"وضوء خوب پورا کیا کرو، خشک رہ جانے والی ایڑیوں کے لیے جہنم کی آگ سے تباہی ہے۔"

اس حدیث میں "أَسْبِغُوا الْوُضُوءَ "کا جملہ حدیث کا حصہ نہیں، بلکہ سیدنا ابو ہریرہؓ کا قول ہے، جس کو متن حدیث کے آغاز میں ملا دیا گیا ہے، جیسا کہ امام بخاریؒ کی روایت سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے، چنانچہ امام بخاریؒ، آدم سے، انہوں نے شعبہ بن حجاج سے، انہوں نے معمر بن زیادہ سے روایت کی ہے کہ سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

" «أَسْبِغُوا الْوُضُوءَ، فَإِنَّ أَبَا الْقَاسِمِ ﷺ قَالَ: وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ[۱]»."

"وضوء خوب پورا کیا کرو اس لیے کہ ابو القاسم ﷺ کا ارشاد ہے" وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ."

خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ابو قطن اور شبابہ کو شعبہ سے روایت کرتے وقت وہم ہوا ہے، کیونکہ انہوں نے سیدنا ابو ہریرہؓ کے کلام کو بھی حدیث سمجھ کر متن کیساتھ ملا دیا ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، اس لیے کہ اس حدیث کو راویوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے آدم کی روایت کے مطابق بیان کیا ہے[۱]۔

---

[۱] صحیح بخاری (۱/ ۳۳، رقم ۶۰)، صحیح مسلم (۱/ ۲۱۴، رقم ۲۴۱)، سنن أبي داود (۱/ ۲۴، رقم ۹۷)، سنن نسائی (۱/ ۷۷، رقم ۱۱۱)، سنن ابن ماجہ (۱/ ۱۵۵، رقم ۴۵۵) .(م)

[۱] تدريب الراوي ج۱، ص ۲۷۰.(ط)

(ب)۔ دوسری قسم: وسط حدیث میں ادراج کی مثال:

وسط حدیث میں ادراج واقع ہونے کی مثال اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث ہے، جو "بدء الوحی" کے متعلق ہے:

"«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتحَنَّثُ فِي غَارِ حِرَاءَ»-وَهُوَ التَّعَبُّدُ- اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ." [1]

"رسول اللہ ﷺ وحی کی ابتداء سے پہلے غار حراء میں کئی کئی راتیں عبادت میں مشغول رہتے۔"

اس حدیث میں "وَهُوَ التَّعَبُّدُ" امام زہریؒ کا قول ہے، جو وسط حدیث میں درج ہے، جس سے امام زہریؒ لفظ "يَتَحَنَّثُ" کی تشریح کر رہے ہیں۔

(ج)۔ حدیث کے آخر میں ادراج کی مثال:

حدیث کے آخر میں ادراج کی مثال سیدنا ابو ہریرہؓ کی یہ مرفوع حدیث ہے:

" «لِلْعَبْدِ الْمَمْلُوكِ أَجْرَانِ "، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْحَجُّ وَبِرُّ أُمِّي لَأَحْبَبْتُ أَنْ أَمُوتَ، وَأَنَا مَمْلُوكٌ»." [2]

"غلام جو کسی کی ملکیت میں ہو، اس کے لیے دو اجر ہیں، اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد، حج اور والدہ کی خدمت کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں یہ پسند کرتا کہ میری موت غلامی کی حالت میں آئے۔"

اس حدیث میں "وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ..." سے لے کر آخر تک سیدنا ابو ہریرہؓ کا اپنا کلام ہے، اس لیے کہ اس قسم کے کلام کا صدور رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس سے محال ہے، کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ غلامی کی تمنا اور آرزو کریں، نیز رسول اللہ ﷺ کے بچپن میں والدہ ماجدہ وفات پا گئی تھیں، ان کی غیر موجودگی میں ان کی خدمت کی تمنا کرنا بے معنی سی بات ہے۔ [1]

۴۔ ادراج کے اسباب و علل:

---

[1] صحيح بخاري، باب بدء الوحي، ١/ ٢٢، حديث ٣. (ط)

[2] صحيح بخاري، كتاب العتق: ٥/ ١٧٥، حديث ٢٥٤٨. (ط)

[1] تدریب الراوی: ١/ ٣١٧۔ (م)

حدیث میں ادراج کے متعدد اسباب اور دواعی ہیں، جن میں چند مشہور یہ ہیں:
(الف)۔ کسی حکم شرعی کا بیان۔
(ب)۔ حدیث مکمل ہونے سے پہلے ہی اس سے کسی شرعی حکم کا استنباط واستخراج۔
(ج)۔ حدیث میں وارد کسی قلیل الاستعمال لفظ کی تشریح۔[1]

۴۔ ادراج کی معرفت کس طرح ہوتی ہے؟

حدیث میں ادراج درج ذیل امور میں کسی ایک کے ذریعے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔
(الف)۔ کسی دوسری حدیث میں اس ادراج کو الفاظ حدیث سے علیحدہ کر کے بیان کیا ہو۔
(ب)۔ کسی ماہر فن محدث کی ادراج کی تصریح کرنا۔
(ج)۔ خود راوی کا اعتراف کرنا کہ اس نے اپنے کلام کو حدیث میں درج کیا ہے۔
(د)۔ مدرج کلام کی نوعیت اس طرح ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے اس کا صدور محال ہو[2]۔

۵۔ ادراج کا حکم:

محدثین کرام، فقہاء عظام اور دیگر اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ ادراج حرام ہے، البتہ اس سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ حدیث میں کسی غریب اور غیر مانوس لفظ کی تفسیر اور تشریح کی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ امام شہاب الدین زہری اور دیگر محدثین کرام نے بعض روایات میں تشریح وتوضیح کی غرض سے ادراج کیا ہے[1]۔

---

[1] مذکورہ تمام اسباب وعلل کا تعلق مدرج المتن کیساتھ ہے۔(م)

[2] النکت علی کتاب ابن الصلاح: ٢/ ٨١٢، نزہۃ النظر: ١١٢۔(م)

[1] حدیث مدرج کا شمار ضعیف حدیث کی اقسام میں ہوتا ہے کیونکہ حدیث میں کسی اور کے کلام کو داخل کرنے سے اس کی صحت متاثر ہوتی ہے، ادراج اگر خطاء وسہو سے واقع ہو تو صاحب ادراج پر کوئی مواخذہ نہیں، ہاں! اگر وہ زیادہ ادراج کرتا ہے تو اس کا ضبط مجروح ہوتا ہے اور قصداً اور عمداً ادراج کرنا بالاتفاق حرام ہے، علامہ سمعانیؒ فرماتے ہیں۔
”مَنْ تَعَمَّدَ الْإِدْرَاجَ فَهُوَ سَاقِطُ الْعَدَالَةِ، وَمِمَّنْ يُحَرِّفُ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ، وَهُوَ مُلْحَقٌ بِالْكَذَّابِينَ "." (تدریب الراوی: ١/ ٣٢٢)

٦۔ادراج پر معروف تصانیف:

(الف)۔ الفصل للوصل المدرج في النقل، از خطیب بغدادیؒ (م:٤٦٣ھ)۔

(ب)۔ تقریب المنهج بترتیب المدرج، یہ حافظ ابن حجرؒ کی تالیف لطیف ہے جو دراصل پہلی کتاب کی تلخیص اور اس پر اضافات ہیں[1]۔

"جو شخص عمداً ادراج کرے اس کی عدالت ساقط ہو جاتی ہے اور اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو کلمات میں تحریف کرتے ہیں اور وہ شخص کذابوں سے ملتا جلتا ہے۔"

علامہ سیوطیؒ (م ٩١١م) فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک غریب الفاظ کی تفسیر کرتے ہوئے ادراج کرنا ممنوع نہیں۔ اس لیے امام زہریؒ اور دیگر محدثین نے ایسا کیا ہے، لیکن ایسا کرنے میں بھی پسندیدہ عمل یہ ہے کہ صاحب کلام اپنی بات کی تصریح کر دے۔ (تدریب الراوی:١/ ٣٢٢)

حافظ ابن حجرؒ (م ٨٥٢ھ) امام زہریؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امام زہریؒ تفسیر کرتے ہوئے تفسیر کے اشارات ساقط کر دیتے تھے، اسی لیے ان کے بعض معاصرین ان سے کہا کرتے تھے:

"أفصل کلامك من کلام النبی ﷺ۔" (النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح:٢/ ٨٢٩)

"اپنی بات کو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد سے الگ بیان کرو۔" (م)

[1] مدرج پر دیگر کتابیں یہ ہیں:

١۔ المدرج الی معرفۃ المدرج: از جلال الدین سیوطیؒ (م ٩١١ھ)

٢۔ تسہیل المدرج الی المدرج: سید عبد العزیز غماری۔ (م)

۲۔ حدیث مقلوب [١]

ا۔ حدیث مقلوب کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مقلوب ''قلب''مصدر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کے معانی ہیں:'' ایک شئ کو اوندھا کرنا''[٢]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

مقلوب وہ حدیث ہے جس کی سند یا متن میں ایک لفظ کو دوسرے لفظ کیساتھ بدل دیا گیا ہو یا مقدم کو مؤخر یا مؤخر کو مقدم کیا گیا ہو[٣]۔ *

---

[١] معرفة علوم الحديث: ٣٩، مقدمة ابن الصلاح: ١٩٤، إرشاد طلاب الحقائق: ١/ ٢٥٤ - ٢٥٧، التقريب: ٧٩ - ٨٠، الاقتراح: ٢٢٣، المنهل الروي: ٥٣، الموقظة: ٥٣، اختصار علوم الحديث: ٧٣، المقنع فی الحديث: ١/ ٢٢٧، نزهة النظر: ١٢٤، شرح التبصرة والتذكرة: ١/ ٣٩٥، ألفية السيوطي: ٧٣ - ٧٩، شرح السيوطي على ألفية العراقي: ٢٠١، فتح الباقي: ١/ ٢٤٦، توضيح الأفكار: ٢/ ٥٠، ظفر الأماني: ٢٤٨. (م)

[٢] القاموس ج١، ص١٢٣. (ط)

[٣] نزہۃ النظر: ٤٩، النکت لابن حجر: ٢/ ٨٦٥۔ (ط)

* محدثین کرام نے مقلوب کی کوئی جامع مانع تعریف نہیں کی، ہر ایک نے کسی خاص پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے تعریف کی ہے، حافظ ابن الصلاحؒ (م ٦٤٣ھ) نے یوں تعریف کی ہے۔

'' هُوَ نَحْوُ حَدِيثٍ مَشْهُورٍ عَنْ سَالِمٍ، جُعِلَ عَنْ نَافِعٍ لِيَصِيْرَ بذلكَ غَرِيباً مَرْغُوباً فيهِ.''

(مقدمۃ ابن الصلاح: ٢٠٨)

''مقلوب جیسے سالم کی مشہور حدیث کو نافع کی سند سے بیان کرنا تاکہ عجیب ہونے کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہو۔''

علامہ ابن الصلاحؒ (م ٦٤٣ھ) کے متبعین نے بھی یہی تعریف کی ہے۔ دیکھئے: التقریب للنووی: ١٢، المنہل الروی: ٥٣، الخلاصہ فی معرفۃ الحدیث: ٧٦۔ =

٢۔ مقلوب کی اقسام وانواع:

مقلوب کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

ا۔ مقلوب السند ٢۔ مقلوب المتن

(الف)۔ مقلوب السند:

وہ حدیث ہے جس کی سند میں تبدیلی واقع ہوئی ہو، پھر اس تبدیلی کی دو صورتیں ہیں:

ا۔ راوی سند کے رواۃ میں سے کسی کے نام اور اس کے والد کے نام میں تقدیم و تاخیر کر دے، مثلاً ایک حدیث "کعب بن مرۃ" سے مروی ہے، اسے راوی "مرۃ بن کعب" کے نام سے بیان کر دے۔

٢۔ راوی سند میں غرابت پیدا کرنے کے لیے ایک راوی کی جگہ دوسرے راوی کا نام ذکر کر دے، مثلاً ایک مشہور حدیث جو سالم سے مروی ہو، راوی اسے نافع سے روایت کر دے، اسانید احادیث میں اس نوعیت کا قلب کرنے والوں میں "حماد بن عمرو نصیبی" کا نام معروف ہے، اس صورت کی مثال وہ حدیث ہے، جس کو حماد بن عمرو نصیبی نے اعمش سے، انہوں نے ابو صالح سے، انہوں نے سیدنا ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے:

" «إِذَا لَقِيتُمُ الْمُشْرِكِينَ فِي طَرِيقٍ فَلَا تَبْدَءُوهُمْ بِالسَّلَامِ». "[1]

"جب تمہیں مشرک راستہ میں ملے تو سلام میں پہل مت کرو۔"

یہ حدیث مقلوب السند ہے، اس لیے کہ حماد نصیبی نے اسے اعمش سے روایت کیا ہے، حالانکہ اس حدیث کے رواۃ میں اعمش کے بجائے سہیل بن ابی صالح ہے، جنہوں نے اپنے والد ابو صالح سے اور وہ سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں، اس پر دلیل یہ ہے کہ امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں اس کی یہی سند بیان کی ہے[1]۔

---

(1) الضعفاء الکبیر للعقیلی: ١/٣٠٨۔ (م)

(1) تدریب الراوی: ١/٣٢٣۔ (م)

اصول حدیث کی اصطلاح میں اس نوعیت کے قلب کرنے کو سارق الحدیث کہا جاتا ہے[1]۔

(ب)۔ مقلوب المتن:

وہ حدیث ہے جس کے متن میں الفاظ کی تبدیلی واقع ہوئی ہو، اس کی بھی دو صورتیں ہیں:

(الف)۔ راوی متن حدیث کے بعض الفاظ میں تقدیم و تاخیر کر دے، اس کی مثال صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث ہے، جس میں ان سات آدمیوں کا ذکر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں جگہ دے گا، جس دن اس کے سائے کے سوا کسی کا سایہ نہ ہو گا، اس حدیث میں ہے:

"رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ أَخْفَاهَا حَتَّى لَا تَعْلَمَ يَمِينُهُ مَا تُنْفِقُ شِمَالُهُ."[2]

"ان سات آدمیوں میں سے ایک وہ شخص بھی ہے، جس نے کوئی صدقہ کیا اور اسے اس طرح پوشیدہ رکھا کہ اس کے دائیں ہاتھ کو پتہ نہیں چل سکا کہ اس کے بائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔"

یہ حدیث کا وہ جملہ ہے جس میں بعض رواۃ نے تقدیم و تاخیر کر دی، اصل جملہ یوں ہے:

"حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ."

"یہاں تک کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چل سکا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔"

(ب)۔ راوی ایک حدیث کی سند کو دوسری حدیث کے متن کیساتھ جوڑ دے اور دوسری حدیث کی سند کو پہلی حدیث کے متن کیساتھ ملا دے اور پھر کسی محدث کے سامنے امتحان وغیرہ کی غرض سے پیش کر دے۔ اس کی مثال اہل بغداد کا وہ قصہ ہے، کہ اہل بغداد نے امام بخاریؒ کیساتھ ایسا ہی کیا کہ انہوں نے سو احادیث کو اپنی اسانید سے الگ کر کے دوسری احادیث کی اسانید کیساتھ جوڑ دیا، پھر امام بخاریؒ کے قوت حافظہ کا امتحان لینے کے لیے ان احادیث کے متعلق سوال کیا، تو آپ نے ہر حدیث کو اپنی سند کیساتھ پڑھ کر سنا دیا اور ایک حدیث کی سند میں بھی غلطی نہیں کی[1]۔

---

[1] تدریب الراوی: ۱/ ۳۲۳۔(م)

[2] یہ روایت صحیح مسلم، باب فضل إخفاء الصدقۃ: ۲/ ۷۱۵، حدیث ۹۱. میں مقلوب موجود ہے۔(ط)

[1] اس واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے: تاریخ بغداد ج ۲، ص ۲۰. (ط)

۳۔ قلب کے دواعی و محرکات:

ایک راوی کو قلب پر آمادہ کرنے والے مختلف اسباب اور دواعی ہو سکتے ہیں، جن میں چند یہ ہیں:
(الف)۔ اغراب اور دوسروں کو تعجب میں ڈالنے کی غرض سے قلب کرنا، تاکہ لوگ اس کی احادیث روایت کریں اور اس کے حلقہ درس سے مستفید ہوں۔
(ب)۔ محدث کے ضبط و حفظ کا امتحان لینا اور اس کے قوت حافظہ کو آزمانا[1]۔

---

[1] بعض اوقات محدث کے حفظ کا امتحان لیا جاتا ہے اور اس امتحان کے لیے احادیث میں تبدیلی کر دی جاتی ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اس کا حفظ واتقان مستحکم ہے یا اس میں اختلاط واقع ہو گیا ہے، اسی طرح یہ جاننے کے لیے کہ محدث کتنا آگاہ اور خبر دار ہے اور تلقین کو قبول کرتا ہے کہ نہیں! احادیث میں تبدیلی کرنے کا امتحان لیا جاتا ہے، محدثین کے ہاں اس طرح امتحان کی رسم تھی، حافظ ابوالحسن احمد بن عبداللہ عجلی کوفیؒ (م۲۶۱ھ) امام یحیی بن معینؒ (م۲۳۳ھ) کے متعلق فرماتے ہیں۔

”ما خلق الله تعالى أحدا كان أعرف بالحديث من يحيي بن معين....ولقد كان يؤتى بالأحاديث قد خلطت وتلبست فيقول هذا الحديث كذا وهذا كذا فيكون كما قال.“

(النکت علی کتاب ابن الصلاح:۲/ ۸۷۰، تہذیب التہذیب:۱۱/ ۲۸۸)

”اللہ تعالی نے ابن معینؒ سے زیادہ حدیث کی معرفت رکھنے والا نہیں پیدا کیا، ان کے سامنے مختلط اور مقلوب احادیث پیش کی جاتیں اور وہ کہتے: یہ اس طرح ہے اور یہ اس طرح اور جس طرح وہ کہتے ایسا ہی ہوتا۔“

حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ امام شعبہ بن حجاجؒ (م۱۶۰ھ) اکثر اس طرح کا امتحان لیتے، اگر کوئی شخص ان سے اتفاق کرتا تو وہ سمجھتے یہ حافظ نہیں اور اگر مخالفت کرتا تو معلوم ہو جاتا کہ اس کا ضبط قوی ہے، بعض اہل علم نے امام شعبہؒ کے اس طرز عمل کو ناپسند کیا ہے، کیونکہ اس طرح اصلاح کی بجائے فساد کا زیادہ خطرہ ہے۔ سامعین میں سے کوئی شخص غلطی سے مقلوب ہی کو صحیح روایت سمجھ سکتا ہے! اس ضمن میں محدثین کے عجیب واقعات ہیں، جنہیں مؤرخین اور اصحابِ سیر نے ذکر کیا ہے، ایک دو واقعات ملاحظہ ہوں۔

خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) نے احمد بن منصور رمادیؒ (م۲۶۵ھ) کی روایت سے لکھا ہے کہ وہ امام احمد بن حنبلؒ (م۲۴۱ھ) اور امام یحیی بن معینؒ (م۲۳۳ھ) کی معیت میں محدث جلیل عبد الرزاقؒ کے پاس گئے، جب کوفہ واپس آئے تو امام یحیی بن معینؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے کہا میں ابو نعیم فضل بن دکین کوفیؒ (م۲۱۸ھ) کا امتحان لینا چاہتا ہوں! امام احمد بن حنبلؒ نے انہیں منع کیا، لیکن وہ نہ رُکے۔ امام یحیی بن معینؒ نے ایک ورق لیا اور اس پر حافظ ابو نعیم کی تیس احادیث لکھیں اور ہر دس احادیث کے بعد ایک ایسی حدیث لکھی =

= جوان کی روایت نہ تھی، پھر حافظ ابو نُعیم کے پاس آئے اور وہ اپنے گھر سے باہر آئے اور دروازے کے سامنے ایک چبوترے پر بیٹھ گئے اور اپنی دائیں جانب امام احمد بن حنبلؒ کو بٹھایا، بائیں جانب امام یحیی بن معینؒ کو بٹھایا اور میں نیچے بیٹھا! ابن معینؒ نے دس احادیث پڑھیں اور حافظ ابو نُعیم خاموش رہے، پھر گیارہوں حدیث پڑھی تو حافظ ابو نُعیم نے کہا یہ میری حدیث نہیں، اسے مٹادو۔ پھر ابن معینؒ نے دوسری دس احادیث پڑھیں،، پھر اکیسویں حدیث پڑھی تو حافظ ابو نُعیمؒ نے کہا کہ یہ میری حدیث نہیں اسے مٹادو! پھر ابن معینؒ نے تیسری دس احادیث پڑھیں، پھر اکتیسویں حدیث پڑھی تو حافظ ابو نُعیم کا چہرہ بدل گیا اور امام احمدؒ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ اس شخص کے تقوی وورع نے مجھے کچھ کرنے سے روکا!! اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ چھوٹا ہے اس کی عمر اس طرح کے کام کرنے کی نہیں! اور ابن معینؒ کو کہا کہ یہ کام تونے کیا ہے! پھر انہوں نے طیش میں آکر اپنے پاؤں ابن معینؒ کے سینے پر مارا اور انہیں چبوترے سے لڑھکادیا اور گھر چلے گئے۔ امام احمدؒ نے ابن معینؒ سے کہا کہ میں نے تمہیں روکا نہیں تھا اور کہا نہ تھا کہ وہ ثقہ وضابط ہیں! امام ابن معینؒ نے کہا: سینہ کی یہ ضرب مجھے اس سفر سے زیادہ عزیز ہے!!

(تاریخ بغداد: ۲/ ۳۵۴، النکت علی کتاب ابن الصلاح: ۲/ ۸۷۰، فتح المغیث: ۱/ ۴۸۲)

اس طرح کا ایک واقعہ امام بخاریؒ کو پیش آیا، حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کو حافظ اابواحمد بن عدیؒ (م ۲۶۵ھ) نے مشائخ بخاری میں اور خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے کہ امام بخاریؒ جب بغداد آئے اور مشائخ کو علم ہوتو وہ اکٹھے ہوئے اور سو احادیث کی اسانید ومتون کو تبدیل کر دیا، سند کو سند سے اور متن کو متن سے تبدیل کر کے دس آدمیوں کو دس دس احادیث دے دیں اور کہا کہ مجلس میں حاضر ہو کر امام بخاریؒ کے سامنے پیش کر دی جائیں۔ جسب وعدہ خراسانی اور بغدادی مشائخ جمع ہوئے، جب سب لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو ان میں سے ہر شخص اٹھتا اپنی احادیث پیش کرتا اور امام بخاریؒ کہتے کہ مجھے ان کا علم نہیں، یہاں تک کہ دس حضرات نے اپنی احادیث پیش کر دیں، مجلس میں موجودہ فقہاء نے امام بخاریؒ کے جواب پر ایک دوسرے کو دیکھا اور کہا کہ اس شخص نے معاملہ سمجھ لیا ہے جب کہ دوسرے لوگوں کو امام بخاریؒ کے عجز و کوتاہی اور قلت حفظ کا احساس ہوا۔ جب یہ سب لوگ فارغ ہو گئے تو امام بخاریؒ پہلے اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ تمہاری پہلی حدیث اس طرح ہے اور دوسری اس طرح اور یوں اس کی دس احادیث صحیح اسانید ومتون کیساتھ سنادیں اور اسی طرح اشخاص کی احادیث کیساتھ کیا۔ اس پر تمام لوگوں نے ان کے حفظ وضبط کا اعتراف کیا اور ان کی فضلیت کو تسلیم کیا۔ (النکت علی کتاب ابن الصلاح: ۲/ ۸۶۷، فتح المغیث: ۱/ ۴۷۹)

=

(ج)۔ بعض اوقات غیر اختیاری طور پر غلطی کر بیٹھنا[1]۔

۴۔ قلب کا حکم:

اسباب قلب کے اختلاف کے اعتبار سے قلب کا حکم بھی مختلف ہوتا رہتا ہے۔

(الف)۔ اگر قلب کا مقصد اغراب اور ندرت پیدا کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ہو تو اس عمل کے ناجائز ہونے میں کوئی شک و تردد نہیں، کیونکہ اس سے حدیث میں لازمی طور پر تغیر و تبدیل ہوگی اور یہ وضاعین (احادیث گھڑنے والوں) کا عمل ہے۔

(ب)۔ اگر قلب کا مقصد کسی کا امتحان لینا ہو تا کہ حفظ و ضبط کا اندازہ ہو سکے تو اس شرط پر یہ عمل جائز ہے کہ مجلس برخاست ہونے سے پہلے صحیح سند اور متن کو بیان کیا جائے تا کہ کوئی غلط فہمی میں مبتلاء نہ ہو۔

(ج)۔ اگر سہو اور خطاء سے قلب ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ معذور ہو گا، تاہم اگر اس سے بکثرت ایسا ہوتا ہے تو اس سے اس کا ضبط متاثر ہو جائے گا اور پھر لازمی طور پر ضعیف قرار دیا جائے گا[1]۔

۵۔ حدیث مقلوب کا حکم:

اب رہی یہ بات کہ حدیث مقلوب کی حیثیت کیا ہے؟ تو حدیث مقلوب ضعیف اور نا قابل قبول ہے[2]۔

= حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) نے اس سلسلے میں کئی واقعات وحکایات لکھی ہیں، جن کے مطالعہ سے سلف صالحین کا حدیث کے ساتھ شغل وانہماک کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے احادیث کو کس قدر اہتمام سے ضبط کیا تھا اور اس میں کتنی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔ دیکھئے: النکت علی کتاب ابن الصلاح: ۲/۸۷۰۔ (م)

[1] اصول الحدیث عجاج الخطیب: ۳۴۶۔ (م)

[1] فتح المغیث للسخاوی: ۱/۳۳۹۔ (م)

[2] محدثین کرام کے نزدیک مقلوب حدیث ضعیف ہے، کیونکہ راوی کے ضبط میں اختلاف کی وجہ یہ تبدیلی آئی ہے، امتحان کے لیے تبدیلی اگرچہ ناجائز ہے، لیکن اسے ناپسندیدہ قرار نہیں دیا گیا ہے، جہاں تک عملی =

٦۔ حدیث مقلوب پر معروف تصانیف:

رافع الارتياب في المقلوب من الأسماء والألقاب:

یہ محدث جلیل خطیب بغدادیؒ کی تصنیف لطیف ہے، کتاب کے نام ظاہر ہے کہ اس میں صرف مقلوب السند احادث پر بحث کی گئی ہے[1]۔

= تبدیلی کرنے کا تعلق ہے تو یہ حرام ہے، اس سے راوی کی عدالت مجروح ہوتی ہے، ایسا ادراج کرنے والا مہتم بالکذب ہوتا ہے اور ایسی مقلوب حدیث کو موضوع کہا جائے گا اگر کبھی تبدیلی کرنے والا راوی متفرد بالحدیث ہو تو اس تبدیلی کو "سرقۃ الحدیث" کہا جاتا ہے اور ایسی حدیث کو "مسروق" کا نام دیا جاتا ہے۔

(فتح المغیث للسخاوی: ۱/ ۸۷۴، تدریب الراوی: ۱/ ۲۶۴) (م)

[1] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے امام دار قطنیؒ (م ۳۸۵ھ) کی علل الحدیث سے ایک کتاب مرتب کی ہے، جس پر انہوں نے کئی اضافات کیے، اس کا نام "جلاء القلوب فی معرفۃ المقلوب" رکھا ہے۔ (م)

۳۔ مزید فی متصل الاسانید[1]

ا۔ مزید فی متصل الاسانید کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مزید "الزیادۃ" مصدر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، متصل "منقطع" کی ضد ہے اور اسانید "اسناد" کی جمع ہے۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

وہ حدیث ہے جس کی سند میں کسی جگہ ایک راوی کا اضافہ کر دیا گیا ہو، جو بظاہر متصل معلوم ہو[2]۔*

---

(1) مقدمۃ ابن الصلاح:۳۹۲، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۵۷۶ - ۵۸۰، التقریب:۱۶۱ - ۱۶۲، اختصار علوم الحدیث:۱۷۶ - ۱۷۷، الشذا الفیاح ۲/ ۴۷۷ - ۴۷۸، المقنع فی الحدیث:۲/ ۴۸۳ - ۴۸۶، شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/ ۴۴۰، فتح المغیث:۳/ ۷۹ - ۸۲، تدریب الراوي: ۲/ ۲۰۳ - ۲۰۴، شرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي:۱۷۰، فتح الباقي: ۲/ ۳۰۶ - ۳۱۰، توضیح الأفکار: ۲/ ٦۴ - ٦۷.(م)

(2) نزہۃ النظر:۴۹۔(م)

* حافظ ابن حجرؒ(م۸۵۲ھ)مزید فی متصل الاسانید کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

" أو إن كانت المخالفة بزيادةِ راوٍ في أثناء الإسناد، ومَن لم يزدها أَتقنُ ممن زادها، فهذا هو المزيد في متصل الأسانيد." (نزہۃ النظر:۱۱۳)

"اگر مخالف اس طور پر ہو کہ سند کے درمیان میں کوئی راوی زیادہ کر دیا گیا ہو اور اضافہ نہ کرنے والا اضافہ کرنے والے سے زیادہ ضابط ہو تو اسے مزید فی متصل الاسانید کہتے ہیں۔"

حافظ ابن حجرؒ(م۸۵۲ھ) کے نزدیک اس کے لیے یہ شرط ہے کہ جس سے اضافہ ثابت نہ ہو اس نے اپنے مروی عنہ سے سماع کی تصریح کی ہو، اگر روایت معنعن ہو(جس میں عدم سماع کا احتمال ہے) تو پھر زائد بیان کو ترجیح دی جائے گی۔ (نزہۃ النظر:۱۱۳)

حافظ بدر الدین ابن جماعہؒ(م۷۳۳ھ) نے یوں تعریف کی ہے۔

" وَهُوَ أَن يزِيد الرَّاوِي فِي إِسْنَاد حَدِيث رجلا أَو أَكثر وهما مِنْهُ وغلطا." (المنہل الروی:۱۷)

"وہ حدیث ہے جس کے اسناد میں راوی وہم اور غلطی سے ایک یا زیادہ راویوں کا اضافہ کر دے۔" =

۲۔ مزید فی متصل الاسانید کی مثال:

مزید فی متصل الاسانید کی مثال وہ حدیث ہے جس کو عبد اللہ بن مبارکؒ نے روایت کیا ہے:

”قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ يَزِيدَ، حَدَّثَنِي بُسْرُ بْنُ عُبَيْدِ اللهِ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا إِدْرِيسَ قَالَ: سَمِعْتُ وَاثِلَةَ يَقُولُ: سَمِعْتُ أَبَا مَرْثَدٍ يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا تَجْلِسُوا عَلَى الْقُبُورِ».“[۱]

”ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں سفیانؒ نے، انہوں نے عبد الرحمٰن بن یزید سے، انہوں بسر بن عبید اللہ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو ادریس سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے واثلہ کو کہتے ہوئے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو مرثد کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قبروں پر نہ بیٹھا کرو اور نہ ہی قبروں کے رخ نماز پڑھو۔“

۳۔ مذکورہ مثال میں اضافہ:

مذکورہ مثال میں دو جگہ اضافہ اور زیادتی ہے، پہلی جگہ ”سفیان“ کے نام کا اور دوسری اور دوسری جگہ ”ابا ادریس“[۱] کے نام کا اور دونوں جگہ زیادتی کا باعث محض راوی کا وہم ہے۔

(الف)۔ پہلا اضافہ سفیان کے نام کا ہے اس کا سبب ابن مبارک سے نیچے رواۃ کا وہم ہے، کیونکہ ثقہ رواۃ کی ایک جماعت نے اس حدیث کو ابن مبارکؒ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے عبد

= ڈاکٹر نور الدین عتر حفظہ اللہ نے مزید فی متصل الاسانید کی تعریف میں متصل کے لفظ کا اضافہ کیا ہے اس لیے غیر متصل میں اضافہ اس نوع میں داخل نہیں۔ (منہج النقد فی علوم الحدیث: ۳۶۴) (م)

[۱] صحیح مسلم، کتاب الجنائز ج۷، ص۳۸، والترمذي ج۳، ص۳۶۷. دونوں محدثین نے اپنی اپنی روایتوں میں ”ابو ادریس“ کا اضافہ کیا ہے اور اسے حذف بھی کر دیا ہے۔ (ط)

[۱] عبد اللہ بن ادریس بن عائذ بن عتبہ بن غیلان، ابو ادریس خولانی عوذی، تابعی ہیں، رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جنگ حنین کے دن پیدا ہوئے، کبائر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سماع کیا، سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ کے بعد شام کے سب سے بڑے عالم شمار ہوتے تھے، ۸۰ھ میں وفات پائی۔

(تہذیب التہذیب: ۲۸۹، مشاہیر علماء الامصار: ۱۱۲) (م)

الرحمٰن بن یزید (۱) سے بلا واسطہ روایت کی ہے، لیکن انہوں نے ان دونوں کے درمیان سفیان کا تذکرہ نہیں کیا، نیز بعض ثقہ راویوں نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ ابن مبارک نے سند میں "عن عبد الرحمٰن" کی بجائے "أخبرنا عبد الرحمٰن" کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

(ب)۔ دوسرا اضافہ ابو ادریس کے نام کا ہے، یہ خود عبد اللہ بن مبارکؒ کا وہم ہے، کیونکہ متعدد ثقہ رواۃ نے اس حدیث کو عبد الرحمٰن بن یزید سے روایت کیا ہے، لیکن انہوں بسر بن عبید اللہ (۲) سے روایت کیا ہے، لیکن انہوں نے بسر بن عبید اللہ کے بعد ابو ادریس کا نام نہیں لیا، بلکہ بعض نے یہ تصریح کی ہے کہ بسر بن عبید اللہ نے ابو ادریس سے نہیں بلکہ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ (۳) سے سنا ہے (۱)۔

۴۔ زیادتی کو رد کرنے کی شرائط:

سند میں اضافہ اور زیادتی رد کرنے اور اسے راوی کا وہم قرار دینے کے لیے دو شرطیں ہیں:

(الف)۔ سند میں اضافہ نہ کرنے والا راوی اضافہ کرنے والے سے احفظ اور اضبط ہو۔

(ب)۔ اضافے کی جگہ کسی اور روایت میں سماع کی تصریح ہو۔

---

(۱) عبد الرحمن بن یزید بن جابر ازدی، ابو عتبہ شامی درانی، ثقہ ہیں، ابن ابی داؤد کہتے ہیں یہ عبد الرحمن بن یزید ثقہ ہے، ۱۵۳ھ کو وفات پائی۔

(خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال: ۱/ ۲۳۶، تقریب التہذیب: ۳۵۳)(م)

(۲) بسر بن عبید اللہ حضرمی شامی، امام نسائی اور عجلی کہتے ہیں کہ ثقہ ہے، ابو مسہر فرماتے ہیں کہ ابو ادریس کے تلامذہ میں بسر بن عبد اللہ سب سے احفظ ہے، مروان بن محمد نے بھی ان کی توثیق کی ہے اور امام حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۱/ ۴۳۸، خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال: ۱/ ۴۷)(م)

(۳) سیدنا واثلہ بن اسقع بن عبد العزی بن عبد اللیل لیثی، کنانی رضی اللہ عنہ، ۲۲ قبل از ہجری پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی اور اصحاب صفہ میں سے تھے، غزوہ تبوک میں شریک ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین سال خادم رہے، بصرہ میں سکونت اختیار کی، فتح دمشق میں شریک رہے، بیت المقدس میں قیام کیا، ۱۰۵ سال زندہ رہے اور بعض کہتے ہیں کہ ۹۸ سال زندہ رہے اور دمشق میں ۸۳ھ کو آخری فوت ہونے والے صحابی ہیں۔

(الاستیعاب: ۴/ ۱۵۶۳، اسد الغابہ: ۵/ ۳۹۹، الاعلام للزرکلی: ۸/ ۱۰۷)(م)

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۹۳، تدریب الراوی: ۲/ ۶۲۱، توجیہ النظر: ۲/ ۵۹۵۔(م)

مذکورہ بالا دونوں شرائط مفقود ہوں یا دونوں میں سے ایک شرط نہ پائی جائے تو اضافہ کو ترجیح دے کر قبول کر لیا جائے گا اور جو سند اس زیادتی اور اضافے سے خالی ہو گی اسے منقطع تصور کیا جائے گا، لیکن یہ انقطاع خفی ہو گا، جس کو مرسل خفی کا نام دیا جائے گا[1]۔

۴۔ وقوع زیادتی کے دعوی پر وارد چند اعتراضات:

زیادتی کے وقوع کے دعوی پر دو قسم کے اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں:

(الف)۔ اگر وہ اسناد جو اضافے اور زیادتی سے خالی ہے اور اضافے والی جگہ حرف ''عن'' کیساتھ بیان ہو تو اسے منقطع متصور کرنا زیادہ مناسب ہو گا؟

(ب)۔ اگر اضافے اور زیادتی کی جگہ سماع کی تصریح ہو تو اس بات کا احتمال ہے کہ راوی نے یہ حدیث پہلے بالواسطہ سنی ہو، پھر اس کے بعد بلاواسطہ بھی سماع کیا ہو، یعنی یہ احتمال ہے کہ راوی نے پہلے اس زائد راوی سے حدیث سنی ہو پھر بعد والے راوی سے بلاواسطہ بھی اس حدیث کو سنا ہو؟

مندرجہ بالا اعتراضات کے جوابات یہ ہو سکتے ہیں:

(الف)۔ پہلا اعتراض بالکل درست ہے اور وہی ہے جو معترض نے کہی ہے کہ ایسی سند کو منقطع کہنا اولی ہے۔

(ب)۔ رہا دوسرا اعتراض تو اس میں مذکورہ بات کا احتمال ممکن ہے، تاہم محدثین کرام اضافے اور زیادتی پر اس وقت تک راوی کے وہم کا حکم نہیں لگاتے جب تک کوئی قرینہ ایسا نہ پایا جائے جو اس زیادتی کے وہم ہونے پر دال ہو[1]۔

۶۔ مزید فی متصل الاسانید پر معروف تصانیف:

تمیز المزید فی متصل الاسانید، از خطیب بغدادیؒ۔

---

(۱) تدریب الراوی: ۲/ ۲۶۳۔ (م)

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۹۳، تدریب الراوی: ۲/ ۲۶۳۔ (م)

۴۔حدیث مضطرب [۱]

ا۔حدیث مضطرب کی تعریف:

(الف)۔لغوی تعریف:

مضطرب ”الاضطراب“(باب افعال) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کے معانی ہیں: بے چینی، نظام کا فاسد اور خراب ہو جانا۔ یہ اصل میں ”اضطراب الموج“ کے محاورہ سے مأخوذ ہے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب لہریں بہت زیادہ اٹھ رہی ہوں اور موجیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہوں [۲]۔

(ب)۔اصطلاحی تعریف:

مضطرب وہ حدیث ہے جو مختلف طرق سے مروی ہو اور تمام طرق قوت میں مساوی ہوں [۳]۔

۲۔تعریف کی توضیح:

مضطرب وہ حدیث ہے جو مختلف اور متعارض شکلوں پر مروی ہو، جن کی باہم جمع اور تطبیق ممکن نہ ہو اور یہ تمام روایات ایسے طرق سے مروی ہو جو ہر اعتبار سے قوت میں ایک دوسرے کے مساوی ہوں، جس کی وجہ سے کسی ایک طریق کو دوسرے طرق پر کسی صورت میں ترجیح دینا ممکن نہ ہو [۱]۔

۳۔اضطراب کے تحقق کے لیے شرائط:

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۱۹۲، إرشاد طلاب الحقائق:۱/ ۲۴۹ - ۲۵۳، التقریب:۷۷ - ۷۸، الاقتراح:۲۱۹، المنهل الروي:۵۲، الموقظة: ۵۱، اختصار علوم الحدیث:۷۲، المقنع في علوم الحدیث:۱/ ۲۲۱، شرح التبصرة والتذکرة:۱/ ۳۹۰، نزهة النظر:۱۲۶، فتح المغیث:۱/ ۲۲۱، ألفیة السیوطي:۶۷ - ۶۸، شرح السیوطي علی ألفیة العراقي:۱۹۷، فتح الباقي:۱/ ۲۴۰، توضیح الأفکار:۲/ ۳۴، ظفر الأماني:۳۹۲.(م)

(۲) لسان العرب:۱/۵۴۳۔(م)

(۳) علوم الحدیث:۹۳-۹۴،التقریب مع التدریب:۱/ ۲۶۲۔(ط)

(۱) محدثین کرام کی اصطلاح میں مضطرب وہ حدیث ہے جس کی روایت میں اختلاف پایا جاتا ہے،انہوں نے مضطرب کی تعریف مختلف انداز میں کی ہے،حافظ ابن حجرؒ(۸۵۲ھ) نے اسے مخالفت ثقات کے ضمن میں ذکر کیا ہے،اس لیے وہ یوں تعریف بیان فرماتے ہیں۔

” أو كانت المخالفة بإبداله، أَيْ: الراوي، ولا مرجِّحَ لإحدى الروايتين على الأخرى، فهذا هو =

مضطرب کی تعریف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی حدیث کو مضطرب کہنے کے لیے دو شرطوں کا متحقق ہونا ضروری ہے، اور وہ دو شرطیں یہ ہیں:

(الف)۔ روایات حدیث میں ایسا اختلاف ہو، جس کی وجہ سے ان کا باہم جمع و تطبیق ممکن نہ ہو۔

(ب)۔ جملہ روایات قوت میں ایک دوسرے کے مساوی ہوں، کسی ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دینا ممکن نہ ہو۔

لیکن جب ایک روایت کو دوسرے پر ترجیح دی جاسکے یا کسی معقول اور مقبول صورت میں تمام روایات کا جمع و تطبیق ممکن ہو تو اس صورت میں حدیث مضطرب نہیں رہے گا پھر ہم حالت ترجیح میں راجح روایت پر عمل پیرا ہوں گے اور جمع و تطبیق کی صورت میں تمام روایات پر عمل کریں گے[1]۔

۴۔ مضطرب کی اقسام وانواع:

مواقع اضطراب کے اعتبار سے مضطرب کی دو قسمیں ہیں:

(الف)۔ مضطرب السند (ب)۔ مضطرب المتن

= المُضْطَرِبُ. "(نزہۃ النظر:۱۱۷)

"اگر ایک راوی کی جگہ دوسرا راوی بدل دینے سے مخالفت ثقات ہوئی اور دونوں روایتوں میں سے کسی ایک کو دوسری ترجیح نہ دی جاسکے تو یہ حدیث مضطرب ہو گی۔"

علامہ ابن الصلاحؒ(م ۶۴۳ھ) اور یگر حضرات نے مطلق اختلاف کے حوالے سے تعریف کی ہے۔

" الْمُضْطَرِبُ مِنَ الحديثِ: هوَ الذي تَخْتَلِفُ الروايَةُ فيهِ، فَيَرْوِيْهِ بَعْضُهُم عَلَى وَجْهٍ، وبَعْضُهُم على وَجْهٍ آخَرَ مخَالِفٍ لَهُ. وإنَّمَا نُسَمِّيْهِ مُضْطَرِباً إذا تَسَاوَتِ الروايتَانِ." (مقدمۃ ابن الصلاح:۱۹۲)

"مضطرب وہ حدیث ہے جس میں روایت مختلف ہو، یعنی ایک راوی ایک طریق پر روایت کرے اور دوسرا راوی ایک اور طریق پر روایت کرے جو پہلے سے مختلف ہو اور ہم اسے مضطرب اسی صورت میں کہیں گے جب دونوں برابر سطح کی ہوں۔"

مضطرب کی یہی تعریف معمولی درو بدل کیساتھ علامہ نوویؒ(۶۷۶ھ)، بدرالدین ابن جماعہؒ(م ۷۱۱ھ) اور حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) وغیرہ نے بھی کی ہے، تاہم اس تعریف میں حافظ ابن الصلاحؒ(۶۴۳ھ) نے اس تعریف میں دو شرطوں کا ذکر کیا ہے: ایک یہ کہ دونوں روایتیں متساوی ہوں کسی ایک کو دوسری پر ترجیح نہ دی جاسکے، اگر وجہ ترجیح پیدا ہو گئی تو راجح کو مقدم سمجھا جائے گا۔ اسی طرح یہ روایت محفوظ یا معروف ہو جائے گی اور مرجوح کو شاذ یا منکر کہا جائے گا۔ مقدمۃ ابن الصلاح:۱۹۲، التقریب والتیسیر:۱۱، اختصار علوم الحدیث:۶۰، المنہل الروی:۵۲۔(م)

[1] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۱۹۲، التقریب للنووی:۱۱، المنہل الروی:۵۲، اختصار علوم الحدیث:۶۰۔(م)

(الف)۔ مضطرب السند :

وہ حدیث ہے جس کی سند میں اضطراب ہو، اور اس قسم کا اضطراب اکثر واقع ہوتا ہے [۱]، اس کی مثال سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے، آپؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

”«يَا رَسُولَ اللهِ! أَرَاكَ شِبْتَ، قَالَ: شَيَّبَتْنِي هُودُ وَأَخَوَاتُهَا»۔ [۲]“

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ کو بوڑھے ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے ”سورۃ ہود“ اور اس طرح کی دیگر سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔“

امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مضطرب ہے؛ اس لیے کہ یہ صرف ابو اسحاق کے طریق سے مروی ہے اور ابو اسحاق سے روایت کرنے والوں نے اسے مختلف طریقوں سے یہ روایت ان سے بیان کی ہے، مثلاً ابو اسحاق کے بعض تلامذہ نے اس کو مرسل روایت کیا ہے، کسی نے موصول روایت کیا ہے، بعض نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی روایت شمار کیا ہے، بعض حضرات نے سیدنا سعدؓ [۱] کا

---

[۱] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے مضطرب السند کی درج ذیل چھ قسمیں ذکر کی ہیں:

۱۔ وصل اور ارسال کا تعارض ۲۔ وقف اور رفع کا تعارض

۳۔ اتصال وانقطاع کا تعارض:

۴۔ ایک شخص تابعی سے روایت کرے جو ایک صحابی سے بیان کرتا ہے جب کہ کچھ دوسرے لوگ اسی شخص سے روایت کریں جو کسی اور تابعی کے ذریعے اسی صحابی سے روایت کرے۔

۵۔ دو سندوں میں سے ایک میں ایک شخص کا اضافہ ہو۔

۶۔ راوی اور اس کے نسب کا اختلاف ہو جب کہ ثقہ وضعیف ہونے میں تردد ہو۔ ان کے اقسام کی تفصیل کے لیے دیکھئے: النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح: ۲/ ۷۷۸۔ (م)

[۲] سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي، كتاب التفسير، تفسير سورة الواقعة ج۹، ص۱۸۴، لیکن الفاظ یہ ہیں: ” «شَيَّبَتْنِي هُودُ، وَالوَاقِعَةُ، وَالمُرْسَلَاتُ، وَعَمَّ يَتَسَاءَلُونَ، وَإِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ».“ مجھے سورۃ ہود، سورۃ واقعہ، سورۃ مرسلات، سورۃ عم یتساءلون اور سورۃ الشمس نے بوڑھا کر دیا۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (ط)

[۱] سیدنا سعد بن ابی وقاص مالک بن اہیب بن عبد مناف قریشی، زہری، ابو اسحاق رضی اللہ عنہ، ۲۳ قبل از ہجری مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، فاتح عراق، مدائن وکسری تھے، عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، انہیں فارس الاسلام کے لقب سے نوازا گیا۔ آپ ان چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنہیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے خلافت کے لیے نامزد کیا تھا، ۱۷ سال کی عمر میں اسلام لائے، غزوہ بدر میں شریک رہے، ان کی مرویات کی تعداد ۲۷۱ ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں کوفہ کے گورنر رہے، =

مسند بتلایا ہے اور بعض نے اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ[۱] کا مسند قرار دیا ہے اور اس کے تمام رواۃ تقریباً ثقہ ہیں، کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی اور نہ ہی ان میں جمع و تطبیق ممکن ہے[۲]۔

(ب)۔ مضطرب المتن:

وہ حدیث ہے جس کے متن میں اضطراب ہو[۳]۔ اس کی مثال وہ حدیث ہے جو امام ترمذیؒ نے شریک سے روایت کی ہے:

"عَنْ أَبِي حَمْزَةَ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ: «سُئِلَ النَّبِيُّ - ﷺ -

---

= عقیق (مدینہ منورہ سے دس میل کے فاصلے پر واقع ایک قصبہ ہے) کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:۴/۱۷۹، اسد الغابہ :۲/۴۵۲، سیر اعلام النبلاء:۱/۹۲، تاریخ الخلفاء:۲۵)(م)

(۱) سیدہ عائشہ بنت ابی بکر صدیق عبد اللہ بن عثمان، ام المؤمنین رضی اللہ عنہم، ۹ قبل از ہجری مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں، فقاہت اور علوم دینیہ میں اپنی مثال آپ تھیں، ۲ ہجری میں رسول اللہ ﷺ کیساتھ ان کی شادی ہوئی، امہات المؤمنین میں رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوبہ تھی، اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے میراث کے مسائل کے متعلق پوچھا کرتے تھے، بکثرت احادیث ان سے مروی ہیں، مدینہ منورہ میں ۵۸ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:۴/۱۸۸۱، اسد الغابہ :۷/۱۸۶، الاصابہ:۸/۲۳۱، الاعلام للزرکلی:۳/۲۴۰)(م)

(۲) تدریب الراوي:۱/ ۲۶۵.(ط)

(۳) یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ اضطراب کا وقوع سند میں زیادہ ہوتا ہے اور متن میں بہت ہی کم ہوتا ہے، حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

"وهو يقعُ في الإِسنادِ غالباً. وقد يقعُ في المتْن. لكنْ قَلَّ أنْ يُحْكَمَ المحدِّث على الحديث باضطرابٍ بالنسبة إلى اختلافٍ في المَتْنِ دونَ الإِسنادِ." (نزہۃ النظر:۱۱۷)

"اضطراب سند میں زیادہ واقع ہوتا ہے اور کبھی متن میں اضطراب پایا جاتا ہے، لیکن ایسا کم ہوتا ہے کہ محدث کسی کے بارے میں سند کے علاوہ صرف متن کی بنیاد پر اضطراب کا فیصلہ کرے۔"

علامہ طاہر جزائریؒ (م ۱۳۳۸ھ) حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کی اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

=

عَنِ الزَّكَاةِ فَقَالَ: إِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ».“[1]

”شریک نے ابو حمزہ سے، انہوں نے شعبی سے، انہوں نے حضرت فاطمہ بنت قیس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے زکوۃ کے متعلق استفسار کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مال میں زکوۃ کے سوا اور بھی حق ہوتا ہے۔“

سنن ابن ماجہ میں یہ روایت اسی طریق سے مروی ہے، تاہم اس کے الفاظ یہ ہیں:

= ” أَن الْمُحدثين قَلما يحكمون على الحَدِيث بِالِاضْطِرَابِ إِذا كَانَ الِاخْتِلَاف فِيهِ وَاقعا فِي نفس الْمَتْن لِأَن ذَلِك لَيْسَ من شَأْنهمْ من جِهَة كَونهم محدثين وَإِمَّا هُوَ من شَأْن الْمُجْتَهدين وَإِنَّمَا يحكمون على الحَدِيث بِالِاضْطِرَابِ إِذا كَانَ الِاخْتِلَاف فِيهِ وَاقعا فِي نفس الْإِسْنَاد لِأَنَّهُ من شَأْنهمْ وَذَلِكَ لِأَن الِاطِّلَاع على مَا فِي الْإِسْنَاد من عِلّة على مَا يَنْبَغِي يعسر على غَيرهم بِخِلَاف الِاطِّلَاع على مَا فِي الْمَتْن من عِلّة سَوَاء كَانَ فِيهِ اضْطِرَاب أم لَا فَإِنَّهُ سهل الْمدْرك فَلذَلِك صرفُوا جلّ عنايتهم إِلَى بَيَان مَا يتَعَلَّق بِالْإِسْنَادِ ليكفوا غَيرهم مؤونة ذَلِك وَلذَلِك تتعرض لذكر مَا وَقع فِيهِ الِاضْطِرَاب من جِهَة الْمَتْن وَإِنَّمَا تعرضوا للمضطرب لِأَنَّهُ دَاخل فِي المعل فانتبه لذَلِك.“

(توجیہ النظر الی اصول الاثر: ۲/ ۵۸۲)

”اگر اختلاف متن میں واقع ہو تو محدثین ایسی حدیث کے مضطرب ہونے کا فیصلہ کم ہی دیتے ہیں، اس لیے محدثین ہونے کے ناطے یہ ان کے شایان شان نہیں، بلکہ یہ کام مجتہدین کا ہے اور محدثین سند پر اضطراب کا حکم اس وقت لگاتے ہیں جب اختلاف سند میں واقع ہو کیونکہ یہ ان ہی کا کام ہے، اس لیے ہے کہ سند میں واقع علت پر مطلع ہونا غیر محدث کے لیے مشکل ہے اور جب کہ متن کے کسی علت پر مطلع ہونا دشوار نہیں، خواہ اس میں اضطراب ہو یا نہ ہو، متن کی علت واضطراب کا معلوم کرنا آسان ہے، یہی وجہ کہ انہوں نے اپنی اکثر توجہات اسناد سے متعلق امور کے بیان پر صرف کی ہیں تاکہ دوسروں کو اس مشقت سے باز رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تم دیکھو گے کہ کتب علل میں سند کے اضطراب کا ذکر موجود ہو گا، لیکن متن میں واقع اضطراب کے ذکر سے کم ہی تعرض کیا جائے گا۔“

مذکورہ تصریحات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اضطراب فی السند وقوع زیادہ ہے اور محدثین کرامؒ اسی سے بحث کرتے ہیں اور اضطراب فی المتن کم پایا جاتا ہے اور اس سے محدثین بحث نہیں کرتے، بلکہ اس مجتہدین اور فقہاء بحث کرتے ہیں۔ (م)

[1] سنن الترمذي، كتاب الزكاة: ۳/ ۴۸، حدیث ۶۵۹. (ط)

"«لَيْسَ فِي الْمَالِ حَقٌّ سِوَى الزَّكَاةِ»." [۱]

"مال میں زکوۃ کے سوا کوئی حق نہیں۔"

اب یہ دونوں متعارض روایات قوت میں مساوی ہیں، کسی ایک کو ترجیح دینا ممکن نہیں اور نہ ہی جمع و تطبیق کا امکان ہے، اسی وجہ سے علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں۔

"فَهَذَا اضْطِرَابٌ لَا يَحْتَمِلُ التَّأْوِيلَ." [۲]

"یہ اس قسم کا اضطراب ہے جس میں کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔"

۵۔ کن رواۃ سے اضطراب واقع ہوتا ہے؟

(الف)۔ کبھی اضطراب ایک راوی سے واقع ہوتا ہے اس طور پر کہ ایک ہی راوی حدیث کو مختلف طرق سے روایت کرتا ہے۔

(ب)۔ بسا اوقات اضطراب متعدد رواۃ سے واقع ہوتا ہے۔ ہر ایک راوہ حدیث کو اس طریق پر روایت کرتا ہے جو دوسروں کے طریق سے مختلف ہوتا ہے [۳]۔

۶۔ حدیث مضطرب کے ضعف کا سبب:

مضطرب کے ضعیف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اضطراب خواہ متن میں ہو یا سند میں ہو رواۃ کے عدم ضبط کی ترجمانی کرتا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ رواۃ کا عدم ضبط حدیث کے ضعیف اور نا قابل ہونے کا سبب ہوتا ہے [۱]۔

۷۔ حدیث مضطرب پر معروف تصانیف:

المقترب فی بیان المضطرب، از حافظ ابن حجر عسقلانیؒ۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الزکاۃ: ۱/ ۵۷۰، حدیث ۱۷۸۹. (ط)

(۲) تدریب الراوی: ۱/ ۳۱۳۔ (م)

((۳)) مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۹۲۔ (م)

((۱)) مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۹۲، التقریب والتیسر: ۱۱، المنہل الروی: ۵۳، فتح المغیث: ۱/ ۲۳۳۔ (م)

۵۔ حدیث مصحف[۱]

۱۔ حدیث مصحف کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مصحف ”تصحیف“ (باب تفعیل) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، اس کے معانی ہیں: صحیفہ کے پڑھنے میں غلطی کرنا اور اس سے ”صحیفی“ مأخوذ ہے[۲]۔ یہ اس شخص کو کہتے ہیں جو صحیفہ پڑھنے میں غلطی کرتا ہے اور اپنی غلط خوانی کے باعث بعض الفاظ کو بدل دیتا ہے[۳]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

مصحف وہ حدیث ہے جس میں حدیث کے ان کلمات کو جو ثقہ راویوں نے روایت کیے ہوں لفظی یا معنوی طور پر بدل دیئے گئے ہوں[۱]۔

۲۔ فن تصحیف کی اہمیت و دقت:

یہ ایک جلیل القدر اور لطیف فن ہے، اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ان دقیق غلطیوں کی نقاب کشائی سے سامنے آتا ہے جو بعض راویوں سے سرزد ہوئی ہیں اس لیے اس مشکل اور پیچیدہ کام کے لیے وہ نابغہ روزگار حفاظ کمربستہ ہوئے جو عبقریت وحذاقت اور حفظ وضبط میں اعلی معیار

---

[۱] معرفة علوم الحديث: ١٤٦ - ١٥٢، مقدمة ابن الصلاح: ٣٨٣، إرشاد طلاب الحقائق: ٢/ ٥٦٦ - ٥٧٠ التقريب: ١٥٨ - ١٥٩، اختصار علوم الحديث: ١٧٠ - ١٧٤، الشذا الفياح ٢/ ٤٦٧ - ٤٧٠، المقنع في علوم الحديث: ٢/ ٤٦٩ - ٤٧٩، شرح التبصرة والتذكرة: ٢/ ٤٢٢ - ٤٣١، نزهة النظر: ١٢٧ - ١٢٨، فتح المغيث: ٣/ ٦٧ - ٧٤، تدريب الراوي: ٢/ ١٩٣ - ١٩٥، شرح السيوطي عَلَى ألفية العراقي: ١٥٦، فتح الباقي: ٢/ ٢٩٥، ٣٠١، توضيح الأفكار: ٢/ ٤١٩ - ٤٢٢، ظفر الأماني: ٢٨٢ - ٢٨٧. (م)

[۲] القاموس ج٣، ص١٦٦. (ط)

[۳] لسان العرب: ١/ ١٨٧، المعجم الوسيط: ١/ ٥١٠۔ (م)

[۱] نخبة الفكر، ص٤٩، توضيح الأفكار. (ط)

کے حامل ہیں، جیسے امام دار قطنیؒ وغیرہ[(۱)]۔

۳۔حدیث مصحف کی تقاسیم وانواع:

محدثین نے حدیث مصحف کو مختلف اعتبار سے درج ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا ہے:

(الف)۔پہلی تقسیم:موقع و محل کے اعتبار سے:

حدیث مصحف کے موقع اور محل کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں:

۱۔تصحیف فی الاسناد ۲۔تصحیف فی المتن

۱۔تصحیف فی الاسناد کی تعریف:

یہ وہ حدیث ہے جس کے سند میں تصحیف ہو۔اس کی مثال وہ حدیث ہے، جس کو شعبہ بن حجاجؒ نے عوّام بن مراجم سے روایت کیا ہے، لیکن امام ابن معینؒ نے تصحیف کر کے "مراجم" کو "مراحم" بنا کر روایت کیا ہے[(۲)]۔

۲۔تصحیف فی المتن کی تعریف:

یہ وہ حدیث ہے جس کے متن میں تصحیف ہو۔اس کی مثال سیدنا زید بن ثابتؓ[(۱)] کی یہ حدیث ہے:

"أَنَّ النبيﷺاحْتَجَرَ في المسجدِ."[(۲)]

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح:۳۸۳۔(م)

(۲) مقدمہ ابن الصلاح:۳۸۴۔(م)

(۱) سیدنا زید بن ثابت بن ضحاک انصاری خزرجی،ابو خارجہ رضی اللہ عنہ،۱۱ قبل از ہجری کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے،مکہ مکرمہ میں پلے بڑھے، جلیل القدر صحابی رسول ہیں، چھ سال کے تھے کہ ان کے والد کو قتل کیا گیا۔۱۱سال کی عمر میں رسول اللہ ﷺ کیساتھ ہجرت کی،مدینہ منورہ میں فقہ،قضاء،فتوی،قراءت اور میراث کے بہت بڑے عالم تھے،سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ ان کے گھر استفادہ کرنے کے لیے آتے، آپ سے ۹۲احادیث مروی ہیں،۴۵ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:۲/۵۳۷، اسد الغابہ:۲/۳۴۶، الاصابہ:۲/۴۹۰، الاعلام للزرکلی:۳/۵۷)(م)

(۲) صحیح بخاری(۱/۱۴۷، رقم:۷۳۱) اور صحیح مسلم(۱/۵۴۰، رقم:۷۸۱)میں یہ حدیث ان الفاظ کیساتھ مروی ہے:" عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ: أَنَّ رَسُولَ اللهِﷺاتَّخَذَ حُجْرَةً – قَالَ: حَسِبْتُ أَنَّهُ قَالَ مِنْ حَصِيرٍ – فِي رَمَضَانَ، =

لیکن ابن لہیعہ (۱) نے اس میں تصحیف کرکے یوں روایت کیا ہے:

" أَنَّ النبي ﷺ احْتَجَمَ في المسْجِدِ." (۲)

رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں سینگی لگوائی۔

(ب)۔ دوسری تقسیم: منشا اور باعث کے اعتبار سے:

حدیث مصحف کی منشا اور باعث کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں:

ا۔ مصحف البصر ۲۔ مصحف السمع

ا۔ مصحف البصر کی تعریف:

وہ تصحیف ہے، جس میں قاری پر تحریر کا خط مشتبہ ہو جائے، اس کا سبب خواہ خط کی خرابی ہو یا الفاظ پر نقطوں کا نہ ہونا ہو۔ تصحیف کی یہ صورت اکثر پیش آتی ہے، اس کی مثال یہ حدیث ہے:

"«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ وَأَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ»." (۱)

"جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شوال کے بھی چھ روزے رکھے۔

= فَصَلَّى فِيهَا لَيَالِيَ، فَصَلَّى بِصَلاَتِهِ نَاسٌ مِنْ أَصْحَابِهِ، فَلَمَّا عَلِمَ بِهِمْ جَعَلَ يَقْعُدُ، فَخَرَجَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ: «قَدْ عَرَفْتُ الَّذِي رَأَيْتُ مِنْ صَنِيعِكُمْ، فَصَلُّوا أَيُّهَا النَّاسُ فِي بُيُوتِكُمْ، فَإِنَّ أَفْضَلَ الصَّلاَةِ صَلاَةُ المَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا المَكْتُوبَةَ»." (م)

(۱) عبد اللہ بن لہیعہ بن عقبہ حضرمی، ابو عبد الرحمن، مصر کے قاضی اور بڑے عالم تھے، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، ابن المدینیؒ اور عبد الرحمن بن مہدیؒ کہتے ہیں کہ ہم ابن لہیعہ سے کوئی روایت نہیں لیتے۔ فلاس کہتے ہیں کہ ان کا کتب خانہ جلنے سے پہلے کی روایات صحیح ہیں، امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ابن لہیعہ ضعیف ہے، امام ابو زرعہؒ اور امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ مضطرب الحدیث ہے۔ (میزان الاعتدال: ۲/ ۴۷۵، تہذیب التہذیب: ۵/ ۳۷۳)(م)

(۲) مقدمہ ابن الصلاح: ۳۸۴۔ (م)

(۱) صحیح مسلم (۲/ ۸۲۲ رقم ۱۱۶۴)، سنن أبي داود (۲/ ۳۲۴، رقم ۲۴۳۳)، سنن الترمذي (۳/ ۱۳۲، رقم ۷۵۹)، سنن النسائي: (۲/ ۱۶۳، رقم ۲۸۶۲)، سنن ابن ماجہ (۱/ ۵۴۷، رقم ۱۷۱۶)، مسند أحمد (۵/ ۴۱۷ رقم ۲۳۵۸۰) صحیح ابن حبان (۸/ ۳۹۶، رقم ۳۶۳۴). (م)

لیکن ابو بکر صولی(۱) کو پڑھنے میں اشتباہ ہوا تو انہوں نے "سِتًّا" کو "شَیْئًا" سمجھ کر روایت کیا(۲)۔

۲۔ مصحف السمع کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس میں تصحیف کا سبب راوی کی قوت سماعت کی کمزوری ہو یا مجلس میں شیخ سے دوری ہو، یا اس قسم کی اور کوئی وجہ ہو، جس کی وجہ سے سامع پر بعض کلمات وزن صرفی میں باہم ایک ہونے کی وجہ سے مشتبہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث عاصم أحول(۳) سے مروی ہے تو قوت سماعت کی کمزوری کی وجہ سے سامع نے تصحیف کرکے واصل أحدب(۴) لکھ دیا

(ج)۔ تیسری تقسیم: لفظ یا معنی کے اعتبار سے:

حدیث مصحف کی لفظ یا معنی کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں:

ا۔ مصحف اللفظ ۲۔ مصحف المعنی

ا۔ مصحف اللفظ کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس کے الفاظ میں تصحیف ہو، جیسا کہ گزشتہ مثالوں سے واضح ہوا(۲)۔

۲۔ مصحف المعنی کی تعریف:

---

(۱) محمد بن محمد بن عبد اللہ بن عباس بن محمد بن صول، کنیت ابو بکر اور صولی کی نسبت سے معروف ہیں، تاریخ، سیر اور ادب پر دسترس حاصل تھی۔ (م۳۳۵ھ) کو وفات پائی۔ دیکھئے: تاریخ بغداد: ۳/ ۴۲۷، معجم الادباء: ۱۹/ ۱۰۹، سیر اعلام النبلاء: ۱۵/ ۳۰۱۔ (م)

(۲) دیکھئے: تاریخ بغداد: ۳/ ۴۳۱. (م)

(۳) عاصم ابن سلیمان احول، ابو عبد الرحمن بصری، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں، یحیی بن سعید قطان کے علاوہ کسی اور نے اس پر کلام نہیں کیا۔ دیکھئے: تقریب التہذیب: ۲۸۵، رقم الترجمہ: ۳۰۶۰۔ (م)

(۴) واصل ابن حیان احدب، اسدی کوفی، ثقہ ہیں۔ دیکھئے: تقریب التہذیب: ۵۷۹، رقم الترجمہ: ۷۳۸۲۔ (م)

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۸۹، تدریب الراوی: ۲/ ۶۵۰۔ (م)

(۲) حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) نے اس کی یہ مثال ذکر کی ہے:

"وبَلَغَنا عَنِ الدَّارَقُطْنِيِّ أنَّ مُحَمَّدَ بنَ المثَنَّى أبا مُوسَى العَنَزِيَّ حَدَّثَ بحديثِ النبيِّ ﷺ: (لا يأتِي أحدُكُمْ يومَ القِيامةِ ببَقَرَةٍ لها خُوارٌ)، فقالَ فيهِ: (أو شَاةٍ تَنْعَرُ) - بالنُّونِ - وإنَّما هوَ: (تَيْعَرُ) - بالياءِ المثناةِ مِنْ تحتُ -." (مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۸۶)

=

وہ حدیث ہے جس میں تصحیف کرنے والا راوی الفاظ کو اپنے حال پر رہنے دے، تاہم اس کی تفسیر و تشریح وہ بیان کرے، جس سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ راوی نے اس لفظ کا مفہوم کچھ اور سمجھا ہے، اس کی مثال ابو موسٰی عنزی (۱) کا یہ قول ہے:

"نَحْنُ قَوْمٌ لَنَا شَرَفٌ، نَحْنُ مِنْ عَنَزَةَ صَلَّى إِلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ." (۲)

"ہم ایسی قوم ہیں جنہیں یہ شرف حاصل ہے کہ ہم عنزہ قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں ہماری طرف رُخ کر کے رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔"

یہ بات انہوں نے اس حدیث کی بنیاد پر کی ہے:

"أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى إِلَى عَنَزَةَ."(۱)

"رسول اللہ ﷺ نے ایک لاٹھی کو سترہ بنا کر اس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی۔"

اس حدیث میں لفظ "عَنَزَة"(۲) دیکھ کر ابو موسٰی کو یہ وہم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے قبیلہ عنزہ کی جانب رُخ کر کے نماز ادا فرمائی، حالانکہ یہاں "عَنَزَة" سے وہ لاٹھی اور چھری مراد

ہے، جس کو نمازی اپنے سامنے سترہ کے طور پر گاڑتا ہے (۱)۔

= "ہمیں دار قطنی سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ محمد بن مثنی ابو موسی عنزی نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کی کہ ناجائز طور پر حاصل کرنے والا شخص گائے ساتھ لائے گا جو آوازیں نکالتی ہو گی۔ اس میں اس نے "تَنْعَرُ" نون کیساتھ کہا جو حقیقت میں "تَيْعَرُ" دو نقطوں والی یاء کیساتھ ہے۔ (جس کے معنی بکری میں میں کرتی ہو گی)۔" (م)

(۱) محمد ابن مثنی ابن عبید عنزی (بفتح النون والزاء)، ابو موسی بصری، نام اور کنیت دونوں سے مشہور ہیں، ثقہ ہیں، کتب ستہ کے راوی ہیں، ابن معینؒ کہتے ہیں کہ ثقہ ہے۔ امام ذہلیؒ فرماتے ہیں کہ حجت ہے۔ صالح بن محمد کہتے ہیں کہ صدوق ہے، ابو حاتم کہتے ہیں کہ صالح الحدیث صدوق ہے، دار قطنی کہتے ہیں کہ ثقہ ہے۔ ۲۵۲ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۲۶/ ۳۵۹، تہذیب التہذیب: ۹/ ۴۲۵، تقریب التہذیب: ۵۰۵، رقم الترجمۃ: ۶۲۶۴) (م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۸۷۔ (م)

(۱) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: " عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: «كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَغْدُو إِلَى الْمُصَلَّى وَالعَنَزَةُ بَيْنَ يَدَيْهِ تُحْمَلُ، وَتُنْصَبُ بِالْمُصَلَّى بَيْنَ يَدَيْهِ، فَيُصَلِّي إِلَيْهَا»." دیکھئے: صحیح بخاری: ۲/ ۲۰، رقم: ۹۷۳، صحیح مسلم: ۲/ ۵۵، رقم: ۵۰۱۔ (م)

(۲) "عَنَزَة" عین اور نون مفتوح کیساتھ ہے۔ دیکھئے: الأنساب للسمعاني: ۴/ ۲۲۱، تاج العروس: ۱۵/ ۲۴۸.

۴۔حافظ ابن حجر کی تقسیم:

مذکورہ تین تقاسیم کے علاوہ حافظ ابن حجرؒ نے تصحیف کی ایک دوسری تقسیم کی ہے، جو دو قسموں پر مشتمل ہے۔

(الف)۔ مصحّف (ب)۔ محرّف

(الف)۔ مصحّف کی تعریف:

یہ تصحیف کی وہ قسم ہے، جس میں خط کی اصل صورت موجود رہتی ہے لیکن حروف کے نقطوں کی تبدیلی وتغیر کی وجہ سے لفظ بدل جاتا ہے[۲]۔

(ب)۔ محرّف کی تعریف:

یہ تصحیف کی وہ قسم ہے جس میں خط کی اصل صورت موجود رہتی ہے، لیکن حروف کی شکل بدلنے سے تلفظ بدل جاتا ہے[۱]۔

۵۔کیا تصحیف راوی کو مجروح کر دیتی ہے؟

اس کی تفصیل یہ ہے:

(الف)۔ اگر راوی سے تصحیف کا ظہور شاذ ونادر ہو تو اس کے حفظ وضبط کو مجروح نہیں کرتا، کیونکہ خطاء اور معمولی تصحیف سے کوئی شخص محفوظ نہیں۔

(ب)۔ لیکن اگر راوی سے تصحیف بکثرت صادر ہو تو یہ اس کے حفظ وضبط کو مجروح کر دیتا ہے اور یہ اس کے ضبط کی کمزوری پر ایک قسم دلیل بن جاتی ہے۔ نیز ایسا راوی محدثین کرام کے نزدیک اس بات کا قابل نہیں رہتا کہ اس کی روایات کو قبول کیا جائے[۱]۔

---

[۱] مقدمۃ ابن الصلاح:۳۸۷، تدریب الراوی:۲/۶۵۰۔(م)

[۲] حافظ ابن الصلاحؒ(م۶۴۳ھ) کی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مصحف محرف سے زیادہ عام ہے، بلکہ حافظ ابن حجرؒ(م۸۵۲ھ) کی تعریف سے زیادہ عام ہے کیونکہ حافظ ابن الصلاحؒ کے نزدیک حرف کو حرف سے تبدیل کرنا بلکہ کلمہ کو کلمہ سے تبدیل کرنا بھی تصحیف میں آتا ہے جب کہ حافظ ابن حجرؒ مصحف کو نقطوں کی تبدیلی تک محدود رکھتے ہیں اور شکل کی تبدیلی کو محرف قرار دیتے ہیں۔(اصول الحدیث:۱/۶۱۷)(م)

[۱] نزہۃ النظر:۱۱۸۔(م)

۶۔ راوی کا کثرت تصحیف میں مبتلا ہونے کا سبب:

راوی کا کثرت تصحیف میں مبتلا ہونے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنے مشایخ[۲] اور مدرسین سے حدیث لینے کا موقع نہیں ملتا تو وہ اکثر کتابوں اور صحیفوں سے استفادہ کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تصحیف کا شکار ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ محدثین کرامؒ نے ایسے لوگوں سے حدیث لینے سے متنبہ فرمایا اور واضح الفاظ میں کہا ہے:

"لا يؤخذ الحديث من صحفي."[۱]

"اس شخص سے احادیث نہ لی جائیں، جس نے کتابوں اور صحیفوں سے حدیث لی ہوں۔"

۷۔ تصحیف پر معروف تصانیف:

(الف)۔ التصحیف، از امام دار قطنیؒ (م: ۳۸۵ھ)۔

(ب)۔ اصلاح خطأ المحدثین از امام خطابیؒ ۔

(ج)۔ تصحیفات المحدثین، از علامہ أبو أحمد عسکریؒ[۲]۔

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح: ۳۸۹، نزہۃ النظر: ۱۹۹، تدریب الراوی: ۲/ ۶۵۰۔ (م)

(۲) اکثر فضلاء کرام مشایخ کو "مشائخ"، "ی" کی جگہ "ہمزہ" پڑھتے ہیں، حالانکہ یہ درست نہیں، کیونکہ علم صرف کا قاعدہ ہے کہ ہر حرف علت جو الف مفاعل کے بعد واقع ہو اس کو ہمزہ سے بدلنا واجب ہے، حرف علت زائد کو مطلقا اور حرفِ اصلیہ کو اس شرط کیساتھ کہ الف مفاعل سے پہلے بھی حرف علت ہو۔ اگر پہلے حرف علت نہ ہو تو اسے ہمزہ سے بدلنا منع ہے اور مشایخ میں الف مفاعل کے بعد حرف اصلی ہے اور اس سے پہلے حرف علت نہیں۔ تو اسے ہمزہ سے بدلا کر "مشائخ" پڑھنا غلط ہے۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: ہامش الرفع التکمیل، از شیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ: ۴۶-۴۷۔ (م)

(۱) منہج النقد فی علوم الحدیث: ۴۴۶۔ (م)

(۲) حسن بن عبد اللہ بن سعید بن اسماعیل عسکری، ابو احمد، عسکر مکرم (اہواز) میں ۲۹۳ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور میں خوزستان کے عظیم ادیب، محدث اور مدرس تھے، حصول علم کے سلسلے میں بغداد، بصرہ اور اصفہان کے اسفار کیے، دور دراز سے طلبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے۔ ۳۸۲ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۴۱۳، الانساب: ۸/ ۴۵۲، وفیات الاعیان: ۲/ ۸۳، الاعلام للزرکلی: ۲/ ۱۹۶) (م)

۸- راوی سے جہالت [۱]

ا۔ جہالت بالراوی کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

جہالت ''جھل'' (باب سمع) فعل کا مصدر ہے جو ''علم'' کی ضد ہے [۲] اور جہالت بالراوی سے راوی کی عدم معرفت مراد ہے۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

راوی کی ذات یا حال سے لا علم ہونا [۳]۔

۲۔ جہالت بالراوی کے اسباب:

راوی کے غیر معروف اور مجہول ہونے کے تین اسباب ہیں:

(الف)۔ کثرت صفات: جن اوصاف کیساتھ راوی کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ کثیر ہوں، مثلاً راوی نام یا کنیت یا حرفت اور یا نسب میں سے کسی ایک کیساتھ مشہور و معروف ہو، لیکن کسی خاص مقصد کے پیش نظر غیر معروف نام یا لقب وغیرہ کیساتھ ذکر کیا جائے، جس کی وجہ سے سننے والا کوئی اور راوی سمجھ بیٹھتا ہے اور یوں ہی وہ راوی مجہول بن جاتا ہے، جیسے معمر بن سائب بن بشر کلبی ہیں [۱]، بعض حضرات نے اسے دادا کی طرف منسوب کر کے معمر بن بشر کہا ہے، بعض نے ان کا نام حماد بن سائب ذکر کیا ہے، بعض نے انہیں ان کی کنیت ابو نصر، بعض نے ابو سعید اور بعض نے

---

(۱) یہ طعن راوی کا آٹھواں سبب ہے۔ (ط)

(۲) المعجم الوسیط: ۱/ ۱۴۳۔ (م)

(۳) مقدمة فی اصول الحدیث: ٦٦۔ (م)

(۱) محمد بن سائب بن بشر بن عمرو ابن حارث کلبی، ابو نصر، کوفہ میں پیدا ہوئے، تاریخ واخبار کا امام ہے، عبد اللہ بن سبا یہودی کے قریبی ساتھی تھے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ ان پر موت نہیں آئی، بلکہ بادلوں میں اٹھائے گئے اور دوبارہ دنیا میں آکر اسے عدل وانصاف سے بھر دیں گے، اس کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ بیت الخلاء چلے گئے، اتنے میں جبریل علیہ السلام وحی لے کر آئے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو وحی کر ڈالی، کذاب اور متروک الحدیث تھا، ابو صالح از ابن عباس کی سند سے تفسیر کو روایت کرتا ہے، حالانکہ ابو صالح اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہی ثابت نہیں۔ کوفہ میں ق۱۴٦ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان: ۴/ ۳۰۹، میزان الاعتدال: ۳/ ۵۵٦، الاعلام للزرکلی: ۷/ ۱۳۳) (م)

ابوہاشم کیساتھ ذکر کیا ہے۔بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک جماعت کا نام ہیں، حالانکہ یہ سب ایک ہی شخص کے نام ہیں[۱]۔

(ب)۔ قلت روایت: بسااوقات راوی سے قلت روایت کی بناپر بہت کم روایات لی جاتی ہیں، بلکہ کبھی تواس سے روایت کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہوتا ہے، اس کی مثال ابو العُشَرَاء دارمی تابعی ہیں، ان سے صرف حماد بن سلمہ[۲] نے روایت کی ہے۔

(ج) ۔راوی کے نام کی تصریح نہ کرنا: بعض اوقات اختصار وغیرہ کی غرض سے صریح نام کے بجائے مبہم قسم کا نام ذکر کیا جاتا ہے، جس سے راوی مجہول بن جاتا ہے، جیسے راوی یہ کہے: "أخبرني فلان "یا "أخبرني شيخ"یا "أخبرني رجل"وغیرہ[۱]۔

۴۔مجہول کی تعریف:

مجہول وہ راوی ہے جس کی ذات یاصفت معلوم نہ ہو، یعنی مجہول وہ راوی ہے جس کی ذات یا شخصیت غیر معروف ہو۔یا شخصیت تو معروف ہو، لیکن ان کی صفت وحالت معلوم نہ ہو، صفت سے عدالت اور ضبط مراد ہے[۲]۔

۵۔مجہول کی اقسام وانواع:

مجہول کی تین قسمیں ہیں:

(الف)۔ مجہول العین (ب)۔ مجہول الحال (ج)۔ مبہم

(الف)۔ مجہول العین:

ا۔مجہول العین کی تعریف:

---

[۱] نزہۃ النظر:۱۲۴۔(م)

[۲] حماد ابن سلمہ ابن دینار بصری، ابوسلمہ، ثقہ عابد تھے، آخری عمر میں حافظہ خراب ہو گیا تھا۔ امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ حماد ثقہ ہے۔امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ حماد ثقہ ہے، امام علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص حماد پر جرح کرے تووہ خود قابل اعتبار نہیں۔
(تقریب التہذیب:۱۷۸، رقم الترجمہ:۱۴۹۹، میزان الاعتدال:۱/ ۵۹۰)(م)

[۱] نزہۃ النظر:۱۲۵۔(م)

[۲] النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح:۳/ ۳۸۰۔(م)

وہ راوی ہے جس کا نام سند میں مذکور ہو، لیکن اس سے روایت کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہو[1]۔

۲۔ مجہول العین کی روایت کا حکم:

مجہول العین کی روایت غیر مقبول ہوتی ہے، البتہ اگر کوئی معروف محدث اس کی توثیق کر دے تو روایت قابل قبول ہو گی[2]۔

۳۔ مجہول العین کی توثیق کیسے ہو گی؟

---

(۱) نزہۃ النظر: ۱۲۱۔ (م)

(۲) مجہول العین کی جہالت کیسے مرتفع ہو گی؟ اس سلسلے میں خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں۔

"وَأَقَلُّ مَا تَرْتَفِعُ بِهِ الْجَهَالَةُ أَنْ يَرْوِيَ عَنِ الرَّجُلِ اثْنَانِ فَصَاعِدًا مِنَ الْمَشْهُورِينَ بِالْعِلْمِ كَذَلِكَ."
(الکفایۃ: ۸۸)

"کسی راوی کے مجہول ہونے کا ازالہ اسی وقت ہو گا جب اس شخص سے ایسے دو یا زیادہ راوی روایت کریں جو علمی شہرت رکھتے ہوں۔"

خطیب بغدادیؒ یحیی بن یحیی سے اپنی رائے کی تائید نقل کرتے ہیں، لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"إِلَّا أَنَّهُ لَا يَثْبُتُ لَهُ حُكْمُ الْعَدَالَةِ بِرِوَايَتِهِمَا عَنْهُ." (الکفایۃ: ۸۹)

"لیکن ان کی روایت سے عدالت ثابت نہیں ہوتی۔"

حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) کا قول نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں۔

"قُلْتُ: قَدْ خَرَّجَ البخاريُّ في "صَحِيْحِهِ "حديثَ جماعةٍ ليسَ لَهُمْ غيرُ راوٍ واحدٍ، منهُمْ: مِرْدَاسٌ الأَسْلَمِيُّ لَمْ يَرْوِ عنهُ غيرُ قَيْسِ بنِ أبي حازمٍ. وكَذَلِكَ خَرَّجَ مُسْلِمٌ حَدِيْثَ قَوْمٍ لاَ راوِيَ لَهُمْ غَيْرُ واحِدٍ، منهُم: رَبِيْعَةُ ... ابنُ كَعْبٍ الأَسْلَمِيُّ، لَمْ يَرْوِ عنهُ غَيْرُ أبي سَلَمَةَ بنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ؛ وذَلِكَ منهُما مصيرٌ إلى أنَّ الراوِيَ قَدْ يَخْرُجُ عَنْ كَوْنِهِ مَجْهُولاً مَرْدُوداً، بروَايَةِ واحِدٍ عنهُ."
(مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۲۶-۲۲۷)

"میں کہتا ہوں کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ایک جماعت کی احادیث نقل کی ہیں، جن کا صرف ایک راوی ہے، ان میں سے ایک مرداس اسلمی ہیں، جن سے قیس بن ابی حازم کے سوا کسی نے روایت نہیں کی۔ اسی طرح امام مسلم نے بعض لوگوں کی احادیث کی تخریج کی ہے جن کا صرف ایک راوی ہے، ان میں سے ایک ربیعہ بن کعب اسلمی ہے جس سے ابو سلمہ بن عبد الرحمن کے علاوہ کسی اور نے روایت نہیں کی۔ ان دو حضرات =

مجہول العین کی توثیق درج ذیل دو امور میں سے کسی ایک کے ذریعے ہو سکتی ہے:

(الف)۔ جس شخص نے اس سے روایت کی ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کی توثیق کرے۔

(ب)۔ یا خود اس کی توثیق روایت کرنے والا ہی کرے، بشرطیکہ وہ اہل جرح وتعدیل میں سے ہو[1]۔

۴۔ کیا مجہول العین کی حدیث کا کوئی خاص نام ہے؟

مجہول العین کی حدیث کا کوئی خاص نام نہیں، البتہ اس کی روایت کا شمار ضعیف احادیث میں ہوتا ہے۔

(ب)۔ مجہول الحال (مستور الحال):

۱۔ مجہول الحال کی تعریف:

= کا ایسا کرنا اس بات پر دال ہے کہ ان سے ایک راوی کی روایت کی وجہ سے وہ مجہول و مردود ہونے سے خارج ہو جاتے ہیں۔"

امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) کی تائید کرتے ہیں۔

"قلت: الصواب ما ذكره الخطيب، فهو لم يقله عن اجتهاد، بل نقله عن أهل الحديث. ورد الشيخ عليه بما ذكره عجب، فإن مرداسًا وربيعة صحابيان معروفان. فمرداس من أهل بيعة الرضوان، وربيعة من أهل الصفة، والصحابة كلهم عدول." (ارشاد طلاب الحقائق:۱/۲۹۸)

"میں کہتا ہوں کہ خطیب نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی طرف سے نہیں کہا، بلکہ انہوں نے محدثین کی رائے نقل کی ہے اور شیخ ابن الصلاح کا اسے رد کرنا عجیب ہے، کیونکہ مرداس رضی اللہ عنہ اور ربیعہ رضی اللہ عنہ معروف صحابی ہیں، مرداس رضی اللہ عنہ بیعت رضوان میں سے ہیں اور ربیعہ رضی اللہ عنہ اہل صفہ میں ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ تمام صحابہ عادل ہیں۔"

الغرض مجہول العین کی روایت قابل قبول نہیں، لیکن اگر اس کی جہالت دور ہو تو اس کی روایت قابل قبول ہو گی۔ (م)

[1] نزہۃ النظر: ۱۲۱۔ (م)

مجہول الحال یا مستور الحال وہ راوی ہے، جس سے دو یا دو سے زیادہ افراد نے روایت کی ہو، لیکن وہ خود ثقہ نہ ہو[1]۔

۲۔ مجہول الحال کی روایت کا حکم:

جمہور محدثین کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مجہول الحال راوی کی روایت مردود اور نا قابل قبول ہو گی[2]۔ *

---

[1] نزہۃ النظر: ۱۲۱۔ (م)

[2] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) مجہول الحال (جس کو وہ مستور بھی کہتے ہیں) کی روایت کے متعلق فرماتے ہیں۔

" وقد قَبِلَ رِوَايَتَهُ جَمَاعَةٌ بغيرِ قيدٍ، وردَّها الجمهورُ. والتحقيقُ: أن روايةَ المستورِ، ونحوِهِ، مما فيه الاحتمال؛ لا يُطْلَقُ القولُ بردِّها، ولا بقبولها، بل يقال: هي موقوفةٌ إلى استبانة حاله، كما جزم به إمام الحرمين، ونحوه قول ابن الصلاح فيمن جُرِحَ بجَرْحٍ غير مُفَسَّر."

(نزہۃ النظر: ۱۲۱-۱۲۲)

"کچھ لوگوں نے غیر مشروط طور پر اس کی روایت کو قبول کیا ہے اور جمہور نے اسے رد کیا ہے، تحقیق یہ ہے کہ مستور کی روایت یا ایسے ہی احتمال والی روایت کے متعلق مطلق قبول اور رد کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ کہا جائے گا کہ اس کے حالات واضح ہونے پر موقوف ہے جیسے امام الحرمین کا نقطہ نظر ہے اور جس طرح ابن الصلاح کی اس شخص کے بارے میں رائے ہے جس پر غیر واضح جرح کی جائے۔"

حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) کا نقطہ نظر یہ ہے کہ احادیث کی مشہور کتابوں میں بہت سے مستورین کی روایات موجود ہیں اور مستورین کے اندرنی حالت پر مطلع ہونا اب مشکل ہے اس لیے ان کی ظاہری عدالت پر اکتفاء کرتے ہوئے ان کی روایات کو قبول کر لینا چاہیے اور ان حضرات کے مذہب پر عمل کرنا چاہیے جو مستور کی روایت کے قبول کرنے کے قائل ہیں۔ (مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۲۴)

مجہول الحال اور مستور کی روایات کو قبول کرنے کے متعلق احناف کا مذہب یہ ہے: ملا علی قاریؒ (م ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) اور صاحبینؒ کا مذہب یہ ہے کہ قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر کے مستور رواۃ کی روایات مقبول ہیں، خیر القرون کے بعد ان کی روایات تب قبول ہوں گی جب ان کی متابعت پائی جائے، کیونکہ اس زمانہ میں عدالت کا پہلو غالب تھا اور آج فسق کا پہلو غالب ہے، لہذا بعد کے لوگوں کی روایات علی الاطلاق مقبول نہ ہوں گی۔ (شرح شرح نخبۃ الفکر: ۱۵۴)۔ (م)

* مذکورہ تعریف محدثین کرام کی اصطلاح کے مطابق ہے، تاہم فقہائے حنفیہ نے مجہول کے اطلاق اور اس کے احکام کو محدثین کرامؒ سے مختلف بیان کیا ہے، فقہائے حنفیہؒ کے نزدیک مجہول اس راوی کو کہتے ہیں جس سے ایک یا دو روایات منقول ہوں، فقہائے احناف کے سرخیل امام شمس الائمہ سرخسیؒ (م ۴۸۳ھ) =

....

= فرماتے ہیں۔

"فَأَما الْمَجْهُول فَإِنَّمَا نعني بِهَذَا اللَّفْظ من لم يشْتَهر بطول الصُّحْبَة مَعَ رَسُول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسلم إِنَّمَا عرف بِمَا رُوِيَ من حَدِيث أَو حديثين." (اصول السرخسی:۱/۳۴۲)

"ہمارے ہاں مجہول وہ راوی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے طولِ صحبت میں مشہور نہ ہو، بلکہ اس کی شہرت کا سبب اس سے ایک یا دو روایات کا منقول ہونا ہو۔"

مذکورہ عبارت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شہرت وجہالت کا مدار کثرت و قلت روایت پر ہے اور محدثین کرامؒ کے بر خلاف فقہائے حنفیہ کے نزدیک مجہول العین راوی کی روایت معتبر ہے۔ اسی اختلاف کی بناء پر ان دونوں اہل علم کے درمیان مجہول العین راوی کے اطلاق واحکام میں نمایاں فرق ہے، مثلاً:

۱۔ فقہائے حنفیہؒ کے نزدیک راوی کی جہالت اس سے قلتِ روایت کی بنا پر ہے اور محدثین کرامؒ کے ہاں راوی کی جہالت اس سے ناقلین کی تعداد کم ہونے کی بناء پر ہے۔

۲۔ فقہائے حنفیہؒ کے ہاں مجہول العین راوی کی روایت مطلقاً مقبول ہے اور جب کہ محدثین کرامؒ کے نزدیک ایسے راوی کی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔ شاید اسی وجہ سے فقہائے حنفیہؒ کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔

"إِنَّهُمْ لَمْ يَفْصِلُوا بَيْنَ مَنْ رَوَى عَنْهُ وَاحِدٌ وَبَيْنَ مَنْ رَوَى عَنْهُ أَكْثَرُ مِنْ وَاحِدٍ، بَلْ قَبِلُوا رِوَايَةَ الْمَجْهُولِ عَلَى الْإِطْلَاقِ." (فتح المغیث:۲/۴۷-۴۸)

"ان حضرات نے اس میں فرق نہیں کیا کہ اس سے ایک راوی یا ایک سے زیادہ راویوں نے روایت کیا ہے، بلکہ انہوں نے مطلقاً مجہول کی روایت کو قبول کیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ فقہائے احنافؒ کے نزدیک قبول روایت کے لیے راوی کا مسلمان ہونا اس کی عدالت کو بیان کرتا ہے جب تک کوئی ظاہری فسق وفجور موجود نہ ہو۔ علامہ نسفیؒ نے مجہول العین راوی سے روایت کرنے کے متعلق تصریح کی ہے۔

"إن روى عنه السلف واختلفوا فيه، أوسكتوا عن الطعن فيه، صاركالمعروف، وان لم يظهر من السلف إلا الرد كان مستنكرة فلا يقبل ، وإن لم يظهرفى السلف فلم يقابل برد ولاقبول يجوزالعمل به ولا يجب." (المنار مع الشرح لابن ملک:۶۲۷)

"اگر سلف نے اس سے روایت کی ہے یا اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے، یا اس پر طعن کرنے کے بارے میں خاموش ہیں تو یہ معروف کی طرح ہے، اگر سلف کی طرف سے تردید پائی گئی تو پھر مستنکر ہے اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر سلف کے ہاں ظاہر نہیں ہوا اور اس پر رد اور قبول کا موازنہ نہیں ہو تو اس پر عمل کرنا جائز ہے اور لازم نہیں ہے۔"

=

....

= مجہول العین کی روایت کے ردو قبول سے متعلق فقہائے احنافؒ کا نقطہ نظر علامہ عبدالعزیز علاء الدین بخاریؒ (م ۷۳۰ھ) نے یوں بیان کیا ہے۔

"وعندنا خبر المجهول من القرون الثلاثة مقبول؛ لأن العدالة كانت أصلا في ذلك الزمان بخبر رسول الله - عليه السلام - «خير الناس قرني الذي بعثت فيهم ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم»...فأما في زماننا فخبر مثل هذا المجهول لا يقبل، ولا يصح العمل به ما لم يتأيد بقبول العدول لغلبة الفسق على أهل هذا الزمان." (کشف الاسرار:۲/۳۸۸،۳۸۶)

"ہمارے فقہائے حنفیہؒ کے نزدیک قرون ثلاثہ کے مجہول کی خبر معتبر ہے، کیونکہ اس زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کی اس خبر کے مطابق عدالت موجود تھی کہ بہترین زمانہ میرا ہے، جس میں مجھے بھیجا گیا، پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد کے ہیں اور پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد کے ہیں۔ باقی ہمارے زمانہ میں ایسے مجہول راوی کو روایت کو قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس پر عمل کرنا درست ہو گا جب تک کہ عادل لوگوں کے قبول کرنے کی تائید حاصل نہ ہو جائے، اس لیے کہ اس میں فسق کا غلبہ ہے۔"

مذکورہ عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ: فقہائے احنافؒ کے نزدیک قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر کے بعد کی خبر مجہول غیر معتبر ہے اور جب کہ قرون ثلاثہ کی خبر مجہول ان کے نزدیک حجت ہے اور یہ مطلق نہیں، بلکہ اس کی قبولیت کے لیے درج ذیل پانچ شرائط ہیں:

۱۔ سلف صالحین صحتِ حدیث کے بارے میں گواہی دیں اور یا اس پر عمل کریں تو قبول ہو گی۔

۲۔ راوی پر اگر سلف نے طعن کرنے سے خاموشی اختیار کی ہو تو تب بھی روایت کو قبول کیا جائے گا۔

۳۔ اگر تمام علمائے سلف نے اس کی صحت پر طعن کیا ہے تو ایسے مجہول راوی کی روایت معتبر نہیں ہو گی۔

۴۔ بعض سلف اس کی روایت کو قبول کریں اور بعض دیگر حضرات اس کو رد کر دیں حالانکہ ثقہ رواۃ نے ان سے نقل کیا ہے، اگر روایت قیاس کے موافق ہو تو قبول کیا جائے گا اور ورنہ نہیں۔

۵۔ سلف میں اس کی روایت ظاہر نہ ہوئی ہو اور پھر سلف نے اس کو رد اور قبول کرنے میں کوئی اقدام نہیں کیا۔ مخالفِ قیاس نہ ہونے پر عمل کرنا جائز ہے، البتہ واجب نہیں۔ جیسا کہ امام شمس الائمہ سرخسیؒ اور علامہ خبازیؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ دیکھئے: اصول السرخسی:۱/۳۴۴، شرح المغنی:۱/۳۵۵۔

فقہائے حنفیہؒ کے عبارات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انہوں مطلق راوی کے جہالت وعدم جہالت کے متعلق گفتگو کی ہے، خواہ صحابی ہو، یا تابعی ہو یا تبع تابعی ہو۔ اسی وجہ سے انہوں نے مجہول کی مثالوں میں سیدنا معقل بن سنان رضی اللہ عنہ، سیدنا وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ اور سیدنا سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پیش کیا ہے، حالانکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں! جمہور امت کے ہاں ان کی جہالت مضر نہیں!! =

....

= اسی لیے مذکورہ قاعدے کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین کیساتھ مختص کرنا ضروری ہے کہ اگر تابعین اور تبع تابعین میں سے کوئی راوی مجہول ہو تو اس کا حکم یہ ہے الخ۔۔۔اس کی وضاحت علامہ امیر حاجؒ، علامہ یحیی رہاویؒ، علامہ کاکیؒ، علامہ امیر بادشاہؒ، ملا علی قاریؒ اور مولانا عبد الحلیم لکھنویؒ وغیرہ نے کی ہے۔ دیکھئے: التقریر لابن امیر حاج:۲/۲۵۱، حاشیہ ابن ملک:۶۲۷، جامع الاسرار:۳/۶۷۶، تیسیر التحریر:۳/۵۳، توضیح المعانی:۳۱۳، قمر الاقمار:۲/۱۸۔

بہر حال مذکورہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ محدثین کرامؒ کے نزدیک مجہول الحال اور مستور دو الگ اصطلاحات ہیں اور دونوں کے احکام بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں جب فقہائے احنافؒ کے ہاں مجہول الحال اور مستور دونوں میں محض نزاع لفظی ہے اور یہ دونوں حکم کے اعتبار سے ایک ہیں، چنانچہ فقہائے حنفیہؒ کے نزدیک مجہول الحال اور مستور ایسا راوی ہے جس میں ظاہری عدالت ہو اور اس اعتبار سے کہ اللہ تعالی کے اوامر کی پاسداری کرے اور منکرات سے اجتناب کرے اور اس کے خلاف کوئی پہلو ظاہر نہ ہو اور اس کی باطنی حالت معلوم نہ ہو۔ دیکھئے: تیسر التحریر:۳/۴۸، التقریر والتحبیر:۱/۵۵۶۔

الغرض فقہائے حنفیہؒ کے نزدیک مجہول الحال اور مستور دونوں حکم کے اعتبار سے ایک ہیں، علامہ عبد العزیز بخاریؒ (م ۷۳۰ھ) فرماتے ہیں۔

"وفي الحقيقة المجهول والمستور واحد إلا أن خبر المجهول في القرون الثلاثة مقبول لغلبة العدالة فيهم وخبر المجهول بعد القرون الثلاثة مردود لغلبة الفسق." (کشف الاسرار:۲/۴۰۰)

"حقیقت میں مجہول اور مستور دونوں ایک ہی قسم ہے، مگر یہ قرون ثلاثہ میں غلبہ عدالت کی وجہ سے مجہول کی روایت معتبر تھی اور جب کہ قرون ثلاثہ کے بعد خبر مجہول غلبہ فسق کے سبب نا قابل اعتبار سمجھی جاتی تھی۔"

یہی بات علامہ ابن نجیم مصریؒ، علامہ رضی الدین ابن حنبلی حنفیؒ اور علامہ عبد العلی انصاریؒ نے بھی کہی ہے کہ عدالت و فسق میں مجہول راوی ہی اصطلاح فقہاء میں مستور کہلاتا ہے۔ دیکھئے: فتح الغفار:۲/۸۹، قفو الاثر:۸۶، فواتح الرحموت:۲/۱۴۶۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس مستور کی روایت معتبر نہیں ہے وہ قرون ثلاثہ کے بعد کا مستور راوی ہے، بلکہ امام محمدؒ کے نزدیک ایسا راوی فاسق کی طرح ہے، جمہور احنافؒ نے امام محمدؒ کی اس بات کو معتبر قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ قرون ثلاثہ کے بعد کے مستور الحال کی روایت نا قابل اعتبار ہے، بلکہ بعض محدثین کرامؒ نے بھی اس حکم کی تائید کی ہے۔ (کنز الوصول:۱۷۷، مقدمہ ابن الصلاح:۲۲۴، النکت للزرکشی:۳/۳۷۴، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:۲/۴۳) (م)

۳۔ کیا مجہول الحال کی حدیث کا کوئی خاص نام ہے؟

مجہول الحال کی حدیث کا کوئی خاص نام نہیں، البتہ اسے ضعیف کی ایک قسم اور نوع کہہ سکتے ہیں۔

(ج)۔ تیسری قسم: مبہم[1]:

مبہم کو مجہول کے انواع میں شمار کیا جا سکتا ہے اگرچہ محدثین کرامؒ نے اسے ایک خاص نام سے موسوم کیا ہے، تاہم اس کی حقیقت مجہول کی حقیقت سے بالکل ملتی جلتی ہے۔

۱۔ مبہم کی تعریف:

وہ راوی جس کا نام سند حدیث میں صراحۃً مذکور نہ ہو[1]۔

۲۔ مبہم کی روایت کا حکم:

مبہم راوی کی روایت غیر مقبول ہوتی ہے، حتی کہ اس سے روایت کرنے والا راوی اس کی نام کی تصریح کردے یا کسی دوسرے طریق میں اس کا نام صراحۃً مذکور ہو، اور مبہم کی روایت اس

---

(۱) حافظ ابن حجرؒ (۸۵۲ھ) نے مبہم کو مستقل اصطلاح کے طور پر بیان کیا ہے جب کہ حافظ ابن الصلاحؒ (۶۴۳ھ) اور اس کے متبعین نے مجہول العین (جس کا نام واضح نہ ہو) کو مبہم کہا ہے۔ (نزہۃ النظر: ۱۲۰، مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۲۴)۔ (م)

(۱) دیکھئے: نزہۃ النظر: ۱۲۰۔ (م)

مبہم کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کسی روایت میں "رجل"، "امراءۃ" یا "فلان" یا "فلانۃ" یا اس جیسے الفاظ ہوں۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

" فَقَالَ: «أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ فَرَضَ اللهُ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ، فَحُجُّوا»، فَقَالَ رَجُلٌ: أَكُلَّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللهِ؟ فَسَكَتَ حَتَّى قَالَهَا ثَلَاثًا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: " لَوْ قُلْتُ: نَعَمْ لَوَجَبَتْ، وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ." (صحیح مسلم: ۲/ ۹۷۵، رقم: ۱۳۳۷)

"سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے خطاب فرمایا: لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہذا حج کرو۔ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہر سال حج کرنا ہے؟ آپ ﷺ خاموش رہے اور اس نے یہ سوال تین مرتبہ دہرایا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو یہ فرض ہو جاتا اور تم اس کی طاقت نہ رکھتے!"

اس حدیث میں "رَجُلٌ" مبہم ہے دوسری روایت میں اس کی تصریح ہے کہ یہ آدمی اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ ہے۔ دیکھئے: سنن ابن ماجہ: ۴/ ۱۳۶، رقم: ۲۸۸۷، سنن ابی داؤد: ۱/ ۱۳۹، رقم: ۱۷۲۱۔ (م)

لیے مردود اور نا قابل قبول ہوتی ہے کہ خود اس کی شخصیت مجہول الحال ہوتی ہے، اس لیے کہ جس کا نام مبہم ہو تو اس کی ذات مبہم ہی ہوتی ہے اور اس صورت میں اس کی عدالت بطریق اولی مبہم ہو جائے گی، لہٰذا اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی[1]۔

۳۔ الفاظ تعدیل کیساتھ راوی مروی عنہ کو مبہم رکھے تو کیا اس کی روایت قبول ہو گی؟

اگر راوی تعدیل و توثیق کے الفاظ کیساتھ مروی عنہ کو مبہم ذکر کرے مثلاً روایت کرنے والا یوں کہے "أخبرني الثقة" (مجھے ایک ثقہ نے خبر دی) وغیرہ۔ تو کیا اس صورت میں اس کی روایت مقبول ہو گی؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اصح قول کے مطابق اس صورت میں بھی اس کی روایت قبول نہیں ہو گی، کیونکہ یہ بات ممکن ہے کہ اس راوی کے نزدیک یہ شیخ ثقہ ہو، لیکن دیگر حضرات کے نزدیک ثقہ نہ ہو[1]۔

۴۔ کیا مبہم راوی کی حدیث کا کوئی خاص نام ہے؟

جی ہاں! مبہم راوی کی حدیث کا خاص نام مبہم ہے اور مبہم وہ حدیث ہے، جس کی سند میں ایسا راوی ہو، جس کا نام صراحۃً مذکور نہ ہو، معروف عالم علامہ بیقونیؒ فرماتے ہیں۔

وَمُبْهَمٍ مَا فِيْه رَاوٍ لَمْ يُسَم

"مبہم وہ حدیث ہے جس میں راوی کا نام نہ لیا گیا ہو۔"

۶۔ اسباب جہالت پر معروف تصانیف:

(الف)۔ جہالت کے پہلے سبب راوی کے کثرت صفات پر علامہ خطیب بغدادیؒ نے "موضح أوهام الجمع والتفريق" کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی ہے۔

(ب)۔ جہالت کے دوسرے سبب راوی کے قلت روایت کے موضوع پر "کتب الوحدان" کے نام سے متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں یعنی وہ کتابیں جن میں ایسے رواۃ کا تذکرہ کیا گیا ہے جن سے صرف ایک حدیث روایت کی گئی ہے، من جملہ ان کتابوں میں ایک جامع کتاب امام مسلم کی

---

[1] دیکھئے: نزہۃ النظر: ۱۲۱۔ (م)

[1] دیکھئے: نزہۃ النظر: ۱۲۱۔ (م)

"کتاب الوحدان" ہے۔

(ج)۔ جہالت کے تیسرے سبب راوی کے نام کی عدم صراحت کے موضوع پر "المبهمات" کے نام سے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، یعنی وہ کتابیں جن میں خطیب بغدادیؒ کی " الأسماء المبهمة في الأنباء المحكمة"[1] اور علامہ ولی الدین عراقیؒ کی "المستفاد من مبهمات المتن والإسناد[2]" کی زیادہ مشہور و معروف ہیں۔

---

(۱) یہ کتاب خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) نے حروف معجم کے اعتبار سے مرتب کی ہے، لیکن اہل علم فرماتے ہیں کہ اس سے استفادہ مشکل ہے اس لیے کہ مبہم کا نام جانے بغیر اس سے استفادہ ممکن نہیں۔ یہ کتاب مطبوع ہے۔(م)

(۲) یہ علامہ ولی الدین عراقیؒ (م۸۲۶ھ) کی کتاب ہے، جس میں انہوں نے خطیبؒ، ابن بشکوالؒ اور علامہ نوویؒ کے معلومات کو جمع کیا اور اس پر اضافات بھی کیے ہیں اور اسے ابواب پر مرتب کیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

" وَهُوَ أَحْسَنُ مَا صُنِّفَ فِي هَذَا النَّوْعِ. " (تدریب الراوی:۲/۸۵۴)

"یہ کتاب اس فن پر سب سے اچھی تصنیف ہے۔" (م)

۹-بدعت(۱)*

ا-بدعت کی تعریف:

(الف)-لغوی تعریف:

بدعت "بدع" فعل کا مصدر ہے، جس کے معانی ہیں، نئی چیز پیدا کرنا جیسے "ابْتَدَعَ" کا معنی بھی یہی ہے، یعنی نئی چیز ایجاد کرنا، جیسا کہ " القاموس المحیط"(۲) میں ہے(۳)۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۱۴، نزہۃ النظر:۱۲۶، فتح المغیث:۲/ ۶۱، قفو الاثر فی صفوۃ علوم الاثر: ۸۷، فتح الباقی بشرح الفیۃ العراقی: ۱/ ۳۲۷، النکت علی کتاب ابن الصلاح:۳/ ۳۹۶، مقدمۃ فی اصول الحدیث: ۶۶، تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی: ۱/ ۳۸۶، الغایۃ فی شرح الہدایۃ فی علم الروایۃ: ۱/ ۱۱۵۔(م)

* یہ طعن راوی کا نواں سبب ہے۔(ط)

(۲) القاموس المحیط:(۱/ ۷۰۲)، لسان العرب: (۸/ ۶)، معجم مقاییس اللغۃ:(۱/ ۲۱۰)، الصحاح:(۳/ ۱۱۸۳)، تاج العروس: (۲۰/ ۳۰۷)، تھذیب اللغۃ:(۲/ ۱۴۲)۔(م)

(۳) بدعت کے معنی ہر نئی چیز ہے اور ہر اس چیز کو بدعت کہتے ہیں جو نئی اور نو پید ہو۔ معروف لغوی علامہ ابن السکیتؒ فرماتے ہیں۔

" البِدْعَةُ كلُّ مُحْدَثةٍ." (لسان العرب:۸/ ۶)

"بدعت کے معنی ہر نئی چیز ہے۔"

علامہ ابن منظور افریقیؒ (م ۷۱۱ھ) بدعت کی یوں تعریف کرتے ہیں۔

" البِدْعةُ: الحَدَث وَمَا ابْتُدِعَ مِنَ الدِّينِ بَعْدَ الإِكمال." (لسان العرب:۸/ ۶)

بدعت نئی چیز ہے اور دین کے مکمل ہونے کے بعد اس میں اپنی طرف سے کوئی چیز ایجاد کرنا ہے۔

یہ تعریف دراصل رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے ماخوذ ہے۔

" إِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ وَأَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، وَشَرُّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ." (سنن النسائی:۳/ ۱۸۸، رقم:۱۵۷۸، اسناد صحیح)

بلاشبہ سب سے زیادہ سچی بات کلام اللہ ہے اور سب سے اچھی سیرت رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے اور سب سے بُرے امور دین میں نئے ایجاد کردہ امور ہیں اور ہر ایجاد کردہ چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم کا ایندھن ہے۔(م)

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

دین کے اصل اور مکمل ہونے کے بعد اس میں کوئی نئی چیز ایجاد کرنے کو بدعت کہتے ہیں[۱]۔ یا رسول اللہ ﷺ کے بعد خواہشات اور رسوم ورواج کو دین کا جزء بنانے کا نام بدعت ہے[۲]۔

۲۔ بدعت کی اقسام وانواع:

بدعت کی دو قسمیں ہیں[۳]:

(الف)۔ بدعت مکفرہ (ب)۔ بدعت مفسقہ

(الف)۔ بدعت مکفرہ: وہ بدعت ہے، جس کا مرتکب دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، مثلاً ایسا اعتقاد رکھنا جو کفر کو مستلزم ہو[۴]۔

یہ بات مسلم ہے کہ جو شخص شریعت کے کسی ایسے متواتر امر کا انکار کرے جو ضروریات دین میں سے ہو۔ یا اس کے برعکس اعتقاد رکھتا ہو تو اس کی روایت کو مسترد کیا جائے گا[۵]*۔

---

[۱] مختار الصحاح: ۳۰، الصحاح:: ۳/ ۱۱۸۴، تاج العروس: ۲۰/ ۳۰۹، القاموس المحیط: ۱/ ۷۰۲۔(م)

[۲] تاج العروس: ۲۰/ ۳۰۹، القاموس المحیط: ۱/ ۷۰۲۔(م)

محدث جلیل حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) صحیح بخاری کے "باب غلوفی الدین والبدع" کے ذیل میں "البدع" کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وَأَمَّا الْبِدَعُ فَهُوَ جَمْعُ بِدْعَةٍ وَهِيَ كُلُّ شَيْءٍ لَيْسَ لَهُ مِثَالٌ تَقَدَّمَ فَيَشْمَلُ لُغَةً مَا يُحْمَدُ وَيُذَمُّ وَيَخْتَصُّ فِي عُرْفِ أَهْلِ الشَّرْعِ بِمَا يُذَمُّ وَإِنْ وَرَدَتْ فِي الْمَحْمُودِ فَعَلَى مَعْنَاهَا اللُّغَوِيِّ." (فتح الباری: ۱۳/ ۲۷۸)

"بدع" بدعت کی جمع ہے اور اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی مثال پہلے موجود نہ ہو۔ لغوی اعتبار سے اچھی اور بری دونوں چیزوں کو شامل ہے، لیکن شریعت کی اصطلاح میں اس کا اطلاق صرف مذموم چیز پر ہوتا ہے البتہ لغت میں اس کا اطلاق اچھی چیز پر بھی ہوتا ہے۔(م)

[۳] معرفۃ علوم الحدیث: ۲۲۸، نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۷۷،۲۷، ۱۲۷، فتح الباقی بشرح الفیۃ العراقی: ۱/ ۳۲۹، الیواقیت والدرر: ۲/ ۱۵۰-۱۵۱۔(م)

[۴] نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۱۲۶۔(م)

[۵] اختصار علوم الحدیث: ۹۹، نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۱۲۷۔(م)

* شرح نخبۃ الفکر: ۵۲۔(ط)

(ب)۔ بدعت مفسقہ: وہ بدعت ہے جس کا مرتکب فاسق وفاجر کہلاتا ہے، تاہم اس کی تکفیر نہیں کی جا سکتی[۱]۔*

۳۔ بدعتی کی روایت کا حکم:

(الف)۔ اگر راوی بدعت مکفرہ کا مرتکب ہو تو اس کی روایت نا قابل قبول اور مردود ہو گی[۲]۔

---

(۱) نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۱۲۷، الغایۃ فی شرح الہدایۃ فی علم الروایۃ: ۱۳۰۔(م)

* محدثِ کبیر امام شمس الدین ذہبیؒ (م۷۴۸ھ) نے بھی بدعت کی دو قسمیں بیان کی ہیں: بدعت صغری، جیسے بغیر غلو کے تشیع اور بدعت کبری، جیسے پختہ رفض اور اس میں غلو۔ دیکھئے میزان الاعتدال: ۱/۵-۶، سیر اعلام النبلاء: ۱/۵۹۔(م)

(۲) دیکھئے: الکفایہ فی علم الروایہ: ۱۲۰، مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۴۲، محاسن الاصطلاح: ۲۹۸، فتح المغیث: ۲/۲۷، رسوم التحدیث فی علوم الحدیث: ۱/۱۰۱، الیواقیت والدرر فی شرح نخبۃ ابن حجر: ۲/۱۴۹، توجیہ النظر الی اصول الاثر: ۲/۸۸۹، شرح نخبۃ الفکر فی مصطلحات اہل الاثر: ۱/۵۲۳، توضیح الافکار لمعانی تنقیح الانظار: ۲/۱۴۶، مقدمۃ فی اصول الحدیث: ۶۷۔(م)

مذکورہ بالا نظریہ جمہور محدثین کا ہے، تاہم بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ بدعتی کی روایت مطلقا قابل قبول ہے، خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) فرماتے ہیں۔

" وَقَالَ جَمَاعَةٌ مِنْ أَهْلِ النَّقْلِ وَالْمُتَكَلِّمِينَ: أَخْبَارُ أَهْلِ الْأَهْوَاءِ كُلِّهَا مَقْبُولَةٌ ، وَإِنْ كَانُوا كُفَّارًا وَفُسَّاقًا بِالتَّأْوِيلِ." (الکفایۃ فی علم الروایۃ: ۱۲۱)

بعض محدثین اور متکلمین کی رائے یہ ہے کہ تمام اہل الاہواء کی روایات مقبول ہے خواہ تاویل کی بناء پر کافر ہیں یا فاسق۔ خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) اس رائے پر دلائل ذکر کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ کئی جلیل القدر رواۃ کا تعلق خوارج اور قدریہ سے تھا اور صحابہ کرام کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے خوارج کی روایات وشہادات کو قبول کیا ہے اور اس کے بعد تابعین وغیرہ نے بھی ان کی روایات کو قبول کیا ہے، کیونکہ انہوں نے ان میں صدق دیکھا ہے اور کذب اور دروغ بیانی سے نفرت کرتے ہوئے دیکھا ہے اور محدثین کرامؒ نے بھی ان کی روایات اس بنیاد پر قبول کیں ہیں کہ وہ ثقہ وصدوق تھے، جیسے عمران بن حطان سدوسی بصری (م۸۴ھ) جو خوارج کے سردار تھے۔ عمرو بن دینار کا رجحان قدریہ اور تشیع کی طرف تھا۔ عکرمہ کا تعلق اباضیہ کیساتھ تھا اور ابویسار ابن ابی نجیح مکی (م۱۳۱ھ) معتزلی تھے۔ خطیب بغدادیؒ نے ان کے علاوہ ایک فہرست دی =

(ب)۔ اگر وہ بدعت مفسقہ کا مرتکب ہو تو اس کے متعلق جمہور محدثین کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کی روایت درج ذیل دو شرطوں کیساتھ قبول کی جائے گی[1]:۔

۱۔ وہ اپنی بدعت کی طرف داعی نہ ہو۔

۲۔ اپنی بدعت کی مؤید اور اسے ترویج دینے والی کسی چیز کو روایت نہ کرے[2]۔

۳۔ کیا مبتدع کی حدیث کا کوئی خاص نام ہے؟

= ہے جو خصوصی رجحات و نظریات کے حامل تھے، لیکن اس کے باوجود بھی ان کی احادیث کو قبول کیا گیا۔ اس فہرست کے آخر میں خطیب رقم طراز ہیں۔

"وَاحْتَجُّوا بِأَخْبَارِهِمْ ، فَصَارَ ذَلِكَ كَالْإِجْمَاعِ مِنْهُمْ، وَهُوَ أَكْبَرُ الْحُجَجِ فِي هَذَا الْبَابِ، وَبِهِ يَقْوَى الظَّنُّ فِي مُقَارِبَةِ الصَّوَابِ." (الکفایہ فی علم الروایۃ:۱۲۵)

محدثین کرام نے ان کی احادیث کو قابل قبول حجت قرار دیا، لہذا یہ ان کی طرف سے ایک طرح کا اجماع ہے جو اس سلسلے کی سب سے بڑی دلیل ہے اور اس سے ظن کی صحت کے قریب ہونے کی تقویت ملتی ہے۔(م)

[1] فتح المغیث: ۱/۶۷)، توضیح الافکار: ۲/۱۴۶، ۱۷۶، مقدمۃ فی اصول الحدیث :۶۷۔(م)

[2] خلاصہ کلام یہ ہے کہ اہل بدعت کی روایت مذکورہ دو شرطوں کیساتھ قبول کی جائے گی، محدث جلیل امام شمس الدین ذہبیؒ(م۷۴۸ھ) نے ابان بن تغلب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابان بن تغلب غالی شیعہ ہے، لیکن صدوق ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بدعتی کو کیسے ثقہ کیا جا سکتا ہے جب ثقہ ہونے کے لیے عدالت واتقان شرط ہے، لہذا بدعتی کیسے عادل ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں امام ذہبیؒ(م۷۴۸ھ) فرماتے ہیں۔

وجوابه أن البدعة على ضربين: فبدعة صغرى كغلو التشيع، أو كالتشيع بلا غلو ولا تحرف، فهذا كثير في التابعين وتابعيهم مع الدين والورع والصدق. فلو رد حديث هؤلاء لذهب جملة من الآثار النبوية، وهذه مفسدة بينة. ثم بدعة كبرى، كالرفض الكامل والغلو فيه، والحط على أبي بكر وعمر رضي الله عنهما، والدعاء إلى ذلك، فهذا النوع لا يحتج بهم ولا كرامة. وأيضاً فما أستحضر الآن في هذا الضرب رجلا صادقا ولا مأمونا، بل الكذب شعارهم، والتقية والنفاق دثارهم، فكيف يقبل نقل من هذا حاله! حاشا وكلا. فالشيعي الغالي في زمان السلف وعرفهم هو من تكلم في عثمان والزبير وطلحة ومعاوية وطائفة ممن حارب عليا رضي الله عنه، وتعرض لسبهم. والغالي في زماننا وعرفنا هو الذي يكفر هؤلاء =

مبتدع کی حدیث کا کوئی خاص نام نہیں، تاہم یہ بات طے شدہ ہے کہ اس کی حدیث نا قابل قبول ہو گی، البتہ مذکورہ بالا شرائط کی روشنی میں اس کی روایت کو قبول کیا جائے گا[1]۔

= السادة، ويتبرأ من الشيخين أيضاً، فهذا ضال معثر ولم يكن أبان بن تغلب يعرض للشيخين أصلا، بل قد يعتقد عليا أفضل منهما.(میزان الاعتدال:۱/۵-۶، سیر اعلام النبلاء:۱/۵۹).

ترجمہ: بدعت کی دو قسمیں ہیں: بدعتِ صغری، جیسے غلو یا بلا غلو کی شیعیت، جس میں تحریف کا عقیدہ نہیں، اس قسم کی رائے تابعین اور تبع تابعین کی کثیر تعداد میں پائی جاتی ہے اور یہ وہ لوگ جو دین، تقوی اور صداقت سے متصف ہیں۔ اگر ان کو رد کر دیا جائے تو تمام آثار نبویہ ضائع ہو جائیں گے اور یہ ایک واضح خرابی ہے اس کے بعد بدعتِ کبری ہے، جیسے کامل رفض اور اس میں غلو، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع اور اس کی طرف دعوت۔ یہ ایسے لوگ ہیں، جن کی روایت قابل حجت واحترام نہیں۔ اب ان لوگوں میں کوئی سچا اور قابل اعتبار آدمی موجود نہیں۔ بلکہ جھوٹ ان کا شعار ہے اور تقیہ و نفاق ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، لہذا جس شخص کا یہ حال ہے اس کی روایت کیسے قبول کی جائے!! ہر گز نہیں! سلف صالحین کے دور میں شیعہ وہ شخص تھا جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور اس گروہ کے بارے میں اعتراض کرتا تھا، جنہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی اور ان کو بُرا بھلا کہتا تھا، لیکن ہمارے زمانے اور عرف کا غالی شیعہ تو وہ ہے جو ان عظیم ہستیوں کی تکفیر کرتا ہے اور حضرات شیخین پر تبرا کرتا ہے، یہ پکا گمراہ ہے، جہاں تک ابان بن تغلب کا تعلق ہے تو اس نے شیخین کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔ صرف یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ حضرات شیخین سے افضل تھا۔" (م)

[1] مذکورہ تفصیل محدثین کرام کے مذہب کے مطابق ہے، فقہائے حنفیہ کا مبتدع کی روایت کو قبول کرنے کے متعلق کیا رائے ہے؟ تو اس مسئلہ میں فقہائے حنفیہ کے درج ذیل چار مذاہب ہیں:

پہلا مذہب: یہ ہے کہ مبتدع راوی کی روایت کو بالکل قبول نہ کیا جائے، خواہ وہ اپنے اعتقادات کا داعی ہو یا نہ ہو، اس ارتکاب بدعت کی وجہ سے اس کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، امام شمس الائمہ سرخسیؒ، امام بزدویؒ اور دیگر متاخرین احناف کی یہی رائے ہے، امام شمس الائمہ سرخسیؒ (م ۴۸۳ھ) فرماتے ہیں۔

"وَأما صَاحب الْهوى فقد بَينا أَن الصَّحِيح أَنه لَا تعتمد رِوَايَته فِي أَحْكَام الدّين فَأَما فِي أَخْبَار الدّين فيتوهم بِهَذَا التعصب لإفساد طَرِيق الْحق على من هُوَ محق حَتَّى يجيبه =

= إِلَى مَا يَدْعُو إِلَيْهِ من الْبَاطِل فَلهَذَا لَا تعتمد رِوَايَته وَلَا تجْعَل حجَّة فِي بَاب الدّين."
(اصول السرخسی:۱/۳۷۳-۳۷۴)

"اہل ہوی کے بارے میں صحیح رائے یہ ہے کہ دینی احکام سے متعلق اس کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ دین سے متعلق روایات میں یہ شبہ موجود ہے کہ وہ اپنے مذہبی رجحان تعصب کی بنیاد پر حق کے راستے میں بگاڑ پیدا کر دے اور لوگوں کو اپنے معتقدات کے مطابق باطل نظریات کی طرف دعوت دے۔ اس لیے اس کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی دین کے معاملہ میں اس کی روایت کو حجت اور معتبر قرار دیا جاسکتا ہے۔"

دوسرا مذہب یہ ہے کہ اگر مبتدع کی بدعت مفضی الی الکفر ہے تو اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی اور محض مفضی الی الفسق ہے اور مبتدع اپنی بدعت کی طرف داعی بھی نہیں تو ایسے شخص کی روایت کو قبول کیا جائے گا۔ امام ابوالیسر بزدویؒ، علامہ ابن ساعاتیؒ، علامہ بابرتیؒ اور قاسم بن قطلوبغاؒ کی یہی رائے ہے۔ دیکھئے: کشف الاسرار:۳/۵۲، التقریر:۴/۳۰۳۰، القول المبتکر:۹۹، دراسات فی اصول الحدیث:۱۶۷-۱۶۹۔

تیسرا مذہب یہ ہے کہ اگر مبتدع ایسے نظریات کا حامل ہو جس کی بنیاد پر اس کی تکفیر کی جاسکے، جیسے روافض اور مجسمہ وغیرہ تو ان کی روایات کو اس وقت قبول کیا جائے گا جب تک وہ دینی امور میں جھوٹ نہ بولیں اور اگر مبتدع ایسے نظریات کا حامل ہو جس کی وجہ سے اس کی تکفیر نہ کی جاسکے تو اس کی روایات کو قبول کیا جائے گا۔ امام ابن ہمامؒ اور علامہ محب اللہ بہاریؒ کا یہی مذہب ہے۔ دیکھئے: التحریر:۳۱۳، مسلم الثبوت:۲/۱۰۴-۱۰۵۔

چوتھا مذہب یہ ہے کہ اگر مبتدع کی بدعت مکفرہ ہے اور اس کی وجہ سے کسی امر متواتر کا انکار لازم آرہا ہے تو ایسی صورت میں بھی اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر مبتدع کی بدعت مفسقہ ہے اور وہ داعی بھی نہیں ہے تو اس کی روایت کو قبول کیا جائے گا اور بدعت کا داعی ہے تو اس صورت میں اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ رائے متاخرین محدثین حافظ ابن حجرؒ، علامہ ابن دقیق العیدؒ اور متاخرین فقہائے احناف علامہ امیر حاجؒ، امیر بادشاہؒ، ملا علی قاریؒ، علامہ عبد العزیز فرہارویؒ، مولانا محمد اکرم سندھیؒ، علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اور شیخ عبد الفتاح ابوغدہؒ کی ہے اور یہی مذہب راجح ہے۔ دیکھئے: نزہۃ النظر:۱۰۰-۱۰۱، الاقتراح فی بیان الاصطلاح: ۲۹۲، التقریر والتحبیر:۲/۲۳۹، شرح شرح النخبۃ:۵۲۴، امعان النظر:۱۷۸-۱۸۲، کوثر النبی:۹۸، قواعد فی علوم الحدیث:۲۳۰، ہامش الرفع والتکمیل:۱۴۴-۱۴۶، دراسات فی اصول الحدیث:۱۷۰-۱۷۱۔(م)

۱۰-سوء حفظ (حافظہ کی خرابی)[۱]

۱۔ سیئ الحفظ کی تعریف:

وہ شخص جو اپنی درست گوئی کے پہلو کو خطاء کے پہلو پر ترجیح نہ دے سکے[۲]۔

۲۔ سیئ الحفظ کی اقسام وانواع:

سیئ الحفظ کی درج ذیل دو قسمیں ہیں[۳]:

(الف)۔ اگر یاداشت اور حافظہ کی کمزوری طفولیت اور بچپن کے زمانے سے ہو اور ہر حالت میں اس کیساتھ منسلک رہے تو بعض محدثینؒ کے نزدیک اس کی روایت شاذ[۴] کہلائے گی[۵]۔

(ب)۔ اگر اس پر ضعف حفظ کی بیماری بعد میں طاری ہوئی ہو، خواہ پیرانہ سالی کی وجہ سے ہو، یا بینائی ختم ہو جانے کے بعد ہو اور یا کتب خانہ جل جانے کے باعث ہو تو ایسے شخص کو "مختلَط" کہتے ہیں[۶]۔

---

[۱] راوی کے اسبابِ طعن میں سے یہ دسواں سبب ہے اور یہ آخری سبب ہے۔(ط)
نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر:(۱۲۹)۔(م)

[۲] نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر:(۱۲۹)،(ط)۔
صاحب لقط الدرر نے ملا علی قاریؒ کے حوالے سے لکھا ہے:يعني بل يكون غلطه أكثر أو مساويا لصوابه .(لقط الدرر: ۱۰۵)-(م)

[۳] سوء حفظ لازم اور سوء حفظ طاری۔ مذکورہ قسموں میں سے پہلی قسم سوء حفظ لازم ہے اور دوسری قسم سوء حفظ طاری ہے۔ (م)

[۴] شاذ کا یہ مفہوم مختلف ہے اس لیے شارحین حضرات نے شاذ سے منفرد مراد لیا ہے جو شاذ کا لغوی معنی ہے، کیونکہ محدثین کی اصطلاح میں شاذ اسے کہتے ہیں جس میں ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی مخالفت کرے۔ دیکھئے: لقط الدرر:۱۰۵۔(م)

[۵] نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر:(۱۲۹)۔(م)

[۶] نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر:(۱۲۹)۔(م)

۳۔ سیئ الحفظ کی روایت کا حکم:

(الف)۔ پہلی قسم کا راوی جس کا حافظہ اور یاداشت بچپن ہی سے خراب چلا آیا ہو تو اس کی روایت مردود اور ناقابل قبول ہو گی[۱]۔

(ب)۔ دوسری قسم مختلط راوی[۲] کی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ جو حدیث اس نے اختلاط[۳] سے پہلے بیان کی ہو اور اس میں امتیاز بھی کر سکتا ہو تو وہ حدیث مقبول ہو گی[۴]۔

۲۔ جو حدیث اس نے اختلاط کے بعد بیان کی ہو تو وہ غیر مقبول ہو گی[۵]۔

---

[۱] اسبال المطر علی قصب السکر: ۳۱۰، مقدمۃ فی اصول الحدیث: ۷۲۔(م)

[۲] مختلط رواۃ پر تصانیف: حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) نے لکھا ہے: "یہ ایک بہت اہم فن ہے اور مجھے علم نہیں کہ کسی شخص نے اس جانب توجہ دی ہو اور اس پر خاص تصنیف مرتب کی ہو، حالانکہ یہ حقیقی توجہ کا طالب ہے۔ حافظ سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) اپنی کتاب "فتح المغیث" (۳/۲۷۸) میں لکھتے ہیں: کہ حافظ ابو بکر الحازمی نے مختلطین پر کتاب مرتب کی جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب "تحفۃ المستفید" شیخ ابن الصلاحؒ کو اس کا علم نہیں اس لیے انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حافظ عراقیؒ (م ۸۰۶ھ) "شرح التبصرۃ: ۳/۲۸۳" میں لکھتے ہیں: "غالباً شیخ ابن الصلاحؒ کے بیان سے متاثر ہو کر حافظ صلاح الدین العلائیؒ نے ایک مختصر کتاب لکھی جو حروف معجم کے اعتبار سے مرتب تھی اور اس پر شیخ عراقیؒ نے ذیل لکھی"۔ اس کے بعد حافظ ابراہیم بن محمد سبط ابن العجمیؒ (۸۴۱ھ) نے "الاغتباط بمن رمی بالاختلاط" لکھی۔ یہ کتاب حلب کے مکتبۃ العلمیہ سے چھپ چکی ہے۔ پھر اس کے نقشِ قدم پر ابن الکیّال چلا اور "الکواکب النیرات فی معرفۃ من اختلط من الرواۃ الثقات" مرتب کی۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔(م)

[۳] اختلاط کے معنی فسادِ عقل کے ہیں جس میں انسان اپنے اقوال وافعال کو متوازن نہیں رکھ سکتا ہے، یعنی مختلط وہ شخص ہے جس کو فسادِ عقل کا عارضہ لاحق ہو جب کہ وہ پہلے صحیح اور تندرست تھا۔ (لقط الدرر: ۱۰۶)(م)۔

[۴] مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۹۲، التقریب والتیسیر للنووی: ۱۲۰، الخلاصۃ فی معرفۃ الحدیث: ۱۰۵، الشذا الفیاح فی علوم ابن الصلاح: ۲/۷۴۴، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/۶۶۳، نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ۱۲۹، مقدمۃ فی اصول الحدیث: ۷۲، مفتاح السعیدیۃ فی شرح الالفیۃ الحدیثیۃ: ۴۴۵۔(م)

[۵] مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۹۲، الخلاصۃ فی معرفۃ الحدیث: ۱۰۵، الشذا الفیاح فی علوم ابن الصلاح: ۲/۷۴۴، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/۶۶۳، مفتاح السعیدیۃ فی شرح الالفیۃ الحدیثیۃ:: ۴۴۵۔(م)

۳۔ وہ حدیث جس میں یہ امتیاز نہ ہو سکے کہ اختلاط سے پہلے اس نے روایت کی ہے یا بعد میں تو اس حدیث کو قبول کرنے میں اس وقت تک توقف کیا جائے گا جب تک یہ امتیاز حاصل نہ ہو[1]۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۹۲، الخلاصۃ فی معرفۃ الحدیث: ۱۰۵، الشذا الفیاح فی علوم ابن الصلاح: ۲/ ۷۴۴، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۶۶۳، مفتاح السعیدیۃ فی شرح الالفیۃ الحدیثیۃ: ۴۴۵۔

حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کے ہاں عدم تمیز کی صورت میں توقف ہے جب کہ حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) کے ہاں عدم قبولیت واضح ہے۔ اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے متوقف فیہ کے متابع مل جانے کی صورت کو بیان کیا ہے جسے وہ حسن لغیرہ کا نام دیتے ہیں (نزہۃ النظر: ۱۰۳)۔

ماضی قریب کے مشہور محقق و ناقد علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے مختلط کی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سماع قبل الاختلاط صحیح ہے، انہوں نے سعید ابن ایاس جریری کے حوالے سے مختلف ناقدین کے اقوال نقل کیے ہیں اور امام بخاریؒ کی روایت کا بھی ذکر کیا ہے اس کے بعد رقم طراز ہیں۔

"قلت: هذه فائدة عجيبة فلتحفظ! وفيه دلالة على أن التردد فی كون السماع قبل الاختلاط أوبعده لايستلزم ضعف الحديث۔" (قواعد فی علوم الحدیث: ۴۱۰)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ یہ ایک عجیب نکتہ ہے اسے یاد رکھنا چاہیے! اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ سماع کے بارے میں قبل الاختلاط اور بعد الاختلاط میں تردد حدیث کے ضعیف ہونے کو مستلزم نہیں۔

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"قلت: فرواية الكبار من أصحاب المختلط محمولة على الصحة۔" (قواعد فی علوم الحدیث: ۴۱۱)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ کبار محدثین کا مختلط شیوخ سے روایت کرنا حدیث کی صحت پر محمول ہو گا۔ (م)

فصل سوم

مقبول اور مردود کے درمیان خبر مشترک

یہ فصل دو مباحث پر مشتمل ہے:

مبحث اول: مسند الیہ کے اعتبار سے خبر کی تقسیم

مبحث دوم: مقبول اور مردود کے درمیان متفرق و مشترک اقسام وانواع

مبحث اول: مسند الیہ کے اعتبار سے خبر کی تقسیم

یہ مبحث چار مطالب پر مشتمل ہے:

مطلب اول: حدیث قدسی کا بیان

مطلب دوم: حدیث مرفوع کا بیان

مطلب سوم: حدیث موقوف کا بیان

مطلب چہارم: حدیث مقطوع کا بیان

ذیل میں مذکورہ اقسام کو ترتیب کیساتھ مفصل پیش کیا جارہا ہے، ملاحظہ ہوں۔

مطلب اول: حدیث قدسی کا بیان[1]

۱۔ حدیث قدسی کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

قدسی "القُدْس" کی طرف منسوب ہے، جس کا معنی "پاکیزگی" ہے، جیسا کہ "القاموس المحیط" میں ہے[2]، یعنی وہ حدیث جو ذات قدسیہ (اللہ تعالی) کی طرف منسوب ہو۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

وہ حدیث قدسی وہ حدیث ہے جو رسول اللہ ﷺ سے روایت ہو کر ہم تک اس طرح پہنچے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی نسبت اللہ تعالی کی طرف منسوب ہو[3]۔

۲۔ حدیث قدسی اور قرآن مجید میں فرق:

حدیث قدسی اور قرآن مجید میں متعدد فرق ہیں، چند درج ذیل ہیں:

(الف)۔ قرآن مجید کے الفاظ و معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، لیکن حدیث قدسی کا معنی و مفہوم من جانب اللہ ہوتا ہے اور الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں۔

(ب)۔ قرآن مجید کی تلاوت عبادت ہے، لیکن حدیث قدسی کی تلاوت اسی طرح کی عبادت نہیں۔

(ج)۔ قرآن مجید کے ثبوت کے لیے تواتر شرط ہے لیکن حدیث قدسی کے ثبوت کے لیے تواتر

---

(۱) قواعد التحدیث: ۶۴-۶۹، الوسیط فی علوم و مصطلح الحدیث: ۲۱۴-۲۲۲، علوم الحدیث و مصطلحہ: ۱۱-۱۳، تحریر علوم الحدیث: ۳۷-۳۹، مدرسۃ الحدیث فی مصر: ۲۳۶-۲۴۲۔ (م)

(۲) القاموس المحیط: ۱/ ۲۴۸۔ (ط)

مزید دیکھئے: معجم مقاییس اللغۃ: ۵/ ۶۳، تہذیب اللغۃ: ۸/ ۳۰۳-۳۰۴، الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ: ۳/ ۹۶۰، لسان العرب: ۶/ ۱۶۸، المعجم الوسیط: ۲/ ۷۱۹، تاج العروس: ۱۶/ ۳۵۵۔ (م)

(۳) الرسالۃ المستطرفہ: ۸۱، قواعد التحدیث: ۶۵۔ (ط)

شرط نہیں[1]۔

---

[1] الوسیط فی علوم و مصطلح الحدیث:۲۱۶-۲۱۷،الحدیث والمحد ثون:۱۷۔
اس کے علاوہ دیگر فرق یہ ہیں: محد ثین نے حدیث قدسی اور قرآن مجید میں واضح فرق بیان کیا ہے کہ:
۱۔ قرآن معجزہ ہے اور اتنی صدیاں گذرنے کے باوجود اس کا اعجاز قائم ہے۔
۲۔ قرآن کی روایت بالمعنی حرام ہے۔
۳۔ غیر طاہر انسان اور جنبی کے لیے اس کی تلاوت ممنوع ہے۔
۴۔ نماز میں اس کی قراءت متعین ہے۔
۵۔ اس کا نام قرآن رکھا گیا ہے۔
۶۔ ہر جملہ کو آیت کا نام دیا گیا ہے اور ہر سورت کی آیات کی تعداد متعین ہے۔
۷۔۔ قرآن کریم الفاظ و معانی کے ساتھ بطریق وحی جلی من جانب اللہ ہے جو بذریعہ فرشتہ بلفظہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا۔اس کے مقابلے میں حدیث قدسی کی صفات مندرجہ ذیل ہیں:
۱۔ اس کے معانی بذیعہ الہام و منام من جانب اللہ ہوتے ہیں۔وحی جلی کے ذریعہ امکان ہے لیکن شرط نہیں۔ اس کے الفاظ نبی اکرم ﷺ کے ہوتے ہیں لہٰذا اسے قرآن کی طرح کلام اللہ نہیں کہا جاسکتا۔حدیث قدسی اقسام وحی میں سے کسی خاص قسم کے ساتھ مختص نہیں۔خواب، القاء فی الروع یا بذریعہ فرشتہ کوئی صورت ہو سکتی ہے جب کہ قرآن وحی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ وحی جلی ہے۔
۲۔ اس کی روایت بالمعنی جائز ہے۔
۳۔ نماز میں اس کی قراءت درست نہیں بلکہ یہ قراءت نماز کو باطل کر دے گی۔
۴۔ اس میں قرآن پاک کے دیگر خصائص میں سے کوئی خصوصیت نہیں ہے۔لہٰذا حدیث قدسی قرآن سے مختلف اور مرتبہ کے لحاظ سے اس سے کم ہے۔ دیکھئے: قواعد التحدیث:۶۴-۶۵ ، الاتحاف السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ:۱۰۲۔

حدیث قدسی اور دوسری احادیث میں نمایاں فرق یہ ہے کہ عام احادیث کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی طرف ہوتی ہے اور اس کی حکایت بھی آپ ﷺ ہی سے ہوتی ہے جب کہ حدیث قدسی کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے لیکن حکایت و روایت رسول اللہ ﷺ کرتے ہیں۔اسی نسبت سے یہ احادیث قدسیہ یا الٰہیہ کہلاتی ہیں دوسری احادیث نبویہ۔ گویا دونوں کا مرجع وحی الٰہی ہے لیکن ایک میں یہ مرجع واضح الفاظ میں بیان ہوتا ہے اور دوسری میں متصور ہوتا ہے۔علماء نے قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کیا ہے گو اکثر مفسرین نے اسے قرآن کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔"وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى."(سورۃ النجم:۳-۴)۔ دیکھئے:اصول الحدیث:۱/۱۴۷۔(م)

۳۔ احادیث قدسیہ کی تعداد:

احادیث قدسیہ کی تعداد احادیث نبویہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اس کی تعداد تقریباً دو سو کے لگ بھگ ہے[1]۔

۴۔ حدیث قدسی کی مثال:

حدیث قدسی کی مثال صحیح مسلم کی یہ حدیث ہے:

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ[2] سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

''«يَا عِبَادِي إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي، وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فَلَا تَظَالَمُوا..»''[3]۔

''اے میرے بندوں! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام رکھا ہے اور تمہارے لیے بھی ظلم کو ممنوع قرار دیا، اس لیے ظلم نہ کرو''۔

---

(۱) بعض حضرات نے احادیث قدسیہ کی تعداد سو سے زیادہ بتلائی ہے۔ دیکھئے: قواعد التحدیث: ٦٤، الوسیط فی علوم مصطلح الحدیث: ۲۱۴۔(م)

واضح رہے کہ احادیث قدسیہ اکثر ترغیب وترہیب کے باب میں وارد ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے ان میں سے اکثر احادیث ضعیف اور منکر ہیں، شیخ محمد المدنی (م: ۱۱۹۱ھ) نے اپنی کتاب میں احادیث قدسیہ ۸٦۴ ذکر کی ہیں حالانکہ یہ احادیث ۲۷۲ سے زیادہ نہیں ہیں۔ دیکھئے: مدرسۃ الحدیث فی مصر: ۲۳٦۔

(۲) سیدنا جُندب بن جُنادہ بن سفیان بن عبید، ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، قبیلہ غفار سے تعلق تھا، ان کے اور ان کے والد کے نام میں متعدد اقوال ہیں، جلیل القدر قدیم الاسلام صحابی ہیں، قناعت، دیانت وصداقت میں ضرب المثل تھے، رسول اللہ ﷺ کے وفات کے بعد شام کو ہجرت کی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت تک وہاں رہے، پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں واپس مدینہ منورہ بُلایا۔ اور انہیں مدینہ کے قریب ربذہ نامی بستی میں سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا، آپ وہاں رہے، ان کی مرویات کی تعداد ۲۸۱ ہے۔ مدینہ منورہ میں ۳۲ھ کو وفات پائی۔

(الاستیعاب: ۱/ ۲۵۲، اسد الغابہ: ۱/ ۵٦۳، الاصابہ: ٦/ ۹٦، الاعلام للزرکلی: ۲/ ۱۴۰)(م)

(۳) صحیح مسلم: ۱/ ۱۱۲۸، رقم: ۲۵۷۷، صحیح ابن حبان: ۲/ ۳۸۵، رقم: ٦۱۹، مسند البزار: ۹/ ۴۴۱، رقم: ۴۰۵۳، مستدرک حاکم: ۴/ ۲٦۹، رقم ۷٦۰٦، وقال: صحیح علی شرط الشیخین. (م)

۵۔حدیث قدسی روایت کرنے کے الفاظ:

حدیث قدسی روایت کرنے والا راوی درج ذیل دو تعبیروں میں سے جس کو چاہے اختیار کر کے روایت کر سکتا ہے:

(الف)۔ قال رسولُ اللهِ ﷺ فِيْمَا يَرْوِيْهِ عَن رَّبِّهِ عَزَّ وَ جَلَّ [۱].

"رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب العزت سے روایت کرتے ہوئے فرمایا"۔

(ب)۔ قالَ اللهُ تَعالى، فِيْمَا رَوَاهُ عَنْهُ رَسُوْلُهُ ﷺ [۲].

"اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، جس کو رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے"۔

۶۔احادیث قدسیہ پر معروف تصانیف:

الاتحافات السنية بالأحاديث القدسية، از علامہ عبد الرؤوف مناویؒ [۳]، جس میں علامہ مناویؒ نے (۲۷۲) احادیث جمع کی ہیں [۴]۔

---

[۱] الوسیط فی علوم و مصطلح الحدیث: (۲۲۱)۔(م)

[۲] اس تعبیر کو متأخرین نے اختیار کیا ہے۔ علوم الحدیث و مصطلحہ: ۱۲۔(م)

[۳] محمد عبد الرؤف بن تاج العارفین ابن علی بن زید عابدین حدادی مُناوی قاہری، زین الدین، قاہرہ میں ۹۵۲ھ کو پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے، علوم وفنون کے نابغہ روزگار عالم تھے، تحقیق وتصنیف کے لیے گوشہ نشینی اختیار کی۔ بہت تھوڑا کھانا کھاتے تھے، ساری رات جاگتے تھے، جس کی وجہ سے بہت جلد کمزور ہو کر لکھنے سے معذور ہو گئے تھے، اکثر کتابیں اپنے والد سے املاء کروا کر لکھوائیں، تقریباً اسی کتابیں لکھیں اور قاہرہ ہی میں ۱۰۳۱ھ کو وفات پائی۔

(خلاصۃ الاثر: ۲/ ۴۱۲، سلک الدرر: ۴/ ۶۶، الاعلام للزرکلی: ۶/ ۲۰۴)(م)

[۴] اس کے علاوہ احادیث قدسیہ پر دیگر تصانیف یہ ہیں:

۱۔ مشكاة الأنوار فيما روى عن الله سبحانه وتعالى من الأخبار، از شیخ محیی الدین ابو عبد اللہ محمد بن علی بن محمد بن عربی الحاتمی الدمشقی (م: ۶۳۸ھ)۔

۲۔ الاحاديث القدسية، اس کو قاہرہ کی المجلس الاعلی للشؤن الاسلامیہ نے شائع کیا ہے۔(م)

مطلب دوم: مرفوع کا بیان[1]

۱-حدیث مرفوع کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مرفوع "رَفَعَ" (بلند کیا) فعل سے اسم مفعول ہے، جو "وضع" (اتار دیا) کی ضد ہے[2]، گویا اس قسم حدیث کو مرفوع اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس کی نسبت بلند و بالا مقام کی مالک ہستی رسول اللہ ﷺ کی طرف کی گئی ہے۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

مرفوع حدیث وہ قول یا فعل یا تقریر یا صفت ہے جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو[3]۔

۲-اصطلاحی تعریف کا مفہوم:

مرفوع وہ حدیث ہے جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جائے، خواہ یہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہو یا فعل یا تقریر ہو یا صفت ہو، خواہ اس کی نسبت آپ ﷺ کی طرف صحابی نے کی ہو، یا تابعی نے یا کسی اور نے اور خواہ اس کی سند متصل ہو یا منقطع ہو۔ اس طرح مرفوع کی تعریف میں موصول، مرسل، متصل اور منقطع داخل ہو جائیں گی[1]۔

---

(۱) الکفایہ: ۵۸، مقدمۃ ابن الصلاح:۱۱۶-۱۱۷، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۵۷، التقریب: ۵۰ - ۵۱، الاقتراح: ۱۹۵، المنہل الروي: ۴۰، الموقظۃ: ۴۱، اختصار علوم الحدیث: ۴۵، المقنع فی علوم الحدیث: ۱/ ۴۳، شرح التبصرة والتذکرة: ۱/ ۲۲۲، نزہۃ النظر: ۱۴۰، فتح المغیث: ۱/ ۹۸، ألفیۃ السیوطي:۲۱، شرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي:۱۴۳، فتح الباقي:۱/ ۱۱۶، توضیح الأفکار: ۱/ ۲۵۴، ظفر الأماني:۲۲۷، وقواعد التحدیث:۱۲۳.(م)

(۲) لسان العرب: ۸/۱۲۹، الصحاح:۳/۱۲۲۱، معجم مقاییس اللغۃ: ۲/۴۲۳، مختار الصحاح: ۱۲۶، تاج العروس: ۲۱/۱۰۴۔(م)

(۳) الکفایۃ فی علم الروایۃ:۱/۹۶، مقدمہ ابن الصلاح:۱۹۳، النکت للزرکشی:۱/۳۱۱، النکت لابن حجر:۱/۵۱۱، الموقظۃ للذہبی: ۴۱، فتح المغیث:۱/۱۳۱، تدریب الراوی:۱/۲۰۳، توضیح الافکار:۱/۲۳۰، منہج النقد فی علوم الحدیث:(۳۲۵)۔(م)

(۱) مقدمہ ابن الصلاح:۱۱۷، الکفایۃ فی علم الروایۃ:۲۱، تدریب الراوی:۱/۲۰۲، ارشاد طلاب الحقائق:۱/۱۵۷، اختصار علوم الحدیث:۴۵، فتح المغیث:۱/۹۸۔(م)

حدیث مرفوع کی یہی مشہور تعریف ہے تاہم اس کے علاوہ دیگر اقوال بھی منقول ہیں [1]۔

۳۔ حدیث مرفوع کی اقسام وانواع:

مذکورہ بالا تعریف سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ مرفوع کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ مرفوع قولی ۲۔ مرفوع فعلی ۳۔ مرفوع تقریری ۴۔ مرفوع وصفی (حالی)

۴۔ مذکورہ اقسام کی مثالیں:

(الف)۔ مرفوع قولی کی مثال: جیسے صحابی یا غیر صحابی یوں کہے: "قَالَ رسوْلُ اللهِ ﷺ كَذَا". "رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا"۔

(ب)۔ مرفوع فعلی کی مثال: جیسے صحابی یا غیر صحابی یوں کہے: "فَعَلَ رسوْلُ اللهِ ﷺ كَذَا". رسول اللہ ﷺ نے یہ کام کیا۔

(ج)۔ مرفوع تقریری کی مثال: جیسے صحابی یا غیر صحابی یوں کہے: "فُعِلَ بحضرةِ النَّبِي ﷺ كَذَا". "رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں یہ کیا گیا اور وہ صحابی یا غیر صحابی رسول اللہ ﷺ کا اس فعل پر نکیر ذکر نہ کرے"۔

(د)۔ مرفوع وصفی کی مثال: جیسے صحابی یا غیر صحابی یوں کہے: "كانَ رسولُ اللهِ ﷺ أحْسَنُ

---

[1] حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) نے خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) کے حوالہ سے مرفوع کی تعریف یوں نقل کی ہے۔

"المرفوعُ: ما أخبرَفيهِ الصحابيُّ عنْ قولِ الرسولِ ﷺ أوفعلِهِ." (مقدمہ ابن الصلاح: ۱۱۷)۔

"مرفوع وہ حدیث ہے جس میں صحابی رسول اللہ ﷺ کے قول یا فعل کی خبر دے۔"

اس تعریف میں خطیب بغدادیؒ نے مرفوع کو صحابی کیساتھ خاص کیاہے کہ مرفوع حدیث وہ ہوتی ہے جس میں صحابی رسول اللہ ﷺ کے قول یا فعل کی خبر دے۔ اس تعریف کے مرسل اور مقطوع وغیرہ خارج ہوگئے، لیکن علامہ ابن الصلاحؒ فرماتے ہیں کہ جو محدثین کرام مرفوع کو مرسل کے مقابلہ میں ذکر کرتے ہیں ان کی مرفوع سے متصل مراد ہے۔ دیکھئے: مقدمہ ابن الصلاح: ۱۱۷۔

محدث جلیل حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ خطیب بغدادیؒ نے مرفوع کو صحابی کیساتھ علی سبیل التمثیل خاص کیاہو، کیونکہ اکثر صحابی کسی قول یا فعل کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ دیکھئے: النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح: ۱/ ۴۰۳، فتح المغیث: ۱/ ۹۸، تدریب الراوی: ۱/ ۲۰۲، فتح الباقی: ۱/ ۱۱۷۔ (م)

النّاسِ خُلُقاً". "رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سے اعلیٰ اخلاق والے تھے"[1]۔

---

[1] بنیادی طور پر مرفوع کی دو قسمیں ہیں:
١۔ مرفوع حقیقی ٢۔ مرفوع حکمی

١۔ مرفوع حقیقی: وہ حدیث ہے جو صراحت کیساتھ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو۔ اس کو مرفوع تصریحی بھی کہتے ہیں، اس کی مذکورہ بالا چار قسمیں ہیں:

٢۔ مرفوع حکمی: وہ حدیث ہے جو بظاہر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب نہ ہو، لیکن حکماً کسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو۔ اس کی متعدد قسمیں ہیں:

(الف)۔ ایسا صحابی جس کا اہل کتاب سے استفادہ معروف نہیں اس کا کوئی ایسی بات کہنا جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو اور نہ ہی اس کا لغت کے بیان یا کسی لفظ کی شرح سے تعلق ہو، مثلاً: گزشتہ واقعات وحالات کی خبر، جیسے آغاز خلقت کا بیان، یا مستقبل کے واقعات کی خبر، جیسے احوال قیامت، یا کسی کام کے کرنے پر مخصوص ثواب یا سزا کا ذکر وغیرہ۔

(ب)۔ صحابی کا کوئی ایسا کام کرنا جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو، جیسے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا نمازِ کسوف میں دو سے زائد رکوع کرنا۔

(ج)۔ صحابی کا یہ بیان کہ "كُنَّا نَقُولُ"، "نَفْعَلُ كَذَا"، "كُنَّا لَا نَرَى بَأْسًا بِكَذَا فِي حَيَاةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَوْ وَ هُوَ فِينَا، أَوْبَيْنَ أَظْهُرِنَا"، "كَانُوا يَقُولُونَ، أَوْيَفْعَلُونَ، أَوْ لَايَرَوْنَ بَأْسًابِكَذَا فِي حَيَاتِهِ ﷺ" وغیرہ۔ پھر اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر صحابی اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی زمانے کی طرف کرے تو یہ حدیث مرفوع ہو گی، جیسے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "«كُنَّانَعْزِلُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ»." اور "«كُنَّانَأْكُلُ لُحُومَ الْخَيْلِ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ»" وغیرہ۔ اور اگر صحابی ان الفاظ کی نسبت رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مقدس کی طرف نہ کرے تو بھی حاکم نیسابوری، ابن حجرؒ اور علامہ عراقیؒ کے نزدیک مرفوع ہو گی، لیکن جمہور محدثین، فقہاء کرام اور اصولیین کے نزدیک یہ روایت موقوف ہو گی، جیسے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "«كُنَّا إِذَاصَعِدْنَا كَبَّرْنَا، وَإِذَا نَزَلْنَاسَبَّحْنَا»" وغیرہ۔

(د)۔ صحابی کا یہ کہنا: " أُمِرْنَابِكَذَا"، جیسے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول ہے: " «أُمِرْنَا أَنْ نُخْرِجَ فِي الْعِيدَيْنِ الْعَوَاتِقَ، وَذَوَاتِالْخُدُورِ، وَأُمِرَالْحُيَّضُ أَنْ يَعْتَزِلْنَ مُصَلَّى الْمُسْلِمِينَ»"۔ یا صحابی کا یہ کہنا: "نُهِينَا عَنْ كَذَا."، جیسے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول ہے: "«نُهِينَاعَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ، وَلَمْ يُعْزَمْ =

مطلب سوم: موقوف(۱) کا بیان

موقوف کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

موقوف "الوَقْف" (روکنا) مصدر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، گویا کہ راوی نے حدیث کو صحابی تک پہنچا کر ٹھہر گیا اور سلسلہ سند کو آگے نہیں چلایا(۲)۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

موقوف حدیث وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جو کسی صحابی کی طرف منسوب ہو(۳)۔

۲-اصطلاحی تعریف کا مفہوم:

موقوف وہ حدیث ہے جو کسی ایک صحابی یا صحابہ کرام کی ایک جماعت کی طرف منسوب ہو، خواہ وہ منسوب حدیث قول ہو یا فعل ہو یا تقریر ہو، خواہ اس کی سند متصل ہو یا منقطع ہو(۱)۔

۳-موقوف حدیث کی اقسام وانواع:

= عَلَيْنَا»۔ "یا صحابی کا یہ قول ہے: "مِنَ السُّنَّةِ كَذَا."، جیسے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "مِنَ السُّنَّةِ إِذَا تَزَوَّجَ الْبِكْرَ عَلَى الثَّيِّبِ أَقَامَ عِنْدَهَا سَبْعًا.."

(ہ)۔ صحابی کے بعد کے لوگوں میں سے کسی کا کسی روایت کی سند میں صحابی کے ذکر کے بعد حسب ذیل چار کلمات میں سے کسی کا استعمال کرنا: "يَرْفَعُهُ"، "يُنْمِيهِ"، "يَبْلُغُبِهِ"، "رِوَايَةً"، جیسے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "«الشِّفَاءُ فِي ثَلَاثَةٍ: شَرْبَةُ عَسَلٍ وَشَرْطَةُ مِحْجَمٍ وَكَيَّةُ نَارٍ.» (تین چیزویں میں شفا ہے شہد پینا، پچھنے لگوانا اور آگ سے داغ دینا)۔

(و)۔ صحابی کی کسی آیت کی تفسیر میں سبب نزول سے متعلق کسی چیز کا ذکر کرنا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: تدریب الراوی: (۱/ ۲۰۴-۲۱۵)۔ (م)

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۱۹، الکفایۃ: ۵۸، مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۱۷، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۵۸، التقریب: ۵۱ – ۵۳، الاقتراح: ۱۹۴، الموقظۃ: ۴۱، اختصار علوم الحدیث: ۴۵، نزہۃ النظر: ۱۵۴، فتح المغیث: ۱/ ۱۰۳، ألفیۃ السیوطي: ۲۱ – ۲۳، توضیح الأفکار: ۱/ ۲۶۱، ظفر الأماني: ۳۲۵. (م)

(۲) تہذیب اللغۃ: ۹/ ۲۵۱، المعجم الوسیط: ۲/ ۱۰۵۱۔ (م)

(۳) الکفایہ فی علم الروایۃ: ۵۸، التمہید لابن عبد البر: ۱/ ۲۵، معرفۃ علوم الحدیث:: ۱۹، نزہۃ النظر: ۱۰۸. (م)

(۱) تدریب الراوی: ۱/ ۲۰۲۔ (م)

موقوف حدیث کی درج ذیل تین قسمیں ہیں:

(الف)۔ موقوف قولی (ب)۔ موقوف فعلی (ج)۔ موقوف تقریری۔

(الف)۔ موقوف قولی کی مثال: جیسے راوی یوں کہے:

”«حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ، اللهُ وَرَسُولُهُ» “[۱]۔

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ لوگوں کو ایسی باتیں بیان کرو جو ان کی سمجھ سے بالاتر نہ ہوں، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کی جائے“۔

(ب)۔ موقوف فعلی کی مثال: جیسے امام بخاریؒ کا یہ قول ہے: ”وَأَمَّ ابْنُ عَبَّاسٍ وَهُوَ مُتَيَمِّمٌ“[۲]۔

”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے تیمم کی حالت میں نماز کی امامت فرمائی“۔

(ج)۔ موقوف تقریری کی مثال: جیسے تابعی کا یہ قول ”فعلْتُ كَذَا أَمَامَ أَحَدِ الصَّحَابَةِ وَلَمْ يُنْكِرْ عَلَيَّ“۔

”میں نے یہ کام ایک صحابی کے سامنے کیا اور انہوں نے اس پر اپنی ناپسندی کا اظہار نہیں کیا“۔

۴۔موقوف کا ایک دوسرا مصداق:

صحابہ کرام کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین سے جو روایات منقول ہیں، ان پر بھی موقوف کا مشروط اطلاق ہوتا ہے، مثلاً یوں کہا جائے: ” هذاحَدِيْثٌ وَقَفَهُ فُلَانٌ عَلَى الزُّهْرِيْ، أَوْعَلَى عَطَاءٍ“[۳]۔

”اس حدیث کو فلان نے امام زہری یا عطاء بن ابی رباح[۱] پر موقوف کر دیا ہے“۔

۵۔فقہائے خراسان کی اصطلاح:

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب العلم: ۱/ ۲۲۵، رقم: ۴۹۔ (ط)

[۲] صحیح بخاری، کتاب التیمم، باب الصعید الطیب وضوء المسلم: ۱/ ۴۴۶۔ (ط)

[۳] مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۱۸، التقریب للنووی: ۳۳، المقنع فی علوم الحدیث: ۱/ ۱۱۴، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۵۸، مشیخۃ القزوینی: ۹۹۔ (م)

[۱] زہریؒ اور عطاءؒ دونوں تابعین میں سے ہیں۔ (ط)

فقہائے خراسان نے مرفوع اور موقوف کے درمیان فرق کے لیے ایک دوسری تعبیر اختیار کی ہے کہ وہ حدیث مرفوع کو خبر اور موقوف کو اثر کہتے ہیں[۱]، تاہم جمہور محدثین کرامؒ ان دونوں قسموں کو اثر ہی کہتے ہیں، اس لیے کہ لفظ اثر "أثرتُ الشيء" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں۔ "میں نے اسے روایت کیا"۔ اب ظاہر ہے کہ روایت کے اعتبار سے مرفوع اور موقوف دونوں اثر ہیں[۲]۔

٦۔ مرفوع حکمی کی چند صورتیں:

موقوف کی کچھ ایسی صورتیں ہیں جو اپنی ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے تو موقوف معلوم ہوتی ہیں، لیکن جب ایک مدقق محدث باریک بینی اور غور وخوض کیساتھ اس حقیقت کا جائزہ لیتا ہے تو اسے حدیث مرفوع کے معنی میں پاتا ہے، اس لیے محدثین کرامؒ نے اس قسم موقوف حدیث کو مرفوع حکمی قرار دیا ہے، یعنی بظاہر یہ حدیث موقوف ہے لیکن اسے مرفوع کا درجہ دیا گیا ہے، اس کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

(الف)۔ مثلاً ایک صحابی جو اہل کتاب سے روایت لینے میں معروف نہ ہو وہ ایک ایسی بات کہہ دے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو نہ اس کا تعلق کسی لغوی تشریح سے ہو اور نہ ہی اس کا تعلق کسی غریب اور غیر مانوس لفظ کی توضیح سے ہو، مثلاً:

۱۔ اخبار ماضیہ اور گزشتہ واقعات مثلاً ابتدائے آفرینش کی خبر دینا۔

۲۔ یا مستقبل کے امور کی خبر دینا جیسے آئندہ آنے والے عظیم جنگوں فتنوں اور احوال قیامت کی خبر دینا۔

۳۔ یا کسی عمل پر ملنے والے مخصوص ثواب کی خبر دینا یا کسی فعل پر عقاب وعذاب کے مستحق ٹھہرنے کی اطلاع دینا، مثلاً راوی یوں کہے: "مَنْ فَعَلَ كَذَا فَلَهُ مِنْ أَجْرِ كَذَا.[۱]" "جس شخص نے یہ عمل کیا تو اسے یہ صلہ ملے گا"۔

---

[۱] یہ اطلاق امام شافعیؒ کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ دیکھئے: الرسالۃ: (۲۱۸)۔ (م)

[۲] التقریب للنووی: ۳۳، تدریب الراوی: ۱/ ۲۰۲، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۵۹، توضیح النظر: ۱/ ۱۷٦۔ (م)

[۱] تدریب الراوی: (۱/ ۲۰۴)۔ اس کی مزید تفصیل ماقبل مرفوع کے بحث میں حاشیہ میں گذر چکی ہے۔ (م)

(ب)۔ یا صحابی رسول ﷺ کوئی ایسا عمل کرے، جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو، جیسے امیر المؤمنین سیدنا علی نماز کسوف کی ہر رکعت میں دو سے زیادہ رکوع کرنا[۱]۔

(ج)۔ یا صحابی رسول ﷺ کی یہ خبر دینا کہ لوگ یوں کہتے تھے یا یوں کہا کرتے تھے یا اس طرح کے عمل کو صحابہ کرام ناپسند نہیں کرتے تھے پھر اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اگر صحابی اس بات کو عہد رسالت کی طرف منسوب کرتا ہے تو صحیح بات یہ ہے کہ وہ حدیث مرفوع ہوگی جیسے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے:

"كُنَّا نَعْزِلُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ[۲]".

"ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عزل کرتے تھے"۔

۲۔ اور اگر صحابی اس بات کو عہد رسالت کی طرف منسوب نہیں کرتا تو محدثین کرامؒ کے نزدیک وہ حدیث موقوف ہوگی جیسے سیدنا جابر کا کہ قول ہے:

"كُنَّا إذا صعِدْنا كَبَّرْنا، وإذا نَزَلْنا سَبَّحْنا.[۳]".

"ہم جب بلندی پر چڑھتے تو "الله أكبر" کہتے اور جب نیچے اترتے تو "سبحان الله" کہتے۔"

(د)۔ یا صحابی رسول ﷺ یہ کہے: "أُمِرْنَا بِكَذَا" (ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا) یا "نُهِينَا عَنْ كَذَا" (ہمیں اس بات سے روکا گیا) یا "وَمِنَ السُّنَّةِ كَذَا" (یہ بات سنت میں سے ہے) جیسا کہ بعض صحابہ کرام کا قول ہے:

"أُمِرَ بِلَالٌ أَنْ يُشْفِعَ الْأَذَانَ، وَيُوتِرَ الْإِقَامَةَ[۱]"۔

"بلال رضی اللہ عنہ کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ کلمات کو دو دو بار کہیں اور اقامت کے وقت ایک کلمات ایک ایک بات کہیں"۔

---

[۱] تدریب الراوی: (۱/ ۲۰۴)۔

[۲] صحیح بخاری، کتاب النکاح: (رقم: ۵۲۰۷)، صحیح مسلم، کتاب النکاح: (رقم: ۱۳۷)۔ (ط)

[۳] صحیح بخاری، کتاب الجہاد: (رقم: ۲۹۹۳)۔ (ط)

[۱] صحیح بخاری، کتاب الاذان: (رقم: ۶۰۷)، صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ: (رقم: ۲)۔ (ط)

یا جیسا کہ ام عطیہ (۱) کا قول ہے:
" نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ، وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا (۲)".
"ہمیں جنازوں کے پیچھے جانے سے منع کیا گیا اور ہمارے اوپر اسے واجب نہیں کیا گیا"۔
اور یا جیسا کہ ابو قلابہ رحمہ اللہ (۳) کا سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی یہ قول ہے:
"مِنَ السُّنَّةِ إِذَا تَزَوَّجَ الْبِكْرَ عَلَى الثَّيِّبِ أَقَامَ عِنْدَهَا سَبْعًا (۴)".
"یہ سنت میں سے ہے کہ جب کوئی شخص شادی شدہ عورت پر کنواری لڑکی بیاہ کر لائے تو کنواری کے پاس سات راتیں قیام کرے"۔
(ھ)۔ یا حدیث کا راوی صحابی کا ذکر کرتے وقت ان چار الفاظ میں سے کوئی ایک لفظ کہے: "يَرْفَعُهُ" یا "يَنْمِيهِ" یا "يَبْلُغُبِهِ" یا "رِوَايَةً" جیسے اعرج رحمہ اللہ (۵) کی حدیث ہے جس کی سند یہ ہے:
"عن أبي هريرة رواية: "لَاتَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تُقَاتِلُوا قَوْمًا صِغَارَ الْأَعْيُنِ. (۱)"
"اعرج سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی جب تک تم ایک چھوٹی آنکھوں والی قوم کیساتھ قتال نہ کر لو"۔

---

(۱) سیدہ نسیبہ بنت حارث، ام عطیہ انصاریہ، بعض ان کا نام نسیبہ بنت کعب بتلایا ہے، جلیل القدر صحابیہ ہے، رسول اللہ ﷺ کیساتھ بعض غزوات میں شریک ہوئیں۔ ان سے سیدنا انس رضی اللہ عنہ، اسماعیل بن عبد الرحمن بن عطیہ، عبد الملک بن عمیر وغیرہ۔ (الاستیعاب: ۴/ ۱۹۴۷، اسد الغابۃ: ۷/ ۳۵۶، الاصابہ: ۸/ ۴۳۷)(م)
(۲) صحیح بخاری، کتاب الجنائز: (رقم: ۱۲۷۸)، صحیح مسلم، کتاب الجنائز: (۳۵)۔ (ط)
(۳) عبد اللہ بن زید بن عمرو جرمی، بصرہ کے باشندے تھے، اپنے دور میں قضاء اور احکام کے بہت بڑے عالم تھے، ثقہ راوی حدیث ہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ، سیدنا ثابت بن ضحاک انصاری رضی اللہ عنہ، سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ، سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کبائر صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں، شام میں ۱۰۴ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۱۴/ ۵۴۲، تہذیب التہذیب: ۵/ ۲۲۴، تذہیب تہذیب الکمال: ۵/ ۱۵۴)(م)
(۴) صحیح بخاری، کتاب النکاح: (رقم: ۵۲۱۴)۔ (ط)
(۵) عبد الرحمن بن ہرمز، ابو داؤد اعرج، بنوہشام سے تعلق تھا، مدینہ منورہ کے بہت بڑے عالم، نسابہ، قاری، حافظ اور محدث تھے، ان کے والد کے نام میں خلاف ہے، امام زہری رحمہ اللہ، صالح بن کیسان رحمہ اللہ، امام یحیی بن سعید انصاری رحمہ اللہ، عبد اللہ بن لہیعہ رحمہ اللہ جیسے اساطین علم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے، اسکندریہ میں ۱۱۷ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۵/ ۲۸۳، سیر اعلام النبلاء: ۵/ ۶۹، طبقات الحفاظ: ۳۸)(م)
(۱) صحیح بخاری، کتاب الجہاد: (رقم: ۲۹۲۹)۔ (ط)

دوم: یا صحابی رسول ﷺ ایسی تقادیر بیان کرے جس کا تعلق سبب نزول سے ہو جیسے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے:"كَانَتِ الْيَهُودُ تَقُولُ: مَنْ أَتَى امْرَأَتَهُ مِنْ دُبُرِهَا فِيقُبُلِهَا، جَاءَالْوَلَدُ أَحْوَلَ فأنزل الله تعالى: "نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُواحَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ." (البقرة:۲۲۳)[۱]

"جو شخص اپنی بیوی کی شرمگاہ میں پیچھے کی طرف سے وطی کرے گا تو اس کے ہاں بچہ بھینگا پیدا ہو گا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:"تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تمہیں اختیار ہے جس طرح چاؤ اپنے کھیتی میں جاؤ۔"

۷-کیا موقوف حدیث قابل استدلال ہے؟

یہ بات ما قبل بیان ہو چکی ہے کہ موقوف حدیث کبھی صحیح ہوتی ہے، کبھی حسن اور کبھی ضعیف ،لیکن اگر اس کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے تو کیا اس سے استدلال کیا جا سکے گا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بنیادی طور پر موقوف حدیث نا قابل حجت ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال وافعال ہیں، تاہم اگر یہ صحیح ثابت ہو جائیں تو ان اقوال وافعال سے ضعیف احادیث کو تقویت مل سکتی ہے جیسا کہ مرسل حدیث کے ذیل میں گزر چکا ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول ہمیشہ سنت پر عمل رہا ہے، یہ تفصیل اس وقت ہے جب یہ مرفوع کے حکم میں نہ ہو لیکن جب یہ مرفوع حکمی ہو تو مرفوع کی مانند قابل حجت واستدلال ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے[۲]۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب النکاح: (رقم:۱۱۷)۔ (ط)

(۲) موقوف روایت کی حجیت میں اہل علم کا اختلاف ہے، احناف میں سے امام ابو بکر رازیؒ، فخر الاسلام بزدویؒ، شمس الائمہ سرخسیؒ اور بعض متاخرین، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ ایک روایت کے مطابق یہ رائے رکھتے ہیں کہ موقوف روایت سے احکام شرعیہ ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ صحابہ کرام کی مجموعی کیفیت یہ تھی کہ ان کا ہر عمل سنت کے مطابق تھا۔ بعض حنفیہ اور شوافع کی یہ رائے ہے کہ موقوف روایت حجت نہیں، کیونکہ اس میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ یہ صحابی کا اجتہاد ہو۔ یا اس سے رسول اللہ ﷺ کے بجائے کسی اور سے سنا ہو۔ علامہ آمدیؒ نے موقوف روایت کے لیے استعمال ہونے والے مختلف الفاظ پر الگ الگ بحث کی ہے جس میں انہوں نے قائلین اور عدم قائلین کے دلائل کا تجزیہ کیا ہے۔ دیکھئے: التقریر والتحبیر لابن امیر حاج: (۲/ ۳۱۰-۳۱۱)، الإحکام فی أصول الأحکام: (۲/ ۱۳۵-۱۴۶) (م)

مطلب چہارم: حدیث مقطوع(۱) کا بیان

۱-حدیث مقطوع کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مقطوع " قَطَعَ " سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور یہ " وَصَلَ " کی ضد ہے (۲)۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

مقطوع حدیث وہ قول و فعل ہے جو تابعی یا اس سے نیچے کسی راوی کی طرف منسوب ہو (۳)۔

۲-اصطلاحی تعریف کا مفہوم:

مقطوع وہ قول و فعل ہے، جس کی نسبت تابعی یا تبع تابعی یا اس سے نیچے کسی شخص کی طرف کی جائے، واضح رہے کہ مقطوع منقطع سے مختلف ہے، اس لیے کہ مقطوع متن کی صفت ہے اور منقطع اسناد کی صفت ہے، یعنی حدیث مقطوع تابعی یا تبع تابعی وغیرہ کا کلام ہوتا ہے، کبھی تابعی تک سند متصل ہوتی ہے، جب کہ منقطع وہ حدیث ہے جس کی سند غیر متصل ہو، اور اس کا متن کیساتھ

---

(۱) الجامع لأخلاق الراوي: ۱/ ۱۹۱، مقدمة ابن الصلاح: ۱۱۹، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۶۶، التقریب للنووی: ۵۳، الاقتراح: ۱۹۴، المنهل الروي: ۴۲، اختصار علوم الحدیث: ۴۶، نزهة النظر: ۱۵۴، فتح المغیث: ۱/ ۱۰۵، ألفیة السیوطي: ۲۱ – ۲۳، توضیح الأفکار: ۱/ ۲۴۹، ظفر الأماني: ۳۴۲.(م)

(۲) مقطوع "قطع" سے ماخوذ ہے جس کے معنی کاٹنا، جدا کرنا ہے، معروف لغوی علامہ ابن منظور افریقیؒ (م ۷۱۱ھ) (لسان العرب: ۸/ ۲۷۶،۲۷۹) میں فرماتے ہیں۔

" القَطْعُ: إبانةُ بَعْضِ أَجزاءِ الجِرْمِ مِنْ بعضٍ فَصْلًا... والقَطْعُ والقَطِيعةُ: الهِجْرانُ ضِدُّ الْوَصْلِ."

"قطع" کے معنی جسم کے بعض اجزاء کو دوسروں سے الگ کرنا۔۔اور "قطع" اور "قطیعہ" کے معنی جدائی کے ہیں جو جوڑنے کی ضد ہے۔

محدث جلیل علامہ نوویؒ (م ۶۷۶ھ) رقم طراز ہیں۔

"وجمع هوالمقاطيع، وهوالموقوف على التابعي قولاً أوفعلاً." (التقریب للنووی: ۳۴)

"مقطوع جس کی جمع مقاطع اور مقاطیع ہے وہ روایت ہے جو قول و فعل کے لحاظ سے تابعی پر موقوف ہو۔" (م)

(۳) دیکھئے: نخبة الفکر: ۵۹۔(ط)

تعلق نہیں ہوتا[1]۔

۳-حدیث مقطوع کی اقسام وانواع:

حدیث مقطوع کی دو قسمیں ہیں:

(الف)- مقطوع قولی (ب)- مقطوع فعلی

(الف)۔ مقطوع قولی کی مثال: اس کی مثال مبتدع کے پیچھے نماز کے سلسلہ میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ[2] کا یہ قول ہے۔

"صَلِّ وَعَلَيْهِ بِدْعَتُهُ."[3]

"بدعتی کے پیچھے نماز پڑھو، رہی اس کی بدعت تو اس کا وبال اس کے سر پڑے گا"۔

(ب)۔ مقطوع فعلی کی مثال: اس کی مثال ابراہیم بن محمد بن المنتشر[1] کا یہ قول ہے۔

---

[1] خلاصہ کلام یہ ہے کہ منقطع وہ حدیث ہے جس کی سند میں اتصال نہ پایا جائے، یہ انقطاع مرفوع، موقوف اور مقطوع سب میں واقع ہو سکتا ہے جب کہ مقطوع وہ روایت ہے جس کی سند تابعی پر ختم ہو جاتی ہے، حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) نے مقطوع پر گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا ہے:

"و هوَ غيرُ المنقطعِ الذي يأتي ذكرُهُ إنْشاءَاللهُ تعالى." (مقدمہ ابن الصلاح:۱۱۹)

مقطوع منقطع سے مختلف ہے جس کا ذکر انشاء اللہ آنے والا ہے۔(م)

[2] ابوسعید بن حسن بن ابی الحسن یسار بصری، مدینہ منورہ میں ۲۱ھ کو پیدا ہوئے، مشہور تابعی ہیں، علم، زہد، تقوی وطہارت میں اپنی مثال آپ تھے، آپ کے والد ماجد یسار سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سایہ عاطفت میں رہے، بصرہ میں سکونت پذیر تھے، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: کثرت سے تدلیس کیا کرتے تھے اس لیے ان کی معنعن روایت مقبول نہیں، حسن بصریؒ کبھی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے "عن" کیساتھ روایت کرتے ہیں، حالانکہ ان کی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت ہی نہیں، اس لیے ان کی یہی روایات منقطع ہیں۔ ۱۱۰ھ کو وفات پائی۔(وفیات الاعیان:۲/۶۹، میزان الاعتدال:۱/۵۲۷، الاعلام للزرکلی:۲/۲۲)(م)

[3] صحیح بخاری، کتاب الآذان، باب امامۃ المفتون والمبتدع:(۲/۱۸۸)۔(ط)

[1] ابراہیم بن محمد بن منتشر اجدع ہمدانی کوفی، سفیان ثوریؒ، مسعر اور ابوعوانہؒ وغیرہ اساطین ان سے روایت کرتے ہیں، امام احمدؒ اور امام ابوحاتمؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ صدوق ہے، امام نسائیؒ کہتے ہیں ثقہ ہے، امام ابن معینؒ، عجلیؒ اور ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن محمد ثقہ ہیں، امام ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔(تہذیب الکمال:۲/۱۸۳، تہذیب التہذیب: ۱/۱۵۷، تذہیب تہذیب الکمال:۱/۲۶۶)(م)

” «كَانَ مَسْرُوقٌ يُرْخِي السِّتْرَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَهْلِهِ وَيُقْبِلُ عَلَى صَلَاتِهِ وَيُخَلِّيهِمْ وَدُنْيَاهُمْ».[1]“

”حضرت مسروق اپنے اور اپنے اہل خانہ کے درمیان پردہ لٹکا کر نماز میں مشغول ہو جاتے اور اپنے اہل وعیال اور دنیا سے بے خبر ہو جاتے تھے“۔

۴-حدیث مقطوع سے استدلال کرنے کا حکم:

مقطوع حدیث احکام شرعیہ میں نا قابل استدلال ہوتا ہے اگرچہ اس کی نسبت قائل کی طرف درست ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ یہ ایک عام مسلمان کا قول وفعل ہوتا ہے، تاہم اگر اس کے مرفوع ہونے پر کوئی قرینہ موجود ہو، مثلاً کوئی راوی تابعی کے ذکر کے وقت ”یرفعه“ کے الفاظ کہہ دے تو اس وقت اس مقطوع حدیث کو مرفوع مرسل کے حکم میں شمار کیا جائے گا۔

۵-کیا مقطوع کا منقطع پر اطلاق ہو سکتا ہے؟

امام شافعیؒ، امام طبرانیؒ[2] اور بعض محدثین[1] نے مقطوع کا اطلاق منقطع پر بھی کیا ہے اور اس سے ان کی مراد وہ منقطع ہے جس کا اسناد متصل نہ ہو[2]، تاہم یہ اصطلاح غیر معروف ہے، اس سلسلہ میں امام شافعیؒ کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جا سکتا ہے، کہ انہوں نے یہ بات

---

[1] حلیۃ الاولیاء لابی نعیم: (۲/ ۹۶)۔ (ط)

[2] سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر لخمی شامی، ابو قاسم، ععکا ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے، اصل میں طبریہ (شام) کے تھے، اسی نسبت سے طبرانی کہلائے، اپنے دور میں عظیم محدث، حافظ اور جید عالم تھے، حصول علم کے سلسلے میں حجاز مقدس، یمن، مصر، عراق، فارس اور جزیرہ کے دور دراز اسفار کیے، معاجم ثلاثہ آپ کی عظیم یادگار ہیں، اصفہان میں ۳۶۰ھ میں وفات پائی۔ (وفیات الاعیان: ۲/ ۴۰۷، تذکرۃ الحفاظ: ۳/ ۹۱۲، النجوم الزاہرۃ: ۴/ ۵۹، سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۱۱۹، الاعلام للزرکلی: ۳/ ۱۲۱) (م)

[1] بعض دیگر محدثین سے امام دار قطنیؒ اور امام حمیدیؒ مراد ہیں کہ انہوں نے بھی مقطوع کا منقطع کا اطلاق کیا ہے، علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں کہ علامہ بردیجی کے منقطع پر مقطوع کا اطلاق کیا ہے۔ دیکھئے: شرح التبصرۃ والتذکرۃ: (۱/ ۲۳۱، تدریب الراوي: ۱/ ۱۹۴. (م)

[2] مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۱۹، نزہۃ النظر: ۱۱۲۔ (م)

اس وقت کی تھی جب مقطوع کے لیے خاص اصطلاح ابھی مقرر نہیں ہوئی تھی، البتہ امام طبرانیؒ کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اصطلاح سے ہٹ کر مجازاً اس کا اطلاق کیا ہے[1]۔

۶-موقوف اور مقطوع احادیث کے مظان و مصادر:

۱۔ مصنف ابن ابی شیبہؒ[2]۔

۲۔ مصنف عبد الرزاق[3]۔

۳۔ تفسیر ابن جریر[4]۔

۴۔ تفسیر ابن ابی حاتم[5]۔

۵۔ تفسیر ابن المنذر[1]۔

[1] اس لیے کہ امام ابو القاسم طبرانیؒ ۳۶۰ ہجری میں وفات پاچکے ہیں اور اس زمانہ میں اصطلاحاتِ حدیث کی تدوین ہوچکی تھی۔(م)

[2] یہ امام ابو بکر بن ابی شیبہ عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم (م۲۳۵ھ) کی تصنیف ہے اس کا اصل نام "الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار" ہے، یہ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابو داؤدؒ، امام ابن ماجہؒ اور دیگر مشاہیر کے شیخ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں مرفوع، موقوف اور مقطوع روایات ذکر کیے ہیں۔(م)

[3] یہ امام ابو بکر عبد الرزاق بن ہمام بن نافع صنعانیؒ (م۲۱۱ھ) کی مشہور و معروف تصنیف ہے، اس کا اصل نام "المصنف فی الحدیث" ہے اس کا "الجامع الکبیر" بھی کہتے ہیں۔ اس میں علامہ صنعانیؒ نے مرفوع، موقوف اور مقطوع روایات ذکر کی ہیں۔ یہ کتاب محدث جلیل علامہ حبیب الرحمن اعظمیؒ کی تحقیق کیساتھ مجلس علمی پاکستان اور المکتب الاسلامی بیروت سے طبع ہوئی۔(م)

[4] یہ امام ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبریؒ (م۳۱۰ھ) کی شہرہ آفاق تفسیر ہے، یہ سب سے پہلی لکھی جانے والی تفسیر ہے، بعد میں آنے والے مفسرین کا ماخذ اور مصدر رہے، اس کا اصل نام "جامع البیان فی تاویل القرآن" ہے، اس میں تفسیر آیات کے سلسلے میں مرفوع، موقوف اور مقطوع روایات نقل کی گئی ہیں۔(م)

[5] یہ امام ابو محمد عبد الرحمن بن محمد رازی ابن ابی حاتمؒ (م۳۲۷ھ) کی مشہور و معروف تفسیر ہے اس کا اصل نام "تفسیر القرآن" ہے، ان کا شمار بھی متقدمین مفسرین میں ہوتا ہے اس میں تفسیر آیات کے سلسلے میں مرفوع، موقوف اور مقطوع روایات ذکر کیے گئے ہیں۔(م)

[1] یہ امام ابو بکر محمد بن ابراہیم بن منذر نیسابوریؒ (م۳۱۹ھ) کی تفسیر ہے اس کا شمار بھی قدیم تفاسیر میں ہوتا ہے، اس میں بھی تفسیر آیات کے سلسلے میں مرفوع، موقوف اور مقطوع روایات کو ذکر کیا گیا ہے۔(م)

مبحث دوم:

مقبول اور مردود کے درمیان دیگر مشترک اقسام وانواع

یہ مبحث درج ذیل چار مطالب پر مشتمل ہے:

۱۔ مطلب اول: مسند کا بیان

۲۔ مطلب دوم: متصل کا بیان

۳۔ زیادت ثقات کا بیان

۴۔ اعتبار، متابع اور شاہد کا بیان

مطلب اول: مسند[1] کا بیان

۱-مسند کی تعریف:

(الف)۔لغوی تعریف:

مسند "أَسْنَدَ" (باب افعال) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے جس کے معانی ہیں نسبت کرنا اور منسوب کرنا[2]۔

(ب)۔اصطلاحی تعریف:

مسند وہ مرفوع حدیث ہے جس کی سند رسول اللہ ﷺ تک متصل ہو[1]۔

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۱۷، الکفایہ فی علم الروایۃ: ۵۸ ، مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۱۴، الجامع لأخلاق الرَّاوِي: ۲/ ۱۸۹، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۵۴ - ۱۵۶، التقریب للنووی: ۴۹ - ۵۰، الاقتراح: ۱۹۶، الموقظۃ: ۴۲، اختصار علوم الحدیث: ۴۴، المقنع فی علوم الحدیث: ۱ / ۱۰۹، شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۱/ ۲۲۴، نزہۃ النظر: ۱۵۴، فتح المغیث : ۱/ ۹۹، ألفیۃ السیوطي: ۲۱، توضیح الأفکار: ۱/ ۲۵۸، ظفر الأماني: ۲۲۵.(م)

(۲) مسند "سند" سے ماخوذ ہے جس کے معنی اعتماد کرنا، بھروسہ کرنا، سہارا اور پہاڑ کے چوٹی وغیرہ کے ہیں، علامہ ابن منظور افریقیؒ (م ۷۱۱ھ) رقم طراز ہیں۔

"السَّنَدُ: مَا ارتَفَعَ مِنَ الأَرض فِي قُبُل الْجَبَلِ أَو الْوَادِي، وَالْجَمْعُ أَسْنادٌ... وكلُّ شيءٍ أَسندتَ إِليه شَيْئًا، فَهُوَ مُسْنَد.." (لسان العرب:۳/ ۲۲۰، تاج العروس:۸/ ۲۱۵، تہذیب اللغۃ:۱۲/ ۲۵۴)

"سند پہاڑ یا وادی کے زمین سے ابھرے ہوئے حصے کو کہتے ہیں، اس کی جمع "اسناد" ہے اور ہر وہ چیز جسے تو نے دوسری شئ کا سہارا بنایا ہو اسے مسند کہتے ہیں۔" (م)

(۱) اہل علم سے مسند کی تعریف میں تین اقوال منقول ہیں:۔

پہلا قول: امام حاکم نیسابوریؒ اور دیگر محدثین کرامؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مسند وہ حدیث ہے جس کی سند رسول اللہ ﷺ تک متصل ہو، لہذا مسند مرفوع متصل کا نام ہے، خطیب بغدادیؒ نے اس کو اکثریت کے رائے قرار دی ہے۔

=

اس تعریف کو حاکم نیسابوریؒ نے راجح قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی اسے ''نخبۃ الفکر [1]'' میں صحیح تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ مسند کی اور تعریفیں بھی کی گئی ہیں۔

۲-حدیث مسند کی مثال:

اس کی مثال صحیح بخاری کی یہ حدیث ہے:

'' حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ، عَنْ مَالِكٍ، عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنِ الأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا شَرِبَ الكَلْبُ فِي إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعًا». ''[2]

''امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن یوسف نے بیان کیا، ان سے مالک نے، ان سے ابو الزناد نے، ان سے اعرج نے، اور ان سے سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جب کُتا برتن میں منہ ڈال دے تو اسے سات مرتبہ دھولو''۔

اس حدیث کی سند اول سے آخر تک متصل ہے اور رسول اللہ ﷺ تک مرفوع ہے۔

= دیکھئے: معرفۃ علوم الحدیث: ۱۷، الکفایہ فی علم الروایۃ: ۵۸، الجامع لأخلاق الراوي: ۲/ ۱۸۹، التمہید: ۱/ ۲۵)۔

دوسرا قول: مسند وہ ہے جس کی سند متصل ہو، لیکن مروی عنہ کے لیے ضروری نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ ہو، صحابی اور تابعی تک متصل مسند روایت کو بھی مسند کہا جائے گا۔ اس میں حدیث معنعن بھی شامل ہے۔ اس قول کو خطیب بغدادی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ الکفایۃ فی علم الروایۃ: (۵۸ - ۲۱)

تیسرا قول: مسند وہ ہے جس کی سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچے، لیکن اس کے لیے اتصال شرط نہیں ہے۔ اس قول کے مطابق متصل اور منقطع دونوں مسند ہو سکتے ہیں۔ اس کو علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ نے ذکر کیا ہے۔ دیکھئے: التمہید: ۱/ ۲۱، مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۱۵۔ (م)

[1] نخبۃ الفکر: ۵۹۔ (ط)

[2] صحیح بخاری، کتاب الوضوء: (۱/ ۴۷ ۲، رقم: ۱۷۲)۔ (ط)

مطلب دوم: حدیث متصل[۱] کا بیان

۱-حدیث متصل کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

متصل "اِتَّصَلَ" (باب افتعال) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور یہ "اِنْقَطَعَ" کی ضد ہے اور اس کا دوسرا نام موصول بھی ہے[۲]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

متصل وہ حدیث ہے جس کی سند متصل (تمام رواۃ مذکور ہو) ہو، خواہ موقوف ہو یا مرفوع ہو[۳]۔

۲-حدیث متصل کی مثال:

متصل مرفوع بھی ہو سکتی ہے اور موقوف بھی، اس لیے ذیل میں دونوں کی مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

(الف)۔ متصل مرفوع کی مثال یہ حدیث ہے:

"مالك عن ابن شهابٍ عن سالمِ بْنِ عَبدِاللهِ، عنْ أبيهِ، عن رَّسولِ اللهِ ﷺ أنّهُ قال: كذا ..."

(ب)۔ متصل موقوف کی مثال: یہ حدیث ہے:

"مالك عن نافعٍ عنِ ابْنِ عُمرَ، أنَّهُ قالَ: كذا ...".

---

(۱) مقدمة ابن الصلاح: ۱۱۵، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۱۵۶، التقريب: ۵۰، الاقتراح: ۱۹۵، المنهل الروي: ۴۰، الموقظة: ۴۲، اختصار علوم الحديث: ۴۵، المقنع في علوم الحديث: ۱/ ۱۱۲، نزهة النظر: ۸۳، فتح المغيث: ۱/ ۱۰۲، ألفية السيوطي: ۲۴، شرح السيوطي على ألفية العراقي: ۱۴۵، توضيح الأفكار: ۱/ ۲۶۰، ظفر الأماني: ۲۲۶۔ (م)

(۲) لسان العرب: ۱۵/ ۳۹۳، تاج العروس: ۳۱/ ۸۵، المعجم الوسيط: ۲/ ۱۰۳۷۔ (م)

(۳) التقريب مع التدريب، نوع المتصل: ۱/ ۱۸۳۔ (ط)

۳-کیا تابعی کے قول کو متصل کہا جاسکتا ہے؟

علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تابعین کے اقوال متصل الاسانید ہوں تو انہیں غیر مشروط طور پر متصل نہیں کہا جائے گا، البتہ بعض شرائط کیساتھ انہیں متصل کہنا درست ہوگا، محدثین کرام سے اس قسم کے الفاظ بھی منقول ہیں:

"هٰذَا مُتَّصِلٌ إِلٰى سَعِيْدِ بْنِ المسَيِّبِ أَوْ إلى الزُّهْرِيْ، أَوْ إِلٰى مَالِكٍ[1]" وغیرہ۔

"یہ حدیث سعید بن مسیبؒ یا زہریؒ یا مالکؒ تک متصل ہے"۔

بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ اس عدم اطلاق میں یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اقوال تابعین کو مقاطیع کہا جاتا ہے، اب ان پر متصل کا اطلاق اس طرح ہوگا جس طرح ایک شئ کو دو متضاد اوصاف کیساتھ موسوم کیا جائے[2]۔*

---

[1] فتح المغیث:(۱/۱۷)۔(م)

[2] فتح المغیث:(۱/۱۷)۔(م)

* اس لیے جمہور کے نزدیک مقطوع روایات کو مطلقاً موصول نہیں کہا جائے گا، امام نوویؒ اور ابن جماعۃؒ کی تعریف سے بعض لوگوں نے یہ استنباط کیا ہے کہ مقطوع پر بھی موصول کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ التقریب:(۵۰)، المنهل الروي في مختصر علوم الحديث النبوي: ۴۰.(م)

مطلب سوم: زیادات ثقات کا بیان[(۱)]

۱-زیادات ثقات کا مفہوم:

"زیادات" یہ "زِیَادَۃ" کی جمع ہے اور "ثِقَات" یہ "ثِقَّۃ" کی جمع ہے، ثقہ سے مراد وہ راوی ہے جو عادل اور ضابط ہو اور زیادات ثقہ سے مراد ثقہ راویوں کی روایت کردہ کسی حدیث کے اندر وہ زائد الفاظ ہیں، جن کا ذکر اس حدیث کے دوسرے ثقہ راویوں کی روایتوں میں موجود ہو[(۲)]۔

۲-اس فن کے معروف شہسوار:

بعض اہل علم نے اس فن کی ترویج میں غیر معمولی کردار ادا کیا اور انہوں نے بعض ثقہ رواۃ کی بعض روایت کردہ احادیث میں اس قسم کے زیادات اور اضافوں کی نشاندہی کی، اور اس سلسلہ میں گراں قدر خدمات سر انجام دیئے۔ ان کی تلاش وتتبع اور جمع وترتیب میں اہم کردار ادا کیا، تاہم درج ذیل محدثین کرام نے اس میدان میں بہت شہرت حاصل کی۔

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۱۳۰، مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۷٦، الکفایۃ: ۵۹۷، إرشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۲۲۵ - ۲۳۱، التقریب: ۱۷ - ۲۷، المنهل الروي: ۵۸، اختصار علوم الحدیث: ٦۱، شرح التبصرۃ والتذکرۃ ۱/ ۳۴٦، نزهۃ النظر: ۹۵، فتح المغیث ۱/ ۱۹۹، ألفیۃ السیوطي: ۵۳ - ۵۴، شرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي ۱۸۷، فتح الباقي ۱/ ۲۱۱، توضیح الأفکار ۲/ ۱٦، قواعد التحدیث: ۱۰۷. (م)

(۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح یا حسن حدیث میں اگر ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی حدیث پر اضافہ کرے تو یہ زیادت ثقہ کہلائے گی، حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) یوں تعریف بیان کرتے ہیں۔

"إذا تفرد الراوي بزيادة في الحديث عن بقية الرواة عن شيخ لهم، وهذا الذي يعبر عنه بزيادة الثقة." (اختصار علوم الحدیث: ٦۱)

"جب راوی اپنے شیخ سے باقی راویوں کے مقابلے میں حدیث میں اضافہ کرنے کی وجہ سے متفرد ہو تو زیادات ثقہ سے تعبیر کیا جائے گا۔" (م)

۱۔ ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن زیاد نیسابوریؒ[(۱)].

۲۔ ابو نُعیم جرجانیؒ[(۲)].

۳۔ ابو الولید حسان بن محمد القرشیؒ[(۳)][(۴)].

۳۔ زیادت ثقات کے مظان ومواقع:

یہ زیادتی متن اور سند دونوں میں واقع ہوتی ہے۔

---

(۱) ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن زیاد نیشاپوری، اپنے دور کے عظیم محدث، فقیہ اور حافظ حدیث تھے، حصول علم کے سلسلے میں نیشاپور، عراق، مصر، شام اور حجاز مقدس کے دور دراز علمی اسفار کیے، امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں کہ میں ابو بکر نیشاپوریؒ سے بڑا احفظ اور اوثق نہیں دیکھا۔ ۳۲۴ھ کو وفات پائی۔

(تاریخ بغداد:۱۰/ ۱۲۰، سیر اعلام النبلاء:۱۵/ ۶۵، طبقات الشافعیہ:۳/ ۱۰)(م)

(۲) ابو نُعیم بن عدی عبد الملک بن محمد جرجانی استر آباذی، اپنے دور کے نابغہ روز گار محدث، فقیہ اور عالم تھے، ۲۴۲ھ کو پیدا ہوئے، حافظ ابو علیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے خراسان میں امام ابن خزیمہ کے بعد ابو نُعیم جیسے محدث وحافظ نہیں دیکھا، ۳۲۳ھ کو وفات پائی۔

(تاریخ جرجان:۲۳۵، تاریخ بغداد:۱۰/ ۴۲۸، سیر اعلام النبلاء:۱۴/ ۲۳۶)(م)

(۳) ابو ولید حسان بن محمد بن احمد بن ہارون نیشاپوری شافعی، اپنے دور کے عظیم محدث، مفتی، حافظ اور عالم تھے، اپنے زمانے کے نابغہ روز گار اہل علم سے کسب فیض کیا، متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔ ۳۴۹ھ کو وفات پائی۔

(سیر اعلام النبلاء:۱۵/ ۴۹۲، طبقات الشافعیۃ:۳/ ۲۲۶، البدایہ والنہایہ:۱۱/ ۲۳۶)(م)

(۴) مقدمۃ ابن الصلاح:۱۷۶۔(م)

حافظ ابن حجرؒ(م ۸۵۲ھ) نے مذکورہ حضرات کے علاوہ امام ابو بکر خزیمہؒ کا ذکر بھی کیا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) محدث جلیل ابن حبانؒ(م ۳۵۴ھ) کا قول نقل کرتے ہیں۔

"لم أر على أديم الأرض من كان يحسن صناعة الحديث ويحفظ الصحاح بألفاظها ويقوم بزيادة كل لفظة حتى كأن السنن بين عينيه إلا ابن خزيمة". (النکت علی کتاب ابن الصلاح:۱/ ۱۱۱)

"میں نے روئے زمین پر محمد بن اسحاق بن خزیمہ کے سوا کوئی شخص نہیں دیکھا جسے سنن میں مہارت حاصل ہو، وہ صحیح احادیث کو پورے الفاظ کیساتھ محفوظ رکھتا ہو اور خبر میں اضافہ شدہ لفظ پر اس کی نظر ہو حتی کہ ایسا معلوم ہو کہ پوری سنن اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔" (م)

(الف)۔ متن میں زیادتی کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ کوئی کلمہ یا جملہ بڑھا دیا جائے۔
(ب)۔ سند میں زیادتی کی صورت یہ ہو سکتی کہ موقوف کو مرفوع یا مرسل کو متصل بنایا جائے[1]۔

۴۔ متن میں زیادتی کا حکم:

متن میں زیادتی اور اضافے کے حکم کے متعلق محدثین کرام کے متعدد اقوال ہیں:
(الف)۔ بعض اہل علم نے ان زیادات کو مطلقاً قبول کیا ہے[2]۔
(ب)۔ بعض حضرات نے انہیں مطلقاً مسترد کیا ہے[1]۔
(ج)۔ بعض نے اس راوی حدیث کے زیادتی کو مسترد کیا ہے، جس نے اس حدیث کو پہلی مرتبہ زیادتی کے بغیر روایت کیا ہو اور پھر اسے زیادتی کیساتھ روایت کیا کرے اور اس کے علاوہ دیگر ان رواۃ کی زیادتی کو قبول کیا جائے گا، جنہوں نے پہلی مرتبہ بھی زیادتی کیساتھ روایت کیا ہو[2]۔
حافظ ابن صلاحؒ نے قبول اور عدم قبول کے اعتبار سے زیادتی کو تین قسموں میں تقسیم کیا

---

[1] مقدمۃ ابن الصلاح:۱۷۷، محاسن الاصطلاح:۱۸۶۔(م)

[2] حافظ ابن حجرؒ(م ۸۵۲ھ) کہتے ہیں کہ ابن حبانؒ(م ۳۵۴ھ) اور حاکم نیسابوریؒ(م ۴۰۵ھ) زیادۃ ثقہ کو مطلقاً قبول کرتے ہیں۔ دیکھئے: النکت علی کتاب ابن الصلاح:۲/۲۸۷۔
یہ نظریہ محل نظر ہے، کیونکہ یہ محدثین کرام کے مذہب پر کسی طرح منطبق نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ ان کے ہاں صحیح کی تعریف میں یہ شرط ہے کہ وہ شاذ نہ ہو اور ثقہ کا اوثق کی مخالفت کرنا شاذ کہلاتا ہے اگر ثقہ کی زیادتی کو مطلقا قبول کر لیا جائے تو صحیح کی تعریف میں عدم شذوذ کی شرط بے معنی ہو جاتی ہے، حافظ ابن حجرؒ(م ۸۵۲ھ) کہتے ہیں کہ ان حضرات کا نظریہ تعجب انگیز ہے جو صحیح وحسن کی تعریف میں عدم شذوذ کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور ثقہ کی زیادتی کو مطلقا قبول بھی کرتے ہیں۔ عبد الرحمن بن مہدیؒ، یحیی بن سعید القطانؒ، امام احمد بن حنبلؒ، یحیی بن معینؒ، علی بن مدینیؒ، امام بخاریؒ، ابوزرعہ رازیؒ، ابوحاتمؒ، امام نسائیؒ اور دار قطنی وغیرہ جیسے متقدمین محدثین سے منقول ہے کہ ثقہ راویوں کے اختلاف کی صورت زاید بیان کو مطلقا قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ ترجیح کا اصول اپنایا جائے گا۔ دیکھئے: نزہۃ النظر:۶۹۔(م)

[1] دیکھئے: الکفایۃ فی علم الروایۃ:۴۲۴۔(م)

[2] علوم الحدیث:۷۷، الکفایۃ:۴۲۴۔(ط)

ہے، حافظ ابن الصلاحؒ کی یہ تقسیم نہایت عمدہ اور جامع ہے، امام نوویؒ اور دیگر محدثین کرام نے بھی ان کی موافقت کی ہے[1]، وہ تقسیم یہ ہے:

(الف)۔ وہ زیادتی جو ثقہ یا اوثق راویوں کی روایت کے منافی نہ ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ یہ زیادتی مقبول ہے، اس لیے کہ اس زیادتی کی حیثیت اس حدیث کی مانند ہے جس کے ایک جملہ کی روایت میں ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ رواۃ سے متفرد ہو[2]۔

(ب)۔ وہ زیادتی جو ثقہ یا اوثق راویوں کی روایت کے منافی ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ زیادتی مردود اور ناقابل قبول ہے، جیسا کہ "شاذ" کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۱۷۷، المنہل الروی:۵۸، اختصار علوم الحدیث:۶۹، ارشاد طلاب الحقائق:۱/۲۲۶۔ (م)

(۲) حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) نے اس قسم زیادتی کے لیے "فھو مقبول" کا جملہ استعمال کیا ہے اور مزید یہ کہا ہے کہ خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) نے اس کی قبولیت پر اتفاق کا دعویٰ کیا ہے۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۲۲۷، الکفایۃ فی علم الروایۃ:۴۲۵۔

خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"وَالَّذِي نَخْتَارُهُ مِنْ هَذِهِ الْأَقْوَالِ أَنَّ الزِّيَادَةَ الْوَارِدَةَ مَقْبُولَةٌ عَلَى كُلِّ الْوُجُوهِ، وَمَعْمُولٌ بِهَا إِذَا كَانَ رَاوِيهَا عَدْلًا حَافِظًا وَمُتْقِنًا ضَابِطًا، وَالدَّلِيلُ عَلَى صِحَّةِ ذَلِكَ أُمُورٌ، أَحَدُهَا: اتِّفَاقُ جَمِيعِ أَهْلِ الْعِلْمِ عَلَى أَنَّهُ لَوِ انْفَرَدَ الثِّقَةُ بِنَقْلِ حَدِيثٍ لَمْ يَنْقُلْهُ غَيْرُهُ، لَوَجَبَ قَبُولُهُ، وَلَمْ يَكُنْ تَرْكُ الرُّوَاةِ لِنَقْلِهِ إِنْ كَانُوا عَرَفُوهُ وَذَهَابُهُمْ عَنِ الْعِلْمِ بِهِ مُعَارِضًا لَهُ، وَلَا قَادِحًا فِي عَدَالَةِ رَاوِيهِ، وَلَا مُبْطِلًا لَهُ، فَكَذَلِكَ سَبِيلُ الِانْفِرَادِ بِالزِّيَادَةِ." (الکفایۃ فی علم الروایۃ:۴۲۵، فتح المغیث:۱/۲۰۲)

"ان اقوال میں جس قول کو ہم نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ وارد اضافہ تمام وجوہ سے مقبول اور معمول بہا ہے، اگر راوی عادل، حافظ اور متقن ضابط ہو۔ اس کی صحت کی دلیل کی کئی وجوہ ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس بات پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ اگر ثقہ راوی نقل حدیث میں منفرد ہو جسے دوسروں نے نقل نہ کیا ہو تو اسے قبول کرنا واجب ہو گا اور راویوں نے اسے ترک نہ کیا ہو تا اگر انہیں اس کا علم ہوتا اور اس کے بارے میں علم نہ ہونا اس کے معارض ہو۔ اس راوی کی عدالت پر کوئی حرف نہ آیا ہو اور نہ اسے باطل کرنے والی کوئی چیز ہو، اضافہ میں متفرد ہونے کا یہ طریقہ ہے۔"

=

(ج)۔ وہ زیادتی جس میں ثقہ یا اوثق راویوں کی روایت کیساتھ بعض وجوہ کیساتھ منافات ہو۔ اور منافات دو باتوں میں منحصر ہے۔

۱- تقیید مطلق (مطلق کو مقید کرنا)   ۲- تخصیص العام (عام کو خاص کرنا)

حافظ ابن الصلاحؒ نے اس قسم کا حکم بیان کرنے سے سکوت اختیار کیا[۱]، تاہم امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

"والصَّحِيْحُ قُبُوْلُ هٰذَاالْأَخِيْرِ".[۲]

"صحیح بات یہ ہے کہ یہ آخری قسم بھی مقبول ہے"۔

۵- متن میں زیادتی اور اضافے کی مثالیں:

ذیل میں تینوں قسموں کی مثالیں بیان کی جاتی ہیں:

(الف)۔ زیادتی غیر منافی کی مثال:

اس کی مثال صحیح مسلم[۱] میں "ولوغ الکلب" (کتے کا برتن میں منہ ڈال دینا) والی حدیث ہے جو انہوں نے علی بن مسہر[۲] کے طریق سے روایت کی ہے، انہوں نے اعمش سے،

= حافظ ابن عبد البر اندلسیؒ (م ۴۶۳ھ) اور امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ) وغیرہ نے بھی اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر زیادتی حافظ اور متقن کی جانب سے ہو تو وہ قابل قبول ہو گی، ورنہ ناقابل التفات ہو گی۔ دیکھئے: النکت علی کتاب الصلاح: ۲/ ۶۹۰، شرح علل الترمذی: ۱/ ۴۱۸۔ (م

[۱] مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۲۷۔ (م)

[۲] دیکھئے: التقریب مع التدریب ج۱، ص۲۴۷. یہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا مذہب ہے اور احناف نے اس کو مسترد کیا ہے۔ (ط)

[۱] دیکھئے: صحیح مسلم بشرح النووي ج۳، ص۱۸۲. (ط)

[۲] علی بن مسہر قرشی ابو الحسن کوفی، اپنے دور کے یگانہ روز گار محدث اور حافظ تھے، ایک زمانہ موصل کے قاضی رہے، ابو زرعہؒ فرماتے ہیں کہ صدوق و ثقہ تھے، امام نسائیؒ کہتے ہیں کہ ثقہ ہے، ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں شمار کیا ہے۔ ۱۸۹ھ کو وفات پائی۔

(تہذیب الکمال: ۲۱/ ۱۳۵، تہذیب التہذیب: ۷/ ۳۸۳)(م)

انہوں نے ابو رزین [1] سے اور ابو صالح سے، ان دونوں نے سیدنا ابو ہریرۃ سے یہ حدیث روایت کی ہے، اس میں ایک کلمہ "فَلْيُرِقْهُ" (اسے انڈیل دے) کا اضافہ ہے، جب کہ اعمش کے باقی شاگردوں میں سے کسی نے اس زیادتی کا ذکر نہیں کیا، ان سب نے اس حدیث کو یوں ذکر کیا ہے:

"إِذَاوَلَغَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءِأَحَدِكُمْ، فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مِرَارٍ."

"اگر تمہارے کسی برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اسے سات مرتبہ دھوڈالو"۔

اب اس حدیث میں مذکور بالا کلمہ "فَلْيُرِقْهُ" کا اضافہ اس خبر کی مانند ہو گا جس میں علی بن مسہر جیساراوی متفرد ہو، لہذا اس زیادتی اور اضافے کو قبول کیا جائے گا۔

(ب)۔زیادتی منافی کی مثال:

اس کی مثال یہ حدیث ہے:

"يَوْمَ عَرَفَةَ وَيَوْمُ النَّحْرِ وَأَيَّامُ التَّشْرِيقِ عِيدُنَا أَهْلَ الْإِسْلَامِ وَهِيَ أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ".

"یوم عرفہ (نواں ذو الحجہ) یوم النحر (عید الاضحیٰ) اور ایام تشریق (گیارہ، بارہ، تیرہ ذو الحجہ) اہل اسلام کے ایام عید ہیں، اور کھانے پینے کے بھی دن ہیں۔

اب اس حدیث میں "یوم عرفہ" زیادتی ہے، اس ایک طریق کے علاوہ باقی کسی طریق میں یہ زیادتی اور اضافہ موجود نہیں، اس حدیث کو اضافے کیساتھ صرف موسیٰ بن علی بن رباح [1] سے اپنے والد سے اور انہوں نے سیدنا عقبہ بن عامر سے روایت کی ہے، امام ترمذیؒ اور ابو

---

[1] مسعود بن مالک ابورزین اسدی کوفی، کبائر صحابہ کرام (سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ وغیرہ) سے روایت کرتے ہیں، امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ مسعود کوفی ثقہ ہے، ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ۸۵ھ کو وفات پائی۔

(تہذیب الکمال: ۲۷/ ۴۷۷، تہذیب التہذیب: ۱۰/ ۱۱۸)(م)

[1] موسی بن علی بن رباح لخمی، ابو عبد الرحمن بصری۔ افریقیہ میں ۹۰ھ کو پیدا ہوئے، امام احمدؒ، امام ابن معینؒ اور عجلیؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہے، امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ صالح الحدیث ہے اور مصر کے ثقات میں سے ہیں، ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے، اسکندریہ میں ۱۶۳ھ کو وفات پائی۔

(تہذیب الکمال: ۲۹/ ۱۲۲، تہذیب التہذیب: ۱۰/ ۳۶۳)(م)

داوُدؒ دیگر حضرات نے اس حدیث کی تخریج کی ہے[۱]۔

(ج)۔ بعض وجوہ سے منافی زیادتی کی مثال:

اس کی مثال صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے، جو انہوں نے ابو مالک الاشجعی کے طریق سے روایت کی ہے، انہوں نے سیدنا حذیفہ[۲] سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"وَ جُعِلَتْ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا، وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُورًا."

"ہمارے لیے روئے زمین کو مسجد اور مٹی کو ذریعہ طہارت قرار دیا گیا ہے"۔

اب اس حدیث میں ابو مالک الاشجعی[۱] "تُرْبَتُهَا" کے الفاظ روایت کرنے میں متفرد ہے، اس کے علاوہ کسی اور راوی نے اس حدیث میں یہ زیادتی روایت نہیں کی ہے، بلکہ تمام رواۃ نے اس حدیث کو ان الفاظ کیساتھ روایت کیا ہے:

"وَجُعِلَتْ لَنَاالْأَرْضُ مَسْجِدًاوَطَهُورًا". [۲]

"ہمارے لیے روئے زمین کو مسجد اور طہارت قرار دیا گیا ہے"۔

٦-اسناد میں زیادتی کا حکم:

اسناد میں زیادتی دو بنیادی مسئلوں میں اکثر واقع ہوتی ہے، ایک وصل مع الارسال (یعنی

---

[۱] سنن أبي داود (۲/ ۳۲۰، رقم ۲۴۱۹)، سنن الترمذی (۳/ ۱۴۳، رقم ۷۷۳)، سنن النسائی (۵/ ۲۵۲، رقم ۳۰۰۴)، مسند أحمد (۴/ ۱۵۲ رقم ۱۷۴۱۷)، مستدرک (۱/ ۶۰۰، رقم ۱۵۸۶) وقال: صحیح علی شرط مسلم. (م)

[۲] سیدنا حذیفہ بن حِسل بن جابر عبسی، ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہ، یمان ان کے والد کا نام تھا، جلیل القدر صحابی ہیں، رسول اللہ ﷺ کے رازدار تھے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں مدائن (فارس) کا گورنر مقرر کیا تھا، دینور، ماہ سندان، ہمذان اور رای کو فتح کیا۔ ان سے کتب میں ۲۲۵ روایات مروی ہیں، مدائن میں ۳۶ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب: ۱/ ۳۳۴، اسد الغابہ: ۱/ ۷۰۶، الاعلام للزرکلی: ۲/ ۱۷۱) (م)

[۱] سعد بن طارق بن اشیم ابو مالک اشجعی کوفی، امام احمدؒ اور امام ابن معینؒ نے ان کی توثیق کی ہے، امام یحیی بن سعید قطانؒ ان کی روایات نہیں لیتے تھے، امام نسائیؒ کہتے ہیں کہ ان کی روایات لینے میں کوئی حرج نہیں، امام ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ ان کی توثیق میں مجھے کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔ (تہذیب الکمال: ۱۰/ ۲۶۹، تہذیب التہذیب: ۳/ ۴۷۲، میزان الاعتدال: ۲/ ۱۲۲) (م)

[۲] صحیح مسلم بشرح النووی: ج ۵ ص ۴۔ (ط)

ایک سند موصول ہو اور دوسری مرسل ہو) کا تعارض اور دوسرا رفع مع الوقف (یعنی ایک سند مرفوع ہو اور دوسری موقوف ہو) کا تعارض۔

اس کے علاوہ زیادتی اور اضافے کی جتنی صورتیں ہیں تو محدثین کرام نے انہیں الگ الگ مباحث میں بیان کیا ہے، جیسے "المزِیْدُ فِيْ مُتَّصلِ الْأَسَانِيْدِ" کی بحث ہے۔

اسناد میں زیادتی اور اضافے کے قبول ورد کے متعلق محدثین کے چار مختلف اقوال ہیں:

(الف)۔ پہلا قول: جمہور فقہاء کرام اور اصولیین فرماتے ہیں کہ جو راوی حدیث کو موصول یا مرفوع روایت کرے تو اس کی زیادتی کو قبول کیا جائے گا۔

(ب)۔ دوسرا قول: اکثر محدثین کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جو راوی مرسل یا موقوف روایت کرے تو اس کی زیادتی مقبول ہو گی۔

(ج)۔ تیسرا قول: بعض محدثین کرام کا مذہب ہے کہ زیادتی اور اضافے کو اگر راویوں کی اکثریت روایت کر رہی ہو تو اسے قبول کیا جائے گا۔

(د)۔ چوتھا قول: بعض علمائے حدیث فرماتے ہیں کہ جو راوی احفظ اور اضبط ہو تو اس کے زیادتی اور اضافے کو قبول کیا جائے گا[1]۔

۷-اسناد میں زیادتی کی مثال:

اس کی مثال یہ حدیث ہے:

"لَانِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ".[2]

"ولی کے اجازت کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا"۔

---

(۱) شرح التبصرة والتذکرة: ۱/۲۷۶، نصب الرایہ: ۱۳۰/۱۰۸۔(م)

(۲) سنن أبی داود (۲/۲۲۹، رقم ۲۰۸۵)، سنن الترمذی (۳/۴۰۷، رقم ۱۱۰۱)، سنن ابن ماجہ (۱/۶۰۵، رقم ۱۸۸۱)، مسند أحمد (۴/۳۹۴، رقم ۱۹۵۳۶)، صحیح ابن حبان (۹/۳۸۹، رقم ۴۰۷۷)، مستدرک حاکم (۲/۱۸۴، رقم ۲۷۱۰).(م)

اس حدیث کو یونس بن ابو اسحاق سبیعی (۱) اور ان کے بیٹے اسرائیل (۲) اور قیس بن ربیع (۳) تینوں نے ابو اسحاق (۱) سے سند متصل کیساتھ روایت کیا ہے، سفیان ثوریؒ اور شعبہ بن حجاجؒ دونوں نے اسے ابو اسحاق سے مرسل روایت کیا ہے (۲)۔

---

(۱) یونس بن ابی اسحاق عمرو بن عبد اللہ ہمدانی سبیعی کوفی: عبد الرحمن بن مہدیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے روایات لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ صدوق ہے، لیکن اس کی روایات قابل حجت نہیں۔ ابن خراش کہتے ہیں کہ اس کی روایات میں کمزوری پائی جاتی ہے۔ ابن حزم فرماتے ہیں کہ امام یحیی بن سعید قطانؒ اور امام احمدؒ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (میزان الاعتدال:۴/۴۸۳)(م)

(۲) اسرائیل بن یونس بن ابی اسحاق سبیعی کوفی: امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اسرائیل ثقہ، ثبت ہے، امام ابو حاتم فرماتے ہیں ابو اسحاق کے تلامذہ میں اسرائیل سب سے اتقن راوی ہیں۔ یعقوب ابن شیبہؒ کہتے ہیں کہ صالح الحدیث اور اس کے روایات میں کچھ کمزوری ہوتی ہے۔ علی بن مدینیؒ، ابن سعدؒ، اور ابن حزم ظاہریؒ فرماتے ہیں کہ اسرائیل ضعیف ہے، امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اسرائیل ثقہ راوی ہیں، امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے ان سے روایات اصالۃً لی ہیں، لہذا اس کی تضعیف نا قابل اعتناء ہے۔ عبد الرحمنؒ بن مہدی ان سے روایات لیتے تھے۔

(میزان الاعتدال:۱/۲۰۹)(م)

(۳) قیس بن ربیع اسدی کوفی: صدوق تھے، لیکن حافظہ کمزور تھا۔ امام شعبہؒ ان کی تعریف کرتے تھے۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ قابل اعتماد نہیں۔ امام یحیی فرماتے ہیں کہ قیس ضعیف ہے اور کبھی فرماتے ہیں اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ قیس شیعہ اور کثیر الخطاء تھے۔ امام وکیعؒ، علی بن مدینیؒ اور امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں کہ ضعیف ہے اور امام نسائی فرماتے ہیں کہ متروک ہے۔

(میزان الاعتدال:۳/۳۹۳)(م)

(۱) عمرو بن عبد اللہ، ابو اسحاق سبیعی: امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ ابو اسحاق ثقہ ہے، فضیل بن غزوان کہتے ہیں کہ ابو اسحاق ہر تین دن میں قرآن مجید ختم کرتے تھے، انتہائی نیکوکار اور متقی تھے۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ ابو اسحاق سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پیدا ہوئے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیارت کی۔ فسوی کہتے ہیں کہ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ یہ اختلاط کے شکار ہو گئے تھے۔

(میزان الاعتدال:۳/۲۷۰)(م)

(۲) اس روایت کے ارسال اور وصل میں اختلاف اور اس کی مثال کے لیے دیکھئے: الکفایۃ:۴۰۹۔ (ط)

مطلب پنجم: اعتبار، متابع اور شاہد کا بیان[1]

۱۔ ہر ایک کی تعریف:

(الف)۔ اعتبار کی تعریف:

۱۔ لغوی تعریف:

اعتبار "اعْتَبَرَ" (باب افتعال) کا مصدر ہے، اعتبار کا معنی ہے: کچھ امور پر ایسی دقت اور دقت اور باریک بینی سے غور و فکر کرنا کہ ان کے ذریعے اسی طرح کی دیگر چیزیں بھی پہچانی جا سکیں[2] جا سکیں[2]۔

۲۔ اصطلاحی تعریف:

جس حدیث کی روایت میں کوئی راوی متفرد ہو اس کے دوسرے طرق کے تتبع اور تلاش کرنے کا نام اعتبار ہے[1]، تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ آیا اس حدیث کی روایت کرنے میں

---

[1] مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۷۳، فتح المغیث: ۱/ ۱۹۴، التقریب والتیسیر: ۴۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۲۲۱، نزہۃ النظر: ۸۹، تدریب الراوی: ۱/ ۲۸۱۔ (م)

[2] تاج العروس: ۱۲/ ۵۱۱، المعجم الوسیط: ۲/ ۵۸۰۔ (م)

[1] اصطلاح میں اعتبار اس کو کہتے ہیں کہ کسی حدیث کی حیثیت جاننے کے لیے اس جیسی دوسری روایات میں غور و فکر کرنا کہ کسی اور نے اسے روایت کیا ہے یا نہیں، اگر کسی اور نے روایت کیا ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟ دونوں میں موافقت ہے یا مخالفت؟ پھر اگر موافقت ہے تو لفظی ہے یا معنوی؟ نیز دونوں کی روایت ایک ہی صحابی سے ہے یا الگ الگ صحابہ سے؟ اگر مخالفت ہے تو دونوں راویوں کے درمیان کیا نسبت ہے جس سے معلوم ہو کہ کسی ایک کو دوسری پر کیا ترجیح ہو سکتی ہے؟ حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

"واعْلم أَنَّ تَتَبُّعَ الطُرُقِ: مِن الجوامعِ، والمسانيدِ، والأَجْزَاءِ، لذلك الحديثِ الذي يُظَنُّ أَنَّه فَرْدٌ؛ ليُعْلَمَ: هل لهُ متابِعٌ أَم لا؟ هُو "الاعتبارُ"." (نزہۃ النظر: ۹۰)

"واضح رہے کہ جوامع، مسانید اور اجزاء میں اس غرض سے تتبع کرنا کہ حدیثِ فرد کے لیے کوئی متابع یا شاہد مل جائے اعتبار کہلاتا ہے۔"

حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) نے اس کے لیے "معرفۃ الاعتبار والمتابعات والشواہد" عبارت استعمال کی ہے، جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اعتبار، متابعات اور شواہد کی طرح کوئی اصطلاح ہے، حالانکہ در حقیقت ایسا نہیں۔ اعتبار تتبع ہی کا نام ہے جو متابع اور شواہد کو دریافت کرنے ذریعہ ہے، =

دوسرے راوی بھی اس کیساتھ شریک ہیں یا نہیں۔[1]

(ب)۔ متابع (تابع) کی تعریف:

ا۔لغوی تعریف:

متابع "تَابَعَ" (باب مفاعلہ) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، جس کے معانی ہیں: پیروی اور موافقت کرنا[1]۔

= حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) نے "النکت" میں حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳) کی اس عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"هذه العبارة توهم أن الاعتبار قسيم للمتابعة والشاهد وليس كذلك، بل الاعتبار هو الهيئة الحاصلة في الكشف عن المتابعة والشاهد، فكان حق العبارة أن يقول: معرفة الاعتبار للمتابعة والشاهد".(النکت علی کتاب ابن الصلاح:۲/۶۸۱)

"اس عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اعتبار، متابعت اور شاہد کی طرح ایک قسم ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ متابعت اور شاہد کو تلاش کرنے کی جو حاصل صورت ہے وہ اعتبار ہے، اس بناء پر حق یہ تھا کہ اس طرح عبارت ووتی: متابعت اور شاہد کو حاصل کرنے کے لیے اعتبار کی معرفت۔"

اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) نے اپنے شیخ ابوالفضل زین الدین عراقیؒ (م۸۰۶ھ) کا یہ شعر اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔

الاعْتِبَارُ سَبْرُكَ الحَدِيْثَ هَلْ شَارَكَ رَاوٍ غَيْرُهُ فيْمَا حَمَلْ

(النکت علی کتاب ابن الصلاح:۲/۶۸۱)

ترجمہ: "کسی حدیث کے حیثیت جاننے کے لیے اس جیسی دوسری روایت میں غور و فکر کرنا کہ کسی دوسرے نے اسے روایت کیا ہے یا نہیں؟ اعتبار کہلاتا ہے۔" (م)

[1] اعتبار کے درج ذیل مقاصد ہیں:

ا۔ راوی اگر ثقہ ہے تو اس پر تفرد کا الزام دور کیا جا سکے۔

۲۔ اگر ایک راوی ضعیف ہے تو اس عمل سے حدیث کو تقویت مل سکے۔

۳۔ اسے دیگر احادیث پر ترجیح دی جا سکے۔

۴۔ جوامع، معاجم اور مسانید جیسی کتب میں اسی حدیث کی مزید اسانید وغیرہ تلاش کی جا سکیں۔(م)

[1] المعجم الوسیط:۱/۸۱۔(م)

۲۔ اصطلاحی تعریف:

متابع وہ حدیث ہے، جس کے رواۃ دوسری حدیث فرد کے رواۃ کیساتھ لفظ و معنی دونوں معنی دونوں میں شریک ہوں اور سب نے ایک ہی صحابی سے روایت کی ہو[۱]۔ *

(ج)۔ شاہد کی تعریف:

ا۔ لغوی تعریف:

شاہد "شهادة" مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جس کے معانی ہیں: گواہی دینا، اور حدیث شاہد کو شاہد اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اس بات کی شہادت اور گواہی دیتا ہے کہ اس حدیث فرد کی اصل ہے، اور حدیث شاہد حدیث فرد کو اس طرح تقویت دیتا ہے کہ جس طرح مدعی کے دعویٰ اور موقف کو شاہد (گواہ) تقویت دیتا ہے[۲]۔

۲۔ اصطلاحی تعریف:

شاہد وہ حدیث ہے جس کے رواۃ دوسری حدیث فرد کے رواۃ کیساتھ لفظ و معنی دونوں معنی دونوں میں یا صرف معنی میں شریک ہوں اور سب نے الگ الگ صحابہ کرام سے روایت کی ہوں[۱]۔ *

---

[۱] قفو الاثر: ۶۴، المختصر فی علم الاثر للکافیجی: ۱۴۴، مقدمۃ فی اصول الحدیث: ۵۶، قواعد التحدیث: ۱۲۸۔ (م)

* اصطلاحی مفہوم میں اگر ایک حدیث کو ایک شخص روایت کر رہا ہو اور تلاش کرنے کے بعد کوئی اور راوی بھی مل جائے جو اسی حدیث کو روایت کر رہا ہو تو اس دوسرے راوی کی حدیث کو 'متابع' کہا جاتا ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ حدیث کو روایت کرنے والے "صحابی" کے نام پر ان دونوں راویوں کی بیان کردہ حدیث کے سلسلہ سند میں اتفاق پایا جاتا ہو۔ (م)

[۲] المعجم الوسیط: ۱/۴۹۷۔ (م)

[۱] اصطلاحی مفہوم میں اگر کوئی ایک راوی کسی صحابی سے کوئی حدیث روایت کر رہا ہو اور دوسرا راوی انہی الفاظ یا مفہوم میں وہی حدیث کسی اور صحابی سے روایت کر رہا ہو تو اس دوسری حدیث کو شاہد کہا جاتا ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ دونوں سلسلہ ہائے سند کے صحابی مختلف ہونے چاہییں۔ اس حدیث کو شاہد کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دوسری حدیث بالکل اسی طرح مضبوط ہو جاتی ہے جیسے گواہ کے گواہی دینے کے نتیجے میں مدعی کا دعوی مضبوط ہو جایا کرتا ہے۔ دیکھئے: نزہۃ النظر: ۵۵، المنہل الروی: ۵۹۔ (م)

* شاہد کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ:

ا۔ صحابہ کرام کے بارے میں یہ علم ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی معنی کی حدیث کو تواتر کے ساتھ روایت کرتے =

۲۔ کیا اعتبار شاہد اور متابع کا قسیم ہے؟

بعض اوقات ایک شخص کو یہ وہم پیدا ہو جاتا ہے کہ اعتبار، متابع اور شاہد دونوں کا قسیم و مقابل ہے، تاہم یہ بات درست نہیں، بلکہ اعتبار تو دراصل متابع در حقیقت متابع اور شاہد کی تلاش اور جستجو کا ایک طریقہ ہے۔

۳۔ تابع اور شاہد کی ایک غیر معروف تعریف:

تابع اور شاہد کی مذکورہ بالا تعریف اکثر محدثین کرام کی بیان کردہ ہے اور یہی مشہور و معروف بھی ہے، تاہم ان دونوں کی ایک اور تعریف بھی کی گئی ہے، ملاحظہ ہو۔

(الف)۔ تابع کی تعریف:

وہ حدیث ہے، جس میں حدیث فرد کے رواۃ کیساتھ صرف لفظوں میں موافقت ہو، خواہ دونوں روایتیں ایک صحابی سے مروی ہوں یا مختلف صحابہ کرام سے مروی ہوں[1]۔

(ب)۔ شاہد کی تعریف:

وہ حدیث ہے، جس میں حدیث فرد کے رواۃ کیساتھ صرف معنی میں موافقت ہو، خواہ دونوں روایتیں ایک صحابی سے مروی ہوں یا مختلف صحابہ کرام سے مروی ہوں[1]۔

= رہے ہیں۔

۲۔ کبھی متن میں موجود اضافہ کو ثابت کرنا ہوتا ہے۔

۳۔ کبھی حدیث کو تقویت مل جاتی ہے جب اس میں معمولی ضعف کا احتمال ہو۔ ضعف شدید کی صورت میں تو ایسی حدیث سے استشہاد نہیں لیا جا سکتا۔ مثلاً راوی متہم و متروک ہو۔

۴۔ کبھی متن میں ابہام کو دور کرنے اور اس کی وضاحت کے لئے شاہد کی ضرورت پڑتی ہے۔

۵۔ کبھی زمان و مکان کی وضاحت کے لئے بھی ضرورت پڑتی ہے۔(م)

[1] تابع اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس میں کسی ایک شخص کی بیان کردہ حدیث کو لفظ بلفظ دوسرا شخص بھی روایت کر رہا ہو۔ دونوں احادیث کا صحابی خواہ ایک ہی ہو یا مختلف ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔(م)

[1] شاہد اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس میں کسی ایک شخص کی بیان کردہ حدیث کے مفہوم کو دوسرا شخص بھی روایت کر رہا ہو۔ دونوں احادیث کا صحابی خواہ ایک ہی ہو یا مختلف ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیکھئے: نزہۃ النظر: ۹۰۔(م)

یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ کبھی ان میں سے ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوتا ہے کبھی شاہد کو تابع کہہ دیتے ہیں اور کبھی تابع کو شاہد کہہ دیتے ہیں، تاہم حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ان دونوں کا اصل مدعیٰ اور ہدف ایک ہی ہے کہ ان سے حدیث غریب کو تقویت و تائید حاصل ہوتی ہے[۱]۔

۴۔ متابعت[۲]:

(الف)۔ متابعت کی تعریف:

ا۔ لغوی تعریف:

متابعت "تَابَعَ" (باب مفاعلہ) کا مصدر ہے، جو "وَافَقَ" کے معنی میں ہے تو اس صورت

---

[۱] شرح نخبۃ الفکر: ۳۸۔ (ط)

[۲] متابعت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی راوی کی حدیث کی مزید تحقیق ہو جائے۔ مثلاً: حماد بن سلمۃ ایک حدیث کو "عَنْ أَيُّوبَ، عَنِ ابْنِ سِيرِينَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ" روایت کرتے ہیں۔ محدثین اس حدیث کی تحقیق مزید کے لئے یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کسی اور ثقہ نے یہی حدیث ایوب سے روایت کی ہے؟ اگر ایسی روایت مل جائے تو وہ اسے متابعت تامہ کہہ دیتے ہیں۔ اور اگر نہ ملے تو پھر یہ تلاش کرتے ہیں کہ ایوب کے سوا کسی اور ثقہ نے یہی حدیث ابن سیرین سے روایت کی ہے اگر وہ مل جائے تو اسے متابعت قاصرہ کہہ دیتے ہیں اور اگر یہ بھی نہ ملے تو پھر اس تلاش میں لگ جاتے ہیں کہ ابن سیرین کے سوا کسی اور ثقہ نے یہی حدیث ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔ اگر وہ مل جائے تو بھی اسے متابعت قاصرہ کا نام دیتے ہیں اور اگر نہ ملے تو پھر کوشش کرتے ہیں کہ کوئی ایسی حدیث مل جائے جیسے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور صحابی نے آپ ﷺ سے یہی حدیث روایت کی ہو۔ اگر ایسی روایت مل جائے تو یہ بھی متابعت قاصرہ کہلاتی ہے ورنہ ایسی حدیث فرد یا غریب ہوگی۔ جیسے یہ حدیث: «أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَا»۔

اسے امام ترمذیؒ نے بہ سند سابق حماد بن سلمۃ روایت کرکے کہا ہے: " غَرِيبٌ لَا نَعْرِفُهُ بِهَذَا الْإِسْنَادِ إِلَّا مِنْ هَذَا الْوَجْهِ. "۔ یہ حدیث غریب ہے جسے ہم سوائے اسی اسناد کے کہیں اور نہیں جانتے۔

علامہ عبدالرحمن سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

" أَيْ مِنْ وَجْهٍ يَثْبُتُ، وَإِلَّا فَقَدْ رَوَاهُ الْحَسَنُ بْنُ دِينَارٍ، عَنِ ابْنِ سِيرِينَ، وَالْحَسَنُ مَتْرُوكُ الْحَدِيثِ، لَا يَصْلُحُ لِلْمُتَابَعَاتِ."

یعنی ایسی سند سے جو ثابت ہے۔ ورنہ اس حدیث کو حسن بن دینار نے ابن سیرین سے روایت کیا ہے۔ یہی حسن متروک ہے جو متابعات کے لائق نہیں۔ دیکھئے: تدریب الراوی: ۱/ ۲۸۲-۲۸۳۔ (م)

میں متابعت کا معنی موافقت کا ہونا ہے[۱]۔

۲۔اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں متابعت کسی راوی کا روایت حدیث میں کسی دوسرے راوی کیساتھ شریک ہونے کا نام ہے[۲]۔

(ب)۔ متابعت کی اقسام وانواع:

متابعت کی دو قسمیں ہیں:

۱-متابعت تامہ ۲-متابعت قاصرہ

۱۔متابعت تامہ کی تعریف:

وہ متابعت ہے جس میں راوی ابتداء سند سے دوسرے راوی کیساتھ روایت حدیث میں شریک رہے[۳]۔

۲۔متابعت قاصرہ کی تعریف:

وہ متابعت ہے جس میں راوی سند کے درمیان میں دوسرے راوی کیساتھ روایت حدیث میں شریک ہو جائے[۱]۔

۵۔مذکورہ اقسام کی مثالیں:

میں ایک ایسی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جو حافظ ابن حجرؒ نے متابعت تامہ،متابعت ناقصہ اور شاہد سب کے لیے پیش کی ہے[۲]،وہ یہ حدیث ہے، جس کو امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الأم"میں امام مالکؒ سے روایت کی ہے انہوں نے عبد اللہ بن دینار سے اور انہوں نے عبد اللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

[۱] المعجم الوسیط:۱/۸۱۔(م)

[۲] نزہۃ النظر:۸۷، النکت علی کتاب ابن الصلاح:۲/۶۸۲۔(م)

[۳] نزہۃ النظر:۸۷۔(م)

[۱] نزہۃ النظر:۸۷۔(م)

[۲] شرح النخبۃ:۳۸۔(ط)

«الشَّهْرُ تِسْعٌ وَعِشْرُونَ، فَلَا تَصُومُوا حَتَّى تَرَوُا الْهِلَالَ، وَلَا تُفْطِرُوا حَتَّى تَرَوْهُ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ»[1].

''مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے، چاند دیکھے بغیر روزہ نہ رکھو اور نہ افطار کرو، اگر بادل چھایا ہوا ہو تو تیس دن کی گنتی پوری کرلو''۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ان الفاظ کیساتھ اس حدیث کو امام مالکؒ سے روایت کرنے میں امام شافعیؒ متفرد ہیں، اس لیے انہوں نے اس حدیث کو امام شافعیؒ کی روایت کردہ غریب احادیث میں شمار کیا ہے، کیونکہ امام مالکؒ کے دوسرے تلامذہ سے اس سند سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

«فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ».[2]

''اگر بادل چھایا جائے تو اندازہ کرلو''۔

لیکن تتبع اور تلاش کے بعد ہمیں امام شافعیؒ کی روایت کا متابعت تامہ، متابعت ناقصہ اور شاہد بھی مل گیا، ملاحظہ ہوں۔

(الف)۔ متابعت تامہ:

اس کی مثال وہ حدیث ہے جو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں عبد اللہ بن مسلمہ قعنبی[1] کے طریق سے امام مالکؒ سے بعینہ اسی سند کیساتھ روایت کی ہے، جس کے الفاظ یہی ہیں:

---

[1] الام للشافعی: ۱/۱۰۳۔ (ط)

[2] صحیح بخاری (۲/۶۷۲، رقم ۱۸۰۱)، و مسلم (۲/۷۶۰، رقم ۱۰۸۰)، سنن النسائی (۴/۱۳۴، رقم ۲۱۲۰)، سنن ابن ماجہ (۱/۵۲۹، رقم ۱۶۵۴)، صحیح ابن حبان (۸/۲۲۶، رقم ۳۴۴۱) .(م)

[1] عبد اللہ بن مسلمہ بن قعنب قعنبی حارثی، ابو عبد الرحمن مدنی: امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور موسی بن حزامؒ جیسے اساطین علم کے شیخ ہیں، امام بخاریؒ نے ان سے ۱۲۳ احادیث نقل کی ہیں اور امام مسلمؒ نے ۷۰ احادیث ان سے روایت کی ہیں۔ امام ابو حاتمؒ اور دیگر محدثین نے ان کو ثقہ اور حجت کہا ہے۔ مکہ معظمہ میں ۲۲۰ھ یا ۲۲۱ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب: ۶/۳۱، تقریب التہذیب: ۳۶۲۰)(م)

فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ»[1].

(ب)۔ متابعت قاصرہ:

اس کی مثال وہ حدیث ہے جو امام ابن خزیمہ نے عاصم بن محمد[2] کے طریق سے روایت کی ہے جنہوں نے اپنے والد محمد بن زید[3] سے، انہوں نے اپنے دادا سیدنا عبد اللہ بن عمر سے بایں الفاظ روایت کی ہے:

«فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ»[1].

(ج)۔ شاہد:

اس کی مثال وہ حدیث ہے جو امام نسائی نے محمد بن حنین[2] کے طریق سے روایت کی ہے ، انہوں نے عبد اللہ بن عباس سے روایت کی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ»[3].

---

(۱) صحیح بخاری: (۲/ ۶۷۴، رقم ۱۸۰۸)، و مسلم (۲/ ۷۶۰، رقم ۱۰۸۰). (م)

(۲) عاصم بن محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب عمری مدنی: ان سے ابو اسحاق فزاری، سفیان بن عیینہ، یزید بن ہارون، یعقوب بن ابراہیم وغیرہ اساطین علم روایت کرتے ہیں، امام احمدؒ، امام ابن معینؒ اور امام ابو داؤدؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہے۔ امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ عاصم محمد ثقہ ہے اس کی روایات لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ امام ابو زرعہؒ کہتے ہیں کہ صدوق فی الحدیث ہے اور امام بزارؒ فرماتے ہیں کہ صالح الحدیث ہے۔ (تہذیب الکمال: ۱۳/ ۵۴۲، تہذیب التہذیب: ۵/ ۵۷) (م)

(۳) محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب قرشی عدوی مدنی: عبادلہ اربعہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں، امام ابو حاتمؒ اور امام ابو زرعہؒ کہتے ہیں کہ ثقہ ہے، ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (تہذیب الکمال: ۲۵/ ۲۲۶، تہذیب التہذیب: ۹/ ۱۷۲) (م)

(۱) صحیح ابن خزیمہ: (۳/ ۲۰۲، رقم ۱۹۰۷). (م)

(۲) محمد بن حنین: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عمرو بن دینار سے روایت کرتے ہیں، امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں یہ عبید بن حنین کا بھائی ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں کہ میری معلومات کے مطابق ان سے عمرو بن دینار کے علاوہ اور کسی نے روایت نہیں کی ہے۔ (تہذیب الکمال: ۲۵/ ۱۲۰، تہذیب التہذیب: ۹/ ۱۳۶، میزان الاعتدال: ۳/ ۵۳۲) (م)

(۳) سنن النسائی (۴/ ۱۳۴، رقم ۲۱۲۰)۔ (م)

اب یہ حدیث اس روایت کے مطابق ہے جو عبد اللہ بن دینار نے سیدنا عبد اللہ بن عمر سے روایت کی ہے[1]۔*

---

[1] دیکھئے: النکت علی کتاب ابن الصلاح:۱/۱۸۸، فتح الباقی:۱/۲۴۹، فتح المغیث:۱/۲۵۹، المختصر فی علم الاثر:۱۴۳، تدریب الراوی:۱/۲۸۴، توضیح الافکار:۲/۱۲، توجیہ النظر:۱/۴۹۳۔(م)

* آخر میں چند قواعد ذہن نشیں رکھیں:

قاعدہ نمبر ۱: متابعت اور شاہد میں یہ شرط نہیں کہ اس کا راوی ثقہ ہو بلکہ ثقہ سے کم تر بھی ہو سکتا ہے۔

دیکھئے: توجیہ النظر للجزائری:۱/۴۹۴۔

قاعدہ نمبر ۲: کبار ائمہ محدثین کو متابع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زعفرانی کہتے ہیں: میں نے امام احمدؒ بن حنبل سے عرض کی: اس حدیث میں عفان کی کس نے متابعت کی؟ مجھے فرمانے لگے: کیا عفان کو کسی متابع کی ضرورت ہے؟

(سیر اعلام النبلاء ۱۰/۲۴۷)

قاعدہ نمبر ۳: اگر ایک راوی ثقات کی متابعت کرتا ہے تو یہ اس کی تقویت کا باعث ہے۔ عفانؒ کہتے ہیں: یحییٰؒ بن سعید، ہمام کی بیشتر احادیث پر اعتراض کیا کرتے۔ جب معاذؒ بن ہشام تشریف لائے اور ہم نے ان کتب کو بغور دیکھا تو وہ بہت سی احادیث میں ہمام کی روایات کے موافقت کر رہے ہیں۔ اس کے بعد یحییٰ بھی اعتراض سے رک گئے۔

(سیر اعلام النبلاء:۷/۲۹۸)۔

قاعدہ نمبر ۴: متابعت اور استشہاد میں ان ضعیف رواۃ کی روایت بھی لی جا سکتی ہے جو انفرادی طور پر نا قابل حجت اور با قابل استدلال ہوں، صحیحین میں کئی ضعفاء کی روایات تابع اور شاہد کے طور پر نقل کی گئی ہیں، ان ضعفاء میں بعض راوی قابل استشہاد اور بعض نا قابل استشہاد ہوتے ہیں، ایسے راویوں کے متعلق امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں کہ فلاں کی روایت بطور اعتبار لی جا سکتی ہے اور فلاں کی نہیں۔

(النکت علی کتاب ابن الصلاح:۲/۲۲۳)۔(م)

باب دوم

مقبول رواۃ کے صفات اور ان کے متعلق جرح وتعدیل کا بیان

یہ باب تین فصلوں پر مشتمل ہے:

فصل اول: راوی اور اس کے قبولیت کے شرائط۔

فصل دوم: کتب جرح وتعدیل پر ایک طائرانہ نظر۔

فصل سوم: جرح وتعدیل کے مراتب

فصل اول: راوی اور اس کی قبولیت کے شرائط

ا۔ تمہیدی مقدمہ:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ ہم تک راویان حدیث کے واسطے اور ذریعے سے پہنچی ہیں، اس لیے یہ حدیث کی صحت اور عدم صحت کی معرفت کے سلسلے میں اساس اور خشتِ اول کا کردار کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ علمائے حدیث نے راویان حدیث پر اپنی توجہ پوری طرح مرکوز رکھی اور ان کی روایات قبول کرنے کے لیے انتہائی دقیق اور ایسی ٹھوس شرائط مقرر کیں، جو ان حضرات کی بالغ نظری، سلامت فکری اور وسعت نظری پر دلالت کرتی ہیں۔

محدثین کرام نے راوی کے لیے جو شرائط مقرر کیے ہیں اور احادیث واخبار کی مقبولیت کے لیے جو شروط وقیود لگائے ہیں، یقیناً یہ ان حضرات کا ایسا کارنامہ ہے کہ اقوام عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے[1]، اگرچہ دور حاضر سائنٹفک طریق کار اور دقیقہ سازی میں ممتاز ہے، لیکن اس میں بھی خبروں کو منتقل کرنے والے افراد اور خبر رساں اداروں کے لیے وہ شرطیں

---

(۱) پوری علمی دُنیا کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلمانوں نے اپنے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ بلکہ ہر اس چیز اور ہر اس شخص کے حالات کی جس کا ادنی سا تعلق بھی آپ ﷺ کی ذات مبارک سے تھا جس طرح حفاظت کی وہ انسانی تاریخ ایک عجوبہ ہے۔ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے اقوال، وافعال اور احوال کو روایت کیا انہیں رواۃ حدیث یا روایانِ حدیث کہا جاتا ہے جن میں صحابہ کرام، تابعین وتبع تابعینؒ اور بعد کے چوتھی صدی ہجری تک کے روایانِ احادیث وآثار داخل ہیں، ان کے مجموعہ احوال کا نام ''فن اسماء الرجال'' ہے، جب حدیث وسنت کے سرمایہ کی تدوین ہو چکی تو ان رواۃ حدیث کے حالات بھی قلم بند کیے گئے، ہر راوی کا نام اس کی کنیت، اس کا لقب، کہاں کے رہنے والے تھے؟ ان کے آباء واجداد کون تھے؟ کس مزاج وطبیعت کے تھے؟ حافظ کیسا تھا؟ تقوی اور دیانت کے لحاظ سے کیا درجہ اور کیا معیار تھا؟ کن اساتذہ اور شیوخ سے علم حاصل کیا تھا؟ غرض ان ہزارہا ہزار راویانِ حدیث کے بارے میں تحقیق وتفتیش کا اتنا زبردست ریکارڈ جمع کیا گیا ہے کہ دنیائے قدیم وجدید کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔ مستشرق ڈاکٹر اسپنگرنے (جس کی اسلام دشمنی مشہور ہے) ''الاصابۃ فی تمیز الصحابہ'' کے انگریزی مقدمہ میں لکھا ہے:

=

تو کیا جو محدثین کرام نے راوی کے لیے لگائی تھیں، بلکہ ان سے کم بھی نہیں لگائی گئیں۔

اکثر سرکاری خبر رساں ایجنسیاں روزانہ ایسی بے شمار خبریں دنیا کے گوشے گوشے مین پھیلاتی ہیں، جن پر سننے والوں کو نہ تو اعتماد ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ان کی صداقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان اخبار کے ناقلین اور ذرائع مجہول ہوتے ہیں اور کسی خبر کے لیے اس سے بڑھ کر آفت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے راوی مجہول ہوں، مقولہ ہے:

"وَمَا آفَةُ الْأَخْبَارِ إِلَّا رُوَاتُهَا". (۱)

خبر کی آفت اس کے راوی ہی تو ہوتے ہیں۔

اور ایسا اکثر ہوا ہے کہ لوگ ایک غلط افواہ اڑا لیتے ہیں لیکن جلد ہی ان کے جھوٹ کا بول کھل جاتا ہے۔

۲۔ راوی کے مقبول ہونے کی شرائط:

جمہور محدثین کرام اور فقہائے عظام کا اس بات پر اجماع ہے کہ راوی کے مقبول ہونے کے لیے بنیادی طور پر درج ذیل دو شرطیں ہیں:

(الف)۔ عدالت:

محدثین کرام کا عدالت سے مراد راوی کا عاقل، بالغ، مسلمان، فسق و فجور سے خالی اور خلاف مروت سے کنارہ کشی ہونا ہے (۱)۔

(ب)۔ ضبط:

= "کوئی قوم نہ دنیا ایسی گزری، نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصیتوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"

صرف طبقہ اولی میں روایانِ حدیث یعنی صحابہ کرام کی تعداد رسول اللہ ﷺ کے آخری دور حیات میں ایک لاکھ سے زائد تھی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: فن اسماء الرجال، از تقی الدین ندوی: ۱۴-۱۵۔ (م)

(۱) یہ محمد بن حسین شریف رضی (م۴۰۶) کے شعر کا ایک مصرعہ ہے، پورا شعر یہ ہے:

وهمْ نَقَلوا عنّي الذي لم أَفُهْ به وما آفَةُ الأَخبارِ إِلا رُواتُها

(۱) دیکھئے: معرفۃ علوم الحدیث: ۵۳، الکفایۃ: ۸۲، نزہۃ النظر: ۶۹، تدریب الراوی: ۱/ ۶۲۔ (م)

محدثین کرام کا ضبط سے مراد یہ ہے کہ راوی دوسرے ثقہ رواۃ کے مخالف نہ ہو، حافظہ کمزور اور خراب نہ ہو، فاش غلطیوں سے محفوظ ومامون ہو، نیز بے خبر سادہ لوح اور واہی بھی نہ ہو[۱]۔

۳۔ عدالت کس طرح ثابت ہو گی؟

عدالت درج ذیل دو باتوں میں سے کسی ایک کے ذریعے ثابت ہوتی ہے۔

(الف)۔ اکثر علماء تعدیل یا بعض کھلے الفاظ میں اس راوی کی عدالت بیان کر دے۔

(ب)۔ یا اس راوی کے عادل ہونے کی اتنی زیادہ شہرت ہو کہ اکثر اہل علم اسے عادل راوی کے حیثیت سے جانتے ہوں اس کے بعد اس کی عدالت کے ثبوت کے لیے کسی تعدیل کنندہ کی تصریح کی چنداں ضرورت نہیں رہتی جیسے ائمہ اربعہؒ (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ اور امام اوزاعیؒ[۱] ایسے حضرات ہیں جنہیں کسی تعدیل کی ضرورت نہیں[۲]۔

۴۔ ثبوت عدالت کے سلسلہ میں حافظ ابن عبد البرؒ[۳] کا مذہب:

---

[۱] دیکھئے: فتح المغیث:۱/۱۴، نزہۃ النظر:۶۹۔(م)

[۱] عبد الرحمن بن عمرو بن یحمد اوزاعی، ابو عمرو، بعلبک میں ۸۸ھ کو پیدا ہوئے، بقاع میں پلے بڑھے، اوزاع قبیلہ سے تعلق تھا، شام میں فقہ، فتوی اور حدیث کے بہت بڑے عالم تھے، ابن شہاب زہریؒ، سفیان ثوریؒ اور عبد اللہ بن مبارکؒ جیسے اساطین علم ان سے روایت کرتے ہی، شام میں آپ کی قدر ومنزلت بادشاہوں سے بڑھ کر تھی، حکم ابن ہشام کے دور تک اندلس میں آپ کے فتاوی پر عمل رہا، بیروت میں ۱۵۷ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد:۷/۴۸۸، تذکرۃ الحفاظ:۱/۱۷۸، سیر اعلام النبلاء:۷/۱۰۷، شذرات الذہب:۱/۲۴۱، الاعلام:۳/۲۳۰)(م)

[۲] الکفایۃ فی علم الراویۃ:۱۴۷، مقدمۃ ابن الصلاح:۲۱۳، ارشاد طلاب الحقائق:۱/۲۷۶۔(م)

[۳] یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر نمری قرطبی مالکی، ابو عمر، ۳۶۸ھ کو قرطبہ (اندلس) میں پیدا ہوئے، مغرب کے عظیم محدث، حافظ حدیث، مؤرخ، ادیب اور فقیہ تھے، حصول علم کے سلسلے میں اندلس کے مغرب ومشرق کے اسفار کیے، انہیں حافظ مغرب کہا جاتا ہے، امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ آپ بہت بڑے امام، متقی، علامہ، متبحر، متبع سنت اور یگانہ روگاز شخصیت تھے، آپ پہلے ظاہری تھے پھر مالکی مذہب اختیار کیا اور مالکی مذہب کی نصرت وتائید میں بے شمار کتابیں لکھیں، ایک زمانے تک شبونہ اور شنترین کے قاضی رہے، شاطبہ میں ۴۶۳ھ کو وفات پائی۔(وفیات الاعیان:۷/۶۶، تذکرۃ الحفاظ:۳/۱۱۲۸، سیر اعلام النبلاء:۱۸/۱۵۳، الاعلام للزرکلی:۸/۲۴۰)(م)

علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہر ایک معروف عالم عادل ہے اور اس کے احوال کو اس وقت تک عدالت پر محمول کیا جائے گا جب تک اس پر واضح طور پر کوئی جرح ثابت نہ ہو جائے[1]۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

«يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ، يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ وَ انْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ، وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ»[2].

"علم دین کے حامل ایک دوسرے کے پیچھے ہمیشہ ایسے عادل لوگ ہوں، جو اس علم سے غلو کرنے والوں کی تحریف کو اہل باطل کی خیانتوں کو اور جاہلوں کی تاویلوں کو دور کریں گے۔"

لیکن علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ کا یہ مذہب محدثین کرامؒ کے ہاں پسندیدہ نہیں[1]، اس لیے کہ ایک تو یہ حدیث صحیح نہیں۔ بالفرض اس کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہو گا: چاہیے کہ اس علم کو ہر اگلوں سے ان کے بعد والے عادل لے لیں[2]، تاہم یہ مطلب نہیں کہ جب بھی بعد والے اپنے پہلوں سے علم حاصل کریں گے تو وہ ضرور یہی ہوں گے، اس تاویل کی دلیل یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو عالم ہونے کے باوجود عدالت کیساتھ متصف نہ ہو سکے۔

۵۔ راوی کا ضبط کیسے پہچانا جاتا ہے؟

راوی کا ضبط معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی راوی اپنی اکثر روایات میں ثقہ اور متقن راویوں کی موافقت کرنے والا ہو تو اسے صحیح الضبط تسلیم کیا جائے گا، اگر کہیں شاذ و نادر ان کی مخالفت کرے تو یہ مخالفت اس کے ضبط پر اثر انداز نہیں ہو گی، تاہم اگر اس نے ثقات کی

---

[1] التمہید لابن عبد البر: ۱/ ۲۸، جامع بیان العلم وفضلہ: ۲/ ۱۹۹. (م)

[2] اس حدیث کو ابن عدی نے الکامل میں روایت کیا ہے، علامہ عراقیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے جملہ طرق ضعیف لیکن اہل علم نے کثرتِ طرق کے باعث اسے حسن کہا ہے۔ اس کی تفصیل دیکھئے: تدریب الراوی: ۱/ ۳۰۲-۳۰۳۔ (ط)

[1] مقدمۃ ابن الصلاح: ۱۱۶۔ (م)

[2] تدریب الراوی: ۱/ ۳۵۷۔ (م)

اکثر مخالفت کی ہو تو اس کا ضبط مجروح ہو جائے گا اور اس کی روایت نا قابل استدلال قرار دی جائے گی(۱)۔

٦۔ کیا سبب کے بیان کیے بغیر جرح وتعدیل مقبول ہو گی؟

(الف)۔ تعدیل کے متعلق صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ تعدیل کو کسی سبب کے بیان کیے بغیر قبول کیا جائے گا، کیونکہ اس کے اسباب بے شمار ہیں، جن کا استقصاء اور احاطہ بظاہر مشکل ہے، اس لیے کہ مزکی اور تعدیل کنندہ کو صرف یہ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً: اس نے یہ کام نہیں کیا۔ یا وہ اس کام کا مرتکب نہیں ہوا۔ یا یوں کہے گا: وہ فلاں کام کرتا تھا، فلاں کام کرتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

(ب)۔ لیکن جرح تب قبول ہو گی جب وہ مفسر ہو، اس لیے کہ اسباب جرح کا شمار کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہے، نیز پھر یہ بات بھی ہے کہ اسباب جرح میں لوگ مختلف الرای ہیں، بعض ناقدین ایسی باتوں کی بناء پر جرح کر دیتے ہیں جو قابل جرح نہیں ہوتیں۔

حافظ ابن صلاحؒ فرماتے ہیں کہ یہ فقہ اور اصول فقہ میں طے شدہ ہے اور خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ یہ معروف ناقدین اور نابغہ روزگار حفاظ حدیث مثلاً امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ کا بھی ہی مذہب ہے یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے عکرمہ اور عمرو بن مرزوق وغیرہ کی روایات کو قابل استدلال تسلیم کیا ہے جن پر امام بخاریؒ کے علاوہ دیگر محدثین کرام نے جرح کی ہے اور امام مسلمؒ نے سوید بن سعید(۱) اور ایک ایسی جماعت کی روایات کو تسلیم کیا ہے، جن پر کھلم کھلا جرح

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۷۷۔۲۱، ارشاد طلاب الحقائق:۱/۲۷۹۔ (م)

(۱) سُوید بن سعید بن سہل بن شہریار، ابو محمد، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ سوید کذاب اور ساقط الاعتبار ہے، اگر میرے پاس گھوڑا اور نیزہ ہوتا تو اس کے خلاف جنگ کرتا اور کبھی کہتے کہ سوید بن سعید مباح الدم ہے، امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ متروک الحدیث ہے، امام نسائیؒ کہتے ہیں کہ سوید ثقہ نہیں، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ آپ اندھے ہونے کے بعد تلقین قبول کرتے تھے، امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ سوید صدوق ہے، لیکن کثیر التدلیس ہے۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں کہ صدوق ہے، لیکن مضطرب الحفظ ہے۔ (التاریخ الصغیر:۱/۳۵۹، الضعفاء والمترکون:۲۶۰، الضعفاء والمتروکون لابن الجوزی:۲/۳۲، اکمال تہذیب الکمال:۶/۱۶۴، سیر اعلام النبلاء:۱۱/۴۱۰، تذھیب تہذیب الکمال:۴/۲۱۸، تہذیب التہذیب:۴/۲۷۲)(م)

وتنقید ہو چکی ہے، نیز امام ابو داؤد سجستانیؒ نے بھی ایسا ہی کیا ہے، ان محدثین عظام کا یہ رَویہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک جرح تب مقبول ہو گی جب مفسر ہو[1]۔ *

۷۔ کیا جرح وتعدیل ایک شخص کے قول سے ثابت ہو جاتی ہے؟

محدثین کرام کے اس کے متعلق دو قول ہیں:

---

[1] علوم الحدیث:۹۶۔ (ط)

* اس کی تفصیل یہ ہے کہ جرح وتعدیل کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ ہے کہ جارح یا معدل نے کسی راوی پر جرح یا اس کی تعدیل کی ہو تو اس کا سبب بیان کر دیا ہے۔ دوسری یہ کہ سبب نہ بیان کیا ہو۔ قسم اول کو جرح مفسر اور تعدیل مفسر کہتے ہیں، یہ جرح وتعدیل بالاتفاق مقبول ہے۔ قسم دوم کو جرح مبہم اور تعدیل مبہم کہتے ہیں، یہ جرح اور تعدیل قابل قول ہو گی یا نہیں؟ اسی میں علما کے مختلف اقوال ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ تعدیل مبہم مقبول ہے لیکن جرح مبہم مقبول نہیں۔ اس لیے کہ تعدیل کے کثیر اسباب ہیں جن کا ذکر کرنا مشکل ہے کیوں کہ اسباب میں ان مناہی اور منکرات کو شمار کرنا ہو گا جن کے ارتکاب پر کوئی فاسق قرار پاتا ہے۔ اسی طرح ان واجبات کو بھی شمار کرنا ہو گا جن کے ترک کرنے پر کوئی فاسق ہو پاتا ہے۔ لہذا کسی راوی کی تعدیل کرنے کے وقت یہ کہنا ہو گا کہ اس راوی نے فلاں فلاں منوعات کا ارتکاب نہیں کیا اور فلاں فلاں واجبات کی بجا آوری کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل بہت دشوار ہے۔ اس کے برخلاف جرح کے اسباب کم ہیں جن کا بیان کرنا آسان ہے، پھر جرح ایک امر کو کر کرنے سے بھی ہو جاتی ہے جس میں کوئی دشواری نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسباب جرح میں لوگوں کا اختلاف بھی ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جارح اپنی سوچ وسمجھ کے مطابق جرح کر دیتا ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ چیز قابل جرح نہیں ہوتی، اس لیے سبب جرح کو بیان کرنا ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس بنا پر راوی پر جرح کی گئی ہے کیا واقعی وہ قبول روایت میں قادح ہے۔ ذیل میں اس کے چند مثالیں ملاحظہ ہوں، جس میں راوی کو ایسی وجوہ کی بنیاد پر مجروح قرار دیا گیا ہے جو حقیقت میں قابل جرح امور نہیں۔

۱۔ امام شعبہ بن حجاجؒ (م۱۶۱ھ) سے دریافت کیا گیا کہ فلاں کی حدیث آپ نے کیوں ترک کر دی؟ تو انہوں نے جواب دیا: میں نے اسے ترکی گھوڑے پر ایڑ لگاتے ہوئے سوار دیکھا تو اس کی روایت کردہ احادیث کو ترک کر دیا۔

۲۔ امام شعبہ بن حجاجؒ (م۱۶۱ھ) منہال بن عمرو کے پاس آئے تو ان کے گھر سے ایک آواز سنائی دی۔ وہ آواز ستار کی تھی یا لحن سے قراءت کی آواز تھی، اسی بنا پر ان کی روایت کو ترک کر دیا۔

۳۔ حکم بن عتیبہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے زاذان سے کیوں نہیں روایت کی تو جواب دیا: کان کثیر الکلام—وہ بہت زیادہ بولتے تھے، اس لیے میں ان سے روایت نہیں لی۔

۴۔ جریر بن عبد الحمید نے سماک بن حرب کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو ان کی روایت کو ترک کر دیا۔ =

(الف)۔ صحیح بات یہ ہے کہ فردِ واحد کے قول سے بھی جرح وتعدیل ثابت ہو جاتی ہے۔
(ب)۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ کم از کم دو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے، تاہم یہ قول غیر معتمد اور ضعیف ہے[1]۔

= ۵۔ اسی طرح جو اس بات کے قائل ہیں کہ عمل جزو ایمان ہے وہ علی الاطلاق اپنے مخالفین کو مرجئہ کہتے ہیں اور ان کی روایات قبول نہیں کرتے۔

۶۔ اسی طرح بہت سے امام ابو حنیفہؒ اور دیگر اہل کوفہ کو اصحاب الرای کہہ کر ان کی روایت کی ہوئی حدیثوں کو رد کر دیتے ہیں۔

جمہور محدثین نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ ھ) کا مذہب بھی یہی ہے۔

دوسرا قول: پہلے قول کے برعکس ہے، یعنی عدالت کا سبب بیان کرنا ضروری ہے اور جرح کا سبب بیان کرنا ضروری نہیں ہے، اس لیے اسباب عدالت میں تصنع بہت کم ہے لوگ ظاہر دیکھ کر بہت جلدی تعریف کرنے لگتے ہیں اور ظاہر حال دیکھ کر حکم عدالت لگانے میں دھوکہ ہو جاتا ہے جیسے امام مالکؒ کو عبد الکریم بن ابی المخارق کے متعلق ہوا، امام مالکؒ سے عبد الکریم بن ابی المخارق کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ مسجد میں اس کے زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے میں دھوکہ میں پڑ گیا۔۔ اس قول کو صاحب محصول نے نقل کیا ہے۔

تیسرا قول: جرح اور تعدیل دونوں میں سبب بیان کرنا ضروری ہے اس لیے کہ جس طرح سبب جرح بیان کرنے میں غلطی ہو سکتی اسی طرح سبب تعدیل بیان کرنے میں بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ مثلاً احمد بن یونس سے کسی نے کہا: عبد اللہ بن عمر بن عاصم بن عمر بن الخطاب عمری ضعیف ہیں۔ اس کے جواب میں احمد بن یونس نے کہا کہ عبد اللہ بن عمر عمری کو رافضی ہی ضعیف کہے گا جو ان کے آباد کا دشمن ہے، اگر تم ان کی داڑھی، ان کا خضاب اور ان کی صورت دیکھتے تو یقین کرتے کہ وہ ثقہ ہیں۔ یہاں پر احمد بن یونس نے ظاہری شکل وصورت دیکھ کر ان کے ثقہ ہونے کا حکم لگا دیا، جب کہ حسن صورت میں عادل اور غیر عادل دونوں شریک ہوتے ہیں۔ اس قول کو خطیب بغدادیؒ اور اصولیین نے نقل کیا ہے۔

چوتھا قول: یہ ہے کہ جرح وتعدیل دونوں میں سے کسی میں بھی سبب بیان کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ جرح و تعدیل اگر ایسے شخص نے کی ہے جس کو اسباب جرح وتعدیل کی پوری واقفیت حاصل ہو اور اس فن میں اس کو مکمل بصیرت حاصل ہو تو اس کی جرح اور تعدیل دونوں مقبول ہے اگرچہ سبب نہ بیان کرے۔ یہ قول قاضی ابو بکر کا مختارہ کردہ ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل: ۷۹-۱۰۹۔ (م)

[1] کیا جرح وتعدیل میں عدد کی شرط ہے؟ اس میں محدثین کرام کے چار اقوال ہیں:
پہلا قول: یہ ہے کہ کم از کم تین افراد کی تعدیل ضروری ہے۔ =

۸۔اگر ایک راوی میں جرح وتعدیل جمع ہوں؟

جب ایک راوی میں جرح وتعدیل دونوں جمع ہو تو پھر کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے گا؟تو اس کے متعلق دو قول ہیں:

(الف)۔ صحیح اور معتمد قول یہ ہے اگر جرح مفسر ہو تو تعدیل پر مقدم ہو گی[1]۔

(ب)۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اگر جرح کرنے والوں کے مقابلہ میں تعدیل کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہو تو تعدیل ہی کو ترجیح دی جائی گی، تاہم یہ قول ضعیف اور نا قابل اعتماد ہے[2]۔

۹۔کسی عادل کا ایک شخص سے روایت کرنے کا حکم:

= دوسرا قول: یہ ہے کہ جرح وتعدیل کے ثبوت کے لیے کم از کم دو آدمیوں کا قول ضروری ہے جیسا کہ شہادت میں دو آدمیوں کی گواہی درکار ہوتی ہے۔

تیسرا قول: یہ ہے کہ اگر معدل ایسا شخص ہے جس کی تعدیل قبول ہونی چاہیے، مثلاً اس فن میں اسے امامت کا درجہ حاصل ہو تو ایک شخص کی تعدیل کافی ہے ورنہ محض ایک شخص کے قول سے جرح وتعدیل کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔

چوتھا قول: یہ ہے کہ ایک شخص کا قول جرح وتعدیل میں معتبر ہے اس لیے کہ جب قبول خبر میں عدد کی شرط نہیں تو اس کے راوی کی جرح وتعدیل میں بھی عدد کی شرط نہ ہو گی۔ حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) نے چوتھے قول کے متعلق کہا ہے۔

وهوَ الصحيحُ الذي اخْتَارَهُ الحافِظُ أبو بَكْرٍ الخطيبُ وغيرُهُ. (مقدمة ابن الصلاح:۲۲۰)

یہی صحیح ہے جس کو حافظ ابو بکر خطیب اور دیگر حضرات نے اختیار کیا ہے۔

واضح رہے کہ جرح وتعدیل کے باب میں ایک آدمی کے قول کا معتبر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر جارح اور معدل کا قول معتبر ہو گا، بلکہ اس آدمی کا قول معتبر ہو گا جو فن جرح وتعدیل میں مہارت تامہ رکھتا ہو اور اس میدان کا شہسوار ہو۔ (م)

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۲۱، نزہۃ النظر: ۱۷۹، فتح المغیث: ۲/ ۳۴، تدریب الراوی: ۱/ ۳۶۴۔ (م)

(۲) یہ قول خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) اور صاحب محصول نے نقل کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ افراد کی کثرت سے معدلین کی حالت مضبوط ہو جاتی ہے اور جب کہ قلتِ افراد سے جارحین کی حالت کمزور ہو جاتی ہے، خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد اسے محل نظر قرار دیا ہے کہ معدلین کی تعداد اگرچہ زیادہ ہے پھر بھی جارحین نے راوی کے بارے میں جو خبر دی ہے معدلین نے وہ خبر نہیں دی ہے اس لیے جارحین کا علم معدلین سے زیادہ ہوا تو جارحین ہی کا قول معتبر ہو گا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل: ۱۱۴۔ (م)

اگر ایک عادل راوی کسی شخص سے روایت کرے تو کیا یہ اس کی تعدیل شمار ہو گی؟ اس کی تفصیل یہ ہے:

(الف)۔ اکثر محدثین کرام کا مذہب یہ ہے کہ اگر ایک عادل راوی کسی شخص سے روایت کر رہا ہو تو اس کی تعدیل شمار نہ ہو گی، یہی صحیح بات ہے، تاہم ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے تعدیل ہو جائے گی[1]۔

(ب)۔ کسی عالم کا عمل یا فتویٰ کسی حدیث کے موافق ہو تو یہ اس حدیث کی صحت کی دلیل نہیں اور اس طرح کسی عالم کی کسی حدیث سے مخالفت اس کی صحت کو مجروح نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس کی راوی پر قدح قرار دی جا سکتی ہے، تاہم ایک ضعیف قول یہ ہے کہ کسی عالم کا عمل یا فتویٰ حدیث

---

[1] عادل کسی شخص سے نام ذکر کر کے روایت کرے تو کیا یہ اس کی تعدیل ہے یا نہیں؟ حافظ ابوالفضل زین الدین عراقیؒ (م ۸۰۶ھ) فرماتے ہیں کہ اس میں محدثین کرام کے تین قول ہیں:

پہلا قول: اکثر محدثین کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس سے شیخ کی تعدیل نہیں ہو گی، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس عادل نے کسی ایسے شخص سے روایت کی ہو جس کی عدالت معروف نہ ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ غیر عادل سے روایت کی ہو۔ دیکھئے: فتح المغیث: ۲/ ۴۲۔

دوسرا قول: بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ عادل شخص کا کسی سے روایت کرنا مطلقاً اس شیخ کی تعدیل ہے، کیونکہ اس شیخ کے متعلق اگر عادل وضابط شخص کو کوئی سبب جرح معلوم ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے، ورنہ معلوم ہونے کے بعد اسے ذکر نہ کرنا دھوکہ دہی ہے۔

حافظ ابو بکر صیرفی فرماتے ہیں کہ عادل کا محض کسی شیخ سے روایت کر دینے سے اس کا عادل ہونا ضروری نہیں، کیونکہ روایت کرنے سے صرف اتنا ہو گا کہ شیخ کی معرفت اور شناخت ہو جائے گی جس کی وجہ سے وہ مجہول العین نہیں رہے گا، باقی عدالت کا ثبوت اس سے نہیں ہو سکتا کیونکہ عدالت کا تعلق شیخ کے حالات سے واقفیت کے بعد ہو گا۔ (فتح المغیث للسخاوی: ۲/ ۴۳)

تیسرا قول: بعض محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ عادل وضابط شخص صرف عادل سے ہی روایت کرتا ہے تو ان کی روایت سے ان کے شیخ کی تعدیل ہو جائے گی اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ =

کی صحت کی دلیل بن سکتی ہے، علامہ آمدیؒ[1] اور دیگر اصولیین نے اسے صحیح قرار دیا ہے، مگر یہ مسئلہ طلب تفصیل ہے[1]۔

۱۰۔ فسق سے تائب کی روایت کا حکم:

فسق وفجور سے توبہ تائب ہو جانے والے کی روایت کا حکم حسب ذیل ہے:

(الف)۔ فسق وفجور سے تائب کی روایت قبول کی جائے گی۔

(ب)۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں دروغ گوئی اور کذب بیانی کرنے والے کی توبہ کے باوجود بھی روایت قبول نہیں کی جائے گی، تاکہ یہ انجام بد دیکھ کر کوئی اور اس ناقابل تلافی جرم کا

= وہ صرف عادل سے روایت کرتے ہیں یا یہ معلوم ہو کہ وہ عادل، غیر عادل سب سے روایت کرتے ہیں تو ان کے محض روایت کر دینے سے اس شیخ تعدیل نہیں ہو سکتی۔ یہ قول اصولیین علامہ سیف الدین آمدیؒ اور علامہ ابن حاجبؒ کا ہے اور محدثین کی ایک جماعت امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، ابن خزیمہؒ اور حاکم نیسابوریؒ کا مختارہ کردہ ہے۔ دیکھئے: فتح المغیث للسخاوی: ۲/ ۴۳۔ (م)

[1] علی بن محمد بن سالم تغلبی، ابوالحسن، سیف الدین آمدی، آمد (دیار بکر) میں ۵۵۱ھ کو پیدا ہوئے، بغداد، شام اور قاہرہ میں تعلیم حاصل کی، اپنے دور کے نابغہ روزگار منطقی، فیلوف، اصولی اور متکلم تھے، قاہرہ میں تدریس کی، وہاں کے بعض اہل علم نے ان پر فساد عقیدہ اور تعطیل کا الزام لگایا جس کی وجہ سے انہیں قاہرہ سے نکال دیا گیا اور پھر یہ دمشق چلے گئے، اور وہیں ٦۳۱ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان: ۳/ ۲۹۳، سیر اعلام النبلاء: ۲۲/ ۳٦۴، النجوم الزاہرہ: ٦/ ۲۸۵، شذرات الذہب: ۵/ ۱۴۲، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۳۳۳)(م)

[1] اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی فقیہ کسی حدیث کے مطابق فتوی دے یا اس پر عمل کرے تو محض ان کے فتوی اور عمل سے حدیث کی تصحیح اور اس کے راوی کی تعدیل لازم نہیں آتی، کیونکہ کہ ہو سکتا ہے کہ اس فقیہ کے پیش نظر کوئی دوسری دلیل ہو جو اس متن حدیث کے موافق ہو۔ یا ازراہ احتیاط فقیہ نے اس حدیث کے مطابق فتوی دیا ہو اور عمل کیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ فقیہ ان لوگوں میں سے ہو جو ضعیف حدیث پر عمل اور قیاس پر اس کی تقدیم کا قائل ہو۔ اسی طرح اگر کوئی فقیہ کسی حدیث کے خلاف فتوی دے، یا ان کا عمل اس کے خلاف ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حدیث ان کے نزدیک صحیح نہیں، یا اس حدیث کے راوی عادل نہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس حدیث سے فقیہ نے اس وجہ سے عدول کیا ہو کہ ان کے نزدیک اس حدیث کے معارض کوئی دوسری دلیل ہو جو اس سے راجح ہو۔ یا یہ ہے کہ وہ حدیث منسوخ ہو۔ دیکھئے: فتح المغیث: ۲/ ۴۲۔ (م)

مرتکب نہ ہو[۱]۔

۱۱۔اجرت پر احادیث بیان کرنے والے کا حکم:

جو شخص اجرت پر احادیث بیان کرے تو اس کا حکم حسب ذیل ہے:

(الف)۔امام احمد بن حنبلؒ، اسحاقؒ بن راہویہ اور ابو حاتمؒ کا مذہب یہ ہے کہ اجرت پر احادیث بیان کرنے والے کی روایت کو قبول نہیں کی جائے گی۔

(ب)۔ بعض محدثین امام ابو نُعیمؒ فضل بن دُکین[۱] اور بعض دیگر محدثین کرام کے نزدیک اس کی روایت کو قبول کیا جائے گا۔

(ج)۔علامہ ابو اسحاق شیرازی[۲] کا فتوی یہ ہے کہ جو شخص روایت حدیث میں مشغول رہنے کے باعث اپنے اہل عیال کے لیے معاش کا بندوبست نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے روایت حدیث پر اجرت لینا جائز ہے[۳]۔

۱۲۔متساہل، قبول تلقین اور کثرت نسیان میں معروف شخص سے حدیث لینے کا حکم:

---

(۱) دیکھئے: فتح المغیث:۲/۴۷، تدریب الراوی:۱/۳۹۰۔(م)

(۱) فضل بن دُکین عمرو ابن حماد تیمی ملائی، ابو نُعیم:۱۳۰ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم محدث اور حافظ حدیث تھے، امام بخاریؒ ا، امام مسلمؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام یحیی بن معینؒ، ابو خیثمہؒ، ابو محمد دارمیؒ، عبد بن حُمید، ابو زرعہ رازیؒ اور ابو حاتمؒ جیسے اساطین علم کے شیخ ہیں، فرق امامیہ سے تعلق تھا اور دُکینیہ فرقہ ان ہی کی طرف منسوب ہے، خلق قرآن کے مسئلہ میں اپنے موقف "القرآن کلام اللہ" پر بڑی مضبوطی کیساتھ قائم رہے، ۲۱۹ھ کو وفات پائی۔(الجرح والتعدیل:۷/۶۱، تاریخ بغداد:۱۲/۳۴۶، تذکرۃ الحفاظ:۱/۳۷۲، سیر اعلام النبلاء:۱۰/۱۴۲، الاعلام للزرکلی:۵/۱۴۸)(م)

(۲) ابراہیم بن علی بن یوسف شیرازی، ابو اسحاق: فیروزآباد (فارس) میں ۳۹۳ھ کو پیدا ہوئے، پھر شیراز کا سفر کیا وہاں کے علماء سے استفادہ کیا اور پھر بصرہ اور پھر بغداد چلے گئے، اپنے دور کے یگانہ روزگار فقیہ، محدث، مناظر اور بے نظیر عالم تھے، نظام الملک نے ان کے لیے مدرسہ نظامیہ دریائے دجلہ کے کنارے تعمیر کیا تھا، آپ وہاں درس وتدریس میں مشغول رہے، بڑی قناعت اور فقر وفاقہ کی زندگی گزارہی۔ بغداد میں ۴۷۶ھ کو وفات پائی۔(الانساب:۹/۳۶۱، تبیین کذب المفتری:۲۷۶، تہذیب الاسماء واللغات:۲/۱۷۲، سیر اعلام النبلاء:۱۸/۴۵۲، الاعلام للزرکلی:۱/۵۱)(م)

(۳) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۲۳۸، النکت علی کتاب ابن الصلاح للزرکشی:۳/۴۲۳، الکفایہ فی علم الروایۃ:۲۴۰، تدریب الراوی:۱/۳۹۹۔(م)

ذیل میں ترتیب وار تینوں کا حکم بیان کیا جا رہا ہے، ملاحظہ ہو۔

(الف)۔ جو شخص حدیث سننے یا سنانے میں متساہل معروف ہو تو اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جائے گا، مثلاً وہ شخص جو سماع حدیث کے وقت ہونے میں لا پرواہ ہو یا ایسی اصل سے حدیث بیان کرے جن کا موازنہ اور مقارنہ نہ کیا گیا ہو، تو اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جائے گا[1]۔

(ب)۔ جو شخص حدیث میں تلقین قبول کرنے میں معروف ہو، مثلاً دوران درس اسے کوئی شخص کسی بات کی تلقین کرے، اور وہ یہ معلوم کیے بغیر کہ یہ حدیث ہے یا نہیں؟ اسے بھی اپنی حدیث سمجھ کر لوگوں سے روایت کرنا شروع کر دے تو ایسے شخص کی روایت بھی قابل قبول نہ ہو گی[2]۔

(ج)۔ جو شخص اپنی روایات میں کثرت نسیان کیساتھ معروف ہو تو اس کی روایت بھی قبول نہیں کی جائے گی[3]۔

۱۳- حدیث بیان کر کے بھول جانے والے کا حکم:

(الف)۔ حدیث بیان کر کے بھول جانے والے کی تعریف:

حدیث بیان کر کے بھول جانے والے کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ شیخ اور استاذ ہے جس کو وہ حدیث یاد نہ رہی ہو جو اس نے اپنے شاگرد کو سنائی ہو اور شاگرد اس حدیث کو اپنے اس شیخ ہی سے روایت کر رہا ہے[4]۔

(ب)۔ اس کی روایت کا حکم:

اگر شیخ اپنی بیان کر کے بھول جانے والی حدیث کی قطعی طور پر نفی کر رہا ہو، مثلاً یوں کہے: میں نے یہ حدیث روایت نہیں کی۔ یا یہ کہے کہ: وہ مجھ پر جھوٹ بولتا ہے، وغیرہ تو ایسے شخص کی حدیث کو رد کیا جائے گا، لیکن اگر شیخ نفی کرنے میں متردد ہو، مثلاً یوں کہے: ”مجھے معلوم نہیں“۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۲۳۸، تدریب الراوی:۱/۴۰۱۔(م)
(۲) مقدمۃ ابن الصلاح:۲۳۹، فتح المغیث:۱/۳۸۵، تدریب الراوی:۱/۴۰۱۔(م)
(۳) مقدمۃ ابن الصلاح:۲۳۹، تدریب الراوی:۱/۴۰۱۔(م)
(۴) تدریب الراوی:/۳۹۵۔(م)

یا ”مجھے یاد نہیں“۔ وغیرہ، تو ایسے شخص کی روایت کو قبول کیا جائے گا[1]۔

(ج)۔ اگر ان شیخ اور شاگرد میں سے کوئی حدیث رد کردے تو کیا یہ رد کسی ایک کے عدالت کو مجروح کرے گا؟

اس کے متعلق قول فیصل یہ ہے کہ یہ رد دونوں میں سے کسی ایک کو بھی مجروح نہیں مجروح نہیں کرے گا، اس لیے کہ اس معاملہ میں دونوں یکساں ہوں گے اور کوئی کسی سے بڑھ کر سے بڑھ کر قابل طعن یا قابل جرح نہیں ہوگا[2]۔

(د)۔ حدیث بیان کرکے بھول جانے والے کی مثال:

اس کی مثال وہ حدیث ہے جس کو امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن[3] کی روایت سے بیان کیا ہے انہوں سے سہیل بن ابی صالح[4] سے، وہ اپنے والد ابو صالح سے اور وہ سیدنا ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں۔

”أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَضَى بِالْيَمِينِ مَعَ الشَّاهِدِ“.[5]

---

[1] مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۳۳، نزہۃ النظر: ۱۵۳، فتح المغیث: ۲/ ۸۴، تدریب الراوی: ۱/ ۳۹۵۔ (م)

[2] تدریب الراوی: ۱/ ۳۹۵۔ (م)

[3] ربیعہ بن ابی عبد الرحمن فروخ تیمی، مولی ابو عثمان مدنی: یحیی بن سعید انصاری، امام مالکؒ، سفیانینؒ، حماد بن سلمہ اور لیث بن سعدؒ جیسے اساطین علم نے ان سے کسب فیض کیا ہے، ابوزرعہ دمشقی فرماتے ہیں کہ ربیعہ ثقہ ہے، امام ابو حاتمؒ، نسائیؒ اور عجلیؒ نے بھی ثقہ کہا ہے، یعقوب بن شیبہؒ کہتے ہیں کہ ربیعہ ثقہ، ثبت اور مدینہ منورہ کے مفتی تھے، مدینہ منورہ میں ۱۳٦ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۹/ ۱۲۳، وفیات الاعیان: ۲/ ۲۸۸، تہذیب التہذیب: ۳/ ۲۵۸)(م)

[4] سہیل بن ابی صالح ذکوان سمان، ابویزید مدنی، دوری ابن معینؒ سے نقل کرتے ہیں کہ سہیل بن ابی صالح کی روایات حجت نہیں، امام حاتمؒ فرماتے ہیں کہ سہیل کی روایات لکھیں جاتی ہیں، لیکن قابل حجت نہیں، امام نسائی کہتے ہیں کہ سہیل کی روایات لینے میں کوئی حرج نہیں، امام بخاریؒ نے ان سے متابعات میں روایت لی ہے، اسی وجہ سے امام نسائیؒ نے امام بخاریؒ پر تعاقب کیا ہے، ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ کبھی خطاء کا شکار ہو جاتے ہیں، ابو جعفر کے دور حکومت میں وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۱۲/ ۲۲۳، تہذیب التہذیب: ۴/ ۲٦۳)(م)

[5] سنن أبی داود (۳/ ۳۰۹، رقم ۳٦۱۰)، سنن الترمذی (۳/ ٦۲۷، رقم ۱۳۴۳)، سنن ابن ماجہ (۲/ ۷۹۳، رقم ۲۳٦۸)، السنن الکبری للبیہقی (۱۰/ ۱٦۹، رقم ۲۰۴۳٦). سنن الدارقطنی (۴/ ۲۱۳)، صحیح ابن حبان (۱۱/ ۴٦۲، رقم ۵۰۷۳)، وأبو عوانہ (۴/ ۵٦، رقم ٦۰۱۱)، مسند أبو یعلی (۱۲/ ۳٦، رقم ٦٦۸۳). (م)

”رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ گواہ کیساتھ مدعی سے قسم لے کر فیصلہ فرمایا“۔

اس روایت کے متعلق عبد العزیز بن محمد دراوردی[1] فرماتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن نے سہیل بن ابی صالح کے واسطے سے بیان کی، پھر جب میری سہیل سے ملاقات ہوئی اور اس سے اس حدیث کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ اس حدیث کو آپ کی روایت سے ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن نے مجھ سے بیان کیا ہے، اس ملاقات و گفتگو کے بعد سہیل اس حدیث کو یوں روایت کرنے لگے۔

”حَدَّثَنِيْ عَبْدُالْعَزِيْزُ، عَن رَّبِيْعَةَ، عَنِّيْ أَنِّيْ حَدَّثْتُهُ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ مَرْفُوْعًا بِكَذَا ...“[2]

”مجھ یہ حدیث عبد العزیز نے بیان کی ہے، ان سے ربیعہ نے مجھ سے سن کر بیان کی، میں نے ربیعہ کو بتایا تھا کہ میں نے یہ حدیث اسے یعنی ربیعہ کو سیدنا ابوہریرہ سے مرفوعاً بیان کی تھی“۔

(ھ)۔اس موضوع پر معروف تصانیف:

أَخْبَارُ مَنْ حَدَّثَ وَنَسِيَ، از خطیب بغدادیؒ۔

---

[1] عبد العزیز بن محمد بن عبید بن ابی عبید دراوردی، ابو محمد مدنی: مصعب زبیری کہتے ہیں کہ امام مالکؒ ان کی توثیق کیا کرتے تھے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ دراوردی طلب حدیث میں مشہور ہیں، جب وہ صحیفے سے روایت کریں تو روایت صحیح ہوتی ہے اور جب لوگوں سے روایت بیان کرتے تو اس میں غلطیاں کرتا ہے، کبھی قلب کے شکار بھی ہو جاتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمر کی جگہ عبید اللہ بن عمرو کہتے۔ امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ دراوردی کا حافظہ خراب ہو گیا تھا جب وہ اپنی یاداش سے روایت کرتے ہیں تو اس میں غلطی کر جاتے ہیں۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ دراوردی قوی نہیں۔ مدینہ منورہ میں ۱۸۹ھ یا ۱۸٦ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال:۱۸/ ۱۸۷، تہذیب التہذیب:٦/ ۳۵۴)(م)

[2] فتح المغیث:۲/ ۸۷، تدریب الراوی:۱/ ۳۹٦۔ (م)

فصل دوم: کتب جرح وتعدیل پر ایک طائرانہ نظر

حدیث کی صحت و ضعف کے حکم کا دار و مدار چند امور پر مبنی ہے جن من جملہ راویان حدیث کی عدالت اور ان کا ضبط و حفظ ہے، یا پھر ان کی عدالت اور ضبط پر طعن ہے، اسی وجہ سے اہل علم نے ایسی کتب کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا، جن میں راویان حدیث کے عدالت وضبط کو ان مستند ائمہ حدیث سے نقل کیا گیا، جو فن تعدیل کے بلند وبالا مرتبہ پر فائز تھے اور ان کا ضبط واتقان اور تقوی وطہارت مسلم تھا، علماء کرامؒ نے محدثین عظام کے اس قابل قدر کاوش کو "فن تعدیل" کے نام سے موسوم کیا ہے، تاہم اس کیساتھ ان حضرات نے اپنی کتابوں میں ان مطاعن اور مسائل کو بھی واضح طور پر بیان کیا، جن کا تعلق رواۃ حدیث کی عدالت وضبط سے تھا، تاہم ان مطاعن کو ان فرشتہ صفت انسانوں سے نقل کیا گیا ہے، جن میں ضد وعناد اور تعصب کی آمیزش تک نہ تھی، ان حضرات کی ان مساعی جملہ کو جرح کے نام سے ملقب کیا گیا ہے، اور ان اقوال اور تصریحات پر مشتمل کتابوں کو "کتب الجرح والتعدیل" سے موسوم کیا گیا ہے[۱]۔

کتب رجال کے عنوان پر مختلف و متنوع تصانیف ہیں، بعض کتابوں میں ثقہ اور عادل رواۃ کا بیان ہے، بعض صرف ضعیف اور مجروح راویوں کے احوال پر مشتمل ہیں جب کہ بعض میں

---

(۱) محدثین کرام نے روایانِ حدیث کی تحقیق وچھان بین میں انتہائی دیانت داری وحق گوئی کی مثال قائم کی ہے اس میں انہوں نے اپنے باپ، بیٹے کسی کی رعایت نہیں کی، جو راوی قابل تنقید تھا اس پر نقد کیا اور جو قابل توثیق تھا اس کی ثقاہت کو بیان کیا، علی بن مدینیؒ جو امام بخاریؒ کے بھی شیخ ہیں، ان سے ان کے والد بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان کے متعلق کسی اور سے دریافت کرو۔ جب لوگوں نے اصرار کیا تو انہوں نے اپنے سر کو جھکا لیا، پھر سر کو اٹھا کر فرمایا کہ دین کا معاملہ ہے میرے والد ضعیف راوی ہیں۔

امام وکیع بن جراحؒ بڑے محدث تھے، لیکن ان کے باپ سرکاری خزانچی تھے اس بنا پر وہ خود ان سے جب روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے راوی کو ضرور ملا لیتے، یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

امام یحیی بن معینؒ نے علی بن قرین کے بارے میں فرمایا کہ وہ کذاب ہے، کسی نے کہا وہ تو آپ کی خدمت میں بہت رہتے ہیں! تو فرمایا بات صحیح ہے، لیکن حق بات نہ کہوں تو اللہ تعالی سے شرم آتی ہے۔

امام ابو داؤد صاحب السنن نے اپنے بیٹے کے بارے میں فرمایا کہ وہ کذاب ہے۔ =

ثقہ اور ضعیف دونوں قسم کے رواۃ کا تذکرہ کیا گیا ہے، بالفاظ دیگر بعض کتابوں میں عام رواۃ حدیث کا تذکرہ ہے، جس میں کسی ایک کتاب یا چند مخصوص کتابوں کے رجال کے بجائے عام راویان حدیث کا تعارف پیش کیا گیا ہے جب کہ بعض کتابوں میں کسی ایک خاص کتاب یا چند مخصوص کتابوں کے رواۃ کے تراجم پر گفتگو کی گئی ہے[1]۔

الغرض اس ہمہ گیر موضوع پر علماء جرح وتعدیل کی متنوع تصانیف اور گراں قدر کاوشیں ایک

= زید بن انیسہ کہتے ہیں کہ میرے بھائی سے نہ روایت کرو کیونکہ وہ ضعیف ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: فن اسماء الرجال تقی الدین ندوی:۴۸، جرح وتعدیل:۲۴۸۔(م)

محدثین کرام جرح وتعدیل کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط کیساتھ خوف خدا سے سرشار تھے، خشیت الٰہی اوراحتساب نفس اور جواب دہی کے خوف کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ پیر کانپ اٹھتے تھے جس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے: ایک مرتبہ امام یحیی بن معینؒ نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ ہم ایسے لوگوں کے بارے میں زبان طعن دراز کرتے ہیں، جو دو سو سال پہلے ہی جنت میں پڑاؤ ڈال چکے ہوں گے۔ جب اس واقعہ کی خبر امام ابن ابی حاتمؒ کو ملی تو وہ اس وقت کتاب "الجرح والتعدیل" پڑھا رہے تھے تو خوف کے مارے ان کے ہاتھ کانپنے لگے، یہاں تک کتاب ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ (سیر اعلام النبلاء:۱۱/ ۸۲)(م)

[1] فن جرح وتعدیل میں جو کتابیں تحریر کی گئی ہیں ان کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ پہلے مرحلہ کتابیں انتہائی مختصر ہوا کرتی تھیں جس میں راوی کا مختصر نام اورایک لفظ میں اس کا حکم ذکر کر دیا جاتا تھا، خواہ وہ مؤلف کا اپنا قول ہو، یا ان کے کسی استاد یا کسی امام کا قول ہو۔ اس طرز کی مختصر کتابیں اہل علم نے بعد میں بھی تحریر کی ہیں، اس طرح کی کتابوں میں امام بخاریؒ کی "الضعفاء الصغیر"، امام ابوزرعہؒ اورامام نسائیؒ کی "الضعفاء والمتروکین"، امام دار قطنیؒ کی "الضعفاء والمتروکون" اور "کتب اسئلہ" وغیرہ کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ دوسرے مرحلے کی کتابیں عموماً متوسط ہوا کرتی تھیں ان کتابوں میں تراجم کو قدرے تفصیل کیساتھ کیا گیا ہے، راوی کا حسب ونسب، اس کے بعض اساتذہ وتلامذہ، اس کے بارے میں علماء کے اقوال اور مثال کے طور پر ایک یا چند حدیثیں بذریعہ اسناد ذکر کی جاتی تھیں جو اس راوی کے واسطہ سے مروی ہوتی تھیں۔

اس سلسلہ میں جن کتابوں کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے ان میں امام بخاریؒ کی "التاریخ الکبیر"، امام ابوجعفر عقیلیؒ کی "الضعفاء الکبیر"، ابن حبانؒ کی "المجروحین من المحدثین"، ابن عدیؒ کی "الکامل فی ضعفاء الرجال" اورامام ابن ابی حاتمؒ کی "الجرح والتعدیل" وغیرہ کتابیں ہیں۔

=

عظیم علمی کارنامہ ہے، اور ان کے مساعی جمیلہ قابل صد افتخار ہے، اس لیے کہ ان حضرات نے پہلے تمام رواۃ کے تراجم کا بغور محققانہ اور ناقدانہ جائزہ لیا، پھر ان پر ہونے والی جرح اور تعدیل کو بیان کیا، پھر ان کے شیوخ اور تلامذہ کے احوال کا بھرپور جائزہ لیا، نیز یہ بھی بتایا کہ ان راویان حدیث نے طلب حدیث میں کہاں کہاں کی خاک چھانی کی، کب اپنے شیوخ کے سامنے زانو تلمذ طے کیے، حیات مستعار کی کتنی گھڑیاں اپنے مشائخ کے محافل و مجالس میں گزاری، الغرض اس سلسلہ میں انہوں نے زمان و مکان کی تحدید اور ان تمام تفصیلات کو متحیر العقول شکل میں پیش کیا، بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ عصر حاضر کی تہذیب یافتہ اور جدید انکشافات سے مالا مال قومیں اس معیار کے قریب نہیں پہنچ سکیں، کہ جس قدر علمائے حدیث نے رواۃ حدیث کے تراجم اور حالات زندگی پر مشتمل موسوعات اور انسائیکلوپیڈیاز کی تشکیل دی، جس میں انہوں نے رواۃ حدیث کے مکمل حالات زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا۔ فَجَزاهُمُ اللهُ عنَّا خيْرًا.

ذیل میں چند معروف کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱- التاریخ الکبیر:

یہ امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ کی شہرہ آفاق کتاب ہے جس میں ثقہ اور ضعیف دونوں قسم رواۃ کا تذکرہ ہے[1]۔

۲- الجرح والتعدیل:

یہ امام ابن حاتمؒ کی تالیف لطیف ہے، اس میں بھی ثقہ اور ضعیف دونوں طرح کے راویوں کا

= ۳۔۔ تیسرے مرحلہ کی کتابیں کافی مفصل ہوا کرتی تھیں، راوی کے بارے میں جو ضروری معلومات دستیاب ہو سکتی تھیں تقریباً ان سب کا احاطہ ہوتا تھا، خاص طور پر ائمہ جرح وتعدیل کے مختلف اقوال کا ذکر حتی المقدور کیا جاتا تھا، مؤلف کے اپنے ذوق کے مطابق کوئی خاص گوشہ کبھی کبھی اجاگر ہوتا تھا، مثلاً: "تہذیب الکمال" میں اساتذہ و تلامذہ کے جمع کرنے کا گوشہ کافی روشن ہے تو "تہذیب التہذیب" میں اقوال ائمہ کے جمع کرنے کا گوشہ کافی حد تک اجاگر ہے۔ ان کتابوں میں ائمہ کے اقوال ذکر کرنے کے لیے اسناد کو ذکر نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ سابقہ کتابوں پر ان کا اعتماد ہوتا تھا جو مستند کتابیں ہوتی تھیں۔ اس طرح کے کتابوں میں تہذیب الکمال، تذہیب تہذیب الکمال، میزان الاعتدال اور تہذیب التہذیب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (م)

[1] یہ نہایت جامع کتاب ہے جس وقت امام بخاریؒ نے یہ کتاب تالیف کی اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی =

ذکر ہے، بلکہ یہ امام بخاریؒ کی التاریخ الکبیر کے قریب قریب ہے، اور دونوں میں حد درجہ تک مشابہت ہے[1]۔

۳- الثقات:

یہ امام ابن حبان بستیؒ کی تصنیف ہے، اس میں انہوں نے صرف ثقہ راویوں کا تذکرہ کیا ہے[2]۔

۴- الکامل فی الضعفاء:

یہ امام ابن عدیؒ کی مایہ ناز کتاب ہے، اس میں صرف ضعیف رواۃ کا تذکرہ ہے جیسا کہ اس کے

= تھی اور سب سے بڑا اعجوبہ یہ ہے کہ آپ نے اس کتاب کو چاند کی روشنی میں روضہ رسول ﷺ کے پاس بیٹھ کر تحریر کیا ہے۔ اس کو مصنف نے حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کیا ہے اور عہد صحابہ سے لے کر اپنے دور تک کے رجال حدیث کے حالات قلم بند کیے ہیں، ان میں مرد، عورت، ثقہ وضعیف سب شامل ہیں۔ اس میں بھی امام بخاریؒ کو بہ لحاظ جامعیت شرفِ اولیت حاصل ہے، ان کے بعد جن لوگوں نے تاریخ، رجال اور اسماء پر کتابیں لکھی ہیں سب ان کے خوشہ چین ہی ہیں۔ حرفِ اول کے بعد کتاب میں ترتیب قائم نہ رہ سکی، نیز جرح وتعدیل سے بہت کم ہی تعارض کیا ہے، البتہ جب صحابی کا نام آیا ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے تاریخ کے نام سے تین کتابیں تالیف کی ہیں: تاریخ کبیر، تاریخ اوسط اور تاریخ صغیر۔ ان میں سب سے اہم مقام تاریخ کبیر کو حاصل ہے اس لیے کہ یہ کتاب نہایت جامع اور مفصل ہے۔ اس کتاب میں موجودہ تراجم کی تعداد ۱۲۳۱۵ ہے، یہ کتاب بارہ جلدوں میں دارالکتب العلمیہ سے طبع ہوئی ہے۔ (م)

(۱) یہ امام عبدالرحمن بن ابی حاتم رازیؒ (م ۳۲۷ھ) کی تالیف ہے، یہ رجال حدیث کی جرح وتعدیل کے لیے مستند ترین اور نہایت مہتم بالشان کتاب ہے، مصنفؒ نے جرح وتعدیل کے باب میں ائمہ فن کے اقوال کو تلاش کیا اور ان کو اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے، بالخصوص اپنے والد امام ابوحاتم رازیؒ اور حافظ ابوزرعہ رازیؒ کے اقوال وآراء کو بکثرت نقل کیا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب اپنے فن میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے، پوری کتاب ۱۸۰۵۰ تراجم پر مشتمل ہے، ہر راوی کے جرح وتعدیل کا صحیح اسانید سے ذکر کیا ہے، ایک جلد میں کتاب کا مقدمہ لکھا ہے جس کا نام "تقدمۃ المعرفۃ لکتاب الجرح والتعدیل" ہے اس میں علم جرح وتعدیل کی اہمیت اور افادیت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کیساتھ ساتھ ائمہ فن کے حالات بھی جمع کیے ہیں۔ علم حدیث کا کوئی طالب اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ (م)

(۲) یہ کتاب چار طبقات پر مرتب ہے، پہلا طبقہ صحابہ کرام کا، دوسرا تابعین کا، تیسرا تبع تابعین کا اور چوتھا تبع =

عنوان سے ظاہر ہے[۱]۔

۵- الکمال فی اسماء الرجال:

یہ علامہ عبد الغنی مقدسیؒ کی شہرہ آفاق کتاب ہے، اس میں انہوں نے ثقہ اور ضعیف دونوں طرح کے راویوں کا ذکر کیا ہے، تاہم اس میں صرف کتب ستہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن النسائی، سنن ابن ماجہ) کے رجال کے تراجم ہیں[۲]۔

۶- میزان الاعتدال:

= الاتباع ہے، ہر طبقہ میں موجودہ ناموں کو حرف تہجی پر مرتب کیا گیا ہے، یہ کتاب نو اجزاء پر مشتمل ہے موصوف تصحیح کے باب میں متسائل ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) نے اپنی کتاب تہذیب التہذیب میں کتاب الثقات سے بہت استفادہ و نقل کیا ہے۔ (م)

[۱] یہ امام احمد بن عدی جرجانیؒ (م ۳۶۵ھ) کی شہرہ آفاق کتاب ہے اس کتاب میں مصنف نے ہر اس راوی کا ذکر کیا ہے جس پر کسی محدث نے کلام کیا ہے، خواہ وہ رجال صحیحین ہی کیوں نہ ہو، یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع کتاب ہے، متاخرین اہل علم اس سے بکثرت استفادہ کیا ہے۔

امام شمس الدین ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب میزان الاعتدال کے لیے اس کتاب کو بنیاد بنایا ہے اور یہ کتاب حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب ہے، تراجم میں حسب و نسب پر زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے، بلکہ راوی کا نام ولدیت، بعض مشائخ اور نسبت پر اکتفاء کیا ہے تاریخ وفات بھی بہت کم ذکر کی ہے۔ ہر راوی کے متعلق اپنے فیصلہ سنایا ہے، ہر راوی کے ترجمہ میں بطور مثال ایک یا چند ضعیف روایتوں کا بھی ذکر کیا ہے، اسی وجہ سے بعض تراجم طویل ہو گئے ہیں اور اسی بناء پر اس کتاب میں ضعیف اور منکر روایتوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ (م)

[۲] یہ کتاب حافظ ابو محمد عبد الغنی بن عبد الواحد مقدسیؒ (م ۶۰۰ھ) کی شہرہ آفاق کتاب ہے، مصنف نے کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں اس انہوں نے کتاب کا منہج بیان کیا ہے: مقدمہ میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ انتہائی مختصر انداز میں بیان کی ہے، راویوں کے متعلق جرح و تعدیل کے ائمہ کے مفید اقوال ذکر کیے ہیں، سب سے پہلے صحابہ کرام کو ذکر کیا ہے اور صحابہ میں عشرہ مبشرہ کو مقدم کیا ہے، پھر باقی صحابہ حروف معجم کے اعتبار سے، پھر کنیت کے اعتبار سے مشہور صحابہ، پھر غیر معروف صحابہ سے بیان کرنے والے راویوں کے اعتبار سے مرتب کیے ہیں، پھر صحابیات کے نام اور پھر صحابیات کی کنیتیں پھر مبہمات کا تذکرہ کیا ہے۔ ترجمہ میں راوی کا نام ونسب، نسبت، کنیت، مشائخ، تلامذہ اور اس راوی کے متعلقہ نقاد اہل علم کے اقوال بیان کیے =

یہ امام شمس الدین ذہبیؒ کی معروف و متداول کتاب ہے، اس کتاب میں ضعیف اور متکلم فیہ رواۃ کا تذکرہ ہے، جس میں انہوں نے ان ضعیف اور متروک رواۃ کا ذکر کیا ہے اگرچہ بعض پر جرح قابل نہیں[1]۔

۷- **تہذیب التہذیب:**

یہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی مایہ ناز کتاب ہے، جو در حقیقت امام جمال الدین مزیؒ کی "تہذیب الکمال فی اسماء الرجال" کی اختصار اور تہذیب ہے[2]۔

= ہیں اور پھر بھی بیان کیا ہے کہ کتب ستہ میں کس کس نے اس سے روایت لی ہے، اگر راوی کے اخراج پر کتب ستہ تمام اصحاب مشترک ہیں تو "أخرج له الجماعة" فرماتے ہیں اور اگر شیخین متفق ہوں تو فرماتے ہیں: "اتفقا علیه" اور اگر دوسرے روایت کریں تو ان کے نام ذکر کر دیتے ہیں۔ حال میں یہ کتاب ڈاکٹر شادی بن محمد بن سالم آل نعمان کی تحقیق کیساتھ گیارہ جلدوں میں کویت سے طبع ہوئی ہے۔ (م)

(۱) یہ امام شمس الدین ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) کی شہرہ آفاق کتاب ہے، مصنف نے اپنی اس کتاب میں ابن عدیؒ کا طریقہ اختیار کیا ہے، بلکہ یہ ابن عدی کی کتاب الکامل فی ضعفاء الرجال کا خلاصہ ہے، بہت سے مقامات میں ابن عدیؒ سے اختلاف بھی کیا ہے اور اپنی رائے کو بیان کیا ہے، اس کتاب کو ایک مختصر مقدمہ سے شروع کیا گیا ہے جس میں تاریخ تدوین رجال حدیث، کتاب کی ترتیب و تصنیف، محتویات اور منہج کے متعلق وضاحت کی ہے، آخر میں جرح و تعدیل کے کلمات اور ان کے مراتب کا ذکر کیا ہے، اس کتاب میں کذابین، وضاعین، متہمین، ضعفاء اور مجہولین کیساتھ ساتھ ان ثقات کا بھی ذکر ہے جو بدعتی ہیں اور ایسے ثقات بھی ہیں جن پر کلام قادح نہیں ہے۔ اس کتاب کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، تراجم میں راوی کا نام و نسب، شیوخ تلامذہ اور ائمہ کے اقوال کا ذکر کیا گیا ہے کہیں کہیں راوی کے عام حالات، اخبار و احادیث کا بھی ذکر ہے تراجم عموما متوسط ہیں اور کہیں کہیں مفصل اور کہیں کہیں مختصر بھی ہیں۔ اس کتاب سے استفادہ انتہائی آسان ہے۔ (م)

(۲) یہ کتاب تہذیب الکمال کے مقابلے میں مختصر اور جامع ہے اس لیے کہ اس میں راویوں کے متعلق صرف ضروری معلومات ہی جمع کی گئی ہیں، یہ کتاب تقریبا ۳۰۳۳ تراجم پر مشتمل ہے، صاحب ترجمہ راوی کے تلامذہ و شیوخ میں صرف مشاہیر کو ذکر کیا ہے، راوی کی توثیق و تجریح کے متعلق ائمہ فن کے اقوال اصل کتاب سے زائد بھی نقل کیے ہیں۔ اس کتاب میں بعض راویوں کا اضافہ کیا گیا ہے جو کتاب کی شرط پر تھے، لیکن امام مزیؒ سے فوت ہو گئے تھے، بعض ایسے راویوں کا اضافہ کیا جو اس کتاب کے راویوں کے ہم نام تھے یہ اضافہ اس لیے کیا تاکہ دونوں میں فرق کیا جا سکے اس لیے ان کے نام پر اشارہ کے بجائے لفظ "تمیز" لکھ دیا ہے۔ =

۸- تقریب التہذیب:

یہ بھی حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی تالیف لطیف ہے، جو در اصل مؤلف کی کتاب تہذیب التہذیب کا اختصار اور خلاصہ ہے[1]۔

= اس کتاب کی ترتیب بھی اپنی اصل یعنی تہذیب الکمال کی طرح نہایت ہی دقیق ترتیب پر حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہے صرف حرف "الف" میں "احمدین" اور حرف "م" میں "محمد ین" کو مقدم کیا گیا ہے۔ ناموں کے بعد کنیت سے مشہور راویوں کا تذکرہ پھر دیگر چار فصلوں میں منقسم راویوں کا ذکر ہے اور آخر میں خواتین کا تذکرہ اسی دقیق ترتیب سے کیا گیا ہے۔ (م)

[1] یہ کتاب انتہائی مختصر اور جامع ہے، لیکن اختصار کے باوجود "تہذیب الکمال" کے تمام تراجم بعینہ اسی طرح سے بیان کیے ہیں، اس کتاب میں حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے بعینہ "تہذیب التہذیب" والے رموز استعمال کیے ہیں، سوائے سنن اربعہ کے کہ اس کے لیے "ع" کی بجائے "عم" کا رمز ذکر کیا ہے اور اس میں ایک رمز زائد ذکر کیا ہے اور وہ ہے "تمیز" ایسے راوی کے لیے جس کی کتب ستہ اور اس کی ملحقات میں کوئی روایت نہیں۔ مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں رواۃ کے مراتب بیان کیے ہیں جن کی تعداد ۱۲ ہے اور ہر مرتبہ کے جرح وتعدیل کے اعتبار سے الفاظ بھی ذکر کیے ہیں اور جرح وتعدیل کے لحاظ سے راوی کے بارے وارد اقوال کا خلاصہ دوٹوک الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ جس سے کسی راوی پر حکم لگانے میں انتہائی آسانی ہوتی ہے اور یہی حکم قول فیصل کہلاتا ہے۔

یہ کتاب عصر حاضر کے عظیم محقق شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ کی تحقیق وتعلیق کیساتھ دار الرشید سوریا سے ایک جلد میں طبع ہو چکی ہے۔ تاہم اس کتاب پر سب سے بہتر کام عصر حاضر کے نابغہ روزگار محقق ڈاکٹر بشار عواد معروف بغدادی حفظہ اللہ اور محدث جلیل شیخ شعیب ارنؤوط مرحوم کا ہے، انہوں نے صرف حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کے احکام پر اعتماد نہیں کیا بلکہ انہوں نے ان احکام کی خوب تحقیق کی اور حافظ ابن حجرؒ کیساتھ متعدد مقامات میں اختلاف کیا ہے اور جا بجا ان پر تعقبات بھی کیے۔ یہ کتاب "تحریر تقریب التہذیب" کے نام سے مؤسسۃ الرسالۃ بیروت لبنان سے چار جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔ (م)

فصل سوم: جرح وتعدیل کے مراتب[1]

امام ابن ابی حاتمؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "الجرح والتعدیل" کے مقدمہ میں جرح و تعدیل میں سے یہ ایک کے چار چار مراتب ذکر کیے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک مرتبہ کا حکم بھی

---

(۱) جرح وتعدیل کے مراتب میں محدثین کرام کے درمیان اختلاف ہے، انہیں مراتب کے اعتبار سے ان کی روایتوں پر اصح، صحیح، حسن اور ضعیف کا حکم لگایا جاتا ہے، لیکن چونکہ یہ علماء مختلف دور مختلف مزاج کے تھے اس لیے لازمی طور سے ان کے زمانہ اور مزاج کا گہرا اثر ان کلمات کے انتخاب پر بھی ہوا ہے، ایک محدث کے یہاں ایک کلمہ کسی خاص مرتبہ پر دلالت کرتا ہے، بعینہ وہی کلمہ دوسرے محدث کے یہاں دوسرے مرتبہ پر دلالت کرتا ہے، اسی وجہ سے حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷٤ھ) فرماتے ہیں۔

"ان کا ضبط کرنا بے حد مشکل ہے۔" (اختصار علوم الحدیث: ۱۰۵)

حالانکہ ہر فرد نے اپنی سمجھ کے مطابق ایسے کلمات کا انتخاب کیا ہے جو مدلول پر واضح طور سے دلالت کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی اس پر کامل اتحاد نہ ہو سکا، خصوصا چوتھی صدی ہجری سے قبل ان میں نمایاں فرق پایا جاتا تھا اور اس سے قبل مراتب کی تحدید بھی نہیں تھی، لیکن اسی صدی ہجری میں امام عبدالرحمن بن ابو حاتم رازیؒ (م ۳۲۷ھ) نے کلمات تعدیل وجرح کو چار مرتبوں میں محدود کیا۔

پھر ساتویں صدی ہجری میں حافظ ابن الصلاحؒ (م ٦٤٣ھ) اور امام شرف الدین نوویؒ (م ٦٧٦ھ) نے کچھ الفاظ کے اضافہ کیساتھ انہیں کا موقف اختیار فرمایا اور امام ابن ابی حاتمؒ (م ۳۲۷ھ) کے بیان کردہ مراتب کی تحسین وتصویب فرمائی۔ پھر آٹھویں صدی ہجری میں امام شمس الدین ذہبیؒ (۷٤۸ھ) نے مزید کچھ الفاظ کا اضافہ کیا اور انہوں نے الفاظ تعدیل کو چار اور الفاظ جرح کو پانچ مرتبوں میں تقسیم کیا۔

پھر نویں صدی ہجری میں حافظ زین الدین عراقیؒ (م ۸۰٦ھ) نے امام ذہبیؒ کی موافقت کی، لیکن مراتب تعدیل میں مزید ایک لفظ کا اضافہ کیا۔ پھر حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے ان میں مزید توسیع کی اور انہوں نے مراتب تعدیل کو چھ اور مراتب جرح کو بھی چھ مرتبوں میں تقسیم کیا اور انہوں نے مراتب تعدیل میں مرتبہ اولی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شمار کیا۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نکال دیا جائے تو ان کے یہاں بھی تعدیل کے پانچ اور تجریح کے چھے مراتب ہوں گے۔

پھر دسویں صدی ہجری میں حافظ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) نے بھی اپنے شیخ کے ذکر کردہ مراتب کو برقرار رکھا، لیکن انہوں نے مراتب تعدیل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن دوسرے مرتبے میں انہوں نے صرف ایک کلمہ "فلان لا يسئل عنه" کو رکھا۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: ہماری تعلیق کیساتھ: الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل۔ (م)

بیان کیا ہے۔

تاہم متاخرین نے ان چاروں مراتب پر دو مرتبوں کا اور اضافہ کیا، تو یوں جرح و تعدیل میں سے ہر ایک کے چھ چھ مراتب بن گئے، ذیل میں ان مراتب کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

ا۔ تعدیل کے مراتب اور ان کے الفاظ کا بیان:

پہلا مرتبہ: وہ الفاظ جو راوی کی توثیق میں مبالغہ پر مشتمل ہو۔ یا وہ الفاظ جو "أَفعَلُ" اسم تفضیل کے وزن پر ہوں، یہ راوی کی توثیق کا اعلیٰ مرتبہ ہے، مثلاً یوں کہا جائے: "فُلَانٌ إِلَيْهِ الْمُنْتَهٰى فِي التَّثَبُّتِ". (فلان شخص پر توثیق کی انتہاء ہے)۔ یا "فُلَانٌ أَثْبَتُ النَّاسِ". (فلان شخص سب سے زیادہ ثقاہت کا حامل ہے)۔

دوسرا مرتبہ: پھر ان الفاظ کا درجہ ہے، جس میں کسی راوی کی توثیق تکرار معنوی کیساتھ ہو، جیسے "ثِقَةٌ ثِقَةٌ" (بہت ہی ثقہ ہے)، یا "ثِقَةٌ ثَبْتٌ." (ثقہ پختہ کار ہے)۔

تیسرا مرتبہ: پھر ان الفاظ کا درجہ ہے، جو تاکید اور تکرار کے بغیر توثیق پر دال ہوں جیسے "ثِقَةٌ" (ثقہ ہے)، یا "حُجَّةٌ" (حجت ہے) وغیرہ۔

چوتھا مرتبہ: پھر ان الفاظ کا درجہ ہے، جو راوی کی تعدیل و توثیق پر دال ہوں، لیکن اس میں ضبط سے تعرض نہ ہو، مثلاً "صَدُوْقٌ" (بہت سچا ہے) یا "مَحَلُّهُ الصِّدْقُ" (سچائی پر قائم ہے) یا "لَا بَأْسَ بِهِ" (اس میں کوئی خرابی نہیں)۔ لیکن "لَا بَأْسَ بِهِ" کا جملہ امام ابن معینؒ کسی راوی کے متعلق کہہ دے تو یہ ان کے نزدیک ثقہ ہو گا۔[1]

پانچواں مرتبہ: پھر ان الفاظ کا درجہ ہے، جو راوی کی تعدیل و توثیق پر دال نہ ہو، جیسے "فُلَانٌ شَيْخٌ"[1]، یا "رَوَى عَنْهُ النَّاسُ". (اس شخص سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے، یا روایت کرتے ہیں)۔

---

[1] الکفایۃ فی علم الروایہ: ۲۲۔ (م)

[1] امام ابوزرعہ رازیؒ اور امام ابن ابی حاتم رازیؒ دونوں اس راوی کو "شیخ" کہتے ہیں جو اہل علم نہ ہو، صرف صاحب روایت ہو۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ "شیخ" نہ جرح ہے اور نہ تعدیل۔ (نصب الرایۃ: ۴/ ۲۳۳، میزان الاعتدال: ۲/ ۱۹) (م)

چھٹا مرتبہ: آخر میں ان الفاظ کا درجہ ہے، جو جرح کے قریب قریب الفاظ ہوں جیسے "فُلَانٌ صَالِحُ الْحَدِیْثِ" (فلاں شخص روایت حدیث کی صلاحیت رکھتا ہے) یا "یُکْتَبُ حَدِیْثُہٗ" (فلاں شخص احادیث لکھ لیتا ہے) وغیرہ۔

۲۔ مذکورہ مراتب کا حکم:

(الف)۔ مذکورہ بالا اول الذکر تینوں مراتب کے حامل راوی قابل حجت ہو گی، تاہم بعض کو بعض پر فوقیت ہو گی[۱]۔

(ب)۔ چوتھے اور پانچویں مرتبہ کے حامل راوی کی روایت قابل حجت نہیں، البتہ ان کی احادیث

---

[۱] اس کی تفصیل یہ ہے کہ ان مراتب میں پہلے تین مراتب والوں کی روایتیں عدالت اور ضبط کے وجود کی بنیاد پر قابل قبول اور قابل حجت ہوتی ہیں، اگرچہ قوت میں بعض بعض سے قوی ہوتے ہیں، صحیحین کی روایتیں پہلے مرتبہ والوں میں شمار ہوتی ہے، صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کی روایتیں دوسرے مرتبہ والوں میں ہوتی ہیں اور کتب سنن کی روایتیں تیسری مرتبہ والوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

چوتھے مرتبہ والوں کے سلسلہ میں قدرے اختلاف ہے لیکن راجح یہ ہے کہ قابل احتجاج ہوتے ہیں اور ان کی روایتیں درجہ حسن کو پہنچتی ہیں۔ عام طور سے اس طرح کی روایتیں سنن میں پائی جاتی ہیں۔

حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ جن کلمات سے ضبط کی وضاحت نہیں ہوتی ہے تو ایسے حضرات کی حدیثوں کا مقارنہ کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ کس طرح کی ہیں، یہاں تک کہ ضبط کا چل جائے۔

(مقدمہ ابن الصلاح: ۱۱۰)

پانچویں مرتبہ والوں کی روایتیں مطلق قابل احتجاج تو نہیں ہوتی ہیں، البتہ قابل اعتبار ہوتی ہیں، لیکن ان کی روایتیں اگر ثقات کے موافق ہوں تو قابل احتجاج ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی روایتوں کو امام ترمذیؒ حسن کہتے ہیں اور امام ابو داؤدؒ سکوت اختیار کرتے ہیں، اس طرح کی روایتیں عام طور سے کتب مسانید اور بعض سنن میں پائی جاتی ہیں۔

چھٹے مرتبہ والوں کی بھی روایت قابل قبول نہیں ہوتی، بلکہ قابل اعتبار ہوتی ہے، لیکن مرتبہ میں کم ہوتی ہے اگر اس کی کوئی شاہد ہے تو حسن لغیرہ ہو گی ورنہ ضعیف ہو گی، لیکن ضعیف خفیف ہو گا اس طرح کی روایتیں عام طور سے کتب ترغیب و ترہیب میں پائی جاتی ہیں۔ (م)

کو لکھا جائے گا اور ان کا اعتبار بھی کیا جائے [۱]، اگرچہ پانچویں مرتبے کا راوی چوتھے مرتبے کے راوی کے مقابلہ میں کم درجے کا ہے۔

(ج)۔ چھٹے مرتبہ والوں راویوں کی روایت نا قابل احتجاج ہیں، تاہم ان کی احادیث صرف کی غرض سے لکھی جائے گی، اس لیے کہ ان کا عدم ضبط بالکل واضح ہوتا ہے۔

۳۔ جرح کے مراتب اور اس کے الفاظ[۳]:

پہلا مرتبہ: وہ الفاظ جو نرمی اور تساہل پر دال ہوں جیسے "فُلَانٌ لَيِّنُ الْحَدِيْثِ" (فلاں شخص حدیث میں کمزور ہے) یا "فِيْهِ مَقَالٌ". (یہ شخص متکلم فیہ ہے)۔

دوسرا مرتبہ: پھر ان الفاظ کا درجہ ہے جس میں راوی کی نا قابل حجت ہونے کی تصریح ہو یا اس سے ملتے جلتے الفاظ ہوں جیسے "فُلَانٌ لَّا يُحْتَجُّ بِهِ" (فلاں قابل حجت نہیں)، یا "ضَعِيْفٌ" (فلاں ضعیف ہے) یا "لَهٗ مَنَاكِيْرُ". (اس کی مرویات منکر ہیں)۔

تیسرا مرتبہ: پھر ان الفاظ کا درجہ ہے جس میں راوی کی روایات کی عدم کتابت کی تصریح ہو یا اس سے ملتے جلتے الفاظ ہوں جیسے: "فُلَانٌ لَّا يُكْتَبُ حَدِيْثُهٗ" (فلاں کی حدیث نہیں لکھی جاتی)، یا "لَا تَحِلُّ الرِّوَايَةُ عَنْهُ" (اس سے روایت لینا ہی درست نہیں)، یا "ضَعِيْفٌ

---

(۱) ایسے راویوں کے ضبط واتقان کا اس طرح اعتبار کیا جائے گا کہ ان کی روایت کو ثقہ راویوں کی روایت پر پرکھا جائے گا اگر موافقت ہو گی تو ان روایات کو بطور استدلال پیش کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہوئی کہ جس راوی کے لیے "صدوق" کا لفظ استعمال ہو اس کی روایت کو اعتبار سے پہلے قابل حجت تسلیم نہیں کیا جائے گا اس لیے جس شخص کا یہ گمان ہے کہ "صدوق" راوی کی حدیث حسن ہوتی ہے وہ غلطی پر ہے کیونکہ ائمہ جرح وتعدیل کے نزدیک حدیث حسن قابل حجت ہوتی ہے، البتہ حافظ ابن حجرؒ نے "صدوق" کے لفظ سے اپنی کتاب "تقریب التہذیب" میں ایک خاص اصطلاح مراد لی ہے۔ واللہ اعلم! (ط)

(۲) اعتبار کا مطلب یہ ہے کہ ان سے صرف شاہد اور تابع کا کام لیا جائے گا، یعنی اس مرتبہ والوں کی روایت کو بطور شاہد اور متابع پیش کیا جا سکتا ہے۔ (م)

(۳) مراتب تعدیل میں ترقی من الاعلی الی الادنی کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور جب کہ مراتب جرح میں ترقی من الادنی الی الاعلی کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ (م)

جِدًّا"(وہ بہت زیادہ ضعیف ہے)یا"وَاہٍ بِمَرَّةٍ".(وہ بہت واہی ہے)۔

چوتھا مرتبہ: پھر ان الفاظ کا درجہ ہے جس میں راوی پر کذب بیانی کی تہمت ہو یا اس کے مشابہ الفاظ ہوں جیسے: "فُلَانٌ مُتَّهَمٌ بِالْكَذِبِ"(فلاں پر جھوٹ کی تہمت لگی ہے)، یا"مُتَّهَمٌ بِالْوَضْعِ"(اس پر احادیث گھڑنے کا الزام ہے)، یا"يَسْرِقُ الْحَدِيْثَ"[1] (فلاں حدیثیں چراتا ہے)، یا"سَاقِطٌ"(اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے)یا"مَتْرُوْكٌ"(اس سے صرف نظر کیا گیا ہے)یا "لَيْسَ بِثِقَةٍ"(یہ ثقہ نہیں ہے)وغیرہ۔

پانچواں مرتبہ: پھر ان الفاظ کا درجہ ہے، جس میں راوی کے جھوٹے ہونے کی صراحت ہو، جیسے "كَذَّابٌ"(بہت جھوٹا ہے)،"دَجَّالٌ(بڑا دھوکہ باز ہے)،وَضَّاعٌ(بڑا جعلساز ہے)، يَكْذِبُ(جھوٹ بکتا ہے)، يَضَعُ"(جعلسازی کرتا ہے)وغیرہ۔[2]

---

[1] سارق الحدیث وہ راوی ہے جو قصداً راویوں کے ناموں میں قلب(ہیر پھیر)کرتا ہو، جیسے مُرہ بن کعب کے بجائے کعب بن مُرہ اور سعد بن سنان کے بجائے سنان بن سعد کہے۔یا کسی حدیث کے لیے صحیح یا ضعیف سند بنادے۔یا کسی حدیث کو استاذ سے نہیں سنا پھر بھی اس سے سماع کا دعوی کرے۔(الموقظہ للذہبی:۶۰)(م)

[2] علامہ ابن وزیر محمد بن ابراہیم یمانیؒ(م ۸۴۰ھ)فرماتے ہیں۔

" ومن لطيف علم هذا الباب: أن يعلم أنّ لفظة / ((كذّاب)) قد يطلقها كثير من المتعنّتين في الجرح على من يهم ويخطىء في حديثه، وإن لم يتبيّن أنّه تعمّد ذلك، ولا تبيّن أنّ خطأه أكثر من صوابه ولا مثله، ومن طالع كتب الجرح والتّعديل عرف ما ذكرته." (الروض الباسم:۱/۱۶۶)

"یہاں ایک لطیف نکتہ جاننا ضروری ہے کہ بعض متشددین ان راویوں پر بھی"کذاب"کا اطلاق کرتے ہیں جو وہم کے شکار ہوتے ہیں، یا کہیں غلطی کر لیتے ہیں، اگرچہ یہ معلوم نہ ہو کہ ان کی غلطیاں ان کی درست روایات سے زیادہ ہیں، یا برابر ہیں۔اس کو وہ شخص بخوبی جانتا ہے جس نے کتب جرح وتعدیل کا مطالعہ کیا ہو۔"

اس طرح"آفته فلان"کا تعلق بھی اسی طبقہ سے ہے، حافظ ابن عراق کنانیؒ(م ۹۶۳ھ)نے حافظ برہان الدینؒ کے حوالے سے لکھا کہ یہ الفاظ وضع حدیث سے کنایہ ہیں۔(تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ:۱/۳۴)

نیز"الحمل فيه على فلان"جس راوی کے متعلق کہا جائے اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اس کو وضع کرنے والا فلاں ہے، جیسے خطیب بغدادیؒ(م ۴۶۳ھ)نے احمد بن حسن ابو حبیش کے متعلق کہا ہے:"الحمل فيه على ابي حبيش."(تاریخ بغداد:۴/۸۱، ترجمہ:۱۷۱۵)

اسی طرح"البلاء فيه من فلان"،"البلية فيه من فلان"،"فلان له بلايا"اور"حدث =

چھٹا مرتبہ: پھر ان الفاظ کا درجہ ہے جس میں راوی کے جھوٹے ہونے کا مبالغہ ہو، یہ سب سے شدید ترین جرح ہے، جیسے: "فُلَانٌ أَكْذَبُ النَّاسِ" (فلاں سب سے بڑھ کر جھوٹا ہے) یا "إِلَيْهِ الْمُنْتَهٰى فِي الْكَذِبِ" (فلاں پر جھوٹ کی انتہاء ہے) یا "هُوَ رُكْنُ الْكَذِبِ" (فلاں جھوٹ کا رکن رکین ہے) وغیرہ[1]۔

۴۔ مذکورہ مراتب کا حکم:

(الف)۔ اول الذکر دونوں مرتبوں کی احادیث نا قابل حجت ہوں گی، البتہ ان کی احادیث صرف اعتبار کے لیے لکھی جائیں گی، اگر چہ دوسرے مرتبے والے راوی پہلے مرتبے والے راویوں سے کم درجہ کے ہیں۔

(ب)۔ آخری چاروں مراتب کی احادیث نہ لکھی جائیں گی، نہ ہی قابل حجت ہوں گی اور نہ ہی ان کا اعتبار کیا جائے گا۔[1]

= بنسخة فيه بلايا" وغیرہ الفاظ کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کی روایت موضوع ہیں۔ (تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ:۱/۱۹)(م)

[1] اس طبقہ میں وہ لوگ بھی داخل ہیں، جن پر "منبع الكذب" (جھوٹ کا منبع ہے)، "معدن الكذب" (جھوٹ کا کان ہے)، "جبل فى الكذب" (جھوٹ کا پہاڑ ہے)، یا "كذاب جبل" (بہت بڑا جھوٹ کا پہاڑ ہے) کا اطلاق کیا جاتا ہے، مثلاً: عیسی بن مہران کے بارے میں امام ذہبیؒ (م۷۴۸ھ) فرماتے ہیں۔ "رافضى كذاب جبل." (میزان الاعتدال:۳/۳۲۴، ترجمہ:۶۶۱۳)

اس قسم لوگوں کے لیے کبھی "جِرابُ الكذب" (جھوٹ کا تھیلا ہے) کے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں، جیسے محمد بن حسن اہوازی کے بارے میں محدث ابن علی کا قول ہے: ہم اسے جھوٹ کا تھیلا کہا کرتے تھے۔ "كنا نسميه جِراب الكذب." (میزان الاعتدال:۳/۵۱۶، ترجمہ:۷۳۸۸) (م)

[1] اس کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں پہلے اور دوسرے مرتبہ والوں کی روایتیں ضعیف ہوتی ہیں، لیکن درجات میں فرق ہوتا ہے، یہ روایتیں قابل احتجاج نہیں ہوتی ہیں، البتہ قابل استیناس ہوتی ہیں، بوقت ضرورت ان کا ذکر کیا جاسکتا ہے اور دوسرے ہم مرتبہ والوں سے مل کر کام چل سکتا ہے اور دوسرے کی تائید کر سکتی ہیں، ان کے علاوہ بقیہ چار مراتب والوں کی روایتیں مردود اور نا قابل قبول ہوتی ہیں، ان کا تحریر کرنا بھی درست نہیں ہوتا، بلکہ آخری تین مراتب والوں کی روایتوں کا بیان کرنا بھی بغیر وضاحت کے حرام ہوتا ہے، اسی طرح کی روایتیں کتب موضوعات میں پائی جاتی ہیں، یہ ترتیب وار ضعیف، انتہائی ضعیف، متروک اور موضوع ہوتی ہیں۔ (فتح المغیث:۲/۱۱۶)

باب سوم

روایت، آداب روایت اور کیفیت ضبط کا بیان

یہ باب دو فصلوں پر مشتمل ہے:

فصل اول: ضبط روایت کی کیفیت اور طرق تحمل کا بیان

فصل دوم: آداب روایت کا بیان

فصل اول: ضبط روایت کی کیفیت اور طرق تحمل کا بیان

یہ فصل چار اہم مباحث پر مشتمل ہے:

مبحث اول: کیفیت سماع حدیث اور اس کے تحمل اور ضبط کا طریقہ۔

مبحث دوم: طرق تحمل اور صیغ اداء کا بیان۔

مبحث سوم: کتابت حدیث، ضبط حدیث اور اس میں تصانیف۔

مبحث چہارم: روایت حدیث کا طریقہ۔

مبحث اول: کیفیت سماع حدیث اور اس کے تحمل وضبط کا طریقہ

ا۔ تمہید:

کیفیت سماع سے مراد یہ ہے کہ جو شخص شیوخ اور اساتذہ حدیث سے سماع کرنا چاہتا ہے، اس میں کن کن اوصاف اور شرائط کا ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ ان شرائط کو ملحوظ نظر رکھ کر اپنے شیوخ سے سماع اور استفادہ کرے اور پھر ان احادیث کو طلبہ حدیث تک پہنچا سکے جیسا کہ ایک معین عمر کا وجوبی یا استحبابی طور پر شرط ہونا وغیرہ۔

تحمل حدیث سے مراد مشائخ سے حاصل کرنے کے طرق کا بیان ہے، اور ضبط حدیث کی صفت سے مراد اس بات کا بیان ہے کہ ایک طالب حدیث اپنے شیخ سے حاصل کردہ احادیث کو خوب اعتناء اور بیدار مغزی سے محفوظ کرے اور اسے دوسروں کو اس طرح وثوق اور اطمینان کیساتھ من وعن پہنچا سکے جس طرح انہوں نے اپنے شیخ سے سنا ہو۔

محدثین کرام نے علوم حدیث کی اس نوع پر خوب توجہ دی ہے اور اس کی فروغ وارتقاء کے لیے نہایت دقیق اور عمدہ قواعد وضوابط وضع کیے، جن میں بعض مراتب دوسروں کے مقابلہ میں اقوی ہیں اور یہ سب کچھ احادیث نبویہ کی اہمیت اور عظمت کے پیش نظر کیا گیا، تاکہ ایک شخص سے دوسرے تک انتقال حدیث نہایت احتیاط اور حفاظت کیساتھ ہو سکے، تاکہ ایک مسلمان کو اس بات کا اطمینان رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے احادیث مبارکہ اس تک انتہائی محفوظ اور عمدہ طریقے سے پہنچی ہیں، اور اسے اس بات کا یقین رہے کہ یہ طرق اپنی دقت اور سلامتی میں بامِ عروج تک پہنچے ہیں[1]۔

۲۔ کیا تحمل حدیث کے لیے اسلام اور بلوغ شرط ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ تحملِ حدیث کے لیے اسلام اور بلوغ شرط نہیں، تاہم اداء حدیث اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے یہ دونوں باتیں شرط ہیں[2]، جیسا کہ یہ بات قبل راوی کے لیے بیان

---

(۱) الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ: ۷۔(م)

(۲) تحمل کا مطلب شیوخ سے حدیث اخذ کرنا ہے اور ادا سے مراد شاگردوں اور طلبہ کو حدیث کی روایت کرنا اور ان تک پہنچانا ہے۔

کردہ شروط کے ذیل میں گزر چکی ہے، اس تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسلمان اور بالغ شخص کی یہ روایت مقبول ہو گی جو اس نے اپنے اسلام اور بلوغ سے پہلے سنی ہو، لیکن بالغ ہونے کے متعلق یہ بات ضروری ہے کہ تحمل حدیث کے وقت وہ سن تمیز اور شعور کو پہنچ چکا ہو، بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ تحمل حدیث کے لیے بلوغ شرط ہے، تاہم یہ بات درست نہیں اس لیے کہ مسلمانوں نے کم عمر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً سیدنا حسن رضی اللہ عنہ [(۱)] اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کی احادیث کو قبول کیا ہے اور یہ فرق نہیں کیا کہ ان میں کونسی احادیث بلوغ سے پہلے کی ہیں اور کونسی بلوغ کے بعد کی ہیں [(۲)]۔

۳۔ کس عمر میں سماعِ حدیث شروع کرنا مستحب ہے؟

(الف)۔ اہل شام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سماع حدیث کی ابتداء تیس سال میں بہتر ہے۔

(ب)۔ اہل کوفہ کی رائے یہ ہے کہ بیس سال کی عمر میں مستحسن ہے۔

(ج)۔ اہل بصرہ کا مذہب یہ ہے کہ دس برس کی عمر میں اولیٰ ہے۔

(د)۔ لیکن اب صحیح قول یہ ہے کہ جب سماع حدیث کی اہلیت پیدا ہو جائے تو جتنی جلدی ممکن ہو سکے حدیث کی سماعت کا آغاز کیا جائے، اس لیے کہ اب جملہ احادیث ضبط تحریر میں آچکی ہیں [(۱)]۔

۴۔ کیا نابالغ کی سماعتِ حدیث کے لیے عمر کی تعیین شرط ہے؟

---

(۱) سیدنا حسن بن علی بن ابی طالب ہاشمی قرشی، ابو محمد رضی اللہ عنہ، مدینہ منورہ میں ۳ھ کو پیدا ہوئے، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سب سے بڑے صاحبزادے اور نواسہ رسول ہیں، سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی معیت میں اصبہان اور جرجان کے غزوات میں شریک رہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اہل عراق نے ۴۰ھ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ۴۱ھ میں خلافت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو سپرد کی، آپ کی خلافت کی مدت چھ ماہ اور پانچ دن تھی۔ اور پھر مدینہ منورہ واپس آئے اور وہیں ۵۰ھ کو وفات پائی۔

(الاستیعاب: ۱/ ۳۸۳، اسد الغابہ: ۲/ ۱۳، الاصابہ: ۲/ ۶۰، الاعلام للزرکلی: ۲/ ۱۹۹)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۴۸، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۳۳۵، تدریب الراوی: ۱/ ۴۱۳۔(م)

(۱) مذکورہ تمام اقوال کی تفصیل کے لیے دیکھئے: الکفایۃ فی علم الروایۃ: ۵۵، المحدث الفاصل بین الراوی والواعی: ۱۸۷، مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۴۸، تدریب الراوی: ۱/ ۴۱۴۔(م)

(الف)۔ بعض حضرات نے نابالغ کے سماعتِ حدیث کے لیے عمر کی حد کم از کم پانچ برس مقرر کی ہے، یہی قول محدثین کرامؒ کا مختار کردہ ہے[۱]۔

(ب)۔ بعض فرماتے ہیں کہ شعور اور تمیز کا لحاظ رکھا جائے گا اگر اس میں بات سمجھنے اور جواب دینے کی صلاحیت موجود ہو تو اس صورت میں اسے صاحب شعور تسلیم کیا جائے گا اور اس کا سماع درست متصور ہو گا، تاہم اگر اس میں بات سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو تو اس کا سماع غیر معتبر ہو گا[۲]۔

---

[۱] مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۴۹، تدریب الراوی: ۱/ ۴۱۵۔ (م)

[۲] مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۵۰، تدریب الراوی: ۱/ ۴۱۶۔ (م)

مبحث دوم: طرقِ تحمل اور صیغ اداء کا بیان

محدثین کرام نے تحملِ حدیث کے درج ذیل آٹھ طرق ذکر کیے ہیں:

١۔ سماع ٢۔ قراءۃ ٣۔ اجازہ ۴۔ مناولہ ۵۔ کتابت ٦۔ اعلام ٧۔ وصیت ٨۔ وجادۃ[١]

ہم مذکوہ طرق پر ذیل میں ایک کیساتھ گفتگو کرتے ہیں، اور ساتھ میں الفاظِ اداء کو بھی مختصر طور پر بیان کرتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

١۔ سماع (شیخ کی زبان سے حدیث سننا)

(الف)۔ سماع کی صورت:

اس کی صورت یہ ہے کہ شیخ حدیث پڑھے اور شاگرد سنے، خواہ شیخ اپنی حافظہ کی مدد سے سنارہاہو، یا کتاب دیکھ کر سنائے، اور خواہ شاگرد سن کر لکھے یا صرف سنے اور کچھ نہ لکھے[٢]۔

(ب)۔ سماع کا مرتبہ:

جمہور محدثین کرام کے نزدیک تحمل حدیث کے جملہ طرق میں سے یہ سب سے اعلیٰ اور بہتر طریقہ ہے[١]۔

(ج)۔ الفاظِ اداء:

جب طرق تحمل میں سے ہر ایک طریق کے لیے مخصوص الفاظِ اداء رائج نہ تھے تو استاذ سے حدیث سننے کے لیے ان الفاظ کو استعمال کرنا جائز تھا جس سے سماع کا مفہوم اداء ہوتا ہو، مثلاً "سَمِعْتُ" (میں نے سنا) یا "حَدَّثَنِيْ" (مجھ سے شیخ نے بیان کیا) یا "أَخْبَرَنِيْ" یا "أَنْبَأَنِيْ"

---

(١) مقدمہ ابن الصلاح:٢٥١، ارشاد طلاب الحقائق:١/٣۴٠۔(م)

(٢) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:٢٥١، الالماع:٩٩، المنہل الروی:٩٠، ارشاد طلاب الحقائق:١/٣۴١۔(م)

(١) دیکھئے: الکفایۃ:٢٧٢، مقدمۃ ابن الصلاح:٢٥١، الالماع:٩٩، المنہل الروی:٩٠، ارشاد طلاب الحقائق:١/٣۴١، المقنع فی علوم الحدیث:١/٢٠۴، فتح المغیث:٢/١٦، توضیح الافکار:٢/٣٩٧۔(م)

(مجھ کو خبر دی) یا "قَالَ لِيْ" (مجھ سے کہا) یا "ذَكَرَلِيْ" (مجھ سے ذکر کیا)۔

لیکن جب طرق تحمل میں سے ہر ایک طریق کے لیے خاص قسم کے الفاظ رائج ہوئے تو الفاظِ اداء کے کے لیے حسبِ ذیل الفاظ وضع ہوئے:

۱۔ سماع کے لیے: "سَمِعْتُ" یا "حَدَّثَنِيْ."

۲۔ قراءۃ کے لیے: "أَخْبَرَنِيْ".

۳۔ اجازت کے لیے: "أَنْبَأَنِيْ".

۴۔ سماع و مذاکرۃ کے لیے[۱]: "قَالَ لِيْ" یا "ذَكَرَلِيْ".[۲]

۲۔ قراءت

اس کو اکثر محدثین عرض کہتے ہیں[۱]۔

(الف)۔ قراءت کی صورت:

قراءت سے مراد یہ ہے کہ شاگرد استاذ کے سامنے حدیث پڑھے اور شیخ سماعت کرے[۲]، خواہ یہی شاگرد پڑھ رہا ہو اور شیخ سن رہا ہو، اور یا کوئی دوسرا شاگرد پڑھ رہا ہو اور یہ بھی شیخ کیساتھ سن رہا ہو، خواہ زبانی پڑھے، یا کتاب دیکھ کر سنائے اور خواہ شیخ اپنے حافظہ کی مدد سے شاگرد

---

[۱] سماع المذاکرہ سماع سماع تحدیث سے الگ چیز ہے، سماع تحدیث میں یہ ہوتا ہے کہ شیخ اور شاگرد دونوں مجلس تحدیث میں آنے قبل بیان ہونے والی احادیث کی ترتیب وضبط کے سلسلے میں پوری طرح تیاری کرتے ہیں جب کہ سماع مذاکرہ میں اس قسم کی کوئی تیاری نہیں ہوتی۔ (ط)

[۲] التقریب والتیسر للنووی: ۵۴، تدریب الراوی: ۱/ ۴۱۸۔ (م)

[۱] مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۵۴، التقریب والتیسر للنووی: ۵۵، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۳۴۵، تدریب الراوی: ۱/ ۴۳۳۔ (م)

[۲] اس سے مراد یہ ہے کہ طالب علم صرف ان احادیث کی قراءت کرے جو شیخ سے مروی ہوں، ہر قسم کی احادیث کی قراءت مراد نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شیخ طالب علم کی زبان سے اپنی مرویات سن کر ان کی تصحیح وتوثیق کر دے۔ (ط)

کیساتھ ساتھ پڑھتا رہے۔ یا شیخ خود یا کوئی دوسرا ثقہ اور قابل اعتماد شخص کتاب کھول کر موازنہ کرے[1]۔

(ب)۔ قراءۃ کا حکم:

شیخ کے سامنے قراءت کے طریق سے حدیث روایت کرنا مذکورہ بالا تمام صورتوں میں بالاتفاق صحیح ہے، تاہم بعض متشددین حضرات کو اس سے اتفاق نہیں[2]۔

(ج)۔ قراءت کا مرتبہ:

اس میں محدثین کرام کے تین اقوال ہیں۔

۱۔ امام مالکؒ، امام بخاریؒ اکثر علماء حجاز و کوفہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ سماع کے مساوی ہے[1]۔

۲۔ جمہور اہل مشرق کا مذہب یہ ہے کہ یہ سماع سے درجہ میں کچھ کم ہے، اور یہی صحیح ہے[2]۔

---

[1] دیکھئے: مقدمہ ابن الصلاح: ۲۵۴، الالماع: ۱۰۳، التقریب والتیسیر: ۵۵، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۳۴۵، المنہل الروی: ۹۱، فتح المغیث: ۲/ ۲۵، تدریب الراوی: ۱/ ۴۳۳۔ (م)

[2] حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں۔

"والرواية بها سائغة عند العلماء، إلا عند شُذاذ لا يعتمد بخلافهم." (اختصار علوم الحدیث: ۱۱۰)

"قراءت کے طریق سے روایت سے اہل علم کے ہاں مقبول ہے، سوائے چند لوگوں کے جن کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں۔"

جن حضرات کے نزدیک یہ مقبول نہیں، ان میں ابوعاصم نبیل، وکیع، محمد بن سلام اور عبدالرحمن بن سلام جمحی سرفہرست ہیں، چنانچہ خطیب بغدادیؒ نے وکیعؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہم نے حدیث بذریعہ عرض کبھی قبول نہیں کی۔ محمد بن سلام سے منقول ہے کہ انہوں نے مالک بن انسؒ کو دیکھا کہ ان کے سامنے احادیث پڑھی جارہی تھیں، لیکن انہوں نے سماع نہیں کیا۔ اسی طرح عبدالرحمن بن سلام جمحی اس کے قائل نہ تھے تو امام مالکؒ نے کہا کہ اسے میری مجلس سے نکال دو۔ دیکھئے: الکفایہ: ۲۷۲، المحدث الفاصل بین الراوی والواعی: ۴۲۱۔ (م)

[1] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۵۴، معرفۃ علوم الحدیث: ۲۵۷، الکفایۃ فی علم الروایۃ: ۲۷۰، الالماع: ۷۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۳۴۱، التقریب والتیسیر: ۵۵۔ (م)

[2] حافظ ابن الصلاحؒ اور حافظ زین الدین عراقیؒ نے اس مذہب کو صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: فتح المغیث للعراقی: ۲/ ۱۹۳، الالماع: ۷۳، النکت للزرکشی: ۳/ ۴۸۲۔ (م)

۳۔ امام ابو حنیفہؒ اور ابن ابی ذئبؒ[(۱)] سے مروی ہے کہ یہ سماع سے اعلیٰ ہے، ایک روایت میں امام مالکؒ سے بھی یہی منقول ہے[(۲)]۔

(د)۔ الفاظِ اداء:

اس سلسلہ میں درج ذیل تین قسم کے الفاظ ہیں:

۱۔ احوط الفاظ: وہ الفاظ ہیں جو قراءت کے مفہوم کو صراحت کیساتھ اداء کرے، مثلاً یوں کہا جائے: "قَرَءْتُ عَلٰی فُلَانٍ". (میں نے فلاں کے سامنے پڑھا) ۔یا "قُرِئَ عَلَيْهِ وَأَنَا أَسْمَعُ فأقرَّ به". (شیخ کے سامنے حدیث پڑھی گئی اور میں سن رہا تھا) اور شیخ نے اس کو تسلیم کر لیا کہ یہ میری حدیث ہے[(۱)]۔

۲۔ جائز الفاظ: وہ تمام الفاظ جو سماع پر دال ہوں اور قراءت کیساتھ مقید ہوں، مثلاً: "حَدَّثَنَا قِرَاءَةً عَلَيْهِ". (شیخ نے ہمیں حدیث کی جب کہ یہ حدیث اس کے سامنے پڑھی جا رہی تھی)[(۲)]۔

---

(۱) محمد بن عبد الرحمن بن مغیرہ بن حارث بن ابی ذئب، ابو حارث: ۸۰ھ کو پیدا ہوئے، قریش کے قبیلہ بنی عامر بن لؤی سے تعلق تھا، جلیل القدر تابعی اور راوی حدیث ہیں، مدینہ منورہ میں مفتی رہے، اپنے دور کے عظیم محدث اور بلند پا عالم تھے، امام مالکؒ اور امام احمدؒ سے ان کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: ابن ابی ذئب نیک صالح اور حق گو عالم تھے۔ ۱۵۸ھ کو وفات پائی۔ (التاریخ الکبیر: ۱/ ۱۵۲، وفیات الاعیان: ۴/ ۱۸۳، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۹۱، سیر اعلام النبلاء: ۷/ ۱۳۹، الاعلام للزرکلی: ۶/ ۱۸۹)(م)

(۲) علامہ ابن فارس نے امام مالکؒ کا قول اس کی تائید میں نقل کیا ہے، ابن جریج اور حسن بن عمارہ سے بھی اسی طرح منقول ہے اور خطیب بغدادیؒ نے امام مالکؒ سے یہی قول نقل کیا ہے، لیث بن سعد، شعبہ، ابن ہیصہ، یحیی بن سعید ضبی، ابو عبید قاسم بن سلام اور حاتم سے بھی یہی رائے منقول ہے۔ دیکھئے: الکفایۃ: ۲۷۶، الالماع: ۷۳، المحدث الفاصل: ۵۲۲، مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۵۴، النکت للزرکشی: ۳/ ۴۸۰۔ (م)

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۵۵، المنہل الروی: ۹۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۳۴۹، اختصار علوم الحدیث: ۱۱۱، فتح المغیث: ۲/ ۲۸۔ (م)

(۲) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۵۵، المنہل الروی: ۹۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۳۴۹، اختصار علوم الحدیث: ۱۱۱، فتح المغیث: ۲/ ۲۸۔ (م)

٣۔ ایک اور مشہور لفظ جس پر اکثر محدثین کا عمل ہے اور وہ لفظ فقط: ''أَخْبَرَنا''۔(شیخ نے ہمیں خبر دی) کا ہے[1]۔

٣-اجازۃ (اجازت دینا)

(الف)۔ اجازۃ کی تعریف:

زبانی یا تحریری طور پر روایت کی اجازت دینا[2]۔

(ب)۔ اجازۃ کی صورت:

اس کی صورت یہ ہے کہ شیخ اپنے کسی شاگرد سے یہ کہے: ''أَجَزْتُ لَكَ أَنْ تَرْوِيَ عَنِّيْ صَحِيْحَ الْبُخَارِي'' (میں نے تجھے اس بات کی اجازت دے دی کہ تم میری طرف سے صحیح بخاری کی روایت کرو)[1]۔

---

(١) قراءۃ علی الشیخ کے لیے مطلقاً لفظ ''حدثنا'' اور ''اخبرنا'' کا استعمال کرنے میں اہل علم کا اختلاف ہے: بعض محدثین کرام نے اسے مطلقاً ممنوع قرار دیا ہے اور یہ ابن مبارک، یحیی بن یحیی، امام احمد بن حنبل اور امام نسائیؒ وغیرہم کی رائے ہے۔ اور اکثر حجازیین اور کوفیین کا مذہب یہ ہے کہ قراءۃ علی الشیخ سماع کی طرح ہے اس لیے اس پر ''حَدَّثَنا، وأَخْبَرَنا، وأَنْبَأَنا'' کا اطلاق جائز ہے۔ یہ امام زہریؒ، امام مالکؒ، سفیان بن عیینہ، یحیی بن سعید قطانؒ اور امام بخاریؒ کا مذہب ہے۔ اور بعض محدثین فرماتے ہیں کہ ان دونوں لفظوں میں فرق ہے کہ قراءۃ علی الشیخ کے لیے ''حدثنا'' کا اطلاق ممنوع ہے اور جب کہ ''اخبرنا'' کا استعمال جائز ہے۔ یہ مذہب امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کا ہے اور یہی امام مسلم سے بھی منقول ہے اور تمام اہل مشرق کا بھی یہی مذہب ہے۔ دیکھئے: الکفایۃ:٢٩٧، مقدمہ ابن الصلاح:٢٥٥، ارشاد طلاب الحقائق:١/٣٤٩، المنہل الروی:٩١، اختصار علوم الحدیث:١١١، فتح المغیث:٢/٢٩۔(م)

(٢) تاج العروس:١٥/٧٥، مقاییس اللغۃ:١/٤٩٤، النکت للزرکشی:٢/٥٠٢۔(م)

(١) حافظ ابن الصلاحؒ (م٦٤٣ھ) فرماتے ہیں کہ اجازت اس وقت مستحسن ہوتی ہے جب اجازت دینے والا اس چیز کا عالم اور ماہر ہو جس کی وہ اجازت دے رہا ہے اور مجازلہ بھی عالم ہو۔ اس لیے کہ اس میں توسع اور رخصت ہے جس کے لیے اہل علم ضرورت کی وجہ سے اس کے اہل ہیں۔ بعض اہل علم نے تو اس کو شرط قرار دیا ہے۔ خطیب بغدادیؒ (م٤٦٣ھ) فرماتے ہیں۔ =

(ج)۔ اجازۃ کی اقسام وانواع:

اجازت کی متعدد اقسام وانواع ہیں، تاہم ان میں سے صرف پانچ کو ذکر کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہوں:

۱۔ شیخ کسی معین شخص کو معین کتاب کی اجازت دے، مثلاً یوں کہے: ”أَجَزْتُكَ صَحِيْحَ الْبُخَارِي“. (میں نے تمہیں صحیح بخاری کی اجازت دے دی)[1]۔

= وَكَانَ مَالِكٌ يَشْتَرِطُ فِي الْإِجَازَةِ أَنْ يَكُونَ فَرْعُ الطَّالِبِ مُعَارَضًا بِأَصْلِ الرَّاوِي ، حَتَّى كَأَنَّهُ هُوَ، وَأَنْ يَكُونَ الْمُجِيزُ عَالِمًا بِمَا يُخْبِرُ بِهِ ، مَعْرُوفًا بِذَلِكَ ، ثِقَةً فِي دِينِهِ وَرِوَايَتِهِ ، وَأَنْ يَكُونَ الْمُسْتَجِيزُ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ ، وَعَلَيْهِ سَمْتُهُ حَتَّى لَا يُوضَعَ الْعِلْمُ إِلَّا عِنْدَ أَهْلِهِ. (الكفاية:۳۱۷)

” امام مالکؒ اجازت کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ طالب علم کے پاس مسودہ اصل راوی کیساتھ مقابل ہو، گویا یہ وہی ہے اور اجازت دینے والا اس چیز کا عالم ہو جس کی اجازت دے رہا ہے اور اس میں سلسلے میں معروف ومتدین ہو اور روایت ثقہ ہو۔ اور جس کو اجازت دی جارہی ہے وہ اہل علم میں سے ہو اور اس میں اسے شہرت حاصل ہو، تاکہ علم نااہل لوگوں کے پاس نہ جائے۔“

اجازت دینے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اجازت نامہ لکھے تو اسے الفاظ میں بھی ادا کرے اور وہ صرف کتاب پر اکتفاء کرے تو یہ جائز ہوگا، بشرطیکہ اجازت کا قصد ساتھ شامل ہو۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۲۷۷، الالماع:۹۵، النکت للزرکشی:۳/۵۲۹۔ (م)

[1] حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں حتی کہ اہل ظواہر کو بھی اس نوع کے جواز میں اختلاف نہیں، قاضی ابو الولید باجیؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کے جواز میں امت کے سلف اور خلف کا کوئی اختلاف نہیں۔ حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) اس پر تبصرۃ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”قُلْتُ: هذا باطِلٌ، فقَدْ خالَفَ في جَوَازِ الروايَةِ بالإجَازَةِ جَماعاتٌ مِنْ أَهْلِ الحديثِ والفُقَهاءِ والأُصُولِيينَ، وذلكَ إِحْدَى الروايتَيْنِ عَنِ الشَّافِعِيِّ رضي الله عنه، رُوِيَ عَنْ صاحِبِهِ الرَّبيعِ بنِ سُلَيمانَ، قالَ: كانَ الشَّافِعِيُّ لاَ يَرَى الإجَازَةَ في الحديثِ. قالَ الربيعُ: أَنَا أُخَالِفُ الشَّافِعِيَّ في هذا.“ (مقدمۃ ابن الصلاح:۲۶۶)

”میں کہتا ہوں کہ یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ روایت بذریعہ اجازت کے جواز کی مخالفت محدثین، فقہاء اور اصولیین کے کئی گروہوں نے کی ہے اور امام شافعیؒ سے بھی ایک روایت منقول ہے، ان کے =

۲۔ شیخ کسی معین شخص کو غیر معین روایات کی اجازت دے، مثلاً یوں کہے: ”أجزْتُكَ رِوَايَةَ مَسْمُوْعَاتِيْ“. (میں نے تمھیں اپنی مسموعات کی روایت کی اجازت دے دی)[1]۔

۳۔ شیخ غیر معین کو غیر معین روایات کی اجازت دے، مثلاً یوں کہے: ”أَجزْتُ أَهْلَ زَمَانِيْ رِوَايَةَ مَسْمُوْعَاتِيْ“. (میں نے اپنے زمانے کے لوگوں کو اپنی مسموعات روایت کرنے کی اجازت دے دی)[1]۔

= شاگرد ربیع بن سلیمان روایت کرتے ہیں کہ امام شافعی حدیث میں طریق اجازت کے قائل نہ تھے، ربیع کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں میرا امام شافعی سے اختلاف ہے۔“

حافظ ابن الصلاحؒ (۶۴۳ھ) عدم جواز پر مزید بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شوافع کی ایک جماعت اس کے ابطال کی قائل ہیں، ان میں قاضی حسین بن محمد مروزی اور قاضی ابوالحسن ماوردی شامل ہیں اور محدثین میں جو لوگ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان میں ابراہیم بن اسحاق حربی، ابومحمد عبداللہ بن محمد اصبہانی، حافظ ابونصر وایلی شامل ہیں۔ حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) اس بحث کے آخر میں رقم طراز ہیں۔

ثُمَّ إنَّ الذي اسْتَقَرَّ عليهِ العَمَلُ، وقَالَ بهِ جَماهِيْرُ أَهْلِ العِلْمِ مِنْ أَهْلِ الحديثِ وغَيْرِهِمْ: القَوْلُ بتَجْوِيزِ الإجَازَةِ وإباحَةِ الروايَةِ بها. (مقدمۃ ابن الصلاح:۲۶۷)

”پھر جس رائے پر عملی استقراء ہوا اور جمہور محدثین کا موقف ٹھہرا وہ طریق اجازت کا جواز اور اس کی روایت کی اباحت کا ہے۔“ (م)

(۱) اس کی حیثیت پر حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”فالخِلَافُ في هذا النوعِ أَقْوَى وأَكثَرُ. والجمهُورُ مِنَ العُلَماءِ مِنَ المحدِّثِينَ والفُقَهَاءِ وغَيْرِهِمْ عَلَى تَجْوِيزِ الروايَةِ بها أيضاً، وعَلَى إيجابِ العَمَلِ بما رُوِيَ بها بِشَرْطِهِ.“ (مقدمۃ ابن الصلاح:۲۶۸)

”اس نوع میں بہت زیادہ اختلاف ہے، جمہور علماء محدثین اور فقہاء وغیرہ اس کی روایت کے بھی جواز کے قائل ہیں اور اس طرح کی روایت پر مشروط وجوب عمل کی رائے رکھتے ہیں۔“

خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) اور حافظ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) نے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ دیکھئے: الکفایۃ:۳۳۴، فتح المغیث:۲/ ۲۲۸۔ (م)

(۱) حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) اجازت کی اس قسم کے متعلق فرماتے ہیں۔

”فَهذا نَوعٌ تَكَلَّمَ فيهِ المتأخِّرُونَ مِمَّنْ جَوَّزَ أَصْلَ الإجَازَةِ واخْتَلَفُوا في جَوَازِهِ: فإنْ كَانَ ذَلكَ مُقَيَّداً بوَصْفٍ حاصِرٍ أَوْ نحوِهِ فَهوَ إلى الجوَازِ أقرَبُ.“ (مقدمۃ ابن الصلاح:۲۶۸) =

۴۔ شیخ کسی مجہول کتاب کی اجازت دے یا کسی مجہول شخص کو دے ، مثلاً یوں کہے: ”أَجَزْتُكَ كِتَابَ السُّنَنِ“. (میں نے تمہیں کتاب السنن کی اجازت دی) حالانکہ شیخ نے متعدد کتب سنن کو روایت کیا ہے، اب یہ معلوم نہیں کہ کونسی کتاب کی اجازت دی؟ یا شیخ یوں کہے: ”أَجَزْتُ لِمُحَمَّدِ بْنِ خَالِدِ الدِّمَشْقِيْ“. (میں نے محمد بن خالد دمشقی کو اجازت دی) جب کہ اس نام کے متعدد افراد ہوں، تو اس صورت میں یہ مجہول کو اجازت دی گئی[1]۔

۵۔ شیخ کسی معدوم اور غیر موجود کو اجازت دے، خواہ معدوم کو روایت کی اجازت کسی موجود کو ملنے والی اجازت کے ضمن میں دے، مثلاً شیخ یوں کہے: ”أَجَزْتُ لِفُلَانٍ وَّلِمَن يُّوْلَدُ لَهُ“. (میں نے فلاں کو اور اس کے ہاں آئندہ پیدا ہونے والی اولاد کو اجازت دے دی) یا معدوم کو

= ”یہ وہ نوع ہے جس کے متعلق متاخرین نے ان سے جنہوں نے اصل اجازت کو جائز قرار دیا کلام کیا ہے اور اس کے جواز کے بارے میں اختلاف کیا ہے اور یہ اجازت بطریق حصر مقید ہو تو جواز کے قریب ہو گی۔“

قاضی عیاض بن موسیٰ (م ۵۴۴ھ) فرماتے ہیں۔

”فما أحسبهم اختلفوا في جوازه ممن تصح عنده الإجازة ولا رأيت منعه لأحد لأنه محصور موصوف كقوله لأولاد فلان أو إخوة فلان.“ (الالماع:۱۰۱)

”میں نہیں سمجھتا کہ جن لوگوں کے نزدیک اجازت صحیح ہے وہ اس کے جواز کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں اور نہ میں نے کسی کو اس سے روکتے بھی نہیں دیکھا اس لیے کہ اس میں حصر ہے اور اس کا وصف بیان کیا گیا ہے، جیسے کسی کا قول: میں اس شخص کی اولاد کے یا فلاں بھائیوں کے لیے۔“

تقریباً یہی بات امام نوویؒ (م ۶۷۶ھ)، حافظ زین الدین عراقیؒ (م ۸۰۶ھ) اور حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) نے بھی کہی ہے اور اس کو حافظ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) نے نقل کیا ہے، حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) نے ان محدثین کا ذکر کیا ہے جو اس کے جواز کے قائل ہیں: ان میں خطیب بغدادیؒ، حافظ ابو عبد اللہ بن مندہؒ، قاضی ابو الطیب طبری اور اندلس کے مشاہیر میں ابو محمد بن سعید میں شامل ہیں۔ لیکن حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) اور علامہ سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) کا اپنا رجحان عدم جواز معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۳۸، فتح المغیث للعراقی: ۲/۲۰۶، اختصار علوم الحدیث: ۱۱۸، فتح المغیث للسخاوی: ۲/۲۴۷، تدریب الراوی: ۱/۴۵۳۔ (م)

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۶۹، فتح المغیث للعراقی: ۲/۲۰۶۔ (م)

مستقل طور پر اجازت دے مثلاً یوں کہے: "أَجَزْتُ لِمَن يُّوْلَدُ لِفُلَانٍ". (میں نے فلاں کی پیدا ہونے والی اولاد کو اجازت دے دی)[1]۔

(د)۔ اجازت کا حکم:

ا۔ پہلی قسم کے متعلق جمہور محدثین کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس صورت میں روایت کرنا اور اس پر عمل کرنے دونوں درست ہیں تاہم بعض اہل علم نے اسے باطل قرار دیا ہے اور امام شافعیؒ سے ایک روایت بھی یہی ہے[1]۔

۲۔ باقی اقسام اجازت کے جواز میں کثیر اور شدید اختلاف ہے، بہر حال تحمل حدیث کا یہ طریقہ بہت ہی کمزور ہے، جس میں ذرا بھر بھی گنجائش نہیں۔

---

(۱) حافظ زین الدین عراقیؒ (م۸۰۶ھ) فرماتے ہیں کہ اجازۃ للمعدوم کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم یہ ہے کہ معدوم موجود پر معطوف ہو، جیسے کوئی کہے کہ میں نے فلاں شخص کو اجازت دی اور اس کے بیٹے کو اور اس کے بعد آنے والی نسل کو۔ یا جیسے میں نے تجھے اجازت دی اور تیرے ہاں جو اولاد ہوں اس کو بھی اجازت دے دی۔ دوسری قسم یہ ہے کہ شیخ موجود پر عطف کیے بغیر معدوم شخص کو اجازت دے، جیسے کسی کا قول کہ میں نے اس کو اجازت دی جو فلاں شخص کے ہاں پیدا ہو گا۔ (فتح المغیث:۲/۲۰۹)

اجازۃ للمعدوم کی حیثیت کے متعلق محدثین کرام کا اختلاف ہے، اس کے جواز میں دو آراء ہیں، ایک یہ کہ دو قسموں میں فرق کر کے ایک کو جائز اور دوسری کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا گیا ہے اور دوسری رائے یہ ہے کہ بغیر فرق کے مطلقاً جائز ہے، خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) نے اجازۃ للمعدوم کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے اور کہتے ہیں کہ میں ابو یعلی بن فراء اور ابو الفضل عمروس مالکی سے سنا ہے کہ وہ اسے جائز قرار دیتے ہیں، خطیب بغدادیؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ ابو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے تلامذہ بھی دونوں قسموں کے جواز کے قائل ہیں۔ قاضی عیاض مالکیؒ (م۵۴۴ھ) فرماتے ہیں۔

"فأجازها معظم الشيوخ المتأخرين وبها استمر عملهم بعد شرقا وغربا."(الالماع:۱۰۴)

"متاخرین مشائخ اس کو جائز قرار دیا ہے اور اس پر ہمیشہ پوری دنیا کے علماء کا عمل رہا ہے۔"

محدثین کرام کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اجازہ معدوم جائز نہیں، خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) نے قاضی ابو الطیب طبری کی رائے نقل کی ہے کہ وہ اسے مطلقاً جائز کہتے ہیں ۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: فتح المغیث للعراقی:۱/۲۰۹، الکفایۃ:۳۲۵، مقدمۃ ابن الصلاح:۱۷۲۔ (م)

(۱) الکفایۃ فی علم الروایۃ:۳۱۷، مقدمۃ ابن الصلاح:۲۶۶۔ (م)

(ھ)۔ الفاظِ اداء:

۱۔ اولیٰ الفاظ: سب سے بہتر الفاظ یہ ہیں: "أَجَازَ لِيْ فُلَانٌ". (مجھے فلاں شخص نے روایت حدیث کی اجازت دی ہے)[1]۔

۲۔ جائز الفاظ: وہ تمام الفاظ جو سماع اور قراءت پر دال ہوں، بشرطیکہ جازت کے لفظ کیساتھ مقید ہوں، مثلاً "حَدَّثَنَا إِجَازَةً" (شیخ نے ہمیں اجازت کے طور پر حدیث بیان کی) یا "أَخْبَرَنَا إِجَازَةً". (شیخ نے ہمیں اجازت کے طور پر خبر دی)[2]۔

۳۔ متاخرین حضرات کے نزدیک اجازت کے طور پر حاصل کی جانے والی حدیث کو "أَنْبَأَنَا" کے لفظ کیساتھ بیان کیا جائے گا[3]۔[1]

---

[1] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۸۲۔ (م)

[2] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۸۱، تدریب الراوی: ۴۷۷۔ (م)

[3] اس قول کو علامہ ابو العباس ولید بن بکر غَمریؒ نے اپنی کتاب "لِوَجَازَةُ فِي تَجْوِيزِ الْإِجَازَةِ" میں اختیار کیا ہے۔ (ط)

ابو العباس ولید بن بکر غمری کا مختصر تعارف یہ ہے:

ولید بن بکر بن مخلد بن ابی دُبار غمری اندلسی: اپنے دور کے عظیم محدث، لغوی اور جید عالم تھے، حافظ عبد الغنی بن سعید، ابو عبد اللہ حاکم، ابو طالب عُشاری، ابو سعد سمان اور احمد بن منصور مغربی جیسے اساطین علم نے ان سے کسب فیض کیا ہے، حصول علم کے سلسلے میں نیشاپور اور عراق کے اسفار کیے، دینور میں ۳۹۲ھ کو وفات پائی۔

(تاریخ بغداد: ۱۳/ ۴۵۰، تذکرۃ الحفاظ: ۳/ ۱۰۸۰، سیر اعلام النبلاء: ۱۷/ ۶۵، شذرات الذہب: ۳/ ۱۴۱)(م)

[1] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۸۱، تدریب الراوی: ۴۷۷۔ (م)

۴-مناولہ [1]

(الف)۔ مناولہ کے اقسام وانواع:

مناولہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ مناولہ مع الاجازۃ ۲۔ مناولہ بغیر الاجازۃ

۱۔ مناولہ مع الاجازۃ:

یہ اجازت کے انواع میں سے علی الاطلاق سب سے اعلیٰ نوع ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ شیخ کسی طالب علم کو اپنی کتاب دے کر یہ کہے "یہ فلاں شیخ سے میری روایات ہیں، اب تم مجھ سے اس کو روایت کرتے رہو" پھر خواہ شیخ کتاب شاگرد کی ملکیت میں رہنے دے یا اعارۃً دے تاکہ لکھنے کے بعد واپس کرے [1]۔

---

[1] مناولہ کے لغوی معنی عطا کرنے اور بخشش کرنے کے ہیں اور اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ استاذ اپنے شاگرد کو لکھی ہوئی احادیث یا کتاب دے تاکہ وہ اسے روایت کرے۔ محمد بن اسماعیل امیر صنعانیؒ (م۱۱۸۲ھ) فرماتے ہیں۔

"المناولة و" هي لغة العطية ومنه حديث الخضر: "فحملوهما بغير نول" أي عطاء واصطلاحا إعطاء الطالب شيئا من مروياته مع إجازته له به صريحا أو كناية."(توضیح الافکار:۲/۲۰۳)

"مناولہ لغت میں عطیہ کے معنی میں آتا ہے اور اسی سے حدیث خضر کے الفاظ "فحملوهما بغير نول" ہیں، جس میں نول کے معنی عطا کرنے کے ہیں اور اصطلاحاً اس مراد استاذ کا طالب علم کو اپنی مرویات میں کچھ عطا کرنا ہے تاکہ وہ اس کی روایت کر سکے۔ یہ اجازت صریحاً بھی ہو سکتی ہے اور کنایۃً بھی ہو سکتی ہے۔"

علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) فرماتے ہیں کہ مناولہ کی بنیاد اور اساس وہ حدیث ہے جس کو امام بخاریؒ (م۲۵۶ھ) نے کتاب العلم میں تعلیقاً نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک فوجی مہم کے امیر کو خط دیا اور اسے کہا کہ فلاں جگہ پر پہنچنے سے پہلے اسے نہ پڑھنا جب وہ اس مکان پر پہنچے تو اسے لوگوں کے سامنے پڑھا اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آگاہ کیا۔ دیکھئے: تدریب الراوی:۱/۴۶۷۔(م)

[1] مناولہ مع الاجازۃ کی کئی صورتیں ہیں، جو تمام محدثین نے ذکر کی ہیں:

۱۔ پہلی صورت وہ ہے جو مصنف نے ذکر کی ہے کہ شیخ طالب علم کو اپنے سماع کی اصل کتاب، یا اس سے موازنہ کی ہوئی کتاب دے اور کہے: فلاں شخص سے یہ میری مسموعات یا روایات ہیں تم مجھی سے روایت =

۲۔ مناولہ بغیر الاجازۃ:

اس کی صورت یہ ہے کہ شیخ طالب علم کو صرف یہ کہہ کر کتاب دے دے کہ "یہ میری روایات ہیں" تاہم اجازت کے متعلق کچھ تصریح نہ کرے[1]۔

(ب)۔ مناولت کی صورت میں روایت کا حکم:

مناولہ مع الاجازۃ کا حکم یہ ہے کہ اس صورت میں آگے احادیث کی روایت درست ہے، اور اس کا مرتبہ سماع اور قراءت دونوں سے کم تر ہے، تاہم مناولہ بغیر الاجازۃ کا حکم صحیح قول کے مطابق یہ ہے کہ اس صورت میں آگے احادیث کی روایت درست نہیں[1]۔

(ج)۔ الفاظِ اداء:

۱۔ احسن اور اولیٰ الفاظ یہ ہیں: کہ راوی یوں کہے "نَاوَلَنِيْ" "شیخ نے یہ میرے حوالے کی ہے" لیکن اگر مناولہ مع الاجازۃ ہو تو "نَاوَلَنِيْ، وَأَجَازَ". "شیخ نے یہ میرے حوالے کرکے مجھے اس کی اجازت دی ہے" کے الفاظ کہے۔

= کرو۔ یا میں نے تمہیں اجازت دی کہ تم اسے روایت کرو۔ پھر یا تو اسے ملکیت میں دے یا اعارۃ دے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طالب علم شیخ کے پاس کوئی کتاب یا اس کے ذخیرہ احادیث میں سے کوئی جزء لائے اور شیخ کے سامنے پیش کرے اور شیخ اس پر غور کرے اور پھر وہ کتاب اسے واپس دے اور کہے کہ یہ فلاں شخص سے منقول میری احادیث ہیں، یا میرے شیوخ سے مروی روایات اس میں موجود ہے، لہٰذا تم مجھ سے اس کی روایت کرو۔ اور میری طرف سے تمہیں اس کی اجازت ہے۔ اسے عرض المناولہ کہتے ہیں۔ مناولہ کی یہ دونوں صورتیں قابل قبول ہیں۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شیخ طالب علم کو کتاب دے اور اس سے روایت کرنے کی اجازت دے پھر شیخ وہ کتاب اپنے پاس رکھے اور طالب علم کو نہ دے۔ یہ صورت ماقبل دونوں صورتوں سے کم درجہ کی ہے اس لیے کہ طالب علم نے جو حاصل کیا تھا وہ اس کے قبضے میں نہیں۔ اسے روایت کی اجازت ہے بشرطیکہ اسے کتاب مل جائے۔

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ طالب علم کوئی کتاب لائے اور شیخ سے کہے کہ یہ آپ کی روایات ہیں، مجھے اس کی اجازت دیجئے اور شیخ بغیر دیکھے درخواست قبول کرلیتا ہے اور اسے اجازت دیتا ہے۔ یہ جائز نہیں۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۷۸۔ (م)

[1] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۸۰۔ (م)

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۷۸، فتح المغیث للعراقی: ۲۱۹/۳۔

۲۔ جائز الفاظ: وہ تمام الفاظ ہیں جو سماع یا قراءت پر دال ہوں، بشرطیکہ یہ الفاظ "حَدَّثَنَا مُنَاوَلَةً". "شیخ نے ہمیں مناولہ کی صورت میں حدیث بیان کی"۔ یا "أَخْبَرَنَا مُنَاوَلَةً وَّ إِجَازَةً". "شیخ نے ہمیں مناولہ مع الاجازۃ کی صورت میں خبر دی" کے قید کیساتھ مقید ہوں[1]۔

۵-مکاتبہ[2]

(الف)۔ مکاتبہ کی صورت:

مکاتبہ کی صورت یہ ہے کہ شیخ اپنی روایات کسی موجود یا غائب شخص کے لیے خود لکھے یا لکھوا کر دے[1]۔

(ب)۔ مکاتبہ کے اقسام وانواع:

مکاتبہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ مکاتبہ مع الاجازۃ ۲۔ مکاتبہ بغیر الاجازۃ

۱۔ مکاتبہ مع الاجازۃ: مثلاً شیخ یوں کہے: "أَجَزْتُكَ مَا كَتَبْتُ لَكَ أَوْ إِلَيْكَ". "میں نے

---

(۱) دیکھئے: تدریب الراوی: ۱/۴۷۷۔ (م)

(۲) مکاتبہ کے معنی باہمی کتابت کے ہیں، لیکن محدثین کی اصطلاح میں سے مراد یہ ہے کہ شیخ خود لکھ کر یا کسی سے اپنی مرویات لکھوا کر حاضر یا حاضر شاگرد کو دے۔ حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) مکاتبہ کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"المكاتَبَةُ، وهيَ أَنْ يَكْتُبَ الشَّيْخُ إلى الطالِبِ وهوَ غائِبٌ شَيئاً مِنْ حَدِيْثِهِ بِخَطِّهِ أَوْ يَكتُبَ لهُ ذلكَ وهوَ حاضِرٌ. ويَلْتَحِقُ بذلكَ مَا إذا أَمَرَ غيرَهُ بأَنْ يَكْتُبَ لهُ ذلكَ عنهُ إليهِ." (مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۸۴)

"مکاتبہ یہ ہے کہ شیخ اپنی حدیث میں سے کوئی چیز اپنے خط میں اس طالب کے لیے لکھے جو غیر موجود ہو، یا اس کے لیے لکھے جو حاضر ہو۔ اس کیساتھ وہ صورت بھی ملحق ہے کہ جب اس نے کسی دوسرے سے کہا کہ وہ اس کی طرف سے اس کے لیے لکھ دے۔"

مکاتبہ کی یہی تعریف معمولی تغیر کیساتھ امام نوویؒ (م۶۷۶ھ)، حافظ زین الدین عراقی (م۸۰۶ھ) اور دیگر حضرات نے کی ہے۔ دیکھئے: ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۴۰۸، فتح المغیث: ۳/۲۲۴، التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/۱۰۴۔ (م)

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۸۴، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۴۰۸، التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/۱۰۴۔ (م)

جو کچھ لکھ کر تمہیں دیا ہے یا تمہاری طرف بھیجا ہے اس کو روایت کرنے کی تمہیں اجازت دی ہے۔" وغیرہ۔

۲۔ مکاتبہ بغیر الاجازۃ: شیخ طالب علم کے لیے چند احادیث لکھ کر بھیج دے لیکن روایت کرنے کی اجازت نہ دے[۱]۔

(ج)۔ مکاتبہ کی صورت میں روایت کا حکم:

مکاتبہ مع الاجازۃ کا حکم یہ ہے کہ اس صورت میں روایت کرنا صحیح ہے اور یہ صورت اپنی صحت و قوت میں مناولہ مع الاجازۃ کی مانند ہے[۲]، تاہم مکاتبہ بغیر الاجازۃ کے حکم میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس صورت میں روایت کرنا ممنوع قرار دیا ہے، جب کہ بعض نے اجازت بھی دی ہے، البتہ محدثین کرام کے نزدیک جواز کا پہلو راجح ہے، اس لیے کہ اس سے اجازت خود بخود مفہوم ہوتا ہے[۱]۔

(د)۔ کیا تحریر کی تصدیق کے لیے گواہ شرط ہیں؟

ا۔ بعض حضرات نے تحریر کے لیے گواہی کی شرط کو ضروری قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ ایک تحریر دوسری تحریر کے مشابہ ہوتی ہے، اس لیے مکتوب کی تعیین کے لیے گواہی ضروری ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

۲۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ صرف اتنا کافی ہے کہ مکتوب الیہ کاتب کی تحریر پہچانتا ہو اور

---

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸۵، ارشاد طلاب الحقائق:۱/۴۰۸، التبصرۃ والتذکرۃ:۲/۱۰۴۔(م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸۴، ارشاد طلاب الحقائق:۱/۴۰۸، المنہل الروی:۹۸، اختصار علوم الحدیث:۱۲۵، التبصرۃ والتذکرۃ:۲/۱۰۴۔(م)

(۱) حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) اس کی مکاتبہ بدون الاجازہ کی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"فقَدْ أجازَ الروايةَ بها كثيرٌ مِنَ المتَقدِّمِينَ والمتأَخِّرينَ، مِنْهُمْ: أيُّوبُ السِّخْتيانِيُّ، ومَنْصُورٌ، واللَّيْثُ بنُ سَعْدٍ وقالَهُ غيرُ واحِدٍ مِنَ الشَّافِعِيِّينَ، وجَعَلَها أبو الْمُظَفَّرِ السَّمْعانِيُّ -مِنْهُمْ- أَقْوَى مِنَ الإجَازةِ، وإليهِ صارَ غيرُ واحدٍ مِنَ الأُصُوليِّيْنَ." (مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸۵) =

یہی قول زیادہ صحیح ہے[1]۔

(ھ)۔ الفاظ اداء:

۱۔ احسن اور اولیٰ الفاظ: وہ ہیں جو کتابت پر صراحت کیساتھ دال ہوں، مثلاً یوں کہنا، "كَتَبَ إِلَيَّ فُلَانٌ". "فلاں نے مجھے یہ کتاب لکھ کر بھیجی ہے"۔

۲۔ جائز الفاظ: وہ تمام جو سماع اور کتابت پر دال ہوں بشرطیکہ کے کتابت کے الفاظ کیساتھ مقید ہوں، مثلاً یہ کہنا، مثلاً "حَدَّثَنِيْ فُلَانٌ كِتَابَةً". "مجھ سے فلان نے تحریری طور پر بیان کیا" یا "أَخْبَرَنِيْ فُلَانٌ كِتَابَةً". "مجھے تحریری طور پر خبر دی"[1]۔

= "متقدمین اور متاخرین میں ایک بڑی تعداد نے اسے جائز قرار دیا ہے ان میں ایوب سختیانی، منصور اور لیث بن سعد شامل ہیں اور کئی شوافع علماء نے یہی رائے ظاہر کی ہے۔ ابو مظفر سمعانی نے اسے مطلق اجازت سے زیادہ قوی قرار دیا ہے اور کئی اصولیین نے کا یہ یہی موقف ہے۔"

بعض حضرات اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، جن میں قاضی ماوردی، سیف الدین آمدی وغیرہ شامل ہیں۔ دیکھئے: مقدمہ ابن الصلاح: ۲۸۵، فتح المغیث للعراقی: ۲/ ۲۲۵۔ (م)

[1] اس بات پر محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ طالب علم کے پاس شیخ کی کتاب سے روایت جائز ہے، بشرطیکہ دلیل کیساتھ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ شیخ ہی کی کتاب ہے اور شیخ نے اس کے لیے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور اس کے حکم کے لکھا گیا ہے، دونوں صورتوں میں مکاتبہ ثابت ہو جائے گی۔ البتہ اس کے متعلق اختلاف ہے کہ اگر دلیل نہیں ہے لیکن طالب شیخ کے خط کو پہچانتا ہے تو کیا خط کی معرفت کافی ہو گی؟ امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) اور دیگر حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ کافی نہیں ہے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ ایک خط دوسرے خط کے مشابہ ہو سکتا ہے اس لیے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن محققین حضرات کی رائے یہ ہے کہ خط کی معرفت کافی ایک قسم دلیل ہے اس سے زیادہ کسی چیز کا مطالبہ درست نہیں۔

(مقدمہ ابن الصلاح: ۲۸۵، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۴۱۱، توضیح الافکار: ۲/ ۲۲۹)۔ (م)

[1] دیکھئے: مقدمہ ابن الصلاح: ۲۸۶، الالماع: ۸۶، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۴۱۲۔ (م)

٦-اعلام

(الف)۔ اعلام کی صورت:

اعلام کی صورت یہ ہے کہ شیخ طالب علم کو مطلع کرے کہ یہ حدیث یا یہ کتاب میں نے اپنے شیخ سے سنی ہے[1]۔

(ب)۔ اعلام کی صورت میں روایت کا حکم:

اعلام کی صورت میں حاصل شدہ احادیث کی روایت کے متعلق محدثین کرامؒ کا اختلاف ہے، جس میں دو قول ہیں:

۱۔ اکثر محدثین کرام، فقہاء اور اصولیین جواز کے قائل ہیں[1]۔

۲۔ جمہور محدثین اور دیگر اہل علم عدم جواز کے قائل ہیں، اور یہی قول صحیح ہے، اس لیے کہ بعض اوقات شیخ یہ جانتا ہے کہ یہ اس کی روایت ہے، لیکن کسی خاص علت اور خلل کی وجہ سے وہ مناسب نہیں سمجھتا کہ اس حدیث کی روایت کر دی جائے، تاہم اگر وہ خود روایت کی اجازت دے تو اس صورت میں روایت آگے درست ہو جائے گی[2]۔

---

(۱) اعلام لغت میں خبر دینے اور اعلان کرنے کو کہتے ہیں اور محدثین کی اصطلاح میں سے مراد یہ ہے کہ شیخ طالب علم کو صرف یہ بتائے کہ فلاں کتاب یا حدیث اس کی مرویات یا مسموعات میں سے ہے۔ حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) فرماتے ہیں۔

"إِعْلَامُ الراوي للطَّالِبِ بأَنَّ هذا الحديثَ أَوْ هذا الكِتابَ سَمَاعُهُ مِنْ فُلاَنٍ، أَوْ روايَتُهُ مُقْتَصِراً عَلَى ذلكَ مِنْ غيرِ أَنْ يَقولَ: ((ارْوِهِ عنِّي، أَوْ أَذِنْتُ لَكَ فِي روايتِهِ))، أَوْ نَحْوَ ذلكَ." (مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸۶)

"راوی کا طالب کو یہ بتانا کہ یہ حدیث یا یہ کتاب فلاں شخص کے سماع یا روایت پر مبنی ہے، اسی پر رک جائے بغیر یہ کہے: اس کو مجھ سے روایت کرو۔ یا میں نے تمہیں اسے روایت کرنی اجازت دے دی وغیرہ۔" (م)

(۱) اکثر فقہاء، محدثین اور اصولیین سے یہی منقول ہے، ابن جریج اور شوافع میں ابو نصر بن صباغ اور مالکیہ میں سے ابو بکر عباس بن الولید بن بکر غمری وغیرہ نے اسے اختیار کیا ہے۔ قاضی ابو محمد بن خلاد رامہرمزیؒ نے بعض اہل ظواہر سے یہی رائے نقل کی ہے۔ (مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸۶، المحدث الفاضل:۴۵۱، الالماع:۱۱۰)(م)

(۲) یہ رائے امام محمد بن محمد غزالیؒ، امام ابن حزمؒ، علامہ ماوردیؒ، ابن القطانؒ، علامہ بیضاویؒ، علامہ ابن السبکیؒ اور علامہ سیف الدین آمدیؒ کی ہے۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸۶، احکام الاحکام:۲/۹۱، نہایۃ السوال:۳/۱۹۳، محاسن الاصطلاح:۲۹۰، النکت للزرکشی:۳/۴۳۹، شرح التبصرۃ:۲/۱۸۲۔ (م)

(ج)۔ الفاظِ اداء:

اعلام کی صورت میں راوی یوں کہے: "أَعْلَمَنِيْ شَيْخِيْ بِكَذَا". "میرے شیخ نے مجھے یہ بیان کیا ہے"۔

۷-وصیت

(الف)۔ وصیت کی صورت:

وصیت کی صورت یہ ہے کہ شیخ بستر مرگ پر یا کسی سفر پر روانہ ہوتے وقت کسی شخص کے حق میں اپنی روایت کردہ کتابوں میں سے کسی کتاب کے متعلق وصیت کر دے[1]۔

(ب)۔ وصیت کی صورت میں روایت کا حکم:

بعض اسلاف جواز کے قائل ہیں، لیکن یہ بات غلط ہے، اس لیے کہ شیخ نے اس کے حق میں فقط کتاب کی وصیت کی ہے، روایت کی وصیت نہیں کی، تاہم صحیح قول عدم جواز کا ہے[1]۔

(ج)۔ الفاظِ اداء:

وصیت کی صورت میں راوی یہ الفاظ کہے: "أَوْصٰى إِلَيَّ فُلَانٌ بِكَذَا" "فلان نے مجھے اس کتاب کی وصیت کی" یا "حَدَّثَنِيْ فُلَانٌ وَّصِيَّةً". "فلان نے مجھے وصیت کی صورت میں یہ حدیث بیان کی"۔

۸-وِجادۃ

وِجادۃ (واؤ کے کسرہ کیساتھ) "وَجَدَ" فعل کا مصدر ہے، تاہم یہ مصدر مولد ہے یعنی اس مادہ سے یہ مصدر اہل عرب سے نہیں سنا گیا، بلکہ ایک جدید الاستعمال لفظ ہے[2]۔

---

[1] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۸۸، الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ: ۱۱۵، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۴۱۶، اختصار علوم الحدیث: ۱۲۷۔ (م)

[1] بعض حضرات جواز کے قائل ہیں، جن میں قاضی عیاض مالکیؒ (۵۴۴ھ) سرفہرست ہیں اور جمہور عدم جواز کے قائل ہیں۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۸۸، الالماع: ۱۱۵، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۴۱۷۔ (م)

[2] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۸۸، اختصار علوم الحدیث: ۱۲۸، شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/۱۸۹۔ (م)

(الف)۔وِجادہ کی صورت:

وجادہ کی صورت یہ ہے کہ ایک طالب علم کسی شیخ کی روایت کردہ احادیث کے ایسے مجموعے کو پائے جو شیخ کے خط سے تحریر کردہ ہو اور طالب علم کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ شیخ کی تحریر ہے، لیکن نہ تو اس نے شیخ سے ان احادیث سماع کیا ہو اور نہ اسے شیخ کی طرف سے اجازت دی گئی ہو[1]۔

(ج)۔وجادہ کی صورت میں روایت کا حکم:

وجادہ کے طریق سے حدیث روایت کرنا منقطع کے قبیل سے ہے، اگرچہ اس میں ایک پہلو اتصال کا بھی ہے[1]۔

(د)۔الفاظ اداء:

وجادہ کی صورت میں راوی یوں کہے: "وَجَدْتُ بِخَطِّ فُلَانٍ" "میں نے یہ حدیث فلاں کی تحریر کی صورت میں پائی ہے"۔ یا یوں کہے: "قَرَأْتُ بِخَطِّ فُلَانٍ كَذَا" "میں نے فلاں کی تحریر میں یہ حدیث پڑھی ہے"۔ پھر آگے حدیث کی سند اور متن بیان کرے[2]۔

---

(۱) محدثین کی اصطلاح میں وجادہ کا مفہوم یہ ہے کہ راوی کو ایک راوی کی احادیث اس کے خط میں لکھی ہوئی مل جائیں ،جنہیں اس نے راوی سے سماع اوراجازت کے طریق پر روایت نہ کیاہو۔ان احادیث کوپانے والاراوی کامعاصر ہو یاغیر معاصر ہواوراس سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ اس نے راوی سے ان احادیث کے علاوہ کچھ اورروایت کیاہو یانہ کیاہو۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸۹، التقریب والتیسیر للنووی:۶۵، ارشاد طلاب الحقائق:۱/ ۴۱۸۔(م)

(۱) دیکھئے: الالماع:۱۱۷، مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸۹، ارشاد طلاب الحقائق:۱/ ۴۱۹۔(م)

(۲) دیکھئے: الالماع:۱۱۷، مقدمۃ ابن الصلاح:۲۸۹، ارشاد طلاب الحقائق:۱/ ۴۱۹۔(م)

مبحث سوم: کتابت حدیث اور ضبط و تصنیف [۱]

ا۔ کتابت حدیث کا حکم:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے دور سے ہی کتابت حدیث کے متعلق اختلاف ہے، متعدد اقوال منقول ہیں:

(الف)۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ [۱] اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ وغیرہ حضرات کتابت حدیث کو پسند نہیں فرماتے تھے [۲]۔

(ب)۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور تابعین میں عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ اباحت کے قائل تھے [۳]۔

(ج)۔ پھر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کتابت حدیث کے جواز پر اجماع ہوا، اور اختلاف ختم ہوا، اگر تدوین احادیث کا سلسلہ شروع نہ ہوتا تو قرون متأخرہ اور بالخصوص ہمارے اس دور میں یہ حدیثیں ضائع ہو جاتیں [۴]۔

۲۔ کتابت حدیث کے حکم میں اختلاف کا سبب:

---

[۱] میں اس موضوع پر اختصار کیساتھ بحث کروں گا، اس لیے کہ اس زمانے میں کتاب وغیرہ کے سلسلے میں لوگوں کے طریق کار کا علم اوران کی تفصیلات کا تعلق اس فن کے ماہرین کیساتھ ہے۔ (ط)

[۱] سیدنا عبد اللہ بن مسعود بن غافل بن حبیب ہذلی، ابو عبد الرحمن رضی اللہ عنہ: جلیل القدر کبار صحابی رسول ہیں، مکہ معظمہ کے باشندے اور سابقون الاولون میں سے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے، سفر و حضر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے بعد کوفہ کے بیت المال کے امیر مقرر ہوئے، آپ کی مرویات کی تعداد ۸۴۸ ہے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینہ منورہ تشریف لائے اور وہیں ۶۰ سال کی عمر میں ۳۲ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب: ۳/ ۹۸۷، اسد الغابہ: ۳/ ۳۸۱، الاصابہ: ۴/ ۱۹۸، سیر اعلام النبلاء: ۱/ ۴۶۱، الاعلام: ۴/ ۱۳۷)(م)

[۲] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۹۳، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۴۲۴۔ (م)

[۳] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۹۴، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۴۲۶۔ (م)

[۴] اس مسئلہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے: تدوین حدیث، از محقق العصر علامہ عبد الرشید نعمانی رحمہ اللہ۔ علوم الحدیث و مصطلحہ، از ڈاکٹر صبحی ابراہیم صالح۔ حدیث اور فہم حدیث، از علامہ عبد اللہ معروفی۔ (م)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں کتابت حدیث کے حکم میں اختلاف کا سبب اجازت اور ممانعت دونوں پر مشتمل متعارض روایات تھیں، بعض احادیث سے اباحت معلوم ہوتی تھی جب کہ بعض میں ممانعت کتابت کا حکم تھا، ذیل میں چند متعارض احادیث ملاحظہ ہوں۔

(الف)۔ ممانعت والی حدیث: صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"لَا تَكْتُبُوا عَنِّي، وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ."[1] *

"مجھ سے قرآن کے سوا کوئی چیز نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو وہ اُسے مٹا دے"۔

(ب)۔ اباحت والی حدیث: صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"اكْتُبُوا لِأَبِي شَاهٍ". [1]*

"ابو شاہ کے لیے حدیث لکھ لو"۔

اس کے علاوہ کتابت حدیث کے مباح ہونے پر دیگر احادیث بھی ہیں، انہیں میں وہ حدیث بھی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عبد اللہ بن عمرو کو کتابت کی اجازت دی تھی[۲]۔

۳۔ اباحت اور ممانعت کی احادیث کے درمیان تطبیق:

محدثین کرام نے اباحت اور ممانعت کی احادیث کے درمیان متعدد طریقوں سے تطبیق کی مختلف توجیہات ذکر کی ہیں، جن میں چند درج ذیل ہیں:

---

[1] صحیح مسلم (۴/ ۲۲۹۸، رقم ۳۰۰۴)، مسند أحمد (۳/ ۳۹، رقم ۱۱۳۶۲)، مسند أبو یعلی (۲/ ۴۱۶، رقم ۱۲۰۹)، سنن الدارمی (۱/ ۱۳۰، رقم ۴۵۰)، صحیح ابن حبان (۱۴/ ۱۴۷، رقم ۶۲۵۴). (م)

* صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب التثبت في الحديث: ۴/ ۲۲۹۸، حدیث ۷۲. (ط)

[1] صحیح بخاری: ۳/ ۱۲۵، رقم: ۲۴۳۴، مسلم: ۲/ ۹۸۸، رقم: ۱۳۵۵، سنن الترمذی: ۵/ ۳۹، رقم: ۲۶۶۷۔ (م)

* صحیح بخاري، کتاب اللقطة: ۵/ ۸۷، حدیث ۲۴۳۴. (ط)

[۲] وہ حدیث یہ ہے: عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: كُنْتُ أَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ أَسْمَعُهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ أُرِيدُ حِفْظَهُ، فَنَهَتْنِي قُرَيْشٌ وَقَالُوا: أَتَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ تَسْمَعُهُ وَرَسُولُ اللهِ ﷺ بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِي الْغَضَبِ، وَالرِّضَا، فَأَمْسَكْتُ عَنِ الْكِتَابِ، فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ، فَأَوْمَأَ بِأُصْبُعِهِ إِلَى فِيهِ، فَقَالَ: «اكْتُبْ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ». (سنن ابی داؤد: ۲/ ۳۱۸، رقم: ۳۶۴۶، مسند احمد: ۲/ ۱۶۲، رقم: ۶۵۱۰، مستدرک حاکم: ۱/ ۱۸۷، رقم: ۳۵۹، سنن الدارمی: ۱/ ۱۳۶، رقم: ۴۸۴۔) (م)

(الف)۔ بعض محدثین کرام فرماتے ہیں کہ کتابت حدیث کی اجازت اسے دی گئی جس پر نسیان کا غلبہ ہو اور حدیث بھول جانے کا اندیشہ ہو اور ممانعت کا حکم ان حضرات کے لیے ہے، جن پر نسیان کا کوئی اندیشہ نہ ہو، بلکہ اس بات کا خوف ہو کہ اگر وہ احادیث لکھیں تو یاد رکھنے سے گریز کریں گے اور تحریر کا سہارا لیں گے۔

(ب)۔ بعض محدثین کرام فرماتے ہیں کہ کتابت حدیث کی ممانعت اس وقت تھی جب اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں یہ قرآنی آیات کیساتھ خلط ملط نہ ہوں، لیکن جب یہ اندیشہ ختم ہوا تو پھر کتابت حدیث کی اجازت دے دی گئی، اس بنا پر کتابت حدیث سے ممانعت والی احادیث منسوخ ہو گئیں[1]۔

۴۔ کاتب حدیث پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہے؟

کاتب حدیث پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ الفاظ حدیث کے ضبط و تحقیق پر تمام تر توجہ مبذول کرے اور حروف کی شکل اور نقطوں کو صحیح طور پر منضبط کرنے میں حتی الوسع کوشش کرے تاکہ ان میں باہم کوئی اشتباہ نہ رہے اور مشکل الفاظ پر حرکات بھی واضح کرے بالخصوص اسماء اور اعلام کی تعریب پر خصوصی توجہ دے، اس لیے کہ اعلام کی حرکات کو سیاق و سباق سے نہیں سمجھا جا سکتا، نیز کاتب حدیث کا رسم الخط تحریر کے معروف قواعد کے مطابق ہونا چاہیئے، اور نہ ہی وہ اپنی طرف سے اس سلسلہ میں کوئی خاص اصطلاح مقرر کرے جو لوگوں میں معروف نہ ہو[2]۔

کاتب حدیث پر یہ بھی فرض ہے کہ حدیث لکھتے وقت جہاں بھی رسول اللہ ﷺ کا ذکر آئے تو وہاں ''ﷺ'' لکھنے کا ضرور اہتمام کرے اور اس کے بار بار تکرار سے نہ اکتائے، نیز اگر

---

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۲۹۳، ارشاد طلاب الحقائق:۱/۴۲۷، فتح المغیث للسخاوی:۱/۱۴۵، فتح الباری:۱/۲۰۴۔(م)

(۲) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۲۹۵، المحدث الفاصل:۶۰۸، الالماع:۱۵۰، تذکرۃ السامع:۱۸۱، ارشاد طلاب الحقائق:۱/۴۲۹۔(م)

اصل نسخہ میں درود لکھا نہ ہو تو اس کمی کو پورا کرتے ہوئے درود لکھے، اور ایسے میں جہاں اسم ذات آئے تو اس کے ساتھ "عَزَّ وَجَلَّ" اور "تَعَالیٰ" وغیرہ کے الفاظ ضرور لکھے، اس طرح صحابہ کرام کے اسماء مبارکہ آنے پر (رضی اللہ عنہ) اور سلف صالحین کے اسمائے گرامی آنے پر "رَحِمَہُ اللہُ" وغیرہ لکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی کیساتھ صرف سلام یا صرف صلوۃ لکھنے پر اکتفاء کرنا مکروہ ہے، اس طرح "ص" اور "صلعم" وغیرہ کے رموز کا استعمال بھی مکروہ ہے، بلکہ ہر مرتبہ آپ ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ "ﷺ" کامل طور پر لکھ دینا چاہئے[1]۔

۵۔ مقابلہ و موازنہ اور اس کی کیفیت:

کاتب حدیث پر یہ بات لازم ہے کہ کتابت سے فارغ ہونے کے بعد اپنے مسودہ کا شیخ کے اصل نسخے کیساتھ موازنہ اور مقابلہ کرے تا کہ اسے یہ اطمینان اور یقین حاصل ہو کہ نقل اصل کے مطابق ہے، خواہ اس نے شیخ سے بطریق اجازت احادیث حاصل کی ہوں اور مقابلہ و موازنہ کا طریقہ یہ ہے کہ طالب علم اور اس کا شیخ حدیث سناتے وقت اپنی کتاب سامنے رکھیں، اور تحریر کا موازنہ کرتے جائیں، نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا قابل اعتماد شخص قراءت حدیث کے دوران یا اس کے بعد جس وقت ممکن ہو شیخ کی اصل کتاب لے کر طالب علم کے مسودے سے اس کا مقابلہ و موازنہ کرے۔

۶۔ الفاظِ اداء کی کتابت کی بعض اصطلاحات:

اکثر کاتبین حدیث کا یہ معمول ہے کہ وہ الفاظِ اداء میں بعض رموز اور اشارات پر اکتفاء کرتے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہے:

(الف)۔ "حَدَّثَنَا" کو "ثَنَا" یا "نَا" کی صورت میں لکھتے ہیں۔

(ب)۔ "أَخْبَرَنَا" کو "أَنَا" یا "أَرَنَا" لکھتے ہیں۔

---

[1] دیکھئے: الجامع لاخلاق الراوی: ۱/ ۲۶۸، مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۹۸، تذکرۃ السامع: ۱۷۵، فتح المغیث: ۲/ ۱۶۰، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۴۳۴۔ (م)

لیکن قاری حدیث کو چاہئے کہ وہ الفاظ کو پڑھتے وقت ان کا پورا تلفظ ادا کرے اور اس کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ ان الفاظ کو اس طرح پڑھے جس طرح وہ لکھے ہوئے ہیں[1]۔

(ج)۔ کاتبین حدیث کی ایک عادت یہ ہے کہ جب ایک اسناد سے دوسری اسناد کی طرف تحویل کرتے ہیں، تو اس کے لیے "ح" کا رمز واشارہ استعمال کرتے ہیں، تو قاری حدیث اسے "حاء" کے تلفظ کیساتھ پڑھے[1]۔

(د)۔ کاتبین حدیث کا ایک معمول یہ ہے کہ اسناد میں مذکور تمام راویوں کے درمیان سے لفظ "قال" اختصار کی خاطر حذف کر دیتے ہیں لیکن قاری کو چاہئے کہ اسناد پڑھتے وقت "قال" کا تلفظ کرے، مثلاً ایک سند یوں ہے: "حَدَّثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ يُوْسُفَ، أَخْبَرَنَا مَالِكٌ" تو قاری اس سند کو یوں پڑھے: "حَدَّثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ أَخْبَرَنَا مَالِكٌ."

(ھ)۔ایک معمول یہ بھی ہے کہ اختصار کی خاطر اسناد کے آخر سے لفظ "أَنَّهُ قَالَ" حذف کر دیا جاتا ہے، مثلاً "عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ" تو قاری کو چاہئے کہ وہ یوں پڑھے "عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ" اور اس کی وجہ یہ کہ عبارت کو اعراب کے لحاظ سے صحیح طور پر پڑھا جائے۔

۷۔ طلب حدیث کے لیے اسفار:

ہمارے اکابر اور اسلاف نے علم حدیث کی طرف بھرپور اعتناء اور توجہ دی اور بے مثال بلند ہمتی کا مظاہرہ کیا، ان حضرات نے احادیث کے جمع وضبط میں اس قدر اہتمام کیا، اتنی کوشش اور محنت کی، اور اتنا وقت صرف کیا، کہ عقل انگشت بدنداں رہ جاتی ہے اور مشکل ہی سے اس کی تصدیق پر آمادہ ہوتی ہے، ایک طالب علم جب اپنے شہر کے مشائخ سے حدیث حاصل کر لیتا تو قریب وبعید کے دوسرے شہروں کی طرف رخت سفر باندھ کر روانہ ہو جاتا، تاکہ ان بلاد وامصار کے مشائخ سے احادیث حاصل کر سکے، چنانچہ یہ تشنگان علوم حدیث سفر کی تمام صعوبتیں اور

---

[1] مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۱۱۔ (م)

[1] مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۱۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۴۴۹۔ (م)

زندگی کی تلخیاں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور اس راہ وفا میں کسی قسم قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔

معروف محدث خطیب بغدادیؒ نے اس موضوع پر "الرَّحْلَةُ فِيْ طَلَبِ الْحَدِيْثِ" کے نام سے ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے، جس میں انہوں نے صحابہ کرام، تابعین اور سلف صالحین کے طلب حدیث کے اسفار کی ایسی ایسی داستانوں کو جمع کیا ہے، جنہیں سن کر آدمی حیرت زدہ ہو جاتا ہے، جو شخص ان دلچسپ واقعات کو جاننا چاہتا ہو وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرے، اس لیے کہ اس کتاب کا مطالعہ طالبان حدیث میں جوش و جذبے کی ایک لہر پیدا کر دیتا ہے، ان کی ہمتوں کو جلا بخشتا ہے، اور ان کے عزائم بلندی عطاء کرتا ہے[1]۔

۸۔ حدیث سے متعلق متنوع تصانیف:

---

(۱) تاریخ شاہد ہے کہ تشنگان علوم نبوت نے طلب حدیث کی خاطر ممالک بعیدہ کی خاک چھانی اور اسفار کی زحمتیں اٹھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رواۃ حدیث کی اولین جماعت سے بالمشافہہ حدیثیں اخذ کیں۔ اس سے ان کی یہ تمنا بر آئی کہ براہ راست اخذ واستفادہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے اور زیادہ دیرپا اور راسخ ہوتا ہے۔

استاذ کی خدمت میں حاضر ہو کر بالمشافہ علم حاصل کرنے کا آغاز پہلی صدی ہجری میں ہو گیا تھا، رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

«لَوْ أَعْيَتْنِي آيَةٌ فِي كِتَابِ اللهِ فَلَمْ أَجِدْ أَحَدًا يَفْتَحُهَا عَلَيَّ إِلاَّ رَجُلٌ بِبِرْكِ الغِمَادِ لَرَحَلْتُ إِلَيْهِ».

(معرفۃ علوم الحدیث: ۵۴)

" اگر مجھے قرآن مجید کی کوئی آیت نہ مل سکے اور مجھے پتہ چلے کہ برک الغماد نامی شہر (یہ شہر مکہ مکرمہ سے جانب سمندر پانچ شب وروز کی مسافت پر واقع ہے) کا کوئی شخص اسے جانتا ہے تو مجھے اس کی خدمت میں حاضر ہونے سے کوئی چیز مانع نہ ہو گی۔

معروف صحابی رسول سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے ایک اونٹ خریدا اور اس پر کجاوہ باندھ کر ایک ماہ سفر میں رہے اور ملکِ شام پہنچ کر عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے قصاص کے بارے میں ایک حدیث دریافت کی۔ دیکھئے: الجامع لاخلاق الراوی: ۲/ ۲۲۵۔

بہت سے علماء سلف ایک حدیث کی خاطر طویل سفر اختیار کرنے سے مانوس تھے، تابعی جلیل سعید بن مسیبؒ (م ۱۰۵ھ) فرماتے ہیں: "میں ایک حدیث کی تلاش میں کئی کئی رات اور دن سفر میں گزار دیتا۔" =

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حدیث کے موضوع پر کسی بھی پہلو سے تصنیف و تالیف کی استعداد اور صلاحیت دی ہو تو اسے چاہیئے کہ تصنیف کا سلسلہ شروع کر دے،[1] مثلاً متفرق احادیث جمع کرے،، مشکلات کی توضیح و تشریح کرے، غیر مرتب احادیث کے ذخیروں کو مرتب شکل دے اور جن کتابوں کے فہارس موجود نہیں ان کی فہارس تیار کر دے، اس کا بڑا فائدہ یہ ہو گا

= دیکھئے: الجامع لاخلاق الراوی: ۲/ ۲۲۶۔

ابو قلابہ بصریؒ (م ۱۰۴ھ) فرماتے ہیں: "میں مدینہ میں تین دن ٹھہرا۔ مدینہ جانے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک شخص کو ایک حدیث یاد تھی اور میں اس سے سننا چاہتا تھا۔" الجامع لاخلاق الراوی: ۲/ ۲۲۶۔

علمی تشنگی اور پیاس بجھانے کے لیے احمد بن موسی جوالیقی (م ۳۰۶ھ) اٹھارہ مرتبہ مصر گئے تا کہ ایوب بن کیسان سختیانیؒ کی منفرد روایات سن سکیں۔ دیکھئے: علوم الحدیث: ۵۵۔

بعض رواۃ حدیث کے متعلق یوں کہا گیا کہ: "أحد من رحل وتعب."

"وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے طویل سفر طے کیے اور بڑی زحمت اٹھائی۔"

بعض کے متعلق یوں کہا گیا۔ "له رحلة واسعة." دیکھئے: علوم الحدیث: ۵۵۔

"انہوں نے طویل سفر کر کے علم حاصل کیا۔"

بعض محدثین کرام کے بارے میں اس قسم کے الفاظ لکھے جاتے ہیں کہ سواریوں کو ہلاک کر کے ان کی خدمت میں حاضری دی جاتی ہے، لوگ ان کے آستانہ کی جانب کوچ کرتے ہیں۔ بعض محدثین رحال اور رحالہ یا جوال اور جوالہ کے القاب کیساتھ معروف ہوئے، یہ القاب ان محدثین کیساتھ مخصوص ہیں، جنہوں نے طلب حدیث کے سلسلہ میں بہت تکالیف اور مشقتیں برداشت کیں اور طویل طویل سفر طے کیے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: الرحلۃ فی طلب الحدیث اور الجامع لاخلاق الراوی۔ (م)

[1] یقیناً بہت بڑی سعادت ہے کہ انسان اپنی حیات مستعار قرآن و سنت کی خدمت اور اشاعت میں صرف کرے اور ان علوم کی ارتقاء و ترویج میں منہمک رہے، قرآن و حدیث پر ہمارے اسلاف نے بہت کچھ لکھا، کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا، لیکن اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہم اس پر اکتفاء کر بیٹھیں۔ آج "کم ترک الاول للاخر" کے قاعدے کے مطابق کتنے ہی موضوعات ہیں، جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے، یقیناً خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی زندگیاں قرآن و سنت کی خدمت میں گزر رہی ہیں۔ اللہ تعالی ہمیں بھی اس کی توفیق دے کہ ہم بھی اس عظیم کام میں اپنا کچھ حصہ ڈال سکیں۔ (م)

کہ طلبہ کرام کے لیے کم سے کم وقت میں احادیث کی بڑی بڑی ضخیم کتب سے استفادہ کرنا آسان ہو جائے گا، تاہم جب تک کسی کتاب کی ترتیب و تہذیب اعلیٰ معیار کی نہ ہو تو اسے شائع کرنے سے گریز کیا جائے، نیز تحقیق و تصنیف کے لیے اس موضوع کا انتخاب کرنا چاہیے، جس کا فائدہ عام اور زیادہ مفید ہو، محدثین کرام نے علم حدیث کے موضوع پر متنوع قسم کی کتابیں تصنیف کی ہیں، ذیل میں چند معروف اقسام بیان کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہوں۔

(الف)۔ جوامع:

جوامع یہ "جامع" کی جمع ہے، جامع حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں مؤلف نے جملہ ابواب حدیث عقائد، عبادات، معاملات، سیر، مناقب، رقاق، فتن اور احوال قیامت کو جمع کیا ہو، جیسے امام بخاریؒ کی "الجامع الصحیح" (صحیح بخاری) ہے۔

(ب)۔ مسانید:

مسانید یہ "مُسْنَد" کی جمع ہے اور مسند ہر وہ کتاب ہے جس میں ہر صحابی کی مرویات کو علاحدہ علاحدہ جمع کر دیا گیا ہو، لیکن اس میں موضوع کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا ہو، جیسے مسند امام احمد بن حنبل [1]۔

(ج)۔ سنن:

وہ کتب احادیث ہیں جو فقہی ابواب پر مرتب ہوں تاکہ فقہاء کرامؒ احکام شریعت کے استنباط کے لیے ان سے استفادہ کر سکیں، یہ کتابیں جوامع سے اس کے مختلف ہوتی ہیں کہ ان میں عقائد اور سیر و مناقب وغیرہ کے ابواب نہیں ہوتے، بلکہ...

---

(۱) چند معروف مسانید یہ ہیں:

مسند ابی داؤد طیالسی، از ابو داؤد سلیمان ابن ابی داؤد طیالسی بصریؒ (م ۲۰۴ھ)

مسند الحمیدی، از ابو بکر عبد اللہ بن زبیر اسدی مکیؒ (م ۲۱۹ھ)

مسند ابی یعلی، از ابو یعلی احمد بن علی بن مثنیؒ (م ۳۰۷ھ)

مسند البزار، از ابو بکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق عتکیؒ (م ۲۹۲ھ) (م)

مباحث صرف فقہی ابواب اور احادیث احکام تک محدود رہتے ہیں، جیسے سنن ابی داؤد[1]۔

(د)۔ معاجم:

معاجم یہ "مُعْجَم" کی جمع ہے، اور معجم وہ کتاب ہے جس کے مؤلف نے اس میں شیوخ کے ناموں کے اعتبار سے احادیث جمع کی ہوں جیسے امام طبرانی کی معجم کبیر، معجم اوسط اور معجم صغیر ہیں۔

(ھ)۔ علل:

کتب علل وہ کتابیں ہیں جو معلول احادیث اور ان کے علل پر مشتمل ہوں جیسے امام ابن ابی حاتمؒ کی "العِلَل" اور امام دار قطنیؒ کی "العِلَل" ہے[2]۔

(و)۔ اجزاء:

اجزاء یہ "جُــــزْء" کی جمع ہے اور جزء ہر اس مختصر کتاب کو کہتے ہیں، جس میں کسی ایک راوی کی روایات کو جمع کیا گیا ہو۔ یا اس میں ایک موضوع سے متعلق تمام احادیث جمع کر دی گئی

---

(١) اس کے علاوہ چند مشہور سنن یہ ہیں۔
سنن الترمذی، از ابو عیسیٰ محمد بن سورۃ ترمذیؒ (م ۲۷۹ھ)
سنن النسائی، از امام ابو عبدالرحمن احمد بن شعیب نسائیؒ (م ۳۰۳ھ)
سنن الدار قطنی، از امام ابو الحسن علی بن عمرو دار قطنیؒ (م ۳۸۵ھ)
السنن الکبری، از امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقیؒ (م ۴۵۸ھ)
سنن سعید بن منصور، از امام سعید بن منصور خراسانیؒ (م ۲۲۷ھ)
کتاب الآثار، از امام ابویوسف یعقوب بن ابراہیمؒ (م ۱۸۲ھ)
کتاب الام، از امام محمد بن ادریس شافعیؒ (م ۲۰۴ھ)
شرح معانی الآثار، از امام ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامۃ طحاویؒ (م ۳۲۱ھ)
سنن الدارمی، از امام عبداللہ بن عبدالرحمن دارمیؒ (م ۲۵۵ھ)۔ (م)

(٢) علل الحدیث پر چند معروف کتابیں یہ ہیں:
العلل المتناہیۃ، از علی بن مدینیؒ (م ۲۳۴ھ)
العلل ومعرفۃ الرجال، از احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ)
العلل الکبری، از امام ترمذیؒ (م ۲۷۹ھ) وغیرہ۔ (م)

ہوں، جیسے امام بخاریؒ کی ”جُزْءُ رَفْعِ الْيَدَيْنِ“ ہے۔

(ز)۔اطراف:

اطراف سے مراد ہر وہ کتاب ہے، جس میں مؤلف نے ہر حدیث کا ایک ایسا طرف اور حصہ جمع کیا ہو، جس پر غور کرنے سے باقی حدیث کا مضمون سمجھ میں آسکتا ہو، پھر اس کے بعد مؤلف جملہ متون احادیث سے یا بعض متون سے اس حدیث کی تمام اسانید ذکر کرے، جیسے علامہ جمال الدین مزیؒ کی ”تحفة الأشراف بمعرفة الأطراف“ ہے۔

(ح)۔مستدرکات:

مستدرکات یہ ”مُسْتَدرَك“ کی جمع ہے، اور مستدرک ہر اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں وہ احادیث جمع ہوں جو کسی مصنف کو شرائط کے مطابق ہوں مگر اس کی کتاب میں موجود نہ ہوں، جیسے امام ابو عبد اللہ حاکم نیسابوریؒ کی ”الْمُسْتَدْرَك علىٰ الصَّحِيحين“ ہے۔

(ط)۔مستخرجات:

مستخرجات یہ ”مُسْتَخْرَج“ کی جمع ہے، مستخرج وہ کتاب ہے جس میں مؤلف نے کسی دوسرے مؤلف کی کتاب کی احادیث کو اپنی اسانید کیساتھ تخریج کیا ہو، جو پہلے مؤلف کی ذکر کردہ اسانید علاوہ ہو، البتہ یہ ممکن ہے کہ دونوں ایک شیخ یا اوپر کسی راوی پر جمع ہوں جیسے امام ابو نعیم اصبہانیؒ کی ”الْمُسْتَخْرَج عَلَى الصَّحِيْحَيْن“ ہے[1]۔

---

(۱) صحیحین کے علاوہ جن مستخرجات کا ذکر ملتا ہے، وہ یہ ہیں۔
المستخرج علی سنن ابی داؤد، از قاسم بن اصبغ بن ناصح اصبہانیؒ (م ۳۴۰ھ)
المستخرج علی سنن ابی داؤد، از محمد بن عبد الملکؒ (م ۳۳۰ھ)
المستخرج علی سنن ابی داؤد، از ابو بکر بن منجویہ اصبہانیؒ (م ۴۲۸ھ)
المستخرج علی سنن الترمذی، از ابو علی حسن بن علی طوسیؒ (م ۳۱۲ھ)
المستخرج علی سنن الترمذی، از ابو بکر بن منجویہ اصبہانیؒ (م ۴۲۸ھ)
المستخرج علی کتاب التوحید لابن خزیمۃ، از ابو نعیم اصبہانیؒ (م ۴۳۰ھ)
المستخرج علی المستدرک للحاکم، از ابو الفضل عراقیؒ (م ۸۰۶ھ)۔(م)

مبحث چہارم: روایت حدیث کی کیفیت وشرائط[1]

ا۔ اس مبحث کا مفہوم:

اس عنوان سے روایت حدیث کی کیفیت مراد ہے، اور وہ آداب وشرائط مراد ہیں جن کیساتھ متصف ہو کر روایت بیان کی جاتی ہے، اور ان کے متعلق کچھ دیگر امور کا بیان ہے [2]، گزشتہ مباحث میں اس عنوان سے متعلق کچھ باتیں بیان ہو چکی ہیں، مزید باقی مباحث ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

۲۔ کیا حفظ کے بغیر کتاب سے حدیث کی روایت جائز ہے؟

محدثین کرام کا اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر راوی کو کتاب یاد نہ ہو تو کیا یہ اس سے روایت کر سکتا ہے؟ بعض حضرات نے افراط کی حد تک اس میں شدت اختیار کی ہے، بعض تساہل اور تفریط کے شکار ہوئے ہیں، اور بعض کا رویہ توسط اور اعتدال کا ہے۔

(الف)۔ متشددین حضرات کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب تک راوی اپنے حفظ سے روایت نہ کرے، اس کی روایت حجت نہیں ہو سکتی، امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور علامہ ابو بکر صیدلانی شافعیؒ [3] سے یہی منقول ہے [4]۔

---

(۱) اس موضوع پر بھی میں مختصر بحث کروں گا اس لیے کہ اس کی بعض جزئیات ضروری تھیں، البتہ اس زمانہ میں ان جزئیات کا مطالعہ تاریخ روایت کے مطالعہ کے ضمن میں آتا ہے جو اس فن کے ماہرین کے لیے ضروری ہے۔ (ط)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح: ٣١٧، إرشاد طلاب الحقائق: ١/ ٢٧٣ - ٣٣٣، التقريب: ٩٠ - ١٠٠، المنهل الروي: ٦٣، اختصار علوم الحديث: ٩٢، محاسن الاصطلاح: ٢١٨، شرح التبصرة: ٢/ ١، التقييد والإيضاح: ١٣٦، نزهة النظر: ١٨٥ - ١٩٩، فتح المغيث: ١/ ٢٦٢، ألفية السيوطي: ٩٦ - ١١٢، فتح الباقي: ١/ ٢٩٢، توضيح الأفكار: ٢/ ١١٤، ظفر الأماني: ٧٨. (م)

(۳) محمد بن داؤد بن محمد مروزی صیدلانی داؤدی شافعی: اپنے دور کے عظیم محدث اور فقیہ تھے، کئی کتابوں کے مصنف تھے، عطر فروش ہونے کی نسبت سے صیدلانی کہلائے، امام ابو بکر قفال مروزی کے شاگرد تھے، ٤٢٧ھ کو وفات پائی۔ (طبقات الشافعیۃ الکبری: ٤/ ١٤٨، طبقات الشافعیۃ لابن شہبہ: ١/ ٢١٤، معجم المؤلفین: ٩/ ٢٩٨)(م)

(۴) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ٣١٧، الالماع: ١٣٦، ارشاد طلاب الحقائق: ١/ ٤٥٦۔ (م)

(ب)۔ متساہلین حضرات کا رویہ اور معمول یہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے ان نسخوں سے بھی احادیث روایت کی ہیں، جن کا اصل کیساتھ موازنہ اور مقارنہ بھی نہیں کیا گیا ہے، مثلاً ابن لہیعہ وغیرہ[۱]۔

(ج)۔ معتدلین اور جمہور حضرات کی رائے یہ ہے کہ اگر راوی تحمل حدیث اور مقابلہ و مقارنہ میں مذکورہ شروط کو ملحوظ نظر رکھتا ہو تو اس کے لیے کتاب سے روایت کرنا جائز ہے اگرچہ اس کے پاس وہ کتاب موجود نہ ہو، بشرطیکہ اس کا غالب گمان یہ ہو کہ اس کی کتاب تغیر و تبدیل سے محفوظ و مامون ہے بالخصوص اس وقت جب راوی ایسا ہو کہ اس پر کتاب میں ہونے والی تبدیلی پوشیدہ نہ رہ سکتی ہو۔[۲]

۳۔ ایسے نابینا کی روایت کا حکم جو سنی بات یاد نہ رکھ سکتا ہو:

اکثر محدثین کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ نابینا جو سنی بات یاد نہ رکھ سکتا ہو کسی ثقہ اور کسی ثقہ اور قابل اعتماد شخص کی مدد سے اپنی مسموعات کو لکھ کر محفوظ کر لیا ہو، کتاب کی بھی پوری بھی پوری نگہداشت کی ہو اور وہ ثقہ آدمی نابینا کو احادیث سناتے وقت احتیاط بھی کرتا ہو۔ نیز اسے یہ گمان غالب بھی ہو کہ یہ احادیث تغیر و تبدیل سے بالکل محفوظ و مامون ہیں تو اس قسم نابینا کی روایت صحیح ہے اور اس کی حیثیت اس ان پڑھ بینا کی طرح ہو گی جو سنی بات یاد نہ رکھ سکتا ہو[۳]۔

۴۔ حدیث کی روایت بالمعنی اور اس کی شرائط:

محدثین کا حدیث کی روایت بالمعنی میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اسے ممنوع قرار دیا ہے جب کہ بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے، ذیل میں تفصیل ملاحظہ ہو۔

(الف)۔ بعض محدثین کرام، فقہاء اور حضرات اصولیینؒ کی ایک جماعت نے روایت

---

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۳۱۷، الالماع:۱۳۶، ارشاد طلاب الحقائق:۱/ ۴۵۶۔ (م)

(۲) دیکھئے: الکفایۃ:۲۳۶، الالماع:۱۳۵، مقدمۃ ابن الصلاح:۳۱۸، المقنع فی علوم الحدیث:۱/ ۲۵۸، ارشاد طلاب الحقائق:۱/ ۴۵۸۔ (م)

(۳) الکفایۃ:۲۲۸، مقدمۃ ابن الصلاح:۳۱۹، ارشاد طلاب الحقائق:۱/ ۴۵۹، اختصار علوم الحدیث:۱۴۰، المقنع فی علوم الحدیث:۱/ ۲۵۸، فتح المغیث:۲/ ۲۰۷۔ (م)

بالمعنی کو ممنوع رقرار دیا ہے، ان میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں، تاہم اس کے لیے شرط یہ ہے کہ راوی کو یقین ہو کہ اس نے حدیث کا ہی معنی ادا کیا ہے، پھر جن حضرات نے روایت بالمعنی کو جائز قرار دیا ہے، توانہوں نے اس کے لیے درج ذیل شرائط مقرر کی ہیں:

۱- راوی الفاظ اور ان کے مقاصد کا عالم ہو۔

۲- راوی ان امور سے باخبر ہو جو معانی بدل دیتے ہیں۔

یہ جملہ تفصیلات ان روایات کے متعلق ہے جو کتب حدیث میں موجود نہیں، لیکن جہاں تک تصنیف شدہ کتابوں کا تعلق ہے تو ان سے روایت بالمعنی کسی صورت میں بھی جائز نہیں اور نہ ہی ان کے الفاظ کو بدلنا جائز ہے، خواہ یہ الفاظ اصل الفاظ کے ہم معنی کیوں نہ ہوں، اس لیے کہ روایت بالمعنی اس ضرورت کے پیش نظر جائز رہا کہ جب راوی کے ذہن سے ایک آدھ لفظ غائب ہو اور اسے یاد نہ ہو تو وہ روایت بالمعنی کر لیتا، لیکن جب احادیث کتابوں میں لکھی جا چکی ہیں تو اب روایت بالمعنی کی ضرورت نہیں رہی[(۱)]۔

واضح رہے کہ روایت بالمعنی کرنے والے کے لیے یہ بات مناسب ہے کہ حدیث روایت کرنے کے بعد "أَوْ كَمَا قَالَ" یا "نَحْوَهُ" یا "شِبْهَهُ" وغیرہ الفاظ کہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، یا اس جیسے الفاظ ہیں یا اس سے ملتے جلتے الفاظ ہیں[(۲)]۔

۵۔ لحن فی الحدیث اور اس کا سبب:

لحن فی الحدیث کا مفہوم حدیث کی قراءت میں غلطی کرنے کے ہیں، اس کے کئی اسباب ہیں، تاہم معروف اسباب یہ ہیں:

(الف)۔ علم نحو اور لغت سے ناواقف ہونا، اس لیے طالب حدیث کے لیے ضروری ہے کہ اس قدر علم نحو اور لغت سیکھ لے جس سے لحن اور تصحیف سے محفوظ رہے اور الفاظ واعراب کی غلطی سے بچ سکے، خطیب بغدادیؒ حماد بن سلمہ سے روایت کرتے ہیں:

---

(۱) دیکھیے: مقدمہ ابن الصلاح:۳۲۲، الالماع:۱۷۴، ارشاد طلاب الحقائق:۱/ ۴۶۵۔(م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح:۳۲۲، ارشاد طلاب الحقائق:۱/ ۴۶۷۔(م)

"مَثَلُ الَّذِي يَطْلُبُ الْحَدِيثَ، وَلَا يَعْرِفُ النَّحْوَ مَثَلُ الْحِمَارِ عَلَيْهِ مِخْلَاةٌ لَا شَعِيرَ فِيهَا."[1].

"اس شخص کی مثال جو طالب حدیث ہے اور نحو نہیں جانتا اس گدھے کی طرح ہے، جس کے اوپر بوری لدی ہوں لیکن جو سے خالی ہوں"۔

(ب)۔ مشائخ اور اساتذہ حدیث کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کے بجائے کتابوں اور صحیفوں سے احادیث لینا، یہ بات ماقبل گزر چکی ہے کہ شیوخ سے احادیث لینے اور حاصل کرنے کے متعدد طرق ہیں، جن میں سے بعض طرق بعض سے اقوی ہیں، تاہم سب سے اقوی طریقہ یہ ہے کہ شیخ کی زبان سے الفاظ حدیث بلاواسطہ سنے جائیں، یا شیخ کے سامنے پڑھ کر سنادیئے جائیں، اس لیے طالب حدیث کے لیے ضروری ہے کہ احادیث نبویہ کو اہل علم اور محققین حضرات کی زبان سے سنے تاکہ لغوی اور لفظی غلطیوں سے محفوظ رہے، ایک طالب حدیث کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ کتب اور صحائف سے احادیث حاصل کرکے روایت شروع کردے اور ان کتابوں کو اپنا شیخ تصور کر بیٹھے، اس صورت میں اس سے بہت سی نحوی اور لغوی غلطیاں سرزد ہوں گی، اسی وجہ سے متقدمین علماء کرام فرماتے تھے:

" لَا تَأْخُذِ الْقُرْآنَ مِن مُّصْحَفِيٍّ، وَ لَا الْحَدِيْثَ مِنْ صُحُفِيٍّ."[2]

"قرآن مجید کو مصحفی اور احادیث کو صحفی سے حاصل مت کرو"[3]۔

---

(1) تدریب الراوي ج۲، ص۱۰٦. (ط)

(2) فتح المغیث:۳/ ١٦٥۔(م)

(3) مصحفی سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن مجید کو قراء اور شیوخ کے بجائے مصحف سے سیکھتا ہے اور صحفی سے مراد وہ شخص ہے جو احادیث کتابوں سے لیتا ہے اور شیوخ سے نہیں لیتا۔ قاموس:۳/ ١٦٦ میں ہے کہ صحفی اسے کہتے ہیں جو صحیفہ کی قراءت میں غلطیاں کرتا ہے۔(ط)

غریب الحدیث[1]

ا۔غریب الحدیث کی تعریف:

(الف)۔لغوی تعریف:

لغت میں غریب اس مسافر کو کہتے ہیں جو اپنے عزیز و اقارب سے دور ہو اور یہاں غریب سے وہ الفاظ مراد ہیں، جن کا معنی مخفی و پوشیدہ ہو، علامہ فیروز آبادیؒ[2] فرماتے ہیں: ''غَرُبَ –كَكَرُمَ-:غَمُضَ و خَفِيَ''۔''غَرُبَ'' باب ''كَرُمَ يَكْرُمُ'' سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے، اس کے معانی ہیں، کلام کا دقیق اور غیر واضح ہونا[3]۔

(ب)۔اصطلاحی تعریف:

غریب متن حدیث میں واقع اس غیر مانوس لفظ کو کہتے ہیں، جو قلت استعمال کی وجہ سے بعید از فہم ہو[4]۔

۲۔فن غریب الحدیث کی اہمیت وصعوبت:

غریب الحدیث ایک اہم اور مشکل کام ہے، اس لیے اس وادی میں قدم رکھنے والے کو بہت سوچ بچار اور احتیاط سے کام لینا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں اپنے وہم وگمان کے سہارے رسول اللہ ﷺ کے کلام کی تغییر کا اقدام نہ کر بیٹھے، اس لیے سلف صالحین

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۳۷۵، ارشاد طلاب الحقائق:۲/ ۵۵۰۔(م)

(۲) محمد بن یعقوب بن محمد بن ابراہیم بن عمر، ابو طاہر، مجد الدین شیرازی فیروزآبادی: کاردین (شیراز) میں ۷۲۹ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور میں حدیث، تفسیر، لغت اور ادب کے چوٹی کے عالم تھے، عراق، مصر، شام، روم اور ہند کے اسفار کیے، ۷۹۶ھ کو زبید چلے گئے وہاں کے امیر اشرف اسماعیل نے ان کی بہت تعظیم و توقیر کی اور انہیں وہاں کا قاضی مقرر کیا اور وہیں ۸۱۷ھ کو وفات پائی۔(البدر الطالع:۲/ ۲۸۰، الضوء اللامع:۱۰/ ۷۹، الاعلام للزرکلی:۷/ ۱۴۶)(م)

(۳) القاموس ج ۱، ص ۱۱۵. (ط)

(۴) علوم الحدیث، ص ۲۷۲. (ط)

اس معاملہ میں غایت احتیاط سے کام لیتے تھے[1]۔

۳۔ غریب الحدیث کی بہتر تفسیر و تشریح:

غریب الحدیث کی سب سے بہتر تفسیر و تشریح یہ ہے کہ دوسری حدیث اس کی تفسیر کر دے، جیسا کہ مریض کی نماز کے سلسلے میں سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ[2] کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ".[1]

"کھڑے ہو کر نماز ادا کرو، اگر ایسا نہ کر سکو تو بیٹھ کر پڑھو، اگر بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکو تو لیٹ کر پڑھو"۔

---

[1] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (م ۲۴۱ھ) سے غریب الحدیث کے ایک لفظ کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا:
((سَلُوا أَصْحابَ الغريبِ، فإِنِّي أَكرَهُ أَنْ أَتَكَلَّمَ في قَوْلِ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم بالظَّنِّ فأُخْطِئَ)). (مقدمة ابن الصلاح: ۳۷۶)
غریب الحدیث کے جاننے والوں سے پوچھو، کیونکہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر اپنے گمان کے مطابق بات کر کے خطاء کا ارتکاب کروں۔
حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ (م ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ ابو قلابہ عبد الملک بن محمد نے مشہور لغوی امام اصمعی رحمہ اللہ سے کہا:
((يا أبا سَعِيْدٍ مَا مَعْنَى قَولِ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((الجارُ أَحَقُّ بِسَقَبِهِ))، فقالَ: أنا لا أُفَسِّرُ حديثَ رسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم ولَكِنَّ العَرَبَ تَزعُمُ أَنَّ السَّقَبَ: اللَّزِيقُ)). (مقدمة ابن الصلاح: ۳۷۶)
"ابو سعید! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے کیا معنی ہیں کہ پڑوسی زیادہ حق دار ہے اپنے قرب کی؟ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تفسیر تو نہیں کرتا، لیکن اہل عرب کا خیال ہے کہ "سقب" کے معنی ساتھ چمٹے ہوئے کے ہیں۔" (م)

[2] سیدنا عمران بن حصین بن عبید، ابو نجید خزاعی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، غزوہ خیبر کے سال ۷ھ کو مشرف باسلام ہوئے، فتح مکہ کے موقع پر آپ کے ساتھ جھنڈا تھا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اپنے دور خلافت میں انہیں بصرہ بھیجا تا کہ وہاں کے لوگوں کو اسلامی تعلیمات کا درس دیں، پھر زیاد انہیں بصرہ کا قاضی مقرر کیا، کتب حدیث میں آپ کی مرویات ۱۳۰ ہیں، بصرہ ہی میں ۵۲ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب: ۳/ ۱۲۰۸، اسد الغابہ: ۴/ ۲۶۹، الاصابہ: ۴/ ۵۸۴، الاعلام للزرکلی: ۵/ ۷۰)(م)

[1] صحيح بخاري، كتاب تقصير الصلاة: ۲/ ۵۸۷، حديث ۱۱۱۷. (ط)

اب اس حدیث میں "عَلَى جَنْبٍ" سے کیا مراد ہے؟ تو اس کی تفسیر و تشریح سیدنا علی کی اس حدیث سے ہوتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"عَلَى جَنْبِهِ الْأَيْمَنِ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ بِوَجْهِهِ"(۱).

"اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ کر قبلہ رو ہو کر نماز ادا کرو"۔

۴۔ غریب الحدیث پر معروف تصانیف:

(الف)۔ غریب الحدیث، از امام ابو عبید قاسم بن سلّامؒ (۲)۔

(ب)۔ النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، از امام ابن اثیرؒ (۳)، یہ اس موضوع پر بہترین کتاب ہے۔

(ج)۔ الدر النثیر، از علامہ جلال الدین سیوطیؒ یہ "النہایۃ فی غریب الحدیث" کی تلخیص ہے۔

(د)۔ الفائق، از علامہ جار اللہ زمخشریؒ (۴)۔

---

(۱) سنن الدار قطنی: ۲/ ۳۷۷، رقم: ۱۷۰۶۔ (ط)

(۲) قاسم بن سلام (بتشدید اللام) ہروی، ازدی خراسانی بغدادی، ابو عبید: ہرات میں ۱۵۷ھ کو پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی، پھر بغداد چلے گئے اٹھارہ سال طرسوس کے قاضی رہے، اپنے دور کے عظیم محدث اور لغوی تھے، شریک بن عبداللہ، اسماعیل بن عیاش، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک اور یحیی بن سعید قطان جیسے اساطین علم سے کسب فیض کیا۔ ۲۱۳ھ کو مصر کا سفر کیا۔ پھر مکہ معظمہ چلے اور وہیں ۲۲۴ ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۷/ ۳۵۵، الجرح والتعدیل: ۷/ ۱۱۱، وفیات الاعیان: ۴/ ۶۰، سیر اعلام النبلاء: ۱۰/ ۴۹۰، الاعلام للزرکلی: ۵/ ۱۷۶)(م)

(۳) مبارک بن محمد بن محمد ابن عبد الکریم شیبانی جزری، ابو السعادات، مجد الدین: جزیرہ ابن عمر میں ۵۴۴ھ کو پیدا ہوئے، پھر موصل منتقل ہوئے، وہاں بیمار ہوئے جس کی وجہ سے ہاتھ پاؤں مفلوج ہوئے اور اسی بیماری میں تمام کتابیں طلبہ کو املاء کر لکھوائیں، جن میں "النہایۃ فی غریب الحدیث" اور "جامع الاصول فی احادیث الرسول" خاص طور پر شامل ہیں اور موصل ہی میں ۶۰۶ ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان: ۴/ ۱۴۱، سیر اعلام النبلاء: ۲۱/ ۴۸۸، البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ ۵۴، شذرات الذہب: ۵/ ۲۲، الاعلام: ۵/ ۲۷۲)(م)

(۴) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۷۶، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۵۰۔ (م)

فصل دوم: روایت حدیث کے آداب

یہ فصل دو مباحث پر مشتمل ہے:

مبحث اول: محدث کے آداب

مبحث دوم: طالب حدیث کے آداب

مبحث اول: محدث کے آداب

ا۔ مقدمہ:

یہ بات حقیقت ہے کہ حدیث نبوی کی فروغ و اشاعت میں اپنی حیات مستعار کے چند روز صرف کرنا بہت بڑی سعادت مندی ہے اور افضل ترین نیکی اور اشرف و اعلیٰ عمل ہے، اس لیے ضروری ہے کہ جو شخص اس عظیم علم کے حصول میں منہمک ہو اور عوام الناس میں اس فریضے کی نشر و اشاعت کر رہا ہو تو وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اعلیٰ اخلاق اور عمدہ عادات سے آراستہ کرے تاکہ لوگوں کو احادیث نبوی کی تعلیم دینے والا خود اس کا سچا اور مثالی نمونہ ہو اور دوسروں کو ان پر عمل پیرا ہونے کی وعظ و نصیحت کرنے سے پہلے خود اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھال چکا ہو۔

۲۔ ایک محدیث میں نمایاں اوصاف وخوبیاں:

(الف)۔ تصحیح نیت و اخلاص اور اس کے ساتھ ساتھ دنیوی اغراض، حب جاہ، حب مال اور شہرت طلبی سے اپنے دل کو صاف رکھے۔

(ب)۔ ایک محدث کا سب سے بڑا مقصد احادیث نبویہ کی نشر واشاعت اور تبلیغ و ترویج ہو اور وہ اس خدمت پر صرف اللہ تعالیٰ سے اجر جزیل کا طلب کار ہو[1]۔

(ج)۔ جو شخص اس سے علم و عمر میں بڑا ہو، اس کی موجودگی میں حدیث بیان نہ کرے[1]۔

---

[1] محاسن اخلاق کے پیکر اور اشاعت دین کے جذبہ سے سرشار ایسے نیک سیرت محدث کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں دعا فرمائی۔

"نَضَّرَ اللّٰہُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِیثًا فَحَفِظَهُ حَتَّى يُبَلِّغَهُ غَيْرَهُ." (سنن الترمذی: ٥/ ٣٣، رقم: ٢٦٥٦)

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرم اور ترو تازہ رکھے جس نے ہم سے حدیث سنی اور اسے یاد کر لیا یہاں تک کہ اسے دوسرے تک پہنچا دیا۔" (م)

[1] شیخ آداب و احترام میں سے یہ بھی ہے کہ اگر اس کے اپنے شہر یا قریب تر دوسرے شہر میں ایسا عالم موجود ہو جو علمی جاہ و حشمت، احادیث کی ثقاہت اور دیگر اوصاف میں اس سے فائق ہو تو اسے چاہیے کہ خود احادیث بیان کرنے سے گریز کرے اور طلبہ حدیث کی راہنمائی اس کی طرف کرے، امام یحییٰ بن معینؒ (م ٢٣٣ھ) =

(د)۔ جب کوئی اس سے کسی ایسی حدیث کا مطالبہ کرے جس کے متعلق اسے علم ہو کہ یہ حدیث کسی دوسرے محدیث کے پاس ہے تو وہ سائل کو اس محدث سے رجوع کرنے کی ہدایت کرے[1]۔

(ھ)۔ وہ محض اس بناء پر کسی سے روایت حدیث میں بخل نہ کرے، جس کے متعلق وہ یہ جانتا ہو کہ اس کی نیت درست نہیں، اس لیے کہ نیت درست ہو جانے کی بعد میں بھی امید ہو سکتی ہے[2]۔

(و)۔ حدیث کی املاء اور تعلیم کے لیے مجلس منعقد کرے، بشرطیکہ درس حدیث کا وہ اپنے آپ کو اہل سمجھتا ہو، اس لیے کہ یہ روایت حدیث کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے[3]۔

۳۔ مجلس املاء میں حاضری سے پہلے کونسے امور مستحسن ہیں؟

(الف)۔ وضوء کرے، خوشبو لگائے اور داڑھی میں کنگھی کرے[4]۔

= اس حوالے سے بہت سختی کرتے تھے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"إِنَّ الَّذِي يُحَدِّثُ بِالْبَلْدَةِ - وَفِيهَا مَنْ هُوَ أَوْلَى بِالتَّحْدِيثِ مِنْهُ - فَهُوَ أَحْمَقُ."

(تاریخ بغداد: ۱۱/ ۴۷، مقدمۃ ابن الصلاح: ۷ ۳۴)

"وہ شخص جو ایسی جگہ احادیث بیان کرتا ہے جہاں اس سے فائق اور اعلیٰ شخصیت موجود ہو تو وہ بہت بڑا بے وقوف ہے۔"

تاریخ بغداد میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم نخعیؒ اور امام شعبیؒ کہیں اکٹھے ہو جاتے تھے تو امام شعبیؒ کی موجودگی میں حضرت ابراہیم نخعیؒ گفتگو نہیں فرماتے تھے۔ دیکھئے: تاریخ بغداد: ۱۱/ ۴۷، مقدمۃ ابن الصلاح: ۷ ۳۴۔ (م)

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۷ ۳۴۔ (م)

(۲) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۷ ۳۴۔ (م)

(۳) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۴۴، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۴۹۸۔ (م)

(۴) امام مالک بن انسؒ (م ۱۷۹ھ) جب بھی حدیث طیبہ بیان کرنے کا ارادہ فرماتے تو آپ غسل کرتے، خوشبو لگاتے اور آداب کا مکمل اہتمام کرتے۔ جب آپ سے اس کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا میں یہ پسند کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث طیبہ کی تعظیم و توقیر کروں اور اور میں کبھی بھی طہارت کے بغیر حدیث بیان نہ کروں۔

(مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۴۸، تدریب الراوی: ۲/ ۵۷۲)

آپ کی مجلس حدیث میں اگر کوئی اپنی آواز بلند کرتا تو آپ اسے جھڑک دیتے اور فرماتے اللہ تعالی =

(ب)۔ وقار، رعب اور وجاہت کیساتھ جم کر بیٹھے، تاکہ احادیث رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و تکریم نمایاں ہو۔

(ج)۔ تمام حاضرین کی طرف متوجہ ہو، کسی ایک کی طرف خصوصی توجہ نہ دے [1]۔

(د)۔ مجلس کی ابتداء اور انتہاء اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے کرے اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے اور

=کا ارشاد ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاَ تَرْفَعُوا أَصْواتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ}، فَمَنْ رَفَعَ صَوتَهُ عِنْدَ حديثِ رسولِ اللهِ ﷺ فكأنَّما رَفَعَ صَوْتَهُ فوقَ صَوتِ رسولِ اللهِ ﷺ.

(مقدمہ ابن الصلاح:۳۴۸)

”اے ایمان والو! اپنی آوازیں رسول اللہ ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو، جس نے آپ ﷺ کی حدیث کے بیان کے دوران اپنی آواز بلند کی تو گویا اس نے رسول اللہ ﷺ کی آواز پر اپنی آواز بلند کیا۔“

تابعی جلیل سعید بن مسیبؒ سے ایک حدیث کے متعلق سوال کیا گیا، اس وقت آپ بوجہ بیماری صاحب فراش تھے لیکن حدیث بیان کرنے کے لیے آپ اٹھے اور بیٹھ کر حدیث بیان فرمائی، جب آپ سے کہا گیا کہ آپ نے اتنی تکلیف کیوں برداشت کی؟ تو آپ نے فرمایا۔

”كَرِهْتُ أَنْ أُحَدِّثَ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَنَا مُضْطَجِعٌ.“ (تدریب الراوی:۲/۵۷۳)

”میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کروں اور میں لیٹا ہوں۔“

اسی طرح بشر بن حارث سے منقول ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ سے راستے میں چلتے ہوئے ایک حدیث کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ علم کی احترام و توقیر کے خلاف ہے۔ (تدریب الراوی:۲/۵۷۲)(م)

[1] محدث کے لیے یہ ضروری ہے کہ حدیث بیان کرتے وقت تمام حاضرین کی طرف اس کی توجہ یکساں ہو اور اسے چاہیے کہ ٹھہر ٹھہر کر حدیث بیان کرے جس سے تمام سامعین مستفید ہو سکیں، حبیب بن ابی ثابتؒ سے منقول ہے:

”إِنَّ مِنَ السُّنَّةِ إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْقَوْمَ أَنْ يُقْبِلَ عَلَيْهِمْ جَمِيعًا.“ (تدریب الراوی:۲/۵۷۳)

”یہ سنت ہے کہ جب کوئی آدمی کسی قوم کے سامنے حدیث بیان کرنے لگے تو اسے چاہیے کہ وہ تمام حاضرین کی طرف یکساں متوجہ ہو۔“

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو تیزی سے حدیث بیان کرتے سنا تو فرمایا:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَمْ يَكُنْ يَسْرُدُ الْحَدِيثَ كَسَرْدِكُمْ». (صحیح مسلم:۴/۱۹۴۰، رقم:۲۴۹۳)

رسول اللہ ﷺ اس طرح تیزی سے حدیث بیان نہیں فرماتے تھے جیسے تم تیزی کرتے ہو۔ (م)

حسب حال اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگے [۱]۔

(ھ)۔ حاضرین مجلس کے فہم وادراک اور سمجھ سے بالاتر کوئی بات اور حدیث بیان نہ کرے۔

(و)۔ املاء حدیث کے اختتام پر طلبہ حدیث کی دلچسپی اور ترغیب کے لیے لطائف و حکایات بھی بیان کرے، تاکہ ان کی تکان اور اکتاہٹ دور ہو جائے [۲]۔

۴۔ ایک محدث کی مناسب وموزون عمر:

ایک محدث کے لیے حدیث بیان کرنے کے لیے کونسی عمر مناسب وموزون ہے؟ تو اس میں محدثین کرام کے مختلف اقوال ہیں:

(الف)۔ بعض کا خیال ہے کہ پچاس برس مناسب ہے، ایک قول چالیس سال کا ہے اور بعض نے اس سے کم وبیش بھی بتلائی ہے۔

(ب)۔ صحیح قول یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتا ہو اور طلبہ حدیث بھی اس سے استفادہ کے لیے شد رحال کرتے ہوں تو اسے روایت حدیث شروع کر دینی چاہئے، عمر چاہے اس کی جو بھی ہو! [۳]

۵۔ آدابِ محدث پر معروف تصانیف:

(الف)۔ الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع، از خطیب بغدادیؒ۔

(ب)۔ جامع بیان العلم و فضله وما ینبغی فی روایته وحمله، از علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ۔

---

[۱] دیکھئے: التقریب والتیسیر: ۸۰، تدریب الراوی: ۲/ ۵۷۳۔ (م)

[۲] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۴۸۔ (م)

[۳] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۴۴، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/ ۴۹۸۔ (م)

مبحث دوم: طالبِ حدیث کے آداب

۱۔ مقدمہ:

طالبِ حدیث کے آداب سے وہ اوصاف عالیہ اور اخلاق حمیدہ مراد ہیں، جن کے ساتھ ایک طالب علم کو متصف ہونا چاہیئے اور وہ جس عظیم علم احادیث رسول اللہ ﷺ کو حاصل کر رہا ہے، اس کے مناسب اور شایاں شان ہوں [1]، ان میں کچھ اوصاف تو وہ ہیں جو محدث اور طالب حدیث دونوں میں مشترک ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق صرف طالب حدیث کیساتھ ہے۔ ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

۲۔ محدث اور طالب حدیث میں مشترک اخلاق و آداب:

(الف)۔ تصحیح نیت اور محض رضا الٰہی کے لیے علم حاصل کرنا۔

(ب)۔ طلب حدیث دنیوی مفاد واغراض کے خاطر نہ ہو اور اس سے بے حد گریز کرے، سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

(۱) طالب حدیث کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جب وہ عبادات اور آداب سے متعلقہ احادیث کا سماع کرے تو ان کے مطابق عمل کی کوشش کرے تاکہ وہ ان کے برکات سے مستفیض ہو، بشر بن حارث حافیؒ (م ۲۲۷ھ) فرماتے ہیں۔

"(يا أصحابَ الحديثِ! أَدُّوا زكاةَ هذا الحديثِ، اعْمَلُوا مِنْ كُلِّ مِئَتَي حديثٍ بِخَمْسةِ أحاديثَ)."
(مقدمۃ ابن الصلاح:۳۵۵)

"اے اصحاب الحدیث! اس علم حدیث کی زکوۃ ادا کرو۔ وہ یہ کہ ہر دوسو احادیث میں سے پانچ احادیث کے مطابق عمل کرو۔"

عمرو بن قیس ملائیؒ فرماتے ہیں۔

"إذا بَلَغَكَ شيءٌ مِنَ الخيرِ فاعْمَلْ بهِ - ولوْ مَرَّةً - تَكُنْ مِنْ أهلِهِ)."(مقدمۃ ابن الصلاح:۳۵۵)

"جب تجھے عمل خیر میں سے کسی کا علم ہو تو اس کے مطابق عمل کرو اگرچہ ایک بار ہی ہو تو تم اس کے اہل بن جاؤ گے۔"

امام وکیع بن جراحؒ فرماتے ہیں۔

(إذا أَرَدْتَ أنْ تَحفظَ الحديثَ فاعْمَلْ بهِ).(مقدمۃ ابن الصلاح:۳۵۵)

"جب تو کسی حدیث کو یاد کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے مطابق عمل کر۔" (م)

"مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا، لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".[1]

"جس شخص نے رضائے الٰہی کا ذریعہ بننے والے علم کو صرف دنیوی اغراض کے حصول کے لیے حاصل کیا وہ قیامت کے دن جنت کے خوشبو سے بھی محروم رہے گا"۔

(ج)۔ سماع حدیث کی ابتداء اپنے علاقے کے اس شیخ اور استاذ سے کرے جس کی سند سب سے عالی ہو اور علم و عمل میں سب سے زیادہ ہو[2]۔

(د)۔ اپنے شیخ کی بلکہ ہر عالم جس سے سماع حدیث کی ہو حد درجہ تعظیم و توقیر کرتا رہے، یہ بات علم حدیث کے شرف و جلال کا ایک حصہ ہی نہیں، بلکہ اس سے فیض یاب ہونے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے، اور طالب حدیث ہمیشہ اپنے شیخ کی رضا جوئی کا متلاشی رہے، اگر وہ بے رخی بھی کرے تو

---

(۱) مستدرک حاکم: ۱/ ۸۵، امام حاکم کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے اور شیخین کے شروط کے مطابق ہے۔ امام ذہبیؒ نے بھی اس کی تصویب کی ہے۔ (ط)

(۲) طلب حدیث کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ سماع حدیث کا آغاز اپنے شہر کے محدثین کرام سے کرے اور اس کے بعد اپنے قریب تر علاقے کے مشائخ اور اساتذہ حدیث کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرے اور پھر دور دراز کا سفر اختیار کرے۔ اہل علم اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ طالبِ حدیث اپنے شہر میں رہ کر علمی مہارت حاصل کرے، بشرطیکہ حصول علم کے مواقع اپنے شہر میں میسر ہوں، خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں۔

"الْمَقْصُودُ فِي الرِّحْلَةِ فِي الْحَدِيثِ أَمْرَانِ: أَحَدُهُمَا تَحْصِيلُ عُلُوِّ الْإِسْنَادِ وَقِدَمِ السَّمَاعِ، وَالثَّانِي لِقَاءُ الْحُفَّاظِ وَالْمُذَاكَرَةُ لَهُمْ وَالِاسْتِفَادَةُ عَنْهُمْ. فَإِذَا كَانَ الْأَمْرَانِ مَوْجُودَيْنِ فِي بَلَدِ الطَّالِبِ وَمَعْدُومَيْنِ فِي غَيْرِهِ فَلَا فَائِدَةَ فِي الرِّحْلَةِ، وَالِاقْتِصَارُ عَلَى مَا فِي الْبَلَدِ أَوْلَى."

(الجامع لاخلاق الراوی: ۲/ ۲۲۳)

"طلبِ حدیث کے سلسلہ میں سفر کرنے کے دو مقصد ہیں: ایک علوِ سند وقدمِ سماع کا حصول اور دوسرا حفاظ حدیث سے ملاقات واستفادہ۔ لیکن جب یہ دونوں باتیں طالب علم کے شہر میں موجود ہوں اور دوسری جگہ موجود نہ ہوں تو سفر کر کے جانے کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اپنے شہر میں اقامت زیادہ بہتر ہے۔" (م)

صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے[۱]۔

(ھ)۔ اگر طالب حدیث کو دوران تعلیم علمی فوائد و نکات حاصل ہوں تو اسے اپنے رفقائے درس اور طلبہ حدیث کو بھی آگاہ کرے اور انہیں ان سے ہر گز نہ چھپائے، اس لیے کہ علمی فوائد و نکات کو طلبہ حدیث سے چھپانا ایک قابل مذمت حرکت ہے جو کمینے اور جاہل قسم لوگوں کا وطیرہ ہے، حالانکہ طلب علم کی غرض وغایت ہی اشاعت علم ہے[۲]۔

---

(۱) طالبِ حدیث کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے شیخ کی عزت وتوقیر کرتا رہے ان کی عظمت علم کا اعتراف کرے اور منافع علم کی پاسداری کے لیے کبھی بھی آداب اور احترام بجالانے میں تساہل اور غفلت کا مظاہرہ نہ کرے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے۔

" تَوَاضَعُوا لِمَنْ تَعَلَّمُونَ مِنْهُ. "(الجامع لاخلاق الراوی:۱/ ۹۳)

"تم جن سے علم حاصل کرتے ہو ان سے تواضع اور انکساری سے پیش آؤ۔"

حافظ خلیلیؒ نے قاضی ابویوسفؒ (م ۱۸۲ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"سَمِعْتُ السَّلَفَ يَقُولُونَ: مَنْ لَا يَعْرِفُ لِأُسْتَاذِهِ لَا يُفْلِحُ. "(تدریب الراوی:۲/ ۵۹۰)

"میں نے سلف صالحین کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو اپنے استاذ کی عزت وتوقیر نہیں کرتا وہ کامیاب نہیں ہوتا۔" (م)

(۲) طالب حدیث کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جہاں سے وہ خود استفادہ کرے اس کی طرف دوسروں کی بھی راہنمائی کرے اور علم کے اظہار میں کبھی بھی بخل سے کام نہ لے، امام یحییٰ بن معینؒ (م ۲۳۳ھ) کا قول ہے۔

(مَنْ بَخِلَ بِالْحَدِيْثِ، وكَتَمَ عَلَى النَّاسِ سَمَاعَهُمْ، لَمْ يُفْلِحْ).(تدریب الراوی:۲/ ۵۹۱)

"جس نے حدیث کے بارے میں بخل سے کام لیا اور لوگوں کو سنانے سے اسے چھپایا تو وہ کامیاب نہیں ہو گا۔"

خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔

«إِخْوَانِي تَنَاصَحُوا فِي الْعِلْمِ، وَلَا يَكْتُمْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، فَإِنَّ خِيَانَةَ الرَّجُلِ فِي عِلْمِهِ أَشَدُّ مِنْ خِيَانَتِهِ فِي مَالِهِ.».(تدریب الراوی:۲/ ۵۹۱)

"میرے بھائیو! علم میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کرو اور ایک دوسرے سے کوئی چیز صیغہ راز میں نہ رکھو، کیونکہ علم میں خیانت مال و زر میں خیانت سے بڑھ کر ہے۔"

علامہ سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) نے (تدریب الراوی:۲/ ۵۹۱) میں عبد اللہ بن مبارکؒ کا قول نقل کرتے ہیں۔

"مَنْ بَخِلَ بِالْعِلْمِ ابْتُلِيَ بِثَلَاثٍ: إِمَّا أَنْ يَمُوتَ فَيَذْهَبَ عِلْمُهُ، أَوْ يَنْسَى، أَوْ يَتْبَعَ السُّلْطَانَ."

"جو شخص علم میں بخل کرے گا اسے تین آزمائشوں میں مبتلا کیا جائے گا، یا تو موت کے وقت اس کا علم ختم ہو جائے گا، یا اسے علم بھول جائے گا، یا وہ پھر سلطان وقت کا تابع ہو جائے گا۔(م)

(و)۔ طالب حدیث حیا یا تکبر کی بنا پر سماع حدیث، حصول علم اور استفادہ کرنے میں کوتاہی نہ کرے، خواہ اسے ایسے شخص کے آگے زانوئے تلمذ طے کرنا پڑے جو اس سے عمر اور مرتبہ میں کم ہو[1]۔

(ز)۔ طلبہ حدیث صرف سماع اور کتابت پر قناعت نہ کریں، بلکہ معرفت اور فہم حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتے رہیں۔

(خ)۔ سماع اور ضبط وحفظ میں صحیحین (بخاری ومسلم) کو مقدم کرے، پھر سنن ابی داؤد، سنن الترمذی اور سنن النسائی کی سماعت کرے، پھر امام بیہقی کی "السنن الکبری" کی سماعت کرے اور اس کے بعد حسب ضرورت مسانید اور جوامع مثلاً مسند احمد اور مؤطا امام مالکؒ کی سماع کرے اور کتب علل میں امام دار قطنی کی "العلل" اسماء رجال میں امام بخاریؒ کی "التاریخ الکبیر" اور امام ابن

---

(۱) طالب علم کے لیے یہ ضروری ہے کہ علم کے حصول میں تکبر اور حیاء کو علم کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دے، امام بخاریؒ (م۲۵٦ھ) نے حضرت مجاہدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"لَا يَنَالُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَلَا مُسْتَكْبِرٌ." (تدریب الراوی:۲/ ۵۹۲)

"علم حاصل کرنے سے حیاء کرنے والا اور تکبر کرنے والا علم حاصل نہیں کر سکتا۔"

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

"مَنْ رَقَّ وَجْهُهُ دَقَّ عِلْمُهُ." (تدریب الراوی:۲/ ۵۹۲)

"جس نے اپنے آپ کو جھکایا تو اس کے علم میں دقت ہو گی۔"

امام اصمعیؒ سے منقول ہے۔

"مَنْ لَمْ يَحْتَمِلْ ذُلَّ التَّعْلِيمِ سَاعَةً بَقِيَ فِي ذُلِّ الْجَهْلِ أَبَدًا." (تدریب الراوی:۲/ ۵۹۲)

"جو شخص علم کی ذلت وانکساری ایک گھڑی کے لیے برداشت نہیں کرتا تو وہ جہالت کی ذلت میں ہمیشہ رہے گا۔"

امام عبد اللہ بن مبارکؒ (م۱۸۲ھ) حصول علم میں اس درجہ حریص تھے کہ وہ اپنے سے کم درجہ کے آدمی سے بھی استفادہ کرتے تھے، ایک صاحب سے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ شاید ان کے پاس ایسی کوئی بات ہو جو میری نجات کا ذریعہ بن جائے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: تدریب الراوی:۲/ ۵۹۲۔ (م)

ابی حاتم کی ''الجرح والتعدیل'' کا مطالعہ کرے ضبط اسماء کے لیے امام ابن ماکولا رحمہ اللہ[1] کی کتاب اور غریب الحدیث میں امام ابن اثیر کی ''النہایۃ'' کو حسب ضرورت مطالعہ میں رکھے۔

---

(۱) علی بن ہبۃ اللہ بن علی بن جعفر، ابونصر، سعد الملک، ابن ماکولا: عکبر (بغداد) میں ۴۲۱ھ کو پیدا ہوئے، اصل میں جرباذقان (اصبہان) کے تھے، اپنے دور کے عظیم محدث، مؤرخ اور جید عالم تھے، حصول علم کے سلسلے میں شام، مصر، جزیرہ، ماواء النہر اور خراسان کے اسفار کیے، خوزستان میں اپنے غلاموں نے ۴۷۵ھ کو شہید کر دیا تھا۔ (وفیات الاعیان:۳/۳۰۵، سیر اعلام النبلاء:۱۸/۵۶۹، النجوم الزاہرہ:۵/۱۵۵، شذرات الذہب:۳/۳۸۱، الاعلام للزرکلی:۵/۳۰)(م)

باب چہارم: اسناد اور متعلقات اسناد

یہ باب دو فصلوں پر مشتمل ہے:

فصل اول: لطائف اسناد

فصل دوم: معرفت رواۃ

فصل اول: لطائف اسناد

یہ فصل علوم حدیث کے درج ذیل سات انواع پر مشتمل ہے:
۱- اسناد عالی ونازل ۲-حدیث مسلسل ۳- اکابر کی اصاغر سے روایت ۴- آباء کی ابناء سے روایت ۵-ابناء کی آباء سے روایت ۶- مدبج اور روایت اقران ۷-سابق ولاحق۔

۱۔ اسناد عالی ونازل[1]

۱۔ تمہید:

اسناد امت محمد یہ کی وہ خصوصیت اور طرہ امتیاز ہے جس میں امم سابقہ میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ شریک نہیں اور یہ ایک مستحکم اور قابل اعتماد سنت اور طرز عمل ہے، اس لیے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے، کہ وہ احادیث اور اخبار کے نقل میں اسناد پر کامل اعتماد کریں، محدث جلیل عبد اللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں:
" الإِسْنادِ مِنَ الدِّيْنِ، لَوْلاَ الإِسْنادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ ما شَاءَ "[1]۔
"اسناد دین کا حصہ ہے، اگر سند نہ ہوتی تو جس کا جو جی چاہتا کہہ دیتا"۔
معروف محدث سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۵ - ۱۴، مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۶۳، الجامع لأخلاق الراوي: ۱/ ۱۱۵ التقریب: ۱۵۰ - ۱۵۲، الاقتراح: ۳۰۱ - ۳۰۸، واختصار علوم الحدیث: ۱۵۹ - ۱۶۴، والشذا الفیاح: ۲/ ۴۱۹ - ۴۳۴، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۴۲۱ - ۴۲۶، نزھۃ النظر: ۱۵۶، فتح المغیث: ۳/ ۳ - ۲۶، تدریب الراوي: ۲/ ۱۵۹ - ۱۷۲، فتح الباقي ۲/ ۲۵۶، توضیح الأفکار: ۲/ ۳۹۵ - ۴۰۱.(م)

(۱) مقدمۃ صحیح مسلم: ۱/ ۱۵، المحدث الفاصل: ۲۰۹، معرفۃ علوم الحدیث: ۶، شرف اصحاب الحدیث: ۴۱، مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۶۳۔(م)

"الْإِسْنَادُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ".[1]

"اسناد مؤمن کا ہتھیار ہے"۔

جس طرح اسناد دین کا حصہ اور سنت ہے اسی طرح علو اسناد کی طلب بھی سلف صالحین کی سنت ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے۔

"طَلَبُ الإسْنادِ العالِي سُنَّةٌ عَمَّنْ سَلَفَ."[2]

"علو اسناد کی تلاش و جستجو سلف صالحین کی سنت ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے رفقاء کوفہ سے مدینہ منورہ کی طرف سفر کر کے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث کی سماعت کرتے اور ان کے سامنے زانوئے تلمّذ طے کرتے تا کہ علو اسناد کی سعادت حاصل کریں[3]، اسی لیے محدثین کرامؒ نے طلب حدیث کے لیے سیاحت اور دور دراز امصار و بلاد کے اسفار کو ایک مستحسن امر قرار دیا ہے، متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے علو اسناد کے حصول کی خاطر اسفار کیے ہیں، سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا شمار ان ہی میں ہوتا ہے[4]۔

۲۔ اسناد عالی و نازل کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

عالی "عُلُوّ" مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور نازل "نُزُوْل" مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جو "عُلُوّ" کی ضد ہے۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

اسناد عالی کسی حدیث کی وہ سند ہے جس کے رجال کی تعداد اُس دوسری سند کے رجال

---

(۱) دیکھئے: تدریب الراوی: ۲/ ۶۰۶۔ (م)

(۲) الجامع لاخلاق الراوی: ۱/ ۱۲۳، مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۶۳، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۳۰۔ (م)

(۳) دیکھئے: تدریب الراوی: ۲/ ۶۰۵۔ (م)

(۴) دیکھئے: تدریب الراوی: ۲/ ۶۰۶۔ (م)

سے کم ہو جس کے ذریعے یہی حدیث زیادہ واسطوں سے منتقل ہو کر پہنچی ہو[1]۔

۳۔ علو اسناد کی اقسام وانواع:

علو اسناد کی پانچ قسمیں ہیں، جن میں ایک کا نام علو مطلق ہے اور باقی چار علو نسبی کہلاتے ہیں، جو یہ ہیں:

(الف)۔ کسی صحیح اور پاکیزہ اسناد کیساتھ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہونا علو مطلق ہے اور یہ علو اسناد کے جملہ اقسام میں سے سب سے اعلیٰ قسم ہے۔

(ب)۔ کسی امام حدیث کے قریب تر ہونا، اگرچہ بعد رسول اللہ ﷺ تک واسطوں کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہوں، مثلاً اعمش، ابن جریج اور امام مالکؒ وغیرہ کے قریب ہونا، بشرطیکہ اس کی سند صحیح اور بے عیب ہو[2]۔

(ج)۔ کتب ستہ یا ان کے علاوہ دیگر معتبر کتب حدیث میں سے کسی سے قریب ہونا، متأخرین کا اس صورت میں بڑا شغف رہا ہے اور انہوں نے اس کی طرف بڑی توجہ دی ہے[3] اور اس کی مختلف صورتیں موافقت، ابدال، مساوات اور مصافحہ وغیرہ بیان کی ہیں۔

ا۔ موافقت:

موافقت کا مطلب یہ ہے کہ ایک مصنف کے شیخ تک ایسے طریق کے ذریعے پہنچنا جو مصنف کے طریق کے علاوہ ہو اور جس میں مصنف کے مقابلے میں واسطوں کی تعداد کم ہو۔ یعنی اگر مصنف کے طریق سے حدیث کی روایت کی جاتی تو اس کے رجال واسطے زیادہ ہوتے۔ اس کی مثال یہ ہے، حافظ ابن حجرؒ نے شرح النخبہ میں اس کی مثال یوں پیش کی ہے:

"امام بخاریؒ نے اپنے شیخ قتیبہ کے واسطے سے امام مالکؒ سے ایک حدیث روایت کی ہے، اب اگر ہم امام بخاریؒ کے کے طریق یہی حدیث روایت کریں تو ہمارے اور قتیبہؒ کے درمیان آٹھ

---

[1] دیکھئے: ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۲۱، تدریب الراوی: ۲/ ۶۰۷۔ (م)

[2] دیکھئے: نزہۃ النظر: ۱۴۲۔ (م)

[3] دیکھئے: نزہۃ النظر: ۱۴۳۔ (م)

واسطے ہوں گے، لیکن اگر ہم یہی حدیث امام بخاریؒ کے دوسرے شیخ ابو العباس سراجؒ کے واسطے قتیبہ[١] سے روایت کریں تو ہمارے اور قتیبہ کے درمیان صرف سات واسطے ہوں گے، اس صورت میں ہمیں امام بخاریؒ کیساتھ ان کے شیخ (ابو العباس سراجؒ)[٢] میں موافقت بھی ہو جاتی ہے، اور اس کیساتھ ہی ان کے شیخ ابو العباس سراج تک علو سند بھی حاصل ہو جاتا ہے"۔[٣]

٣۔ مساوات:

مساوات کا مطلب یہ ہے کہ کسی مصنف نے ایک حدیث کو ایک خاص سند سے روایت کیا ہو، ایک دوسرا شخص کسی دوسری سند سے یہ حدیث بیان کرے اور دونوں میں راویوں کی تعداد برابر ہو۔ اس کی مثال حافظ ابن حجرؒ نے یہ دی ہے:

فرض کیجئے امام نسائیؒ ایک حدیث روایت کرتے ہیں اور اس کی سند میں ان سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک گیارہ راوی موجود ہوں یہی حدیث ایک دوسری سند سے مروی ہو اور اس میں بھی اتنے ہی راوی ہوں۔ تو گویا ہم اس صورت میں امام نسائی کے مساوی ہوں گے، اگرچہ ان کی سند ہماری سند سے الگ ہے[١]۔

٤۔ مصافحہ:

مصافحہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی حدیث کے رجال کی تعداد راوی سے لے کر آخر تک کسی دوسرے مصنف کے شاگرد کی رجال اسناد کی تعداد کے برابر ہو۔ وجہ تسمیہ بھی اس کی یہی ہے

---

[١] قتیبہ بن سعید بن جمیل ثقفی، ابو رجاء بغلانی: بغلان (بلخ کا ایک قصبہ ہے) میں ١٥٠ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم محدث اور جید عالم تھے، امام مالکؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام یحیی بن معینؒ جیسے اساطین علم نے ان سے کسب فیض کیا۔ عراق میں رہائش پذیر تھے، امام بخاریؒ نے ان سے ١٣٠٨ احادیث روایت کی ہیں اور امام مسلمؒ نے ان سے ٦٦٨ احادیث روایت کی ہیں، ١٥٠ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب: ٨/ ٣٥٨، تقریب التہذیب: ٤٥٤، الاعلام للزرکلی: ٥/ ١٨٩) (م)

[٢] یہ محمد بن اسحاق بن ابراہیم سراج ہے، خراسان کے مشایخ میں سے ہیں، ثقہ اور حافظ تھے، ٢١٦ھ کو پیدا ہوئے ور ٣١٣ھ کو وفات پائی۔ (ط)

[٣] شرح النخبۃ ص ٦١. (ط)

[١] نزہۃ النظر: ١٤٤۔ (م)

کہ بالعموم جب شخص آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو بات چیت سے پہلے وہ مصافحہ کرتے ہیں[1]۔

(د)۔ کسی راوی کے پہلے وفات پا جانے کی وجہ سے علو اسناد حاصل ہونا۔ اس کی مثال امام نوویؒ نے یوں بیان کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں میں جس حدیث کو ایسے تین راویوں سے روایت کروں، جنہوں نے امام بیہقیؒ سے اور انہوں نے امام حاکم سے روایت کی ہو تو یہ سند اس روایت کی سند سے اعلیٰ ہو گی جس کو میں تین واسطوں سے ابو بکر بن خلف[2] سے اور ان کے واسطے سے حاکم سے روایت کروں اس لیے کہ امام بیہقیؒ نے ابو بکر بن خلف سے پہلے وفات پائی ہے[3]۔

(ھ)۔ تقدم سماع کے ذریعے علو اسناد حاصل ہونا، یعنی جس شخص نے شیخ سے پہلے حدیث کی سماعت کی ہو، اس کی سند اُس شخص سے عالی ہو گی، جس نے اس شخص کے بعد میں حدیث کی سماعت کی ہو۔ مثلاً دو آدمیوں نے ایک شیخ سے سماعت حدیث کیا ہو ایک کا سماع ساٹھ سال پہلے ہے اور دوسرے کے مقابلے میں اعلیٰ سند کا حامل ہو گا، اس عملی طور پر ظہور اس شیخ کے حق میں ہو گا جس کے شیخ کو اختلاط کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو یا بڑھاپے کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھے۔

۴۔ نزول اسناد کی اقسام وانواع:

نزول اسناد کی پانچ قسمیں ہیں جو اپنے اضداد سے پہچانے جاسکتے ہیں، اس لیے علو اسناد کی ہر قسم کے مقابلے میں اسناد کی ایک قسم ہے[1]۔

۵۔ کیا علو اسناد افضل ہے یا نزولِ اسناد؟

(الف)۔ جمہور محدثین کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ علو اسناد نزولِ اسناد سے افضل ہے، اس لیے کہ علو اسناد کی صورت حدیث میں کسی قسم خلل کا احتمال بہت کم ہوتا ہے، اسی وجہ سے نزول غیر پسندیدہ ہے، امام علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں۔

---

(۱) نزہۃ النظر: ۱۴۴۔ (م)

(۲) ابو بکر بن خلف احمد بن علی بن عبد اللہ بن عمر بن خلف شیرازی نیشاپوری: اپنے دور کے عظیم محدث، ادیب اور مسند وقت تھے، امام حاکمؒ اور عبد اللہ بن یوسفؒ سے روایت کرتے ہیں، ۴۸۷ھ کو وفات پائی۔ (العبر فی خبر من غبر: ۲/ ۳۵۴، مرآۃ الجنان: ۳/ ۱۰۹، شذرات الذہب: ۵/ ۳۷۲) (م)

(۳) التقریب بشرح التدریب ج ۲، ص ۱۶۸، امام بیہقیؒ نے ۴۵۸ھ کو وفات پائی اور خلف نے ۴۸۷ھ وفات پائی۔ (ط)

(۱) دیکھئے: مقدمہ ابن الصلاح: ۳۶۹، معرفۃ علوم الحدیث: ۱۲۔ (م)

«النُّزُولُ شُؤْمٌ».(۱)

" نزول اسناد ایک قسم بد شکونی ہے"۔

واضح رہے یہ اس وقت ہے جب دونوں سندیں قوت میں برابر ہوں۔

(ب)۔ صرف اس صورت میں نزول افضل ہو گا جب اسناد کے نزول کا کوئی فائدہ ہو، جیسے اس کے رجال اسناد عالی کے رجال سے زیادہ ثقہ یا زیادہ حافظ یا زیادہ فقیہ ہوں(۲)۔

٦۔اس موضوع پر مشہور تصانیف:

اسنادِ عالی اور اسنادِ نازل کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں، البتہ محدثین کرامؒ نے کچھ مستقل اجزاء تالیف کیے ہیں، جن کو ثلاثیات کے نام سے موسوم کیا ہیں، اس سے وہ احادیث مراد ہیں، جن میں مؤلف اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے ہیں(۳)، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ محدثین کرام اسناد عالی کے جمع کرنے میں کسی قدر اہتمام کرتے تھے، ان ثلاثیات میں چند معروف یہ ہیں۔

(الف)۔ ثلاثیات البخاری، از حافظ ابن حجر عسقلانیؒ۔

(ب)۔ ثلاثیات احمد بن حنبلؒ، از علامہ سفارینیؒ۔

---

(۱) الجامع لاخلاق الراوی:۱/۱۲۳، مقدمۃ ابن الصلاح:۳۶۹۔(م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح:۳۶۹، تدریب الراوی:۲/۶۱۹۔(م)

(۳) صحیح بخاری میں ۲۲ ثلاثیات ہیں، جن میں گیارہ مکی بن ابراہیم سے، چھ ابو عاصم نبیل سے، تین محمد بن عبد اللہ انصاری سے، ایک عصام بن خالد حمصی سے اور ایک خلاد بن یحیی کوفی سے مروی ہے۔ سنن ترمذی (رقم:۲۲۶۰) میں صرف ایک ثلاثی حدیث ہے، سنن ابن ماجہ میں پانچ ثلاثیات ہیں، لیکن ان کے راوی متکلم فیہ ہیں، دیگر کتب ستہ میں ثلاثیات نہیں۔ (الرسالۃ المستطرفہ:۸۱-۸۲)(م)

۲۔حدیث مسلسل [۱]

ا۔حدیث مسلسل کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مسلسل "السِلْسِلَةُ" سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، اور "سلسلہ" ایک چیز کے دوسری چیز کیساتھ ملنے کو کہتے ہیں، اسی سے "سِلْسِلَةُ الحَدِيدِ" (لوہے کی زنجیر) ماخوذ ہے، گویا کہ اس حدیث کا مسلسل نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ اجزاء کے درمیان تماثل اور اتصال کے اعتبار سے یہ سلسلہ زنجیر کے مشابہ و مماثل ہے [۲]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

حدیث مسلسل وہ حدیث ہے جس کے راوی خود یا روایت کی کسی صفت یا حالت کے بیان کرنے میں ایک تسلسل کیساتھ ہوں [۳]۔

۲۔اصطلاحی تعریف کا مفہوم:

مسلسل وہ حدیث ہے جس کے رواۃ درج ذیل امور میں ایک تسلسل کیساتھ ہوں۔

(الف)۔ رواۃ کی کسی ایک صفت میں سب مشترک ہوں۔

(ب)۔ یا رواۃ کی کسی حالت میں سب مشترک ہوں۔

---

(۱) معرفة علوم الحديث: ۲۹ - ۳۴، مقدمة ابن الصلاح: ۳۷۷، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۵۴ - ۵۵۸، التقريب: ۱۵۵ - ۱۵۶، الاقتراح: ۲۰۱ - ۲۰۵، الموقظة: ۴۳ - ۴۴، اختصار علوم الحديث: ۱۶۸ - ۱۶۹ الشذا الفياح: ۲/ ۴۵۶ - ۴۵۹، المقنع فى علوم الحديث: ۲/ ۴۴۷ - ۴۴۹، شرح التبصرة والتذكرة: ۲/ ۴۰۵، نزهة النظر: ۶۴ - ۶۵، فتح المغيث: ۳/ ۵۳ - ۵۸، تدريب الراوي: ۲/ ۱۸۷ - ۱۸۹، شرح السيوطي عَلَى ألفية العراقي: ۱۵۸، فتح الباقي: ۲/ ۲۸۴ - ۲۸۹، توضيح الأفكار: ۲/ ۴۱۴ - ۴۱۶، ظفر الأماني: ۲۸۷ - ۳۲۳. (م)

(۲) دیکھئے: لسان العرب: ۱۱/ ۳۴۵۔ (م)

(۳) التقريب مع التدريب: ۲/ ۱۸۷. (ط)

(ج)۔ یا روایت کی کسی ایک صفت میں اشتراک ہوں[1]۔

۳۔ حدیث مسلسل کی اقسام وانواع:

حدیث مسلسل کی تعریف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ مسلسل باحوال الرواۃ ۲۔ مسلسل بصفات الرواۃ ۳۔ مسلسل بصفات الروایۃ

ذیل میں مذکورہ انواع کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، ملاحظہ ہوں۔

(الف)۔ مسلسل باحوال الروایۃ:

وہ حدیث ہے جس میں رواۃ کے احوال میں تسلسل پایا جائے، خواہ یہ احوال ان کے اقوال ہوں، یا افعال ہوں، یا اقوال وافعال دونوں ہوں اس اعتبار سے اس کی تین صورتیں بن جاتی ہیں:

ا۔ مسلسل باحوال قولیہ ۲۔ مسلسل باحوال فعلیہ ۳۔ مسلسل باحوال قولیہ وفعلیہ

ا۔ مسلسل باحوال قولیہ:

وہ حدیث ہے جس کے تمام رواۃ کسی قول میں اول تا آخر متفق ہوں جیسے کہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

«يَا مُعَاذُ إِنِّي أُحِبُّكَ، فَقُلْ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ: اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»[2].

"اے معاذ! مجھے تم سے محبت ہے، پس تم ہر نماز کے بعد یہ دُعا کرو۔ اے اللہ! اپنے ذکر و شکر اور اچھی طرح اپنی عبادت کرنے میں میری مدد فرما"۔

یہ حدیث اس طرح مسلسل ہے کہ اس کے ہر راوی نے یہ روایت بیان کرتے وقت اپنے شاگردوں سے یہ کہا ہے "وَأَنَا أُحِبُّكَ فَقُلْ"۔ "اور مجھے تم سے محبت ہے، لہذا یہ کہو۔۔۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۷۸، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۹۰۔(م)

(۲) سنن أبي داود (۲/ ۸۶، رقم ۱۵۲۲)، سنن النسائي (۶/ ۳۲، رقم ۹۹۳۷)، مستدرک حاکم (۱/ ۴۰۷، رقم ۱۰۱۰) وقال: صحیح الإسناد علی شرط الشیخین. (م)

۔۔ ''پھر آگے حدیث بیان فرماتے''[۱]۔

۲۔ مسلسل باحوال فعلیہ:

وہ حدیث ہے جس کے تمام رواۃ کسی فعل میں اول تا آخر متفق ہوں، جیسے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

«شَبَكَ بِيَدِي أَبُو الْقَاسِمِ ﷺ وَقَالَ: خَلَقَ اللهُ الْأَرْضَ يَوْمَ السَّبْتِ»[۲].

ابو القاسم رسول اللہ ﷺ نے اپنی مبارک انگلیاں میری انگلیوں میں ڈال کر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا۔

یہ حدیث اس طرح مسلسل ہے کہ اس حدیث کو روایت کرتے وقت ہر شیخ نے اپنے شاگرد کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر اسے بیان کیا[۳]۔

۳۔ مسلسل باحوال قولیہ وفعلیہ:

وہ حدیث ہے جس کے تمام رواۃ کسی قول و فعل دونوں میں اول تا آخر تسلسل کیساتھ متفق ہوں، جیسے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

«لَا يَجِدُ الْعَبْدُ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ حَتَّى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ حُلْوِهِ وَمُرِّهِ»[۴].

''کوئی شخص اس وقت تک ایمان کی حلاوۃ نہیں محسوس کر سکتا جب تک تقدیر پر ایمان نہ کے آئے خواہ وہ خیر ہو یا شر ہو اور خواہ شیریں ہو یا تلخ ہو۔

یہ ارشاد فرماتے وقت رسول اللہ ﷺ نے اپنا دست مبارک اپنی داڑھی پر رکھا اور ساتھ ہی فرمایا:

آمَنْتُ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ حُلْوِهِ وَمُرِّهِ.

---

[۱] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۳۷۹، تدریب الراوی:۲/۶۴۱۔(م)

[۲] معرفۃ علوم الحدیث:۴۲۔(ط)

[۳] شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:۲/۹۱، فتح الباقی:۳/۲۶، فتح المغیث:۴/۳۹، تدریب الراوی:۲/۶۴۱۔(م)

[۴] دیکھئے: معرفۃ علوم الحدیث:۴۰۔(ط)

”میں تقدیر پر ایمان لایا ہوں خواہ وہ خیر ہو یا شر، شیریں ہو یا تلخ“۔

یہ حدیث اس طرح مسلسل ہے کہ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد ہر راوی نے اپنی داڑھی کو مٹھی میں لیا اور پھر فرمایا[1]۔

(ب)۔ مسلسل بصفات الرواۃ:

وہ حدیث ہے جس کے تمام رواۃ کسی صفت قولیہ پر اول تا آخر تسلسل کیساتھ متفق ہوں، پھر اس کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ مسلسل بصفات الرواۃ القولیہ:

یہ وہ حدیث ہے جس کے تمام رواۃ کسی صفت قولیہ پر اول تا آخر تسلسل کیساتھ متفق ہوں، جیسے وہ حدیث ہے جس کے تمام رواۃ سورۃ الصف کو تسلسل کیساتھ تلاوت کرتے ہیں۔ اس میں تمام رواۃ تسلسل کیساتھ یوں کہتے ہیں:

”فَقَرَأَهَا فُلَانٌ هٰكَذَا“[2].

”اس سورۃ کی تلاوت فلاں نے یوں کی ہے“[3]۔

---

[1] شرح التبصرۃ والتذکرۃ:۲/ ۹۲، فتح الباقی:۲/ ۱۶۶، فتح المغیث:۴/ ۴۰، تدریب الراوی:۲/ ۶۴۱۔(م)

[2] تدریب الراوی:۲/ ۶۴۱۔(م)

[3] اس حدیث کو امام ترمذیؒ (م ۲۷۹ھ) نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔

”حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ: أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ كَثِيرٍ، عَنِ الأَوْزَاعِيِّ، عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِي كَثِيرٍ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ، قَالَ: قَعَدْنَا نَفَرٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَتَذَاكَرْنَا، فَقُلْنَا: لَوْ نَعْلَمُ أَيَّ الأَعْمَالِ أَحَبَّ إِلَى اللّٰهِ لَعَمِلْنَاهُ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالَى {سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الأَرْضِ وَهُوَ العَزِيزُ الحَكِيمُ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ}، قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ: «فَقَرَأَهَا عَلَيْنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ» قَالَ أَبُو سَلَمَةَ: «فَقَرَأَهَا عَلَيْنَا ابْنُ سَلَامٍ» قَالَ يَحْيَى: «فَقَرَأَهَا عَلَيْنَا أَبُو سَلَمَةَ» قَالَ ابْنُ كَثِيرٍ: «فَقَرَأَهَا عَلَيْنَا الأَوْزَاعِيُّ» قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: «فَقَرَأَهَا عَلَيْنَا ابْنُ كَثِيرٍ».“(سنن الترمذی:۵/ ۴۱۲، رقم:۳۳۰۹)

”عبد اللہ بن عبد الرحمن بیان کرتے ہیں کہ انہیں محمد بن کثیر نے اوزاعی سے انہوں نے یحیی بن کثیر سے انہوں نے ابو سلمہ سے انہوں نے عبد اللہ بن سلام سے روایت کی کہ انہوں نے کہا: ہم اصحاب رسول میں سے چند لوگ بیٹھے ہوئے تذکرہ کر رہے تھے، ہم نے کہا کہ اگر ہمیں علم ہو تا کہ اللہ تعالی کو کون سا عمل سب سے زیادہ پسند ہے تو ہم عمل کرتے۔ اس پر اللہ تعالی نے سورۃ الصف نازل فرمائی: جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے =

علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں۔

وَصِفَاتُ الرُّوَاةِ الْقَوْلِيَّةِ وَأَحْوَالُهُمُ الْقَوْلِيَّةُ مُتَقَارِبَةٌ بَلْ مُتَمَاثِلَةٌ۔[۱]

”رواۃ کے صفات قولیہ اور فعلیہ نہ صرف باہم متقارب بلکہ متماثل ہوتے ہیں۔“

۲۔ مسلسل بصفات الرواۃ الفعلیۃ:

وہ حدیث ہے جس کے تمام رواۃ کسی صفت فعلیہ پر اول تا آخر متفق ہوں تمام رواۃ ایک ہی نام ہو، جیسے تمام رواۃ کا نام ”محمد“ ہوں یا تمام رواۃ کسی صفت میں باہم متفق ہوں، جیسے تمام راوی فقہاء ہوں یا حفاظ حدیث ہوں اور یا تمام رواۃ کسی نسبت میں متفق ہوں، جیسے تمام راوی دمشقی ہوں یا مصری ہوں[۲]۔

(ج)۔ مسلسل بصفات الروایۃ:

وہ حدیث ہے جس کے تمام رواۃ اول تا آخر روایت کی کسی صفت پر تسلسل کیساتھ متفق ہوں، خواہ روایت کی صفات کا تعلق صیغہ اداء کیساتھ ہو یا روایت کے زمان یا مکان کیساتھ ہو، ذیل میں تفصیل ملاحظہ ہو۔

ا۔ مسلسل بصیغ الاداء:

وہ حدیث ہے جس میں ہر راوی تسلسل کیساتھ ایک ہی لفظ کہے جیسا کہ ہر راوی مثلاً ”سَمِعْتُ“ یا ”أَخْبَرَنَا“ یا ”أَخْبَرَنَا واللهِ“ کہے[۱]۔

۲۔ مسلسل بزمان الروایۃ:

= سب اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں اوروہ غالب وحکمت والاہے، ایمان والو! تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔ ابن سلام نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے اسے پڑھا۔ ابو سلمہ نے کہا کہ ہمارے سامنے عبد اللہ بن سلام نے اسے پڑھا۔ یحیٰ نے کہا کہ ابو سلمہ نے ہمارے سامنے اسے پڑھا۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اوزاعی نے اسے ہمارے سامنے پڑھا، عبد اللہ نے کہا کہ ابن کثیر نے اسے ہمارے سامنے پڑھا۔ (م)

(۱) تدریب الراوی: ۲/ ۶۴۱۔ (م)

(۲) دیکھئے: شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/ ۹۳، تدریب الراوی: ۲/ ۶۴۳۔ (م)

(۱) شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/ ۹۴، فتح الباقی: ۲/ ۱۶۷، فتح المغیث: ۴/ ۴۰، تدریب الراوی: ۲/ ۶۴۲۔ (م)

وہ حدیث ہے جس میں ہر راوی کسی معین وقت میں روایت کرے جیسا کہ عید کے دن روایت کرنا[(۱)]۔

۳۔ مسلسل بمکان الروایۃ:

وہ حدیث ہے جس میں ہر راوی کسی خاص مقام پر روایت کرے جیسا کہ ملتزم پر قبولیت دعا کی حدیث ہے، جس کو تمام رواۃ نے اس مقام پر روایت کیا ہے[(۲)]۔

۴۔ احادیث مسلسلہ کی افضل قسم:

احادیث مسلسلہ میں سب سے افضل حدیث وہ ہے جو سماع کیساتھ اتصال اور عدمِ تدلیس پر دلالت کرتی ہو[(۳)]۔

۵۔ حدیث مسلسل کے فوائد:

حدیث مسلسل کے من جملہ فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ رواۃ کے ضبط و اتقان پر دلالت کرتی ہے[(۴)]۔

٦۔ کیا پوری سند میں تسلسل کا موجود ہونا شرط ہے؟

پوری سند میں تسلسل کا موجود ہونا شرط نہیں، اس لیے کہ بعض اوقات اسناد کے اول یا درمیان میں تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، تاہم ایسی صورت حال میں محدثین کرام یہ کہتے ہیں یہ حدیث فلاں راوی تک مسلسل ہے[(۱)]۔

---

(۱) شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/ ۹۴، فتح الباقی: ۲/ ١٦٧، فتح المغیث: ۴/ ۴۰، تدریب الراوی: ۲/ ٦۴۲۔(م)

(۲) شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/ ۹۴، فتح الباقی: ۲/ ١٦٧، فتح المغیث: ۴/ ۴۰، تدریب الراوی: ۲/ ٦۴۲۔(م)

(۳) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۳٧۹، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۵۸، التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۲۸۸، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۳۱۹۔(م)

(۴) مقدمۃ ابن الصلاح: ۳٧۹، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۵۸، التقریب: ۸٧، تدریب الراوی: ۲/ ٦۴۲۔(م)

(۱) مسلسل روایات کی خوبیوں کے باوجود بعض میں ضعف کے امکانات موجود ہوتے ہیں، کبھی ایک مسلسل روایت مرفوع ہونے کے باوجود منقطع ہو جاتی ہے، جو یہ سند کا نقص ہے، جیسے سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے: «الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ». =

۷۔ تسلسل اور صحت کا آپس میں کوئی ارتباط نہیں!

یہ بات ضروری نہیں کہ حدیث مسلسل صحیح ہی ہو گی، بلکہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ حدیث مسلسل اپنے تسلسل میں خلل یا ضعف سے خالی ہو، اگرچہ خود اصل حدیث جو تسلسل کے طریق کے علاوہ کسی دوسرے طریق سے مروی ہو صحیح ہی کیوں نہ ہو[1]۔

۸۔ احادیث مسلسلہ پر معروف تصانیف:

(الف)۔ المسلسلات الکبریٰ:

یہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی تالیف لطیف ہے، جو (۸۵) احادیث مسلسلہ پر مشتمل ہے۔

(ب)۔ المناهل السلسلة فی الأحادیث المسلسلة:

یہ علامہ محمد عبد الباقی ایوبیؒ کی تصنیف ہے، جو (۲۱۲) احادیث مسلسلہ پر مشتمل ہے[2]۔

= حدیث کے آغاز میں "سَمِعْتُهُ" کی وجہ سے روایت مسلسل ہے، سند کے آغاز سے سفیان بن عیینہ تک تسلسل ہے، لیکن اس سے اوپر رسول اللہ ﷺ تک یہ تسلسل منقطع ہو جاتا ہے۔ (ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۵۸، التبصرة والتذکرة: ۲/ ۲۸۹، تدریب الراوی: ۲/ ٦۴۳۔ (م)

[1] دیکھئے: ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۵۸، التبصرة والتذکرة للعراقی: ۲/ ۲۸۹، تدریب الراوی: ۲/ ٦۴۳۔ (م)

[2] احادیث مسلسلہ پر مزید کتابیں یہ ہیں:

العروس المجلیة في أسانید الحدیث المسلسل بالأولیة، از محمد بن أحمد بن محمد بن خیر الله حنفي الأثري (م ۱۲۰۰ھ)

الأحادیث العیدیة المسلسلة، از أبو طاهر السِّلَفِي أحمد بن محمد بن أحمد بن محمد أصبهاني (م ۵۷٦ھ)

المسلسلات المختصرة المقدمة أمام المجالس المبتكرة، از صلاح الدین أبو سعید خلیل بن کیکلدي بن عبد الله الدمشقي العلائي (م ۷٦۱ھ)

جیاد المسلسلات للسیوطي، از عبد الرحمن بن أبي بکر، جلال الدین السیوطي (م ۹۱۱ھ)

رسالة المسلسلات، از أبو عبد الله محمد بن أبي الفیض جعفر بن إدریس الکتاني (م ۱۳۴۵ھ)

العجالة فی الاحادیث المسلسلة، ابو الفیض محمد یاسین فادانی مکیؒ (م ۱۴۱۱ھ)

مباحث فی الحدیث المسلسل، از احمد ایوب محمد عبد اللہ فیاض۔ (م)

۳۔ روایۃ الاکابر عن الاصاغر [۱]

ا۔ روایۃ الاکابر عن الاصاغر کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

"أکابر" یہ "أکْبَر" کی اور "أصاغر" یہ "أصْغَر" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں بڑوں کا چھوٹوں سے روایت کرنا۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

وہ روایت ہے جس میں ایک شخص اپنے سے عمر اور طبقہ یا علم و حفظ میں کم درجہ کے شخص سے روایت کرے [۲]۔

۲۔ اصطلاحی تعریف کا مفہوم:

مذکورہ تعریف کا مفہوم یہ ہے کہ راوی ایک ایسے شخص سے حدیث روایت کرے، جو اس سے عمر اور طبقہ میں یا علم و حفظ میں کم درجہ کا ہو، طبقہ میں کم تر کی مثال جیسے صحابہ کرام کا تابعین سے روایت کرنا وغیرہ۔ اور یا راوی اس شخص سے حدیث روایت کرے جو علم و حفظ میں اس سے کم درجہ کا ہو، جیسے کسی عالم اور حافظ حدیث کا اپنے سے علم و حفظ میں کم درجے کے شیخ سے حدیث روایت کرنا اگرچہ وہ شیخ عمر میں راوی سے بڑا ہو۔

یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ صرف عمر میں بڑا ہونا یا طبقہ میں مقدم ہونا "رِوَايَةُ الْأَكَابِرِ

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۴۸ - ۴۹، مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۱۰، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۱۷ - ۶۱۹، التقریب والتیسر: ۱۶۷ - ۱۶۸، اختصار علوم الحدیث: ۱۹۵ - ۱۹۶، الشذا الفیاح ۲/ ۵۳۵ - ۵۴۰، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۵۱۸ - ۵۲۰، شرح التبصرۃ: ۳/ ۳۷ - ۷۶، نزہۃ النظر: ۶۲، فتح المغیث: ۳/ ۱۵۷ - ۱۵۹، تدریب الراوي: ۲/ ۲۴۳ – ۲۴۵ وشرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي: ۱۹۸، فتح الباقي ۳/ ۶۴ - ۶۵، توضیح الأفکار ۲/ ۴۷۳ - ۴۷۴.(م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۱۰، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۱۷ - ۶۱۹، التقریب والتیسر: ۱۶۷ - ۱۶۸، اختصار الحدیث: ۱۹۵ – ۱۹۶.(م)

عَنِ الْأَصَاغِرِ" کہلائے جانے کے لیے کافی نہیں، جب کہ علمی طور پر مساوات نہ ہو، اس کی وضاحت کے لیے ذیل کے مثالوں پر غور کیجئے۔

۳۔"رِوَايَةُ الْأَكَابِرِ عَنِ الْأَصَاغِرِ" اقسام اور مثالیں:

رِوَايَةُ الْأَكَابِرِ عَنِ الْأَصَاغِرِ کی درج ذیل تین قسمیں ہیں:

(الف)۔ راوی مروی عنہ (شیخ) سے عمر میں بڑا اور طبقہ میں مقدم ہو[۱]۔

(ب)۔ راوی مروی عنہ سے مرتبہ و مقام میں بڑا ہو، لیکن عمر میں کم ہو، جیسے کوئی حافظ حدیث اور عالم راوی کسی غیر حافظ مگر بڑی عمر کے شیخ سے روایت کرے، مثلاً امام مالکؒ کا عبد اللہ بن دینارؒ سے روایت کرنا[۲]۔

(ج)۔ راوی عمر اور مرتبہ دونوں میں مروی عنہ سے بڑا ہو، یعنی راوی مروی عنہ سے عمر اور علم دونوں میں بڑا ہو، جیسے برقانیؒ[۱] کی خطیب بغدادیؒ سے روایت کرنا[۲]۔

۴۔رِوَايَةُ الْأَكَابِرِ عَنِ الْأَصَاغِرِ کی چند مزید مثالیں:

(الف)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تابعین سے روایت کرنا جیسے عبادلہ (عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ) وغیرہ کا...

---

[۱] راوی مروی عنہ سے عمر اور طبقے میں مقدم ہو، جیسے زہری اور یحیی بن سعید انصاری کی امام مالکؒ سے روایت۔ یا ابو القاسم عبید اللہ بن احمد ازہری (جو خطیب بغدادیؒ کے شیخ ہیں) کی خطیب بغدادیؒ سے روایت۔ انہوں نے بعض تصانیف میں خطیب بغدادیؒ سے روایت کی ہے حالانکہ خطیب بغدادیؒ اس وقت جوان اور طالب علم تھے۔ دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۴۱۱، ارشاد طلاب الحقائق:۲/۶۱۷۔(م)

[۲] امام مالکؒ امام اور حافظ حدیث ہیں، جب کہ عبد اللہ بن دینارؒ صرف ان کے شیخ اور راوی ہیں تاہم عمر میں امام مالکؒ سے بڑے ہیں۔(ط)

[۱] احمد بن محمد بن احمد بن غالب، ابو بکر برقانی:۳۳۶ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم محدث اور جید عالم تھے، اصل میں خوارزم کے تھے، بغداد میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۴۲۵ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد:۵/۳۷۳، الاعلام للزرکلی:۱/۲۱۲)(م)

[۲] علامہ برقانیؒ عمر اور علم دونوں میں خطیب بغدادیؒ سے بڑے ہیں، کیونکہ علامہ برقانیؒ خطیب بغدادیؒ کے شیخ اور استاذ ہیں۔(ط)

کعب احبارؒ [1] (تابعی) سے روایت کرنا۔

(ب)۔ تابعین کا تبع تابعین سے روایت کرنا جیسے یحیی بن سعید انصاری [2] (تابعی) کا امام مالکؒ (تبع تابعی) سے روایت کرنا [3]۔

۵۔ رِوَایَةُ الْأَكَابِرِ عَنِ الْأَصَاغِرِ کے فوائد:

محدثین کرام نے اس کے متعدد فوائد بیان کیے ہیں، تاہم چند درج ذیل ہیں۔

(الف)۔ یہ وہم پیدا نہ ہو کہ ہمیشہ مروی عنہ (شیخ واستاذ) راوی (شاگرد) سے افضل اور عمر میں بڑا ہی ہوگا، کیونکہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔

(ب)۔ یہ گمان نہ ہو کہ سند میں قلب ہے اس لیے کہ عموماً اصاغرین اکابر سے روایت کرتے ہیں [1]۔

۶۔ رِوَایَةُ الْأَكَابِرِ عَنِ الْأَصَاغِرِ پر معروف تصانیف:

---

(۱) کعب بن ماتع بن ذی ہجن حمیری یمانی، ابو اسحاق: جلیل القدر تابعی ہیں، زمانہ جاہلیت میں یمن میں یہود کے پیشوا تھے، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اسلام لائے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینہ منورہ تشریف لائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ نے ان سے امم سابقہ کے احوال واخبار سنیں اور انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قرآن وسنت کے علوم اخذ کیے، پھر شام چلے گئے اور حمص میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۰۴ سال کی عمر میں ۳۲ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۷/ ۴۴۵، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۴۹، سیر اعلام النبلاء: ۳/ ۴۸۹، الاعلام للزرکلی: ۵/ ۲۲۸) (م)

(۲) یحیی بن سعید بن قیس انصاری نجاری، ابو سعید: اپنے دور میں عظیم محدث اور راوی حدیث تھے، مدینہ منورہ کے باشندے تھے، امام زہریؒ، ابن ابی ذئبؒ، امام مالکؒ، شعبۃ بن حجاجؒ، امام اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ، یحیی بن سعید قطان اور عبد اللہ بن مبارکؒ جیسے اساطین علم نے ان سے کسب فیض کیا۔ بنو امیہ کے دور میں یوسف بن محمد ثقفی نے آپ کو مدینہ منورہ کا قاضی نامزد کیا تھا، پھر ابو جعفر منصور نے انہیں قضاء سے برطرف کر دیا، پھر عباسی دور میں عراق چلے گئے، وہاں حیرہ کے قاضی مقرر کیے گئے، ہاشمیہ میں ۱۴۳ھ کو وفات پائی۔ (الجرح والتعدیل: ۹/ ۱۴۷، تہذیب الاسماء واللغات: ۲/ ۱۵۳، سیر اعلام النبلاء: ۵/ ۴۶۸، الاعلام للزرکلی: ۸/ ۱۴۷) (م)

(۳) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۱۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۱۸۔ (م)

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۱۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۱۷۔ (م)

مَا رَوَاهُ الْكِبَارُ عَنِ الصِّغَارِ وَالْآبَاءُ عَنِ الْأَبْنَاءِ، **از حافظ ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم وراق**ؒ[1]۔

---

[1] ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم بن یونس بغدادی، وراق: ۲۲۰ ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم محدث اور جید عالم تھے، امام نسائیؒ، ابن عدیؒ، طبرانیؒ اور احمد بن محمد خباشؒ جیسے اساطین علم نے ان سے کسب فیض کیا، امام نسائیؒ فرماتے ہیں صدوق تھے، ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ ثقہ ہیں، امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں، ابن یونسؒ کہتے ہیں کہ نیک صالح اور صدوق تھے، ۳۰۴ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد: ٦/٣٨٦، سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۱۴۱، شذرات الذہب: ۲/۲۴۳)(م)

۴- رِوَايَةُ الْآبَاءِ عَنِ الْأَبْنَاءِ[1]

ا۔رِوَايَةُ الْآبَاءِ عَنِ الْأَبْنَاءِ کی تعریف:

کسی حدیث کی سند میں یہ بات پائی جائے کہ باپ اپنے بیٹے سے حدیث روایت کر رہا ہو۔

۲۔رِوَايَةُ الْآبَاءِ عَنِ الْأَبْنَاءِ کی مثال:

اس کی مثال وہ حدیث ہے جس میں سیدنا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ[2] نے اپنے بیٹے سیدنا فضل رضی اللہ عنہ[1] سے روایت کی ہے:

"أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ جَمَعَ بَيْنَ الصَّلاتَيْنِ بِالْمُزْدَلِفَةِ".[2]

رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ میں دو نمازیں اکٹھی پڑھیں۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۱۷، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۳۲ - ۶۳۶، التقریب: ۱۷۰ - ۱۷۱، اختصار علوم الحدیث: ۱۹۹ - ۲۰۲، الشذا الفیاح: ۲/ ۵۵۸ - ۵۶۲، المقنع فی علوم الحدیث:۲/ ۵۳۵ - ۵۳۹، شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۳/ ۸۵، نزھۃ النظر: ۶۲، فتح المغیث: ۳/ ۱۷۰ - ۱۸۲، تدریب الراوي: ۲/ ۲۵۴ - ۲۵۵، فتح الباقي: ۳/ ۸۳ - ۱۰۰، توضیح الأفکار ۲/ ۴۷۷ - ۴۸۰.(م)

(۲) سیدنا عباس بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف، ابو فضل رضی اللہ عنہ: ۵۱ قبل از ہجری کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی اور رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے، جاہلیت اور اسلام دونوں میں قریش کے سردار تھے، ستر غلاموں کو خرید کر انہیں آزاد کیا، حاجیوں کو پانی پلایا کرتے تھے اور بیت اللہ کی تعمیر میں حصہ لیتے، غزوہ حنین اور فتح مکہ میں شریک تھے، آخری عمر میں نابینا ہو گئے، ان کی مرویات کی تعداد ۳۵ ہے، مدینہ منورہ میں ۳۲ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:۲/ ۸۱۰، اسد الغابۃ:۳/ ۱۶۳، الاعلام للزرکلی:۳/ ۲۶۲)(م)

(۱) سیدنا فضل بن عباس بن عبد المطلب ہاشمی قرشی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، رسول اللہ ﷺ کے چچازاد تھے، سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے سب سے پہلے صاحبزادے تھے، حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ردیف تھے اسی وجہ سے آپ کا لقب ردیف رسول اللہ ﷺ پڑھ گیا۔ آپ کی مروایات کی تعداد ۲۴ ہے، رسول اللہ ﷺ کے وفات کے بعد شام چلے گئے، اجنادین (فلسطین) میں ۱۳ھ کو شہید کیے گئے۔ (الاستیعاب:۳/ ۱۲۶۹، اسد الغابہ: ۴/ ۳۴۹، الاصابہ:۵/ ۲۷۸، الاعلام للزرکلی:۵/ ۱۴۹)(م)

(۲) اسے خطیب رحمہ اللہ نے (اپنی کتاب روایۃ الاباء عن الابناء میں) روایت کیا ہے جیسا کہ سخاوی رحمہ اللہ ص ۴۱۰ نے کہا ہے اور اصل حدیث صحیحین اور دیگر کتب حدیث میں موجود ہے۔ (ط)

۳۔ رِوَايَةُ الْآبَاءِ عَنِ الْأَبْنَاءِ کے فوائد:

محدثین کرام نے اس کے متعدد فوائد بیان کیے ہیں، جن میں ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ کسی کو یہ وہم پیدا نہ ہو کہ مذکورہ حدیث کی سند میں قلب یا خطاء ہے، اس لیے کہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ بیٹا اپنے باپ سے روایت کرتا ہے[1]۔

لطائف اسناد کی یہی قسم اور گزشتہ قسم محدثین کرام کی انتہائی تواضع اور عاجزی پر دلالت کرتی ہے کہ یہ لوگ علم وعرفان کے اتنے قدر داں اور شیدائی تھے کہ اس کے حصول میں یہ پرواہ نہیں کرتے کہ جس سے وہ علم حاصل کر رہے ہیں ان سے عمر اور مرتبہ میں کم ہیں!

۴۔ رِوَايَةُ الْآبَاءِ عَنِ الْأَبْنَاءِ پر معروف تصانیف:

رِوَايَةُ الْآبَاءِ عَنِ الْأَبْنَاءِ، از خطیب بغدادیؒ۔

---

(۱) ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۱۷، اختصار علوم الحدیث: ۱۹۶، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۳۹۰۔ (م)

۵- رِوَايَةُ الْأَبْنَاءِ عَنِ الْأَبَآءِ[(۱)]

۱۔رِوَايَةُ الْأَبْنَاءِ عَنِ الْأَبَآءِ کی تعریف:

کسی حدیث کی سند میں یہ بات پائی جائے کہ بیٹا صرف اپنے باپ سے یا اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے حدیث روایت کر رہا ہو[(۲)]۔

۲۔"رِوَايَةُ الْأَبْنَاءِ عَنِ الْأَبَآءِ" کی اہم نوع:

"رِوَايَةُ الْأَبْنَاءِ عَنِ الْأَبَآءِ" کی سب سے اہم نوع یہ ہے، جس میں راوی اپنے باپ یا دادا کا نام ذکر نہ کرے، اس لیے کہ اس صورت میں باپ یا دادا کا نام معلوم کرنے کے لیے بحث و تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے[(۳)]۔

۳۔"رِوَايَةُ الْأَبْنَاءِ عَنِ الْأَبَآءِ" کی اقسام وانواع:

"رِوَايَةُ الْأَبْنَاءِ عَنِ الْأَبَآءِ" کی درج ذیل دو قسمیں ہیں:

(الف)۔ راوی صرف اپنے باپ سے روایت کرے، یعنی دادا سے روایت نہ کرے، ایسی روایات بکثرت ہیں، مثلاً ابو العشراء کی اپنے باپ سے روایت کرنا[(۱)]۔

(ب)۔ راوی اپنے باپ کے واسطے سے دادا سے روایت کرے، یا اپنے باپ کے واسطے سے دادا اور پردادا سے روایت کرے، جیسے "عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن..........................

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۲۱، اِرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۳۲ - ۶۳۶، التقریب:۱۷۰ - ۱۷۱، اختصار علوم الحدیث: ۱۹۹ - ۲۰۲، المقنع فی علوم الحدیث:۲/ ۵۳۵ - ۵۳۹، شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۳/ ۸۵، نزہۃ النظر: ۶۲، فتح المغیث:۳/ ۱۷۰ - ۱۸۲، تدریب الراوي: ۲/ ۲۵۴ - ۲۵۵، شرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي:۲۰۶، فتح الباقي:۳/ ۸۳ - ۱۰۰، وتوضیح الأفکار:۲/ ۴۷۷ - ۴۸۰.(م)

(۲) نزہۃ النظر:۱۴۶۔(م)

(۳) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۴۲۱، ارشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۳۶، تدریب الراوی:۲/ ۳۹۷۔(م)

(۱) ابو العشراء کے اپنے نام اور باپ کے نام میں اختلاف ہے، مشہور قول یہ ہے کہ ان کا نام اسامہ بن مالک ہے۔(ط)

جده.”[۱]

۴۔ ”رِوَايَةُ الْأَبْنَاءِ عَنِ الْأَبَاءِ“ کے فوائد:

محدثین کرام نے ان کے متعدد فوائد بیان کیے ہیں، چند درج ذیل ہیں۔

(الف)۔ جب سند حدیث میں راوی کے باپ یا دادا کی نام کی تصریح ہو، تو اسے معلوم کرنے کے لیے بحث و تحقیق کی جائے۔

(ب)۔ نیز یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ”جَدّ“ سے کون مراد ہے؟ بیٹے کا دادا یا باپ کا دادا۔

۵۔ رِوَايَةُ الْأَبْنَاءِ عَنِ الْأَبَاءِ پر معروف تصانیف:

(الف)۔ رِوَايَةُ الْأَبْنَاءِ عَنِ أَبَآئِهِمْ، از ابو نصر عبید اللہ بن سعید وائلی رحمہ اللہ[۲]۔

(ب)۔ جُزْءُ مَن رَّوَى عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، از ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ[۱]۔

(ج)۔ الْوَشْي الْمُعْلَم فِيْمَن رَّوَى عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، از حافظ صلاح الدین علائی رحمہ اللہ[۲]۔

---

[۱] عمرو کا نسب یوں ہے: عمرو بن شعیب بن محمد بن عبد اللہ بن عمرو بن عاص، چنانچہ عمرو کا دادا محمد ہے، لیکن محدثین کرامؒ تتبع اور استقراء کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ”جَدِّهِ“ کی ضمیر کا مرجع عمرو نہیں بلکہ شعیب ہے، اور شعیب کا دادا عبد اللہ بن عمرو بن عاص ہے، جو معروف صحابی ہیں۔ (ط)

[۲] ابو نصر عبید اللہ بن سعید بن حاتم بن احمد وائلی بکری سجستانی: عظیم محدث، مجود اور حافظ حدیث تھے، شیخ السنہ اور شیخ الحرم جیسے القابات سے نوازے گئے، حصول علم کے سلسلے میں شام، عراق، حجاز مقدس اور خراسان کے اسفار کیے، حافظ ابو اسحاق حبال، سہل بن بشر اسفراینی، ابو معشر طبری، اسماعیل بن حسن علوی اور جعفر بن احمد سراج جیسے اساطین علم نے ان سے کسب فیض کیا۔ ۴۴۴ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۳/ ۱۱۱۸، سیر اعلام النبلاء: ۱۷/ ۶۵۴، شذرات الذہب: ۳/ ۳۷۱)(م)

[۱] احمد بن زہیر (ابو خیثمہ) بن حرب ابن شداد نسائی بغدادی، ابو بکر: بغداد میں ۱۸۵ھ کو پیدا ہوئے، عظیم مؤرخ، محدث اور حافظ حدیث تھے، اصول حدیث، رجال اور تاریخ پر کتابیں لکھیں، بغداد ہی میں ۲۷۹ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۴۲۷، سیر اعلام النبلاء: ۱۱/ ۴۹۴، الاعلام للزرکلی: ۱/ ۱۲۵)(م)

[۲] خلیل بن کیکلدی بن عبد اللہ علائی دمشقی، ابو سعید صلاح الدین: دمشق میں ۶۹۴ھ کو پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی، اپنے دور کے عظیم محدث اور فقیہ تھے، حصول علم کے سلسلے میں طویل اسفار کیے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، قدس کے مدرسہ صلاحیہ میں ۷۳۱ھ کو مدرس منتخب ہوئے اور وہیں ۷۶۱ھ کو وفات پائی۔ (النجوم الزاہرہ: ۸/ ۳، فوات الوفیات: ۱/ ۱۵۱، الاعلام للزرکلی: ۲/ ۳۲۱)(م)

۶-مدبج اور روایت اقران[1]

ا۔اقران کی تعریف:

(الف)۔لغوی تعریف:

اقران یہ "قَرِیْن" کی جمع ہے، جس کے معنی ساتھی اور دوست کے ہیں، جیسا کہ قاموس میں ہے[2]۔

(ب)۔اصطلاحی تعریف:

عمر اور اسناد میں ایک دوسرے کے قریب افراد کا ایک دوسرے سے روایت کرنا[3]۔

۲۔روایت اقران کی تعریف:

مذکورہ بالا تعریف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ روایت اقران سے مراد یہ ہے کہ دو ساتھیوں میں سے ایک ساتھی دوسرے سے روایت کریں[1]، جیسے سلیمان تیمی[2] ....

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث:۲۱۵ - ۲۲۰، مقدمۃ ابن الصلاح:۴۱۳، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۲۰ - ۶۲۲، التقریب: ۱۶۸، الاقتراح:۳۱۱ - ۳۱۳، اختصار علوم الحدیث:۱۹۷، الشذا الفیاح ۲/ ۵۴۱ - ۵۴۶، المقنع فی الحدیث:۲/ ۵۲۱ - ۵۲۳، شرح التبصرۃ:۳/ ۶۷ - ۷۹، نزھۃ النظر:۶۱ - ۶۲، فتح المغیث ۳/ ۱۶۰ - ۱۶۲، فتح الباقی ۳/ ۶۷ - ۶۹، تدریب الراوی ۲/ ۲۴۶ - ۲۴۸، توضیح الأفکار ۲/ ۴۷۵ - ۴۷۶.(م)

[2] قاموس:۴/ ۲۶۰۔(ط)

[3] علوم الحدیث:۳۰۹، متقارب فی الاسنادوہ رواۃ ہیں، جنہوں نے ایک ہی طبقہ کے شیوخ سے احادیث روایت کی (ط)

[1] علوم الحدیث:۳۱۰۔(ط)

[2] سلیمان بن طرخان قیسی بصری تیمی، ابو معتمر: امام شعبہ بن حجاجؒ، سفیانؒ، حماد بن سلمہؒ، عبد اللہ بن مبارکؒ اور اسماعیل بن علیہؒ جیسے اساطین علم نے ان سے کسب فیض کیا۔ امام شعبہ بن حجاجؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سلیمان تیمی سے بڑھ کر کوئی سچا انسان نہیں دیکھا، امام احمد بن حنبلؒ، یحیی بن معینؒ اور امام نسائیؒ نے ان کی توثیق کی، امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ اہل بصرہ کے ممتاز عالم اور ثقہ ہیں، ۱۴۳ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ:۱/ ۱۵۰، سیر اعلام النبلاء:۶/ ۱۹۵، تہذیب التہذیب:۴/ ۲۰۱، شذرات الذہب:۱/ ۲۱۲)(م)

کا مسعر بن کدام [۱] سے روایت کرنا ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کے قرین اور ہم عمر ہیں، لیکن مسعر بن کدام بھی سلیمان تیمی سے روایت کی ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں [۲]۔

۳۔ مدبَّج کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

مدبج یہ "تَدْبِیْج" (باب تفعیل) مصدر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کے معنی تزیین اور مزین کرنے کے ہیں اور "تَدْبِیْج" مصدر "دیباجَتِي الوجه" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں، دونوں رخسار گویا اس حدیث کا نام "مدبج" اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں دونوں رخساروں کی طرح راوی اور مروی عنہ مساوی ہوتے ہیں [۳]۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

وہ حدیث ہے، جس میں دو ساتھیوں میں سے ہر ایک دوسرے سے حدیث روایت کرے [۱]۔ *

---

(۱) مسعر بن کدام ہلالی کوفی: ثقہ اور متقن راوی ہیں، امام شعبہ بن حجاجؒ، سفیان ثوریؒ، مالک بن مغولؒ، سلیمان بن مہران اعمشؒ اور یحییٰ بن سعید قطانؒ جیسے اساطین علم ان سے روایت کرتے ہیں۔ امام شعبہ بن حجاجؒ فرماتے ہیں کہ مسعر بن کدام کو ضبط واتقان کی وجہ سے مصحف کہا کرتے تھے، امام یحییٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ میں مسعر بن کدام سے بڑھ کر ثقہ کوئی نہیں دیکھا۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ شعبہؒ اور مسعرؒ جیسے ہوتے ہیں۔ ۱۵۵ھ کو وفات پائی۔
(تذکرۃ الحفاظ:۱/۱۸۸، تہذیب الاسماء واللغات:۲/۸۹، تہذیب التہذیب:۱۰/۱۱۳)(م)

(۲) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۴۱۴۔(م)

(۳) التقیید والایضاح:۳۳۴، المحکم لابن سیدہ:۷/۲۴۴، الصحاح:۳۱۲، تدریب الراوی:۲/۱۷۔(م)

(۱) علوم الحدیث:۳۰۹۔(ط)

* حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) مدبج پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
"وهو أَخصُّ مِن الأول؛ فكلُّ مُدَبَّجٍ أقران، وليس كل أقران مُدَبَّجاً." (نزہۃ النظر:۱۴۵)
"یہ پہلی قسم سے اخص ہے، لہذا ہر مدبج اقران ہو گی، لیکن ہر اقران مدبج نہیں ہو گی۔"
کیا اگر استاذ شاگرد سے روایت کرے تو یہ مدبج ہو گی؟ حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) استاذ اور شاگرد کی مشترک =

۴۔ حدیث مدبج کی مثالیں:

(الف)۔ صحابہ کرام میں حدیث مدبج کی مثال:

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا سیدنا ابو ہریرہؓ سے اور سیدنا ابو ہریرہ کا ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرنا[1]۔

(ب)۔ تابعین میں حدیث مدبج کی مثال:

امام شہاب الدین زہریؒ کا حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا امام زہریؒ سے حدیث روایت کرنا[1]۔

(ج)۔ تبع تابعین میں حدیث مدبج کی مثال:

امام مالکؒ کا امام اوزاعیؒ سے اور امام اوزاعی کا امام مالکؒ سے حدیث روایت کرنا[2]۔

۵۔ حدیث مدبج کے فوائد:

محدثین کرام نے اس کے متعدد فوائد بیان کیے ہیں، چند درج ذیل ہیں:

=روایت کو مدبج نہیں مانتے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

”وإذا روى الشيخ عن تلميذه صدَقَ أَنَّ كلاً منهما يَرْوِي عن الآخر؛ فهل يُسَمَّى مُدَبَّجاً؟ فيه بحث، والظاهر: لا؛ لأنه من روايةِ الأكابر عن الأصاغر، والتدبيج مأخوذ من دِيباجَتَيْ الوجه؛ فيقتضي أن يكون ذلك مستوياً مِن الجانبين؛ فلا يجيء فيه هذا.“(نزہۃ النظر:۱۴۵)

”جب شیخ اپنے شاگرد سے روایت کرے بایں صورت کہ دونوں ایک دوسرے سے روایت کریں تو کیا یہ مدبج کہلائے گی؟ یہ مسئلہ غور طلب ہے! بظاہر مدبج نہیں ہو سکتی؟ اس لیے کہ یہ روایۃ الاکابر عن الاصاغر کے قبیل سے ہے اور تدبیج ”دیباجتی الوجہ“ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب چہرے کے دو رخسار ہیں اور یہ اس بات کی مقتضی ہے کہ جانبین برابر ہوں اور اس میں ایسا نہیں، کیونکہ شاگرد کا مساوی نہیں ہوتا۔“

حافظ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) نے اس پر مدبج اور روایۃ الاقران پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ دیکھئے: فتح المغیث: ۴/ ۱۶۸۔ (م)

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۱۴، التقریب والتیسیر للنووی: ۹۶۔ (م)

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۱۴، التقریب والتیسیر للنووی: ۹۶۔ (م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۱۴، التقریب والتیسیر للنووی: ۹۶۔ (م)

(الف)۔ یہ وہم پیدا نہ ہو کہ اسناد میں زیادتی اور اضافہ ہے[1]۔
(ب)۔ یہ گمان پیدا نہ ہو کہ "واؤ" کی جگہ اسناد میں "عن" لکھ دیا گیا ہے[2]۔

٦۔ مدبج اور روایت اقران پر معروف تصانیف:

(الف)۔ المدبج، از امام دار قطنیؒ۔
(ب)۔ روایۃ الاقران، از ابو شیخ اصبہانیؒ[3]۔

---

(۱) اس لیے کہ معروف طریقے تو یہی ہے کہ شاگرد اپنے شیخ سے روایت کرے، لیکن جب ایک راوی اپنے قرین اور ساتھی سے روایت کرتا ہے تو ممکن ہے کہ جو شخص اس نوع کی روایت سے ناواقف ہو، یہ گمان کر بیٹھے کہ قرین کا تذکرہ کاتب کا اضافہ ہے۔(ط)

(۲) تا کہ اسناد کے سامع یا قاری کو یہ وہم نہ ہو کہ اسناد کے اصل الفاظ یہ ہیں: "حَدَّثَنَا فُلَانٌ وَ فُلَانٍ"(ہم اور فلاں نے روایت کی)، لیکن غلطی سے "حَدَّثَنَا فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ"(ہم سے فلاں نے حدیث بیان کی اور اس سے فلاں نے بیان کی) زبان سے نکل گئے۔(ط)

(۳) عبد اللہ بن محمد بن جعفر بن حیان اصبہانی، ابو محمد، ابو شیخ، ۲۷۴ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم مفسر اور محدث تھے، ابو نعیم اصبہانیؒ، ابن مندہؒ، ابن مردویہؒ اور ابو بکر احمد بن عبد الرحمن شیرازیؒ جیسے اساطین علم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ۳۶۹ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ:۳/۲۷٦، سیر اعلام النبلاء:۱٦/۲۷٦، النجوم الزاہرہ:۴/۱۳٦، شذرات الذہب:۳/٦۹)(م)

۷۔ سابق ولاحق[1]

۱۔ سابق ولاحق کی تعریف:

(الف)۔ لغوی تعریف:

سابق ''السبق'' سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، جس کے معنی آگے بڑھنے والا کے ہیں اور لاحق یہ ''اللَّحَاق'' سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جس کے معنی بعد میں آنے والا کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وفات میں جو راوی مقدم ہو وہ سابق اور جو راوی وفات میں متأخر ہو وہ لاحق ہے۔

(ب)۔ اصطلاحی تعریف:

سابق و لاحق وہ ہے جس میں کسی شیخ سے روایت کرنے میں دو ایسے رواۃ مشترک ہوں، جن کی تاریخ وفات میں کافی مدت کا فاصلہ ہو[1]۔

۲۔ سابق ولاحق کی مثال:

(الف)۔ محمد بن اسحاق سراج[2]، امام بخاریؒ اور ابو حسین احمد بن محمد خفاف نیشاپوریؒ[3] دونوں کے استاذ ہیں، لیکن ان دونوں کی وفات میں ایک سو سینتیس (۱۳۷) سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ

---

(۱) معرفة علوم الحدیث: ۴۹۳، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۴۰ - ۶۴۲، التقریب: ۱۷۱، اختصار علوم الحدیث: ۲۰۵، محاسن الاصطلاح: ۴۹۱، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۵۴۷ - ۵۴۸، شرح التبصرة والتذکرة: ۳/ ۱۰۲، نزهة النظر: ۶۲، فتح المغیث: ۳/ ۱۸۳ - ۱۸۶، قفو الاثر: ۱۰۴، تدریب الراوي: ۲/ ۲۶۲ - ۲۶۳، شرح السیوطي علی ألفیة العراقي: ۲۱۳، توضیح الأفکار: ۲/ ۴۸۰ - ۴۸۱. (م)

(۱) التقریب مع التدریب: ۲/ ۲۶۲. (ط)

(۲) محمد بن اسحاق سراج ۲۱۶ ہجری کو پیدا ہوئے اور ۳۱۳ ہجری کو وفات پائی۔ ان کی عمر ۹۷ سال تھی۔ (ط)

(۳) احمد بن محمد بن احمد بن عمر نیشاپوری خفاف، قنطری، ابو حسین، اپنے دور کے عظیم محدث، زاہد اور مسند خراسان تھے، امام حاکمؒ، ابو قاسم قشیریؒ، احمد بن عبد الرحیم اسماعیلیؒ اور ابو مظفر محمد بن اسماعیل شجاعیؒ جیسے اساطین کے شیخ ہیں، ۹۳ سال کی عمر میں ۳۹۵ھ کو وفات پائی۔

(الانساب: ۵/ ۱۵۶، سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۴۸۱، شذرات الذہب: ۳/ ۱۴۵) (م)

ہے[1]۔

(ب)۔ امام مالکؒ، امام شہاب الدین زہریؒ اور احمد بن اسماعیل سہمی[2] دونوں کے شیخ ہیں، لیکن ان دونوں کی وفات میں ایک ایک سو پینتیس (۱۳۵)سال کا طویل عرصہ ہے، اس لیے کہ امام زہریؒ کی وفات ۱۲۴ھ میں اور احمد بن اسماعیل سہمیؒ کی وفات ۲۵۹ھ میں ہوئی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ امام شہاب الدین زہریؒ امام مالکؒ سے عمر میں بڑے ہیں، اس لیے کہ امام زہریؒ تابعی ہیں اور امام مالکؒ تبع تابعی ہیں، چنانچہ امام زہریؒ کی امام مالکؒ سے روایت ''روایۃ الأکابر عن الأصاغر'' کے قبیل سے ہے، جیسا کہ ماقبل گزر چکا ہے، تاہم دوسری طرف احمد بن اسماعیل سہمیؒ امام مالکؒ سے عمر میں کم ہیں۔ اس پر مزید یہ بات بھی ہے کہ احمد بن اسماعیل سہمیؒ نے سو برس کی طویل عمر پائی ہے، اس وجہ سے ان کے اور امام زہریؒ کے وفات کے درمیان طویل عرصہ پایا جاتا ہے[1]۔

الغرض اس کی زیادہ واضح تعبیر یوں کی جاسکتی ہے، کہ سابق راوی امام زہریؒ مذکورہ مروی عنہ امام مالکؒ کا شیخ ہو گا، جب کہ راوی لاحق احمد بن اسماعیل سہمیؒ مذکورہ مروی عنہ امام مالکؒ کا شاگرد ہو گا اور پھر اس شاگرد کی طویل عمر ہے۔

۳۔ سابق ولاحق کے فوائد:

(الف)۔ دل ودماغ میں اسناد عالی کی عظمت ومقام کو بیٹھانا۔

---

(۱) امام بخاریؒ کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی جب کہ خفاف نیشاپوری کا انتقال ۳۹۳ھ میں ہوا۔ بعض کا قول ہے کہ ان کی وفات ۳۹۴ھ میں ہوئی اور بعض کے نزدیک ۳۹۵ھ میں ہوئی۔ (ط)

(۲) احمد بن اسماعیل بن محمد بن نبیہ بن عبد الرحمن سہمی، ابو حذافہ مدنی، نزیل بغداد: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ اسماعیل سہمی متروک الحدیث ہے۔ امام ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ اسماعیل سہمی اپنے چچا سے اباطیل روایت کرتا ہے۔ دار قطنیؒ کہتے ہیں کہ ضعیف ہے۔ ۲۵۹ھ کو وفات پائی۔

(تہذیب الکمال:۱/ ۲۳۶، تہذیب التہذیب:۱/ ۱۵)(م)

(۱) ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۴۱، التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/ ۱۹۳، فتح المغیث: ۴/ ۱۹۴، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۵۴۷، تدریب الراوی: ۲/ ۷۴۷۔ (م)

(ب)۔ راوی لاحق کے سند میں انقطاع کا وہم نہ ہونا[1]۔

۴۔ سابق ولاحق پر معروف تصانیف:

السابق واللاحق، از خطیب بغدادیؒ۔

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۴۲۴، التقریب والتیسیر:۹۹، المنہل الروی:۷۳، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:۲/۱۹۳، فتح الباقی:۲/۲۳۲، فتح المغیث:۴/۱۹۳، المقنع فی علوم الحدیث:۲/۵۴۷۔(م)

فصل دوم: معرفت رواۃ

یہ فصل علوم حدیث کی درج ذیل اکیس (۲۱) انواع پر مشتمل ہے:

۱- معرفت صحابہ
۲- معرفت تابعین
۳- معرفت برادران وخواہران
۴- معرفت متفق و مفترق
۵- معرفت مؤتلف و مختلف
۶- معرفت متشابہ
۷- معرفت وحدان
۸- معرفت مبہمات
۹- معرفت مہمل
۱۰- مختلف اسماء وصفات کیساتھ معروف رواۃ کی معرفت
۱۱- مفرد اسماء، کنی اور القاب کی معرفت
۱۲- کنیت کیساتھ مشہور رواۃ کی معرفت
۱۳- معرفت القاب
۱۴- غیر آباء کی طرف منسوب رواۃ کی معرفت
۱۵- خلافِ ظاہر نسبتوں کی معرفت
۱۶- تواریخ الرواۃ کی معرفت
۱۷- ثقہ اصحاب اختلاط کی معرفت
۱۸- محدثین کرامؒ اور رواۃ کے طبقات کی معرفت
۱۹- موالی علمائے حدیث اور رواۃ کی معرفت
۲۰- ثقہ اور ضعیف رواۃ کی معرفت
۲۱- رواۃ حدیث کے اوطان اور بلاد وامصار کی معرفت

۱۔ معرفتِ صحابہ [1]

1۔ صحابی کی تعریف:

(الف)۔ صحابی کی لغوی تعریف:

لغت کے اعتبار سے لفظ "صحابہ" مصدر ہے، جس کے معنی صحبت کے ہیں، اسی سے لفظ "صحابی" اور "صاحب" ماخوذ ہیں اور اس کی جمع "اصحاب" اور "صُحُب" آتی ہے اور صحابہ کا اکثر استعمال "اصحاب" کے معنی میں ہوتا ہے [1]۔

(ب)۔ صحابی کی اصطلاحی تعریف:

ہر وہ شخص ہے، جس نے حالت اسلام میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی ہو، اور اسلام کی حالت پائی ہو، اگرچہ درمیان میں ارتداد کی نوبت بھی آئی ہو۔ یہی صحیح ترین تعریف ہے [2]۔

۲۔ معرفت صحابہ کی اہمیت وفوائد:

صحابہ کی معرفت ایک اہم اور عظیم علم ہے، اس کے بے شمار فوائد ہیں، من جملہ ان میں ایک یہ ہے کہ مرسل اور متصل کے درمیان فرق وامتیاز اسی کے ذریعے قائم کیا جاسکتا ہے [3]۔

۳۔ صحابی کی صحبت کی معرفت کس طرح ہوگی؟

---

[1] معرفة علوم الحديث: ۲۲ - ۲۵، الكفاية:: ۹۳ ، مقدمة ابن الصلاح:۳۹۵-۴۰۴، التقريب للنووي: ۹۲ - ۹۴، اختصار علوم الحديث: ۱۷۹ - ۱۹۱، الشذا الفياح:۲/ ۴۸۳ - ۵۱۸، المقنع في علوم الحديث: ۲/ ۴۹۰ - ۵۰۵، رسوم التحديث في علوم الحديث:۱۴۲-۱۴۸، شرح التبصرة والتذكرة:۲/۱۱۹-۱۴۸، فتح المغيث:۳/ ۸۳ - ۱۳۸، وتدريب الراوي:۲/ ۲۰۶ - ۲۳۳، وشرح السيوطي على ألفية العراقي:۱۷۱، فتح الباقي:۲/ ۱۸۵-۲۰۸، وتوضيح الأفكار: ۲/ ۲۴۳ - ۲۷۶، ظفر الأماني: ۴۹۶ - ۵۱۳.(م)

[1] دیکھیے: تاج العروس:۳/۱۸۶، لسان العرب:۱/ ۵۲۰، المعجم الوسيط:۱/ ۵۰۷۔(م)

[2] نخبة الفكر، ص۵۷.(ط)

[3] مقدمة ابن الصلاح:۳۹۵، الإصابة:۱/ ۲ - ۳، شرح التبصرة:۳/ ۵، الرسالة المستطرفة:۱۲۶.(م)

صحابی کی صحبت کی معرفت درج ذیل پانچ امور میں سے کسی ایک سے ہو سکتی ہے:
(الف)۔ تواتر، جیسے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور عشرہ ومبشرہ رضی اللہ عنہم ۔[1]
(ب)۔ شہرت، جیسے ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ اور عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ۔
(ج)۔ اخبار صحابی، جیسے کوئی صحابی یہ خبر دے کہ فلاں صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔
(د)۔ اخبار ثقہ تابعی، جیسے کوئی ثقہ تابعین میں سے کوئی یہ خبر دے کہ فلاں صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔
(ہ)۔ اخبار نفسہ، جیسے کوئی خود گواہی دے کہ میں صحابی ہوں، بشرطیکہ وہ عادل ہو اور اس کا یہ دعوی ممکن بھی ہو[1]۔ *

۴۔ تمام صحابہ عادل ہیں!

اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہ عادل ہیں، خواہ فتن اور باہمی اختلافات میں ملوث ہوئے ہوں یا نہیں! صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے عدالت کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے روایتِ حدیث میں دانستہ طور پر جھوٹ سے اجتناب اور کنارہ کشی کی ہے اور کسی بھی ایسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے جو ان سے روایت لینے میں مانع ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرات

---

[1] عشرہ مبشرہ کے نام یہ ہیں:
سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ، سیدنا طلحہ ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ، سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، سیدنا عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو عبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنہ۔ (م)

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے بعد سو سال کے اندر اندر کوئی صحابہ رسول ہونے کا دعوی کرے تو یہ دعوی قابل قبول ہو سکتا ہے، لیکن اگر اس زمانے کے بعد کوئی صحابی ہونے کا دعوی کرے تو اس کا دعوی ناقابل قبول ہو گا، جیسے بھارت کے رتن ہندی نامی ایک ہندو نے چھ سال کے بعد صحابی ہونے کا دعوی کیا تھا اور درحقیقت یہ ایک مکار اور جھوٹا انسان تھا۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے میزان الاعتدال ج ۲ ص ۴۵ پر اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (ط)

* مقدمۃ ابن الصلاح: ۲۹۷، محاسن الاصطلاح: ۴۲۷، التقیید والایضاح: ۲۹۹۔ (م)

صحابہ سے کسی قسم کی بحث عدالت کے بغیر ہر قسم کی روایت لی جائے گی[1]۔ اوران میں سے جو فتن میں ملوث ہوئے ہیں ان کے معاملہ کو ایسے اجتہاد پر محمول کیا جائے گا، جس میں ان کے لیے

---

[1] صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے اور شرفِ صحابیت سے مشرف ہوئے ان کی عدالت کے لیے یہی بات کافی ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی عدالت پر امت مسلمہ کا اجماع ہے، علامہ ابن عبدالبر اندلسیؒ (م۴۶۳ھ) فرماتے ہیں۔

"قد كفينا البحث عن أحوالهم لإجماع أهل الحق من المسلمين وهم أهل السنة والجماعة على أنهم كلهم عدول." (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب:۱/۱۹)

"یہ ثابت کرنے کے لیے ہم نے صحابہ کے احوال کی کافی تحقیق کی ہے کہ مسلمانوں کے اہل حق یعنی اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ تمام صحابہ عادل ہیں۔"

خطیب بغدادیؒ (م۴۶۳ھ) نے اس کو تمام اہل علم اور فقہاء کرام کا مذہب قرار دیا ہے، حافظ ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ) فرماتے ہیں۔

"ثُمَّ إنَّ الأُمَّةَ مُجْمِعَةٌ عَلَى تَعْدِيلِ جَمِيْعِ الصَّحَابَةِ ، ومَنْ لاَبَسَ الفِتَنَ مِنْهُم فكذلكَ بإجْماعِ العلماءِ الَّذِينَ يُعْتَدُّ بهم في الإجماعِ، إحْساناً للظَّنِّ بهم ونَظَراً إلى ما تمهَّدَ لهم مِنَ المآثِرِ، وكأَنَّ اللهَ سُبْحانَهُ وتعالى أتاحَ الإجماعَ عَلَى ذَلِكَ لِكَوْنِهِمْ نَقَلَةَ الشَّرِيْعَةِ."

(مقدمۃ ابن الصلاح:۳۹۸، الکفایۃ:۴۹)

"پھر امت مسلمہ کا تمام صحابہ کی عدالت پر اجماع ہے حتی کہ ان کے بارے میں بھی جو دور فتن میں مبتلا ہوئے، اس طرح ان علماء کا اجماع ہے جن کے اجماع پر اعتماد کیا جاسکتا ہے ان کے بارے میں حسنِ ظن کی وجہ سے اور ان کے کارناموں کو سامنے رکھتے ہوئے جو انہوں نے انجام دیے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر اجماع مقدر کیا کیونکہ یہ حضرات شریعت کے ناقل تھے۔"

امام محمد بن محمد غزالیؒ (م۵۰۵ھ) بعض آیات واحادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"فَأَيُّ تَعْدِيلٍ أَصَحُّ مِنْ تَعْدِيلِ عَلَّامِ الْغُيُوبِ - سُبْحَانَهُ - وَتَعْدِيلِ رَسُولِهِ ﷺ؟ كَيْفَ وَلَوْ لَمْ يَرِدْ الثَّنَاءُ لَكَانَ فِيمَا اشْتَهَرَ وَتَوَاتَرَ مِنْ حَالِهِمْ فِي الْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ وَبَذْلِ الْمُهَجِ وَالْأَمْوَالِ وَقَتْلِ الْآبَاءِ وَالْأَهْلِ فِي مُوَالَاةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَنُصْرَتِهِ كِفَايَةٌ فِي الْقَطْعِ بِعَدَالَتِهِمْ؟" (المستصفی:۱۳۰)

علام الغیوب سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعدیل سے زیادہ کس کی تعدیل ہو سکتی ہے؟ اگر یہ تعریف وثناء نہ بھی وارد ہوتی تو ان حضرات کے جو حالات مشہور ومتواتر ہیں ان میں ہجرت، جہاد، جان ومال کی قربانی اور رسول اللہ ﷺ کی محبت اور اس کی نصرت میں آباء واولاد کا قتل، ان کی عدالت کے لیے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ (م)

بہر حال اجر موجود ہے، تاکہ ان کیساتھ ہمارا حسن ظن قائم رہے ۔اس لیے کہ ان کی حیثیت حاملین شریعت کی ہے اوران کے زمانے کو خیر القرون فرمایا گیا ہے[1]۔

(۵)۔سب سے زیادہ احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے بعد جو حوادثات پیش آئے اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اس میں مبتلا ہوئے اورایک دوسرے کے خلاف نبرد آزمائے ہوئے تو اس سے عدالت میں فرق نہیں ،کیونکہ عدالت کے معنی عصمت کے نہیں ہے، بلکہ صحابہ کے بارے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی صحابی جان بوجھ کر گناہ کا ارتکاب نہیں کرے گا اوراگر سرزد ہوا تو توبہ کی طرف مائل ہو گا، کیونکہ اللہ تعالی نے انہیں اپنے رسول کی صحبت کے لیے منتخب کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تربیت کی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچھی اور پاکیزہ ترتیب کرنے والا کون ہو گا؟حافظ ابن کثیرؒ (م۷۷۴ھ)فتن اور حوادث کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

”وأما ما شجر بينهم بعده عليه الصلاة والسلام، فمنه ما وقع عن غير قصد، كيوم الجمل، ومنه ما كان عن اجتهاد، كيوم صفين. والاجتهاد يخطئ ويصيب، ولكن صاحبه معذور وإن أخطأ، ومأجور أيضاً، وأما المصيب فله أجران اثنان، وكان علي وأصحابه أقرب إلى الحق من معاوية وأصحابه رضي الله عنهم أجمعين...وقد ثبت في صحيح البخاري عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال – عن ابن بنته الحسن بن علي، وكان معه على المنبر: " إن ابني هذا سيد، وسيصلح الله به بين فئتين عظيمتين من المسلمين "...فسمي الجميع " مسلمين " وقال تعالى (وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما) فسماهم " مؤمنين " مع الاقتتال.“

(اختصار علوم الحدیث:۱۸۲)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو اختلافات واقع ہوئے تو یہ بلاارادہ تھے، جیسے جنگ جمل، یا جو اجتہاد کی بنیاد پر پیش آئے، جیسے جنگ صفین، اجتہاد میں خطا وصواب دونوں کا امکان ہوتا ہے اور صاحب اجتہاد معذور ہوتا ہے اگر اس سے خطا سرزد ہو تو بھی اسے اجر ملے گا اوراگر اجتہاد صحیح ہے تو اس کو دو اجر ملیں گے اور علی رضی اللہ عنہ ،معاویہ رضی اللہ عنہ اوران کے اصحاب کے مقابلے میں حق کے قریب ترتھے اور صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں جب وہ منبر پر ان کیساتھ تھے فرمایا: یہ میرا بیٹا سید ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالی مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا۔سو آپ نے تمام لوگوں کو مسلمان کہا۔اسی طرح اللہ تعالی نے فرمایا: اگر مومنوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔یہاں بھی باہمی جنگ کے باوجود دونوں کو مؤمن کیا۔“

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عدالت دلائل قطعیہ سے ثابت ہے اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ =

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کثرت سے روایت کرنے والے چھ صحابی ہیں، جن کی ترتیب درج ذیل ہے۔

(الف)۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ: انہوں نے پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) احادیث روایت کی ہیں، ان سے روایت کرنے والے شاگرد تین سو سے زائد ہیں[1]۔

(ب)۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: آپ نے دو ہزار چھ سو تیس (۲۶۳۰) احادیث روایت کی ہیں۔[1]

(ج)۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ: آپ نے دو ہزار دو سو چھیاسی (۲۲۸۶) احادیث روایت کی ہیں۔[2]

(د)۔ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا: آپ نے دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) احادیث روایت کی ہیں۔[3]

= علیہم اجمعین کے متعلق دل و دماغ میں کسی قسم کا فتور رکھنا رفض کی نشانی ہے اور ان کے بارے میں زبان درازی وہی شخص کرتا ہے جس نے رافضیت کا لبادہ اوڑھ ہو۔ محدث جلیل امام ابوزرعہ رازیؒ (م ۲۶۴ھ) نے بہت واضح طور پر کہا ہے۔

«إِذَا رَأَيْتَ الرَّجُلَ يَنْتَقِصُ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَاعْلَمْ أَنَّهُ زِنْدِيقٌ ، وَذَلِكَ أَنَّ الرَّسُولَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَنَا حَقٌّ ، وَالْقُرْآنَ حَقٌّ ، وَإِنَّمَا أَدَّى إِلَيْنَا هَذَا الْقُرْآنَ وَالسُّنَنَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَإِنَّمَا يُرِيدُونَ أَنْ يُجَرِّحُوا شُهُودَنَا لِيُبْطِلُوا الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ ، وَالْجَرْحُ بِهِمْ أَوْلَى وَهُمْ زَنَادِقَةٌ». (الکفایۃ فی علم الروایۃ:۴۹)

"جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ وہ اصحاب رسول میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہے تو جان لو کہ وہ زندیق ہے اور یہ اس لیے کہ ہمارے نزدیک رسول حق ہے اور قرآن حق ہے اور قرآن و سنت کو ہم تک پہنچانے والے صحابہ ہیں۔ یہ لوگ چاہیے کہ ہمارے گواہوں کو مجروح کریں تا کہ کتاب و سنت کو غلط ثابت کر سکیں، ان پر جرح کرنا زیادہ بہتر ہے اور یہ لوگ زنادقہ ہیں۔" (م)

(۱) التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:۳/ ۱۵، فتح المغیث:۳/ ۱۰۷۔(م)

(۱) التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:۳/ ۱۵، فتح المغیث:۳/ ۱۰۷۔(م)

(۲) التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:۳/ ۱۵، فتح المغیث:۳/ ۱۰۷۔(م)

(۳) التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:۳/ ۱۵، فتح المغیث:۳/ ۱۰۷۔(م)

(ھ)۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما: آپ نے ایک ہزار چھ سو ساٹھ (١٦٦٠) احادیث روایت کی ہیں۔[١]

(و)۔ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ: آپ نے ایک ہزار پانچ سو چالیس (١٥٤٠) احادیث روایت کی ہیں[٢]۔

٦۔ سب سے زیادہ فتوی دینے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ میں سب سے فتوے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں، پھر اکابر صحابہ میں چھ جلیل القدر صحابہ ہیں، جن کے متعلق تابعی جلیل مسروقؒ[٣] فرماتے ہیں کہ صحابہ کے علم کی انتہا چھ حضرات پر ہے، جو یہ ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ[١]، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ پھر ان چھ حضرات کے علم کی انتہا سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر ہوئی ہے[٢]۔

٧۔ عبادلہ کون صحابہ ہیں؟

---

(١) التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:٣/ ١٥، فتح المغیث:٣/ ١٠٧۔(م)

(٢) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:٣٩٨، ارشاد طلاب الحقائق:٢/ ٥٩٣، اختصار علوم الحدیث:١٨٥۔(م)

(٣) مسروق بن اجدع بن مالک ہمدانی وادعی، ابو عائشہ، جلیل القدر تابعی ہیں، یمن کے باشندے تھے، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینہ منورہ آئے، کوفہ میں سکونت اختیار کی، کبار صحابہ کرام سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، قاضی شریحؒ سے زیادہ فتوی پر دسترس تھی، ٦٣ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد:٦/ ٧٦، تاریخ بغداد:١٣/ ٢٣٢، سیر اعلام النبلاء:٤/ ٦٣، الاعلام للزرکلی:٧/ ٢١٥)(م)

(١) سیدنا عویمر بن مالک بن قیس بن امیہ انصاری خزرجی، ابو درداء رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، زمانہ جاہلیت میں بہت بڑے تاجر تھے، اسلام لانے کے بعد شجاعت وبہادری میں ضرب المثل تھے، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں دمشق کا قاضی نامزد کیا تھا، اور یہ دمشق کے سب پہلے قاضی تھے، آپ کی مرویات کی تعداد ١٧٩ ہے، شام میں ٣٢ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:٣/ ١٢٢٧، اسد الغابہ:٤/ ٣٠٦، الاصابہ:٤/ ٦٢١، الاعلام:٥/ ٩٨)

(٢) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:٤٠٠، طبقات ابن سعد:٢/ ٣٥١، العلل لابن المدینی:٤٤، المعرفۃ والتاریخ:١/ ٤٨١، ارشاد طلاب الحقائق:٢/ ٥٩٥۔(م)

عبادلہ سے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ مراد ہیں، جن کا نام عبد اللہ ہے[1]، ان کی تعداد تقریباً تین سو صحابہ تک پہنچتی ہے، تاہم یہاں ان سے وہ چار جلیل القدر صحابہ مراد ہیں، جن کا نام عبد اللہ ہے۔

(الف)۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما.

(ب)۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما.

(ج)۔ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ[2].

(د)۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما[1].

ان سب حضرات کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ یہ وہ جلیل القدر صحابہ ہیں، جنہوں نے طویل نے طویل عمر پائی اور ان کے علم و عرفان سے عرصہ دراز تک لوگوں مستفید ہوئے، جس کی وجہ

---

[1] بعض حضرات نے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھی عبادلہ میں شمار کیا ہے، لیکن معروف اصطلاح کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ کا شمار عبادلہ میں نہیں ہوتا، کیونکہ آپ ۳۲ھ میں فوت ہوئے اور اس وقت عبادلہ کی اصطلاح متعارف نہیں تھی۔(م)

[2] سیدنا عبد اللہ بن زبیر بن عوام قرشی اسدی، ابو بکر رضی اللہ عنہ: ہجرت کے بعد سب سے پہلے پیدا ہونے والے صحابی ہیں، ان کی مرویات کی تعداد ۳۳ ہے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتح افریقیہ میں شریک ہوئے، یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے وفات کے بعد ان کے ہاتھ پر ۶۴ھ میں بیعت ہوئی، مصر، حجاز مقدس، یمن، خراسان، عراق اور شام کے اکثر علاقوں کے حاکم مقرر رہوئے، بنو امیہ کیساتھ ان کی شدید اختلاف تھے، حجاج بن یوسف ظالم نے انہیں ۷۳ھ میں شہید کر دیا تھا۔ (الاستیعاب:۳/۹۰۵، اسد الغابہ:۲/۳۰۷، الاصابہ:۴/۷۸، الاعلام للزرکلی:۴/۸۷)(م)

[1] سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص بن وائل بن ہاشم قریشی رضی اللہ عنہ: ۷ قبل از ہجری مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی ہیں، اپنے والد سے پہلے اسلام لائے، کاتب رسول اور انتہائی عابد زاہد تھے، غزوات میں شریک رہے، جنگ صفین میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہمنوا تھے، ایک زمانے تک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفہ کے امیر مقرر کیا تھا، لیکن جب یزید حاکم بنے تو ان کے بیعت سے انکار کیا اور امارت کو چھوڑ کر عسقلان کا رخ کیا اور عبادت میں منہمک ہوئے، ان کی مرویات کی تعداد ۷۰۰ ہے، ۶۵ھ کو وفات پائی۔ مکان وفات میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں مکہ میں فوت ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ فلسطین میں وفات پائی۔ بعض فرماتے ہیں کہ طائف میں فوت ہوئے اور بعض کا خیال ہے کہ مصر میں وفات پائی۔(الاستیعاب:۲/۹۵۶، اسد الغابہ:۳/۳۴۵، الاصابہ:۴/۱۶۵، الاعلام للزرکلی:۴/۱۱۱)(م)

کی وجہ سے انہیں یہ فضیلت اور شہرت حاصل ہوئی کہ جب یہ حضرات کسی فتوی پر متفق ہوں تو کہا جاتا ہے۔
"یہ عبادلہ کا قول ہے"[1]۔

۸۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد کے متعلق کوئی مستند معلومات اور اعداد و شمار موجود نہیں، تاہم اہل علم کے کچھ اقوال ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، ان اقوال میں مشہور قول معروف محدث ابورزعہ رازیؒ[2] کا ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی جب وفات ہوئی تو اس وقت صحابہ کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تھی، جن سے روایت بھی کی گئی اور سماع بھی کیا گیا ہے[1]۔ *

۹۔ صحابہ کے طبقات کی تعداد:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طبقات کی تعداد کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے، بعض نے سبقت الی الاسلام کی وجہ سے یا سبقت ہجرت یا بڑے بڑے غزوات میں حاضر ہونے کے اعتبار

---

[1] مقدمۃ ابن الصلاح:۳۹۹، تہذیب الاسماء واللغات:۱/۲۶۷، محاسن الاصطلاح:۴۳۰، التقیید والایضاح:۳۰۳، ارشاد طلاب الحقائق:۲/۵۹۶، التبصرۃ والتذکرۃ:۳/۱۷، اختصار علوم الحدیث:۱۸۹۔(م)

[2] عبید اللہ بن عبد الکریم بن یزید بن فروخ مخزومی، ابوزرعہ رازی: رای میں ۲۰۰ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم محدث اور حافظ حدیث تھے، رای کے باشندے تھے، محمد بن حُمید رازیؒ، امام مسلمؒ، ابوعوانہ اسفرائینیؒ جیسے اساطین علم کے شیخ ہیں، حصول علم کے سلسلے میں بغداد کا سفر کیا اور وہاں درس حدیث دیا، امام احمد بن حنبلؒ کے مجالس میں شریک ہوئے، حدیث پر اتنا عبور تھا کہ محدثینؒ فرماتے تھے کہ جس حدیث کو امام ابوزرعہؒ نہیں جانتے تو اس کی کوئی اصل ہی نہیں۔ رای میں ۲۶۴ھ کو وفات پائی۔(الجرح والتعدیل:۱/۳۲۸، تاریخ بغداد:۱۰/۳۲۶، تذکرۃ الحفاظ:۲/۵۵۷، سیر اعلام النبلاء:۱۳/۶۵، الاعلام للزرکلی ۴/۱۹۴)(م)

[1] التقریب مع التدریب ج۲، ص۲۲۰.(ط)

* دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۴۰۰، ارشاد طلاب الحقائق:۲۲/۵۹۷، التقیید والایضاح:۳۰۶، اختصار علوم الحدیث:۱۸۵۔(م)

سے اور بعض حضرات نے دیگر وجوہات کی بنا پر طبقات کی تقسیم کی ہے، غرض ہر ایک محدث نے اپنے اپنے اجتہاد کے لحاظ سے طبقات کی تقسیم کی ہے، چنانچہ:

(الف)۔ علامہ ابن سعدؒ[1] نے صحابہ کرام کو پانچ طبقات پر تقسیم کیا ہے۔

(ب)۔ حاکم نیسابوریؒ نے صحابہ کرام کے بارہ طبقات بنائے ہیں[2]۔

---

(۱) محمد بن سعد بن منیع زہری، ابوعبداللہ، بصرہ میں ۱٦۸ھ کو پیدا ہوئے، بغداد میں سکونت اختیار کی، عظیم مؤرخ، نسابہ اور حافظ حدیث تھے، مشہور مؤرخ واقدی کے کاتب رہے، کاتب واقدی کے نام سے مشہور ہوئے، حصول علم کے سلسلے میں بغداد، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے اسفار کیے، ہشیم بن بشیرؒ، سفیان بن عیینہؒ اور وکیع بن جراحؒ سے استفادہ کیا۔ خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ابن سعد عادل اور ثقہ ہیں۔ الطبقات الکبری ان کی عظیم علمی شاہکار ہے، ۲۳۰ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۷/ ۳٦۴، وفیات الاعیان: ۴/ ۳۵۱، تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۴۲۵، سیر اعلام النبلاء: ۱۰/ ٦٦۴، الاعلام للزرکلی: ٦/ ۱۳٦)(م)

(۲) اکثر اہل علم نے طبقات صحابہ میں تفاوت مراتب کے بجائے مجرد صحبت کا اعتبار کیا ہے، علامہ ابن حبان بستیؒ (۳۵۴ھ) نے "الثقات" اور حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے "تقریب التہذیب" میں تمام صحابہ کو ایک طبقہ میں شمار کیا ہے، بعض دیگر اہل علم نے صحبت کے علاوہ دیگر خصوصیات، مثلاً سبقت اسلام، ہجرت، شرکت غزوات کا اعتبار کرتے ہوئے ان کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے، محمد بن سعدؒ (م ۲۳۰ھ) نے "الطبقات الکبری" میں اور امام حاکم نیسابوریؒ (۴۰۵ھ) نے بارہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ یہ ہر ایک کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ دیکھئے: فتح الباری: ۴/ ۳۹۵۔

امام حاکم نیسابوریؒ (م ۴۰۵ھ) کی تقسیم سب سے زیادہ مفصل ہے اس لیے اس کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے۔

پہلا طبقہ: ان صحابہ کرام کا ہے جو مکہ میں ابتدائی دور میں اسلام لائے، جیسے خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم۔

دوسرا طبقہ: اصحاب دارالندوہ، یعنی وہ حضرات جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد مکہ والوں کی مجلس شوری (دارالندوہ) میں ایمان لائے۔ جس کا واقعہ یہ ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ لیا اور دارالندوہ میں جاکر اپنے ایمان کا اعلان کیا اور وہاں کے لوگوں کو دعوتِ ایمان دی، جس کو ایک جماعت نے قبول کیا۔

تیسرا طبقہ: حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

چوتھا طبقہ: پہلی بیعت عقبی میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

پانچواں طبقہ: دوسری بیعت عقبی میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

چھٹا طبقہ: مہاجرین مدینہ کا وہ قافلہ جو رسول اللہ ﷺ کے مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے مقام قباء میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ساتواں طبقہ: غزوہ بدر میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ =

۱۰۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے افضل کون ہے؟

جمہور اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں علی الاطلاق سب سے افضل سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، پھر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں، پھر ان کے بعد عشرہ مبشرہ ہیں، پھر اہل بدر، پھر اہل اُحد اور پھر بیعت رضوان میں شامل ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں[۱]۔

۱۱۔ سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:

(الف)۔ آزاد مردوں میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

(ب)۔ بچوں میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔

(ج)۔ عورتوں میں ام المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا[۱] تھیں۔

= آٹھواں طبقہ: غزوہ بدر (رمضان ۲ھ) میں اور صلح حدیبیہ (ذی القعدہ ۶ھ) کے درمیان ہجرت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

نواں طبقہ: بیعت رضوان میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

دسواں طبقہ: صلح حدیبیہ (ذی القعدہ ۶ھ) اور فتح مکہ (رمضان ۸ھ) کے درمیان مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

گیارہواں طبقہ: وہ حضرات جنہوں نے فتح مکہ (رمضان ۸ھ) کے دن اسلام قبول کیا جس میں قریش اور اہل مکہ کے اکثر باشندے تھے۔

بارہواں طبقہ: وہ لوگ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ یا حجۃ الوداع کے موقع پر یا اپنے بچپن میں سن شعور دیکھا تھا، جن کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے۔ دیکھئے: معرفۃ علوم الحدیث: ۲۴-۲۲۔(م)

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۰۱، شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۳/ ۳۳، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۵۹۸، اختصار علوم الحدیث: ۱۸۳، معالم السنن: ۷/ ۱۸، فتح الباری: ۷/ ۱۶۔(م)

(۱) سیدہ خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبد العزی، ام المؤمنین رضی اللہ عنہا: مکہ مکرمہ میں ۶۸ قبل از ہجری پیدا ہوئی، رسول اللہ ﷺ کی رفیقہ حیات تھی، مکہ مکرمہ کے ایک معزز و متمول خاندان سے تعلق تھا، ان کی پہلی شادی ابو ہالہ بن زرارۃ تمیمی سے ہوئی، پھر وہ انتقال کر گئے، آپ لوگوں کو تجارت اور مضاربت کے طور پر پیسے دیتی، رسول اللہ ﷺ کی عمر جب پچیس سال ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کیساتھ عقد نکاح کیا، آپ کے بطن مبارک سے قاسم، عبد اللہ، زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہم پیدا ہوئے، عورتوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والی خاتون ہیں۔ ۳ قبل از ہجری مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ (الاستیعاب: ۴/ ۱۸۱۷، اسد الغابہ: ۷/ ۸۰، الاصابہ: ۸/ ۹۹، اعلام للزرکلی: ۲/ ۳۰۲)(م)

(د)۔ آزاد شدہ غلاموں میں سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے۔
(ھ)۔ غلاموں میں سے سیدنا بلال بن رباح رضی اللہ عنہ [1] تھے [2]۔

۱۲۔سب سے آخر میں فوت ہونے والے صحابی:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے صحابی سیدنا ابو طفیل عامر بن واثلہ لیثی رضی اللہ عنہ [3] ہیں، آپ کی وفات مکہ مکرمہ میں سن سو ہجری میں ہوئی۔ بعض نے اس سے زیادہ مدت بتلائی ہے۔اوران سے پہلے وفات پانے والے صحابی سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں، جن کی وفات ۹۳ھ میں بصرہ میں ہوئی [1]۔

---

[1] سیدنا بلال بن رباح حبشی، ابوعبداللہ رضی اللہ عنہ، جلیل القدر صحابی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن تھے، سابقین فی الاسلام میں سے تھے، اسلام قبول کرنے پر بہت مشکلات ومصائب سہے، تمام غزوات میں شریک رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے بعد شام ہجرت کرلی، ان کی مرویات کی تعداد ۴۴ ہے اور شام ہی میں ۲۰ھ کو وفات پائی۔(الاستیعاب:۲/۱۱۹، اسد الغابہ:۱/۴۱۵، الاصابہ:۱/۴۵۵، الاعلام للزرکلی:۲/۷۳)(م)

[2] دیکھئے: الاستیعاب:۲/۲۸، مقدمۃ ابن الصلاح:۴۰۲، ارشاد طلاب الحقائق:۲/۶۰۱، التبصرۃ والتذکرۃ:۳/۲۹، المقنع فی علوم الحدیث:۲/۳۵۶، فتح المغیث:۳/۱۲۳۔(م)

[3] سیدنا عامر بن واثلہ بن عبداللہ بن عمرو لیثی کنانی قرشی، ابو طفیل رضی اللہ عنہ: غزوہ احد کے دن ۳ھ کو پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی ہیں، بعض غزوات میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا پرچم اٹھایا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ۹احادیث روایت کیں، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے بہت محبت کرتے تھے، مختار ثقفی کیساتھ دم حسین کے مطالبہ کرنے کے لیے خروج کیا، جب مختار ثقفی قتل کیے گئے تو ابن اشعث کیساتھ پھر میدان میں آئے، عمر بن عبدالعزیز کے زمانے تک حیات رہے، صحابہ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے صحابی ہیں، مکہ مکرمہ میں ۱۰۰ھ کو وفات پائی۔

(الاستیعاب:۳/۲۵۵، اسد الغابہ:۳/۱۴۳، الاصابہ:۷/۱۹۳، الاعلام للزرکلی:۲/۲۵۵)(م)

[1] صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تمام مفتوحہ علاقوں میں پھیل گئے اس لیے مکمل فہرست تو ممکن نہیں۔البتہ بعض شہروں میں فوت ہونے والے آخری صحابہ کا تذکرہ ملتا ہے، چنانچہ مدینہ منورہ میں محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ ۹۹ھ میں فوت ہوئے، بصرہ میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ ۹۳ھ میں وفات پائی۔ کوفہ میں سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے ۸۶ھ میں وفات پائی۔ حمص شام میں سیدنا عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ ۹۶ھ میں فوت ہوئے اور مصر میں عبداللہ بن حارث زبیدی رضی اللہ عنہ فوت ہوئے۔ طائف میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ۶۸ھ کو فوت ہوئے۔ دمشق میں سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ ۸۳ھ یا ۸۵ھ یا ۸۶ھ میں فوت ہوئے۔ اور سب =

۱۳۔ معرفت صحابہ پر مشہور ومعروف تصانیف:

(الف)۔ الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ، از حافظ ابن حجر عسقلانیؒ۔

(ب)۔ اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، از علامہ ابن اثیر علی بن محمد جزریؒ[1]۔

(ج)۔ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، از علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ۔

= سے آخر میں فوت ہونے والے صحابی بالاتفاق سید ابو طفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ ہیں، جو ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے۔ دیکھئے: الاستیعاب: ۴/ ۱۱۶، الاصابہ: ۴/ ۱۱۳، اسد الغابۃ: ۳/ ۱۴۵، مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۰۳، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۰۳، التقیید والایضاح: ۳۱۲، التبصرۃ والتذکرۃ: ۳/ ۳۴، فتح المغیث: ۳/ ۱۲۷۔ (م)

[1] علی بن محمد بن عبد الکریم بن عبد الواحد شیبانی جزری، ابو الحسن عز الدین، ابن اثیر: جزیرہ ابن عمر میں ۵۵۵ھ کو پیدا ہوئے، موصل میں سکونت اختیار کی، اپنے دور کے عظیم مؤرخ، محدث، نسابہ اور ادیب تھے، حصول علم کے سلسلے میں دور دراز کے علمی اسفار کیے اور موصل ہی میں ۶۳۰ھ کو وفات پائی۔

(تذکرۃ الحفاظ: ۴/ ۱۳۹۹، سیر اعلام النبلاء: ۲۲/ ۳۵۳، النجوم الزاہرہ: ۶/ ۲۸۱، شذرات الذہب: ۵/ ۱۳۷، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۳۳۱)(م)

۲۔ معرفت تابعین[۱]

ا۔ تابعی کی تعریف:

(الف)۔ تابعی کی لغوی تعریف:

لغت میں "تابعون" تابعی یا "تابع" کی جمع ہے اور تابع "تبع" سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں کسی کے پیچھے چلنا[۲]۔

(ب)۔ تابعی کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں تابعی اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس نے اسلام کی حالت میں کسی صحابہ سے ملاقات کی اور اسلام کی حالت میں وفات پائی۔[۱] اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ تابعی وہ ہے جس نے صحابی کی صحبت اختیار کی ہو[۲]۔

۲۔ معرفت تابعین کے فوائد:

تابعین کی معرفت کے متعدد فوائد ہیں، تاہم اس کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے مرسل اور متصل کے درمیان فرق وامتیاز ممکن ہو جاتا ہے[۳]۔

۳۔ تابعین کے طبقات:

---

(۱) معرفة علوم الحديث:۴۱ - ۴۶، مقدمة ابن الصلاح:۴۰۵، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۰۶ - ۶۱۶، التقريب: ۱۶۵ - ۱۶۷، اختصار علوم الحديث:۱۹۱ - ۱۹۴، الشذا الفياح ۲/ ۵۱۹ - ۵۳۴، المقنع فی علوم الحديث:۲/ ۵۰۶ - ۵۱۷، فتح المغيث:۳/ ۱۳۹ - ۱۵۶، تدريب الراوي: ۲/ ۲۳۴ - ۲۴۳، توضيح الأفكار: ۲/ ۴۷۱ - ۴۷۳، ظفر الأماني:۵۱۳ - ۵۱۴.(م)

(۲) لسان العرب:۸/ ۲۷، المعجم الوسيط:۱/ ۸۱۔(م)

(۱) شرح نخبة الفكر:۵۸۔(ط)

(۲) الكفاية:۲۲۔(ط)

(۳) اس کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تابعین اور تبع تابعین میں تمیز ہو جاتی ہے اور ان کے مقام میں جو فرق ہے وہ واضح ہو جاتا ہے اور چونکہ تابعین میں ضعفاء کی تعداد کم ہے اس لیے کہ اس تمیز سے تابعین کی ثقاہت کا ایک رجحان بھی واضح ہو جاتا ہے۔ دیکھئے: مقدمة ابن الصلاح:۴۰۵، معرفت علوم الحدیث:۴۱، ارشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۰۶۔(م)

تابعین کے طبقات کی تعداد میں اہل علم کا اختلاف ہے، محدثین کرام نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے انہیں مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے۔

(الف)۔ امام مسلمؒ نے ان کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے۔

(ب)۔ علامہ ابن سعدؒ نے ان کو چار طبقات میں تقسیم کیا ہے۔

(ج)۔ حاکم نیسابوریؒ نے پندرہ طبقات بنائے ہیں، جن میں پہلا طبقہ وہ ہے جس نے عشرہ مبشرہ کو پایا[1]۔

۴۔ مخضرمون:

مخضرمون کا واحد "مخضرم" ہے[1] اور "مخضرم" وہ شخص ہے جس نے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں کو پایا ہو، لیکن رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا ہو۔ صحیح قول کے مطابق مخضرمین کا تعلق تابعین سے ہے، مخضرمین کی تعداد امام مسلمؒ کی تحقیق کے مطابق بیس ہے، لیکن در حقیقت ان کی تعداد اس سے زیادہ ہے، جن میں ابو عثمان نہدیؒ[2] اور.... ....

---

[1] دیکھئے: معرفۃ علوم الحدیث: ۴۲، شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۳/ ۴۷، تدریب الراوی: ۲/ ۱۰۷۔ (م)

[1] مخضرم "خضرمة" سے ماخوذ ہے جو قطع کے معنی میں ہے: "ناقة مخضرمة" اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جس کے کان کٹے ہوئے ہوں۔ اس صورت میں مخضرم "أردك الخضرمتين" کے معنی ہو گا جنہوں نے دونوں قطع (یا دونوں نشان) کا زمانہ پالیا، جو زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا اور جو زمانہ اسلام میں ہوتا تھا۔ یا اس قطع کے معنی میں ہے جو "مقطوع عن نظرائه" کے معنی میں ہے جس کا حکم اپنے ہم عصر سے کٹا ہوا ہے۔ یا "خضرمة" کا اصل معنی بین بین (درمیان) کے ہیں اس لیے کہ جس کا کان کاٹ دیا جاتا تھا کہ وہ کامل اور ناقص کے درمیان ہو جاتا تھا۔ دیکھئے: النہایۃ فی غریب الحدیث: ۲/ ۴۲، مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۰۷۔ (م)

[2] عبد الرحمن بن مُلِّ بن عمر بن عدی بن وہب، ابو عثمان نہدی: مخضرمین میں سے ہیں، کوفہ میں رہائش تھی، کبار صحابہ کرام سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا سعد رضی اللہ عنہ، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ سے ملاقات کی۔ ثقہ راوی ہیں، امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں۔ امام ابو زرعہ رازیؒ، امام نسائیؒ اور ابن خراشؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہے۔ امام ابن معینؒ اور ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ ابو عثمان نہدی ۱۰۰ھ کو فوت ہوئے۔ (تہذیب الکمال: ۳۴/ ۴۷، تہذیب التہذیب: ۶/ ۲۷۸) (م)

اسود بن یزید نخعیؒ[۱] شامل ہیں[۲]۔

۵۔ فقہاء سبعہ:

یہ سات فقہاء اکابر تابعین میں سے ہیں اور یہی حضرات تابعین میں بلند پایہ علماء شمار ہوتے ہیں، یہ سب کے سب مدنی ہیں، ان کے نام یہ ہیں: سعید بن مسیبؒ، قاسم بن محمد[۱]، عروۃ بن زبیر[۲]، ....

---

[۱] اسود بن یزید بن قیس نخعی، ابو عبد الرحمن: جلیل القدر تابعی ہیں، کبار صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اور سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں۔ یحیی بن معین فرماتے ہیں کہ اسود ثقہ ہیں۔ ابن سعد نے بھی انہیں کی توثیق کی ہے، کوفہ میں ۷۵ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۵۰، تہذیب التہذیب: ۱/ ۳۴۲)(م)

[۲] حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے "الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ" کی قسم ثالث میں مخضرمین کا تذکرہ کیا ہے، حافظ برہان الدین حلبی سبط بن عجمیؒ (م ۸۴۱ھ) نے مخضرمین پر ایک خاص کتاب تالیف کی۔ جس کا نام "تذکرۃ الطالب المعلم فی من یقال انہ مخضرم" ہے جس میں تقریباً ایک سو پچپن افراد کا ذکر کیا ہے۔ چند مشہور مخضرمین کے نام یہ ہیں: سوید بن غفلہؒ (م ۸۰ھ)، زید بن وہب جہنیؒ (م ۸۴ھ / ۹۶ھ)، قیس بن ابی حازمؒ (م ۹۷ھ)، ابو مسلم خولانیؒ (م ۶۲ھ)، ابو عبد اللہ صنابحیؒ (م ۷۰ھ / ۸۰ھ)، اویس قرنیؒ (م ۳۶ھ)، علقمہ بن قیس نخعیؒ (م ۶۲ھ)، مسروق بن اجدعؒ (م ۶۷ھ)، اسود بن یزید نخعیؒ (م ۷۴ھ)، اسلم مولیٰ ابن عمرؒ (م ۸۰ھ)، قاضی شریح بن حارثؒ (م ۸۰ھ) وغیرہ۔ (م)

[۱] قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق، ابو محمد، یا ابو عبد الرحمن، ان کا شمار مدینہ کے فقہاء سبعہ میں ہوتا ہے، مدینہ منورہ میں ۳۷ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے بہت بڑے فقیہ، عابد وزاہد اور نیک صالح تھے، حج یا عمرہ کے لیے جا رہے تھے، مکہ اور مدینہ منورہ کے درمیان قدید نامی جگہ میں ۱۱۲ھ کو وفات پائی۔ (التاریخ الکبیر: ۷/ ۴۴، سیر اعلام النبلاء: ۵/ ۵۴، تہذیب التہذیب: ۸/ ۳۳۳)(م)

[۲] عروہ بن زبیر بن عوام اسدی قرشی، ابو عبد اللہ، ۲۲ھ کو پیدا ہوئے، مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے، جلیل القدر اور بہت زیادہ نیک وصالح اور متدین انسان تھے، کسی بھی فتنے کا حصہ نہیں بنے۔ بصرہ چلے اور وہاں سے مصر کا رخ کیا۔ مصر میں عقد نکاح کیا اور وہاں سات سال مقیم رہے، پھر وہاں سے مدینہ منورہ آئے اور وہیں ۹۳ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۵/ ۱۷۸، تہذیب الکمال: ۲۰/ ۱۱، تہذیب التہذیب: ۷/ ۱۸۰)(م)

خارجہ بن زید[۱]، ابو سلمہ بن عبد الرحمن[۲]، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ[۳]، سلیمان بن یسار[۴]۔[۱]

٦۔ تابعین میں سب سے افضل:

تابعین میں سب سے افضل تابعی کے متعلق محدثین کرام کے متعدد اقوال ہیں اور مشہور یہی ہے کہ ان میں سب سے افضل سعید بن مسیبؒ ہیں۔ علامہ ابو عبد اللہ محمد بن حفیف شیر ازیؒ[۲] فرماتے ہیں۔

---

(۱) خارجہ بن زید بن ثابت انصاری، ابوزید: ۲۹ھ میں پیدا ہوئے، بنو نجار سے تعلق تھا، جلیل القدر تابعی ہیں، اپنے دور کے عظیم فقیہ اور محدث تھے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا، مدینہ منورہ میں ۹۹ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۵/ ۲۶۲، تہذیب الکمال: ۴/ ۴۳۷، تہذیب التہذیب: ۳/ ۴۷)(م)

(۲) ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف زہری، ابن عبد عوف، ۲۲ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم فقیہ، مجتہد اور جید عالم تھے، امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ ابو سلمہ بن عبد الرحمن بہت بڑے امام اور ثقہ ہیں، ۹۴ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۳۳/ ۳۷۰، سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۲۸۷، تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۱۱۵)(م)

(۳) عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ ہذلی مدنی، اپنے دور کے عظیم فقیہ، مجتہد اور جید عالم تھے، سیدنا عمر کے خلافت میں پیدا ہوئے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ عبید اللہ بن عبد اللہ مدنی امام، ثقہ اور متقن تھے، ۹۹ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۵/ ۲۵۰، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۴۷، تہذیب التہذیب: ۷/ ۲۳)(م)

(۴) سلیمان بن یسار مدنی مولی ام المؤمنین میمونہ: سیدنا عثمان کے دور خلافت میں پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم فقیہ، محدث اور بے نظیر عالم تھے، ان کا شمار فقہاء سبعہ میں ہوتا ہے، سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، ۹۴ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۵/ ۱۷۴، وفیات الاعیان: ۲/ ۳۹۹، سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۴۴۴)(م)

(۱) امام عبد اللہ بن مبارکؒ نے ابو سلمہ کی بجائے سالم بن عبد اللہ بن عمر کو ان میں شمار کیا ہے جب کہ ابو الزناد نے سالم اور ابو سلمہ کی بجائے ابو بکر بن عبد الرحمن کو ان میں شمار کیا ہے۔ (ط)

(۲) ابو عبد اللہ محمد بن خفیف شیر ازی، مشہور صوفی ہیں، اپنے دور کے عظیم فقیہ، ماہر فنون اور عارف باللہ تھے، ابو فضل خزاعی، حسن بن حفص اندلسی اور قاضی بکر بن باقلانی جیسے اساطین علم ان سے روایت کرتے ہیں، ۳۷۱ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۳۴۲، البدایہ والنہایۃ: ۱۱/ ۲۹۹، شذرات الذہب: ۳/ ۷۷)(م)

(الف)۔ اہل مدینہ کہتے ہیں کہ تابعین میں سب سے افضل تابعی سعید بن مسیبؒ ہیں۔
(ب)۔ اہل کوفہ کہتے ہیں کہ سب سے افضل تابعی اویس قرنیؒ[1] ہیں۔
(ج)۔ اہل بصرہ کہتے ہیں کہ سب سے افضل تابعی حسن بصریؒ ہیں[2]۔

۷۔افضل ترین تابعیات:

حافظ ابو بکر بن ابی داؤدؒ[1] فرماتے ہیں کہ تابعیات کی سردار حفصہ بنت سیرینؒ[2] اور عمرۃ بن عبد الرحمنؒ[3] ہیں اور ....

---

[1] اویس بن عامر بن جزء بن مالک قرنی، بنو قرن بن ردمان بن ناجیہ ابن مراد: جلیل القدر کبار تابعی ہیں، اصل میں یمن کے تھے، قفازاور رمال میں رہائش پذیر تھے، رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا، لیکن آپ سے ملاقات نہ ہو سکی، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آئے اور کوفہ میں سکونت اختیار کرلی۔ جنگ صفین میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے، اکثر مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ آپ جنگ صفین ہی میں شہید کر دیئے گئے۔
(اسد الغابہ:۱/ ۳۳۱، الاصابہ:۱/ ۳۵۹، سیر اعلام النبلاء:۴/ ۱۹، الاعلام للزرکلی:۲/ ۳۲)(م)

[2] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۴۰۹، التقیید والایضاح:۳۲۶، ارشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۱۴۔(م)

[1] ابو بکر عبد اللہ بن سلیمان بن اشعث سجستانی: سجستان میں ۲۳۰ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے بلند پایہ محدث، مفسر، مجود اور ناقد تھے، اپنے والد کیساتھ حصول علم کے اسفار میں شریک رہے، اپنے عظیم والد، عیسی بن حماد، احمد بن صالح، علی فلاس اور موسی بن عامر مزیؒ جیسے اساطین علم سے کسب فیض کیا۔ حجاز مقدس، عراق، مصر، شام، اصبہان، فارس اور خراسان کے اسفار کیے۔ ۳۱۶ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء:۱۳/ ۲۲۱، میزان الاعتدال:۲/ ۴۳۳، الضعفاء والمتروکون لابن الجوزی:۲/ ۱۲۶)(م)

[2] حفصہ بن بنت سیرین ام ہذیل انصاریہ بصریہ: جلیل القدر تابعیہ فقیہ ہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ اور ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہے۔ ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ستر سال کی عمر میں ۱۰۰ھ لگ بھگ وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد:۸/ ۴۸۴، سیر اعلام النبلاء:۴/ ۵۰۷، تہذیب التہذیب:۱۲/ ۴۰۹)(م)

[3] عمرۃ بنت عبد الرحمن بن سعد بن زارہ انصاریہ: جلیل القدر تابعیہ فقیہ ہیں، ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی صحبت میں رہی اوران سے احادیث سنیں، بہت بڑی عابدہ زاہدہ اور صالحہ خاتون تھی، عمر بن عبد العزیزؒ نے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور سیدہ عمرہ بنت عبد الرحمن کی روایات محفوظ کرلیں مجھے علم اٹھتا ہوا نظر آرہا ہے۔ ۹۸ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد:۸/ ۴۸۰، سیر اعلام النبلاء:۴/ ۵۰۷، شذرات الذہب:۱/ ۱۱۴، الاعلام للزرکلی:۵/ ۷۲)(م)

ام الدرداء رحمہا اللہ[۱]، [۲] کا مرتبہ بھی ان کے قریب ہے[۳]۔

۸۔ معرفت تابعین پر معروف تصانیف:

معرفۃ التابعین، از ابو مطرف بن فطیس اندلسی رحمہ اللہ[۱] [۲]۔

---

(۱) هُجِيمَة بنت حيي وصابیہ، ام الدرداء صغری: بہت بڑی محدثہ، فقیہ اور عالمہ فاضلہ تھی، اصل میں دمشق سے تعلق تھا، حمیریہ قبیلہ سے تعلق تھا، سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ کی رفیقہ حیات تھی، ان کے وفات کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے پیغام نکاح بھیجا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ چھ ماہ بیت المقدس اور چھ ماہ دمشق میں رہتی تھی۔ ۸۱ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۵۰، سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۲۷۷، الاعلام للزرکلی: ۸/ ۷۷)(م)

(۲) یہ ام الدرداء صغری ہیں، ان کا نام هَجِيمَة ہے اور انہیں جَهِيمَة بھی کہتے ہیں۔ یہ ابو الدرداء کی بیوی ہیں۔ ام الدرداء کبری بھی ابو الدرداء کی بیوی ہے، ان کا نام خیرہ ہے اور یہ صحابیہ ہیں۔ (ط)

(۳) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۰۹، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۱۵، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۵۷۵، تدریب الراوی: ۲/ ۷۰۹۔ (م)

(۱) عبد الرحمن بن محمد بن عیسی بن فطیس بن اصبغ، ابو مطرف: قرطبہ میں ۳۴۸ھ کو پیدا ہوئے، اندلس میں تفسیر، حدیث اور رجال کے بلند پایہ عالم تھے، ۳۹۴ھ میں قرطبہ کے قاضی مقرر ہوئے اور ۳۹۵ھ میں معزول ہوئے، ان کے چھ کاتب تھے جو ان کی روایات اور اخبار کو قلم بند کرتے رہتے تھے اور قرطبہ میں ہی ۴۰۲ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۳/ ۱۰۶۱، سیر اعلام النبلاء: ۳/ ۳۲۵، النجوم الزاہرہ: ۴/ ۲۳۱، الاعلام للزرکلی: ۳/ ۳۲۵)(م)

(۲) دیکھئے: الرسالۃ المستطرفۃ: ۱۰۵۔ (ط)

۳۔ معرفت اخوۃ واخوات[1]

ا۔ تمہید:

محدثین کرام نے جن علوم کی طرف بہت زیادہ توجہ مبذول کی ہے، ان میں من جملہ رواۃ کے ہر طبقہ میں بھائیوں اور بہنوں کی معرفت بھی داخل ہے، جس کے لیے انہوں نے مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ محدثین کرامؒ کا بحث وتصنیف کے لیے اس موضوع کو منتخب کرنا در حقیقت اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہوں نے رواۃ کے انساب اور ان میں بھائی بہنوں کے متعلق معلومات جمع کرنے کا بے حد اہتمام کیا ہے، جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیجئے۔

۲۔ معرفت اخوۃ واخوات کے فوائد:

معرفت اخوۃ واخوات کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اگر کچھ افراد کے باپ ہم نام ہوں تو بظاہر یہ گمان پیدا نہ ہو کہ یہ اشخاص آپس میں بھائی ہیں، مثلاً عبد اللہ بن دینار اور عمرو بن دینار ہیں، اب جو شخص ان دونوں کے مفصل حالات سے باخبر نہ ہو تو وہ ان دونوں کو آپس میں بھائی سمجھے گا، اس لیے کہ دونوں کے باپ کا نام دینار ہے، حالانکہ یہ آپس میں بھائی نہیں ہیں۔

۳۔ معرفت اخوۃ واخوات کی مثالیں:

(الف)۔ صحابہ میں دو کی مثال:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا زید رضی اللہ عنہ[1]: یہ دونوں خطاب کے بیٹے ہیں۔

(ب)۔ صحابہ میں تین کی مثال:

---

[1] معرفة علوم الحديث: ۱۵۲ - ۱۵۷، مقدمة ابن الصلاح: ۴۱۵-۴۱۷، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۲۳ - ۶۳۱، التقريب: ۱۶۹، اختصار علوم الحديث: ۱۹۸ - ۱۹۹، الشذا الفياح: ۲/ ۵۴۷ - ۵۵۷، المقنع في علوم الحديث: ۲/ ۵۲۴ - ۵۳۴، شرح التبصرة: ۳/ ۷۹ - ۸۵، نزهة النظر: ۷۹، فتح المغيث: ۳/ ۱۶۳ - ۱۶۹، تدريب الراوي: ۲/ ۲۴۹ - ۲۵۳، شرح السيوطي على ألفية العراقي: ۲۰۱، فتح الباقي: ۳/ ۶۹ - ۸۳، توضيح الأفكار: ۲/ ۴۷۶ - ۴۷۷.(م)

[1] سیدنا زید بن خطاب بن نفیل بن عبد العزی قرشی عدوی، ابو عبد الرحمن رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے برادر اکبر ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے، تمام غزوات میں شریک =

سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ[۱] اور سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ[۱]: یہ تینوں ابو طالب[۲] کے فرزند ہیں۔

= رہے، مہاجرین اولین میں سے تھے، جنگ یمامہ کے دن آپ کے ہاتھ میں جھنڈا تھا، اسی ۱۲ھ دوران شہید کر دیئے گئے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان کی شہادت بہت رنجیدہ ہوئے، آج بھی یمامہ میں ان کی قبر موجود ہے۔

(الاستیعاب: ۲/ ۵۵۰، اسد الغابہ: ۲/ ۳۵۶، الاصابہ: ۲/ ۴۹۹، الاعلام للزرکلی: ۳/ ۵۸) (م)

[۱] سیدنا جعفر بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور ہوئے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے برادر اکبر تھے آپ سے دس سال بڑے تھے، سابقین فی الاسلام میں سے ہیں، ۲ھ میں حبشہ کی طرف ہجرت کی، رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے تک آپ وہیں رہے، غزوہ موتہ میں بڑی شجاعت و بہادری کیساتھ لڑے اور اسی ہی غزوہ میں ۸ھ کو شہید ہوئے۔

(الاستیعاب: ۱/ ۲۴۲، اسد الغابہ: ۱/ ۵۴۱، الاصابہ: ۱/ ۵۹۲، الاعلام للزرکلی: ۲/ ۱۲۵) (م)

[۱] سیدنا عقیل بن ابی طالب بن عبد المطلب ہاشمی قرشی، ابو یزید رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول اللہ ہیں، آپ قریش کی تاریخ اور انساب کے بڑے عالم تھے، زمانہ جاہلیت میں بھی قریش کے فیصلے کرتے تھے، آپ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی تھے، صلح حدیبیہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے اور ۸ھ کو مدینہ منورہ ہجرت کی، غزوہ موتہ اور غزوہ حنین میں پیش پیش رہے، یزید کی دور حکومت میں ٦٧ھ کو وفات پائی۔

(الاستیعاب: ۳/ ۱۰۷۸، اسد الغابہ: ۴/ ٦۱، الاصابہ: ۴/ ۴۳۸، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۲۲۴) (م)

[۲] عبد مناف بن عبد المطلب بن ہاشم قریشی، ابو طالب: ۸۵ قبل از ہجری کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، رسول اللہ ﷺ کے محسن و مربی چچا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے والد تھے، قریش کے سردار اور لیڈر تھے، رسول اللہ ﷺ ان کے گھر میں پلے اور بچپن میں ان کیساتھ شام کا سفر کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ شروع تو تمام رؤساء قریش دین توحید کی مخالفت پر تُلے اور آپ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی دفاع کرتے رہے، آخری وقت میں رسول اللہ ﷺ نے ان پر کلمہ توحید پیش کیا، لیکن شومی قسمت سے قریش کی عار و ملامتی کی وجہ سے آپ نے انکار کیا اور مکہ مکرمہ میں حالت کفر ہی میں دنیا سے قبل از ۳ھ رخصت ہوئے، شیعہ امامیہ اور زیدیہ کا ایک باطل نظریہ یہ بھی ہے کہ ابو طالب نے اسلام قبول کیا تھا، لیکن انہوں نے مصالحت کی وجہ سے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔

(طبقات ابن سعد: ۱/ ۷۵، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۱٦٦) (م)

(ج)۔ تبع تابعین میں چار کی مثال:

سہیل،[۱] عبد اللہ[۲]، محمد[۱] اور صالح[۲]: یہ چاروں ابو صالح[۳] کے بیٹے ہیں۔

(د)۔ تبع تابعین میں پانچ کی مثال:

سفیان[۴]، آدم ....

---

(۱) سہیل بن ابی صالح ذکوان سمان، ابویزید مدنی، دوری ابن معینؒ سے نقل کرتے ہیں کہ سہیل بن ابی صالح کی روایات حجت نہیں، امام حاتمؒ فرماتے ہیں کہ سہیل کی روایات لکھیں جاتی ہیں، لیکن قابل حجت نہیں، امام نسائی کہتے ہیں کہ سہیل کی روایات لینے میں کوئی حرج نہیں، امام بخاریؒ نے ان سے متابعات میں روایت لی ہے، اسی وجہ سے امام نسائیؒ نے امام بخاریؒ پر تعاقب کیا ہے، ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ کبھی خطاء کا شکار ہو جاتے ہیں، ابو جعفر منصور کے دور حکومت میں وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۱۲ / ۲۲۳، تہذیب التہذیب: ۴ / ۲۶۳) (م)

(۲) عبد اللہ بن ابی صالح سمان، ان کا نام عباد بھی بتلایا جاتا ہے: اپنے والد اور سعید بن جبیرؒ سے روایت کرتے ہیں، ان کی توثیق میں اختلاف ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ لین الحدیث ہیں۔ (الکاشف: ۱ / ۵۶۲، تقریب التہذیب: ۳۰۸) (م)

(۱) محمد بن ابی صالح ذکوان: نافع بن سلیمان اور ہشیم وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں، ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے نیز فرماتے ہیں کہ خطاء کا شکار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۹ / ۱۵۷، تقریب التہذیب: ۴۷۷) (م)

(۲) صالح بن ابی صالح ذکوان، ابو عبد الرحمن مدنی: اپنے والد اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ابو صالح کے تینوں بیٹے ثقہ ہیں، ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ابو بکر بزارؒ نے بھی انہیں ثقہ کہا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۴ / ۳۹۴، تقریب التہذیب: ۲۷۲) (م)

(۳) ذکوان ابو صالح سمان زیات مدنی، مولی جویریہ بنت احمس غطفانی، کتب ستہ کے راوی ہیں، جلیل القدر تابعی ہیں، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، سیدنا عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں، امام ابن معینؒ نے ان کی توثیق کی ہے، ابوزرعہ، ساجی اور عجلی کہتے ہیں کہ ابو صالح ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے، ۱۰۱ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۱۲ / ۲۲۳، تہذیب التہذیب: ۳ / ۲۱۹، تقریب التہذیب: ۲۰۳) (م)

(۴) سفیان بن عیینہ بن میمون ہلالی کوفی مکی، ابو محمد، محدث حرم مکی، کوفہ میں ۱۰۷ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محدث، مفسر، حافظ اور متبحر عالم تھے، امام شافعیؒ کا قول ہے کہ اگر امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز مقدس میں علم نہ رہتا، آپ نے سترحج کیے تھے، مکہ معظمہ میں رہائش پذیر تھے اور وہیں ۱۹۸ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۸ / ۴۵۴، تاریخ بغداد: ۹ / ۱۷۴، تذکرۃ الحفاظ: ۱ / ۲۶۲، سیر اعلام النبلاء: ۸ / ۴۵۴، الاعلام للزرکلی: ۳ / ۱۰۵)

[۱]، عمران [۲]، محمد [۱] اورابراہیم [۲] : یہ پانچوں عیینہ [۳] کے فرزند ہیں۔

(ہ)۔ تابعین میں چھ کی مثال:

محمد [۴] ....

---

[۱] آدم بن عیینہ ہلالی: آپ سفیان بن عیینہ کے بھائی تھے، امام ابو حاتم رازیؒ فرماتے ہیں کہ آدم بن عیینہ مناکیر روایت کرتے ہیں، ان کی روایات حجت نہیں۔
(الجرح والتعدیل: ۲/ ۲۶۷، میزان الاعتدال: ۱/ ۱۷۰)(م)

[۲] عمران بن عیینہ ہلالی: سفیان بن عیینہ کے بھائی ہیں۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ یہ مناکیر روایت کرتے ہیں، ان کی روایات ناقابل حجت ہیں۔ امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ عمران بن عیینہ ضعیف ہیں۔ امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ صالح الحدیث ہے۔ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ابو صالحؒ کہتے ہیں کہ صدوق ہیں۔ (الجرح والتعدیل: ٦/ ٣٠٢، میزان الاعتدال: ۳/ ۲۴۰، تہذیب التہذیب: ۸/ ۱۳٦)(م)

[۱] محمد بن عیینہ ہلالی: سفیان بن عیینہؒ کے بھائی ہیں۔ یحیی بن سعید قطان، حسن بن ربیع، یعقوب بن ابی علوی وغیرہ اساطین علم ان سے روایت کرتے ہیں۔ امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں، امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ یہ مناکیر روایت کرتے ہیں، ان کی روایات ناقابل حجت ہیں۔ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (الجرح والتعدیل: ۳/ ٦۸۰، تہذیب التہذیب: ۹/ ۳۹۵)(م)

[۲] ابراہیم بن عیینہ ہلالی: سفیان بن عیینہؒ کے بھائی ہیں۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ یہ مناکیر روایت کرتا ہے۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن عیینہ قوی راوی نہیں۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ ان سے یحیی بن معین اور اہل علم کی جماعت روایت کرتی ہے۔ یحیی بن معینؒ فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن عیینہ انتہائی نیک صالح تھے، لیکن محدث نہ تھے۔ (الجرح والتعدیل: ۲/ ۱۱۸، میزان الاعتدال: ۱/ ۵۱، الکاشف: ۱/ ۲۲۰، تہذیب التہذیب: ۱/ ۱۴۹)(م)

[۳] عیینہ بن ابی عمران مولی بن ہلال کوفی: سفیان بن عیینہؒ کے والد محترم ہیں، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ یہ کوفہ میں صراف تھے، اپنے بیٹے کے علاوہ کسی اور نے ان سے روایت نہیں کی۔ ان کے پانچ بیٹے تھے اور وہ تمام کے تمام محدث تھے۔ (تصحیفات المحدثین: ۲/ ۱۴۷، الاکمال: ۲/ ۱۲۴)(م)

[۴] محمد بن سیرین بصری انصاری ابو بکر، بصرہ میں ۳۳ھ کو پیدا ہوئے، مشہور تابعی ہیں، زہد و تقوی اور تعبیر رویاء میں غیر معمولی شہرت حاصل کی، آپ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، سیدنا مالک بن انس رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سیدنا حذیفۃ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے بلاواسطہ روایت کرتے ہیں اور آپ کے مشہور تلامذہ میں امام شعبیؒ، امام اوزاعیؒ، عاصم احول اور مالک بن دینار وغیرہ ہیں۔ ابو عوانہ کہتے ہیں کہ میں ابن سیرین سے ملا انہیں دیکھ کر خدا یاد آجاتا تھا۔ ۱۱۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ (حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۲٦۳، تاریخ بغداد: ۵/ ۳۳۱، وفیات الاعیان: ۴/ ۱۸۱، الاعلام للزرکلی: ٦/ ۱۵۴)(م)

،انس[۱]، یحیی[۲]، معبد[۱]، حفصہ[۲] اور کریمہ[۳]: یہ سب سیرین کی اولاد ہیں۔

(و)۔ صحابہ میں سات کی مثال:

سیدنا نعمان رضی اللہ عنہ[۴]، ....

---

(۱) انس بن سیرین انصاری ،ابوموسی مولی انس: جلیل القدر تابعی ہیں، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پیدا ہوئے، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام ابن معین ؒ اور امام نسائی ؒ فرماتے ہیں کہ انس بن سیرین ثقہ ہیں۔ امام ابن سعد ؒ کہتے ہیں کہ قلیل الحدیث ہے۔ ۱۱۸ھ یا ۱۲۰ھ کو وفات پائی (تہذیب التہذیب: ۱/ ۳۷۴، تقریب التہذیب: ۱۱۵)(م)

(۲) یحیی بن سیرین انصاری مولی ابو عمرو بصری: جلیل القدر تابعی ہیں، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات سے روایت کرتے ہیں، ابن حبان ؒ نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ امام عجلی ؒ نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے بھی انہیں ثقہ کہا ہے۔ بصرہ میں طاعون کی وباء میں ۹۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب: ۱۱/ ۲۲۸، تقریب التہذیب: ۵۹۱) (م)

(۱) معبد بن سیرین انصاری بصری مولی انس: جلیل القدر تابعی ہیں، ابن سیرین ؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، ابن حبان ؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ابن سعد ؒ نے انہیں طبقہ ثالثہ میں ذکر کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے راوی ہیں۔ (تہذیب التہذیب: ۱۰/ ۲۲۳، تقریب التہذیب: ۵۳۹)

(۲) حفصہ بن بنت سیرین ام ہذیل انصاریہ بصریہ: جلیل القدر تابعیہ فقیہ ہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ اور ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں، امام ابن معین ؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہے۔ ابن حبان ؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ستر سال کی عمر میں ۱۰۰ھ لگ بھگ وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۸/ ۴۸۴، سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۵۰۷، تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۴۰۹)(م)

(۳) کریمہ بنت سیرین: محمد بن سیرین ؒ کی ہمشیرہ ہے، محمد بن عیسی واسطی ؒ کہتے ہیں کہ میں یحیی بن معین ؒ سے سناوہ فرما رہے تھے کہ یحیی بن سیرین اور کریمہ بنت سیرین دونوں ضعیف ہیں۔ (میزان الاعتدال: ۴/ ۶۰۹)(م)

(۴) سیدنا نعمان بن مقرن بن عائذ ،ابو عمرو مزنی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، آپ کا تعلق اس خوش نصیب گھرانے سے ہے کہ سات بھائیوں نے ایک دفعہ ہجرت اور اسلام قبول کیا۔ آپ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو فتح قادسیہ کی خوشخبری سنائی اور اصفہان کو فتح کیا، حافظ ابن عبد البر ؒ فرماتے ہیں کہ نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ بصرہ میں سکونت پذیر تھے، پھر وہاں سے کوفہ چلے اور آپ نے ۲۱ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب: ۴/ ۱۵۰۵، اسد الغابہ: ۵/ ۳۳۳، الاصابہ: ۶/ ۳۵۷)(م)

سیدنا معقل رضی اللہ عنہ[1]، سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ[1]، سیدنا سوید رضی اللہ عنہ[2]، سیدنا سنان رضی اللہ عنہ[3]، سیدنا عبد الرحمن رضی اللہ عنہ[4] اور سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ[5]: یہ سب مقرن کے فرزند ہیں۔

---

(۱) سیدنا معقل بن مقرن، ابو عمرۃ مزنی رضی اللہ عنہ: آپ سیدنا نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں، کوفہ میں رہائش پذیر تھے، آپ سے کئی احادیث مروی ہیں، آپ کا تعلق اس خوش نصیب خاندان سے ہے کہ سات بھائیوں نے ایک دفعہ ہجرت اوراسلام قبول کیااور یہ سعادت آپ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔

(الاستیعاب:۳/ ۱۴۳۴، اسد الغابہ:۵ / ۲۲۲، الاصابہ:٦ / ۱۴۵)(م)

(۱) سیدنا عقیل بن مقرن مزنی، ابو حکیم رضی اللہ عنہ: آپ سیدنا نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ اور سیدنا معقل بن مقرن رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں، کوفہ میں رہائش پذیر تھے، آپ کا تعلق اس خوش نصیب خاندان سے ہے کہ سات بھائیوں نے ایک دفعہ ہجرت اوراسلام قبول کیااور یہ سعادت آپ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔

(الاستیعاب:۳/ ۱۰۷۹، اسد الغابہ:۴/ ٦۳، الاصابہ:۴/ ۴۳۹)(م)

(۲) سیدنا سوید بن مقرن بن عائذ مزنی، ابو عمرو، یاابو عدی رضی اللہ عنہ: آپ سیدنا نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ اور سیدنا معقل بن مقرن رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں، کوفہ میں رہائش پذیر تھے اور کوفہ ہی میں وفات پائی۔ آپ کا تعلق اس خوش نصیب خاندان سے ہے کہ سات بھائیوں نے ایک دفعہ ہجرت اوراسلام قبول کیااور یہ سعادت آپ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔ صحیح مسلم اور کتب سنن میں آپ کی روایات موجود ہیں۔

(الاستیعاب:۳/ ٦۸۰، اسد الغابہ:۲/ ٦۰۰، الاصابہ:۳/ ۱۹۰)(م)

(۳) سیدنا سنان بن مقرن بن عائذ مزنی رضی اللہ عنہ: صحابی رسول اللہ ہیں، آپ سیدنا نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ اور سیدنا معقل بن مقرن رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں، آپ کا تعلق اس خوش نصیب خاندان سے ہے کہ سات بھائیوں نے ایک دفعہ ہجرت اوراسلام قبول کیااور یہ سعادت آپ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔ حافظ ابن مندہ اصفہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مغازی میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ (الاستیعاب:۲/ ٦۵۹، اسد الغابہ:۲/ ۵٦۴، الاصابہ:۲/ ۱۵۹)(م)

(۴) سیدنا عبد الرحمن بن مقرن بن عائذ مزنی رضی اللہ عنہ: صحابی رسول اللہ ہیں، آپ سیدنا نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں، بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ کا نام عبد عمرو بن مقرن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بدلا کر عبد الرحمن بن مقرن رکھا۔ آپ کا تعلق اس خوش نصیب خاندان سے ہے کہ سات بھائیوں نے ایک دفعہ ہجرت اوراسلام قبول کیااور یہ سعادت آپ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔ (الاصابہ:۴/ ۳۰۴)(م)

(۵) مؤرخین اور اصحاب سیر نے ان کا نام نعیم بن مقرن بتلایا ہے: سیدنا نعیم بن مقرن مزنی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، جب ان کے بھائی نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ نہاوند میں شہید ہوئے تو یہ ان کے جانشین مقرر ہوئے اور پرچم اٹھا کر سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو دیا، آپ نے بلاد فارس کو فتح کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آپ کے فضیلت کے معترف تھے۔ آپ کا تعلق اس خوش نصیب خاندان سے ہے کہ سات بھائیوں نے ایک دفعہ ہجرت =

یہ سات کے سات مہاجر صحابہ ہیں، اس فضیلت وسعادت میں کوئی بھی ان کا شریک نہیں، سب کے سب ایک ہی باپ کے فرزند ہیں [۱] اور کہا جاتا ہے کہ یہ سب غزوہ خندق میں شریک ہوئے [۱]۔

۴۔ معرفت اخوۃ واخوات پر معروف تصانیف:

(الف)۔ کتاب الاخوۃ، ازابو مطرف بن فطیس اندلسیؒ۔

(ب۔)۔ کتاب الاخوۃ، ازابو العباس السراجؒ [۲]۔

= اور اسلام قبول کیا اور یہ سعادت آپ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔ (الاستیعاب:۴/۱۵۰۹، اسد الغابہ:۵/۳۲۹، الاصابہ:۶/۳۶۴)(م)

[۱] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے سات حقیقی بھائی نہیں گذرے جو سب کے سب ہجرت کے شرف سے مشرف ہوئے ہوں، صرف مذکورہ بالا ساتوں بھائیوں کو یہ سعادت حاصل ہے۔ (ط)

[۱] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۴۱۵-۴۱۷، اِرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۲۳ - ۶۳۱، التقریب:۱۶۹، اختصار علوم الحدیث:۱۹۸ - ۱۹۹۔ (م)

[۲] ''سراج'' چراغ بنانے کی صنعت کی طرف منسوب ہے، ان کے دادا چراغ سازی کا کام کرتے تھے، ان کا نام ابوالعباس محمد بن اسحاق بن ابراہیم ثقفی تھا، ان کا تعلق بنو ثقیف سے نہیں بلکہ یہ ان کے آزاد کردہ غلام تھے اور یہ اپنے دور میں نیشابور کے نامور محدث تھے اور یہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے شیخ ہیں، ۳۱۳ھ میں وفات پائی۔ (ط)

۴۔ معرفت متفق و مختلف(۱)

۱۔ تعریف:

(الف)۔ متفق اور مختلف کی لغوی تعریف:

متفق "اتفاق" سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور مفترق "افتراق" سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور مفترق متفق کی ضد اور نقیض ہے۔

(ب)۔ متفق اور مختلف کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں متفق اور مفترق اس کو کہتے ہیں کہ رواۃ اور ان کے آباء واجداد کے نام رسم الخط اور تلفظ میں متفق اور ایک جیسے ہوں، لیکن ان کی شخصیتیں الگ الگ ہوں(۱)۔ اسی طرح ان کے نام اور کنیتیں، یا ان کے نام اور نسبتیں متفق اور ایک جیسی ہوں(۲)۔

۲۔ متفق و مختلف کی مثالیں(۳):

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۶۲-۴۶۹، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۳۰ - ۷۴۳، التقریب: ۱۸۵ - ۱۸۸، الاقتراح: ۳۱۴ - ۳۱۵، المنھل الروي ۱۲۷ - ۱۲۹، اختصار علوم الحدیث: ۲۲۷ - ۲۲۹، الشذا الفیاح: ۲/ ٦٦٢ - ٦٨٢، المقنع فی علوم الحدیث؛ ۲/ ٦١۴ - ٦٢١، شرح التبصرۃ: ۳/ ۱۹۰، نزھۃ النظر: ٦٨، فتح المغیث: ۳/ ۲۴۵ - ۲۵۸، تدریب الراوي: ۲/ ۳۱٦ - ۳۲۹، فتح الباقي: ۳/ ۲۰۰، توضیح الأفکار: ۲/ ۴۸۸ - ۴۹۳، ظفر الأماني: ۸۹ - ۹۸.(م)

(۱) شرح نخبۃ الفکر: ٦٨۔ (ط)

(۲) اگر صرف نام میں یکسانیت ہو تو ایسی صورت میں بہت ہی کم اشکال پیش آتا ہے اور یہ تعریف اس کی ہے جس میں اشکال پیدا ہوتا ہو، اس کا ذکر مطولات میں موجود ہے اور یہ نوع مہمل کے زیادہ قریب ہے۔ (ط)

(۳) متفق و مختلف کی حافظ ابن الصلاحؒ (م ٦۴۳ھ) اور ان کے متبعین نے چھ قسمیں بیان کی ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۶۲-۴۶۹، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۳۰ - ۷۴۳، فتح المغیث: ۳/ ۲۴۵ - ۲۵۸، تدریب الراوي: ۲/ ۳۱٦ - ۳۲۹۔ (م)

(الف)۔ خلیل بن احمد: اس نام کے چھ اشخاص اور راوی ہیں، ان میں سے پہلا شخص مشہور نحوی امام سیبویہ رحمہ اللہ[1] کا شیخ[1] اور استاذ ہے۔[2]

---

(1) عمرو بن عثمان بن قنبر حارثی، ابوبشر سیبویہ: شیراز میں ۱۴۸ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور میں نحو کے بہت بڑے امام اور جید عالم تھے، حصول علم سلسلے میں بصرہ آئے اور امام خلیل احمدؒ سے کسب فیض کیا، پھر بغداد چلے گئے۔ علم نحو میں آپ کے شہرہ آفاق کتاب "کتاب سیبویہ" ہے، اہل علم فرماتے ہیں کہ اس جیسی نہ ان سے پہلے لکھی گئی ہے اور نہ ہی بعد میں۔ شیراز میں عنفوان شباب میں ۱۸۰ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد: ۱۲/ ۱۹۵، وفیات الاعیان: ۱/ ۴۸۷، سیر اعلام النبلاء: ۸/ ۳۵۱، الاعلام للزرکلی: ۵/ ۸۱)(م)

(1) خلیل بن احمد بن عمرو بن تمیم، ابوعبدالرحمن ازدی نحوی بصری فراہیدی: بصرہ میں ۱۰۰ھ کو پیدا ہوئے، لغت، ادب، نحو اور عروض کے امام تھے، بڑی فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کی۔ مشہور نحوی امام سیبویہؒ ان کے شاگرد ہیں، علم عروض کے موجد و مؤسس ہی، ابوعباس مبردؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد پہلا شخص ہے جس کا نام احمد ہے، ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ بصرہ ہی میں ۱۷۰ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان: ۲/ ۲۴۴، انباہ الرواۃ: ۱/ ۳۴۱، سیر اعلام النبلاء: ۷/ ۴۲۹، الاعلام للزرکلی: ۲/ ۳۱۴)(م)

(2) باقی پانچ اشخاص یہ ہیں:

۱۔ خلیل بن احمد ابوبشر مزنی بصری: بصرہ کے مشہور محدث تھے، ان سے عباس بن عبد العظیم عنبری، محمد بن یحیی بن ابی سمینہ اور عبد اللہ بن محمد مسندی وغیرہ نے روایت کی ہے، انہیں صاحب فہم اور معرفہ کہا گیا ہے۔ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (الثقات لابن حبان: ۸/ ۲۳۰، التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۲۵۹)

۲۔ خلیل بن احمد عجلی، ابوعباس: روح بن عبادہ وغیرہ سے روایت کرتا ہے، حافظ زین الدین عراقیؒ (م۸۰۶ھ) فرماتے ہیں کہ حافظ ابن الصلاحؒ نے غلطی سے اسے خلیل ابن احمد اصبہانی کہا ہے، ابن حبان نے طبقات الاصبہانیین اور ابونُعیم نے تاریخ اصبہان میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ (التقیید والایضاح: ۴۰۶، تاریخ اصبہان: ۱/ ۳۰۷)

۳۔ خلیل بن احمد بن محمد، ابوسعید سجزی قاضی حنفی: انہوں نے ابن خزیمہ، ابن صاعد اور بغوی سے روایت کی ہے، سمرقند میں قاضی رہے، حاکم ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ اپنے زمانے میں بہت بڑے شیخ اور واعظ تھے۔ (الانساب: ۷/ ۸۳، مقدمہ ابن الصلاح: ۴۶۴، التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۲۶۰)

۴۔ خلیل بن احمد، ابوسعید بُستی قاضی مہلبی: ان سے امام بیہقیؒ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح: ۴۶۴، التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۲۶۱)

۵۔ خلیل بن احمد بن عبد اللہ بن احمد، ابوسعید شافعی: مختلف علوم وفنون میں دسترس رکھتے تھے۔ ۴۲۲ھ میں عراق سے اندلس گئے وہاں علم حدیث کی اشاعت کی، ابوحامد اسفراینی سے روایت کی۔ (مقدمہ ابن الصلاح: ۴۶۴، التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۲۶۱)(م)

(ب)۔ احمد بن جعفر بن حمدان: ایک ہی زمانہ میں اس نام کے چار اشخاص تھے[1]۔
(ج)۔ عمر بن خطاب: اس نام کے چھ شخص ہیں[1]۔[2]

---

[1] وہ چار اشخاص یہ ہیں:
۱۔ احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک، ابو بکر بغدادی قطیعی (م۳۶۸ھ): خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ قابل احتجاج ہیں۔ امام حاکمؒ کہتے ہیں کہ ثقہ مامون ہے، عبد اللہ بن احمد بن حنبلؒ سے "مسند" اور "کتاب الزہد" کا سماع کیا ہے۔ حافظ ابو نعیم سمیت کئی لوگوں نے ان سے روایت کی ہے۔
(تاریخ بغداد: ۴/ ۷۳، طبقات الحنابلہ: ۲/ ۶، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۳۳)
۲۔ احمد بن جعفر بن حمدان بن عیسی سقطی بصری، ابو بکر (۳۶۴ھ): عبد اللہ بن احمد بن ابراہیم دورقی وغیرہ سے روایت کی اور ان سے حافظ ابو نُعیم اصبہانی وغیرہ سے روایت کی ہے۔
(الانساب: ۵/ ۳۹۰، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۲۶۳، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۳۴)
۳۔ احمد بن جعفر بن حمدان دینوری (م۲۸۹ھ): انہوں نے عبد اللہ بن محمد بن سنان روحی سے روایت کی ہے اور ان سے علی بن قاسم بن شاذان رازی وغیرہ نے روایت کی ہے۔
(الانساب: ۵/ ۴۵۶، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۲۶۳، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۳۴)
۴۔ احمد بن جعفر بن حمدان، ابو الحسن طرسوسی: عبد اللہ بن جابر طرسوسی اور محمد بن حصن بن خالد طرسوسی سے روایت کی اور ان سے قاضی ابو الحسن خطیب بن عبد اللہ بن محمد خصیبی مصری وغیرہ نے روایت کی ہے۔
(الانساب: ۹/ ۶۷، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۲۶۳، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۳۵)(م)

[1] وہ چھ اشخاص یہ ہیں:
۱۔ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔
۲۔ عمر بن خطاب کوفی: جو سفیان بن زیاد عصفری کے شاگرد اور خالد بن عبد اللہ واسطی کے شیخ ہیں۔
۳۔ عمر بن خطاب راسی بصری: جو سوید حاتم کے شاگرد اور یحیی بن حکیم مقوم کے شیخ ہیں۔
۴۔ عمر بن خطاب بن جلیلۃ بن زیاد بن ابی خالد اسکندرانی: جو یعقوب بن عبد الرحمن، ضمام بن اسماعیل اور زین بن شعیب کے شیخ ہیں، اسکندریہ میں ۲۲۲ھ کو وفات پائی۔
۵۔ عمر بن خطاب ابن خالد بن سوید عنبری: یہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں اور ان کا بیٹا محمد بن اسماعیل بن عمر، ان سے روایت کرتا ہے۔
۶۔ عمر بن خطاب سجستانی: یہ محمد بن کثیر صنعانی، محمد بن یوسف فریابی مصری، سعید بن ابی مریم مصری، اصبغ بن فرج مصری اور ابو ولید طیالسی سے روایت کرتا ہے اور ان سے ابو داود سجستانی، احمد بن یحیی بن زہیر تستری، محمد بن یونس عصفری اور حسن بن حماد قریعی بصری روایت کرتے ہیں۔ دیکھئے: المتفق والمفترق، از خطیب بغدادی: ۳/ ۱۶۰۰-۱۶۰۳۔ (م)

[2] خطیب بغدادیؒ کی کتاب "المتفق والمفترق" میں یہ مثال میرے لیے سب سے زیادہ غرابت کا پہلو لیے ہوئے ہے اگرچہ اس کتاب کے نام میں یکسانیت رکھنے والے افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد سترہ بتائی گئی ہے۔ (ط)

۳۔ معرفت متفق ومختلف کی اہمیت وفوائد:

علوم الحدیث میں یہ فن بہت زیادہ اہم ہے، متعدد اکابر محدثین کرام کو اس فن سے ناواقفیت کی وجہ سے ٹھوکر لگ چکی ہے۔ اس فن کے اہم فوائد یہ ہیں:

(الف)۔ اس کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ ایک ہی نام کے متعدد اشخاص کو ایک شخص سمجھنے کی غلطی نہیں ہوتی۔ اور یہ مہمل کے برعکس ہے، کیونکہ اس میں ایک راوی کو دو یا زیادہ رواۃ شمار کرنے کا خدشہ ہوتا ہے[۱]۔

(ب)۔ ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کی معرفت سے ایک نام میں باہم مشترک رواۃ کے درمیان تمیز ہوجاتی ہے، بسااوقات ایک راوی ضعیف اور دوسرا ثقہ ہوتا ہے، اس کی معرفت کے بغیر ضعیف کو ثقہ، یا ثقہ کو ضعیف گمان کرنے کا اندیشہ ہوتا ہے[۲]۔

۴۔ متفق ومختلف کا ذکر کرنا کب مستحسن ہوتا ہے؟

متفق ومختلف کا ذکر کرنا اس وقت مستحسن ہوتا ہے، جب کسی ایک ہی زمانہ میں دو یا دو سے زائد ہم نام رُواۃ جمع ہوجائیں اور وہ اپنے بعض شیوخ اور تلامذہ میں شریک ہوں، تاہم جب ان کے درمیان بُعدِ زمانی ہو تو پھر مشترک ناموں سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا[۳]۔

۵۔ متفق ومختلف پر مشہور ومعروف تصانیف:

(الف)۔ المتفق والمفترق، یہ خطیب بغدادیؒ کی اس موضوع پر ایک جامع اور عمدہ کتاب ہے[۴]۔

---

(۱) شرح نخبۃ الفکر: ۶۸۔ (ط)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۶۳۔ (م)

(۳) حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ "المتفق والمفترق" کے سلسلے میں وہ اسماء جنہیں واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا ہے انہیں یا تو تحقیق سے متعین کیا جائے گا اور راوی ومروی عنہ کے سلسلے میں جو ممیزات بیان ہوئے ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، بعض اوقات ظن کی بنیاد پر تعیین کیا جاتا ہے جو قوی نہیں ہوتا۔ (مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۶۹، تدریب الراوی: ۲/ ۸۳۶)(م)

(۴) اس کا ایک قلمی نسخہ استنبول کے کتب خانہ اسعد آفندی میں سلسلہ نمبر: ۲۰۹۷ کے تحت موجود ہے لیکن یہ ناقص ہے اس کے ۲۳۹ اوراق ہیں جو دسویں جزء سے شروع ہو کر اٹھارویں جزء یعنی آخر کتاب تک ہے۔ =

(ب)۔ کتاب الانساب المتفقۃ، یہ حافظ محمد بن طاہرؒ[1] کی تصنیف ہے، یہ کتاب متفق کی ایک خاص نوع پر مشتمل ہے۔

= شیخ عبداللہ بن حمید کے پاس اس کا ایک حصہ موجود ہے جو تیسرے جزء سے نویں جزء تک ہے۔اس کی تحقیق ہمارے بھائی ڈاکٹر محمد صادق آیدن نے کی ہے اور اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔(ط)

(۱) محمد بن طاہر بن علی بن احمد مقدسی شیبانی، ابوالفضل: بیت المقدس میں ۴۴۸ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محدث، مؤرخ اور حافظ حدیث تھے، حصول علم کے سلسلے میں میں اطراف عالم (حجاز مقدس، قدس، مصر، شام، جزیرہ، عراق، اصبہان، فارس، خراسان) کی خاک چھانی کی، اسی وجہ سے آپ کو "رحالہ" کہا جاتا ہے، حدیث اور اسماء رجال پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔بغداد میں ۵۰۷ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان:۴/۲۸۷، تذکرۃ الحفاظ:۴/۱۲۴۲، سیر اعلام النبلاء:۱۹/۳۶۱، شذرات الذہب:۴/۱۸، الاعلام للزرکلی:۶/۱۷۱)

۵۔ معرفت مؤتلف ومختلف[۱]

۱۔ تعریف:

(الف)۔ مؤتلف اور مختلف کی لغوی تعریف:

مؤتلف ”الایتلاف“ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، جس کا معنی اجتماع اور ملاقات کے ہیں اور یہ ”نُفرۃ“ کی ضد ہے اور مختلف ”اختلاف“ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے ،جو اتفاق کی ضد ہے[۲]۔

(ب)۔ مؤتلف اور مختلف کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں مؤتلف اور مختلف اس کو کہتے ہیں کہ راویوں کے نام، یا القاب، یا کنیتیں اور یا نسبتیں رسم الخط میں یکساں اور متفق ہوں، لیکن تلفظ میں مختلف ہوں[۳]۔

۲۔ مؤتلف اور مختلف کی مثالیں:

(الف)۔ سَلَام اور سَلَّام: پہلے لفظ میں ”لام“ مخفف اور دوسرے میں ”لام“ مشدد ہے[۴]۔

(ب)۔ مِسْوَر اور مُسَوَّر: پہلے لفظ میں ”میم“ مکسور، ”سین“ ساکن اور ”واؤ“ مخفف ہے جب کہ دوسرے میں ”میم“ مضموم، ”سین“ مفتوح اور ”واؤ“ مشدد ہے[۵]۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۵۰-۴۶۲، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۹۶ - ۷۲۹، التقریب: ۱۸۰ - ۱۸۵، الاقتراح: ۳۱۳ - ۳۱۴، المنهل الروي: ۱۲۱ - ۱۲۷، الموقظۃ: ۹۲، اختصار علوم الحدیث: ۲۲۳ - ۲۲۶، الشذا الفیاح: ۲/ ۶۱۷ - ۶۶۱، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۵۹۲ - ۶۱۳، شرح التبصرۃ: ۳/ ۱۳۳، نزهۃ النظر: ۶۸، فتح المغیث: ۳/ ۲۱۱ - ۲۴۴، تدریب الراوي: ۲/ ۲۹۷ - ۳۱۵، شرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي: ۲۲۲، فتح الباقي: ۳/ ۱۲۳ - ۱۲۷، توضیح الأفکار: ۲/ ۴۸۷ - ۴۸۸، وظفر الأماني: ۹۸ - ۱۰۲.(م)

(۲) دیکھئے: لسان العرب: ۹/ ۱۰، ۹۰۔ (م)

(۳) خواہ یہ اختلاف لفظوں میں ہو یا نقطوں میں ہو یا صورت میں ہو۔ دیکھئے: التقریب مع التدریب: ۲/ ۲۹۷۔ (ط)

(۴) تفصیل دیکھئے: المؤتلف والمختلف للدارقطنی: ۳/ ۱۱۹۳، الاکمال: ۴/ ۴۱۰، تبصیر المتنبہ: ۲/ ۷۰۲۔ (م)

(۵) تفصیل کے لیے دیکھئے: الاکمال لابن ماکولا: ۷/ ۲۴۵، تبصیر المشتبہ: ۴/ ۱۲۸۶۔ (م)

(ج)۔ بَزَّاز اور بَزَّار: پہلے لفظ کے آخر میں "ز" ہے اور دوسرے کے آخر میں "ر" ہے [1]۔
(د)۔ ثَوْري اور تَوَّزي: پہلا لفظ "ثا" اور "را" کیساتھ ہے اور دوسرا "تا" اور "زا" کیساتھ ہے [1]۔

۳۔ کیا مؤتلف اور مختلف کے کوئی ضابطہ ہے؟

(الف)۔ اکثر اسماء اور اعلام کے لیے کوئی ضابطہ اور قانون نہیں ہے، کیونکہ وہ عام اور متداول ہیں، صرف حفظ کی بناء پر ہر نام کو الگ الگ ضبط کیا جاسکتا ہے۔

(ب)۔ تاہم ان میں سے بعض اسماء ایسے ہیں، جن کے لیے ضابطہ اور قانون ہے، ان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ کسی خاص کتاب یا چند کتابوں کی نسبت سے اس کا ضابطہ ہو، مثلاً ہم کہیں کہ صحیحین یا مؤطا میں جس جگہ بھی لفظ "یسار" آجائے تو وہ "یاء" اور "سین" مہملہ کیساتھ ہوگا۔ سوائے محمد بن بشار [2] کے کہ وہ "یاء" اور "شین" کیساتھ ہوگا [3]۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے لیے ایک عمومی ضابطہ اور قانون ہو، کسی خاص کتاب یا چند کتابوں کی نسبت سے نہیں ہوتا، مثلاً: ہم کہیں "پانچ مقامات کے سوا "سلام" جہاں کہیں بھی استعمال ہوگا تو "لام" کی تشدید کیساتھ ہوگا" پھر ہم ان پانچ مقامات کا تذکرہ کردیں [4]۔

معرفت مؤتلف و مختلف کے فوائد:

مؤتلف اور مختلف علم الرجال کا ایک اہم ترین شعبہ ہے، جس کی معرفت کو اس فن

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح: ۴۶۰، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۲۵، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۲۵۰۔(م)

(۱) ان کے علاوہ دیگر مثالوں کے لیے دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۵۰-۴۶۲، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۹۶ - ۷۲۹، اختصار علوم الحدیث: ۲۲۳ - ۲۲۶.(م)

(۲) محمد بن بشار بن عثمان بن داؤد بن کیسان عبدی، ابو بکر بصری بُندار: کتب ستہ کے راوی ہیں، امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ محمد بن بشار بصری ثقہ اور کثیر الحدیث ہے۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ صدوق ہے۔ امام ابن خزیمہؒ کہتے ہیں کہ محمد بن بشار اپنے زمانہ کے امام تھے۔ امام بخاریؒ نے ان سے ۲۰۵ روایات لی ہیں اور امام مسلمؒ نے ۴۶۰ھ روایات نقل کی ہیں۔ ۲۵۲ھ کو وفات پائی۔
(تہذیب الکمال: ۲۴/ ۵۱۱، تہذیب التہذیب: ۹/ ۷۰)(م)

(۳) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۵۴، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۰۷۔(م)

(۴) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۵۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۹۷۔(م)

میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، محدث جلیل علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں۔

«أَشدُّ التَّصحيفِ ما يقعُ في الأسماءِ»[1].

''سب سے زیادہ تصحیف رواۃ کے ناموں میں واقع ہوتی ہے۔''

تصحیف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسماء اور اعلام میں نہ تو قیاس کا دخل ہے اور نہ ہی سیاق وسباق سے کوئی رہنمائی ملتی ہے[2]۔

اس فن کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ اس علم میں دسترس اور مہارت رکھنے والا اسماء اور اعلام میں تصحیف اور غلطیوں سے محفوظ رہتا ہے[3]۔

۴۔ معرفت مؤتلف ومختلف پر معروف تصانیف:

(الف)۔ المؤتلف والمختلف، از عبد الغنی بن سعیدؒ[4]۔

(ب)۔ الاکمال، جو علامہ ابن ماکولاؒ کی تصنیف لطیف ہے اور اس پر علامہ ابو بکر بن نقطہؒ کی تعلیق اور ذیل ہے۔

---

(1) دیکھئے: فتح المغیث:۴/۲۲۹۔(م)

(2) نخبۃ الفکر:۶۸۔(ط)

(3) محدثین کرامؒ کے ہاں اس فن کی بڑی اہمیت ہے، حافظ زین الدین عراقیؒ (م۸۰۶ھ) فرماتے ہیں کہ طالب حدیث کے لیے اس کی طرف توجہ اور اعتناء بے حد ضروری ہے جس شخص کو اس فن کی تعلق نہ ہو وہ اکثر غلطی کا شکار ہوتا ہے اور بسا اوقات اسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔(شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی:۲/۲۱۶)
اس میں زیادہ غلطی کا امکان راویوں کے ناموں میں ہوتا ہے، کیونکہ اسماء واعلام کا صحیح تلفظ نقل کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے کہ اس میں قیاس کا دخل بھی نہیں اور اسے کلام کے سیاق وسباق سے بھی نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔(م)

(4) عبد الغنی بن سعید بن علی بن سعید بن بشر بن مروان ازدی: اپنے دور کے عظیم محدث، نسابہ اور حافظ حدیث تھے، بہترین حافظہ کے مالک ثقہ، مامون اور متدین تھے، کئی کتابوں کے مؤلف ہیں۔۴۰۹ھ میں وفات پائی۔ آپ کے جنازہ میں ہزاروں لوگ نے شرکت کی اور یہ صدا لگائی جارہی تھی کہ یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا زندگی بھر دفاع کرتا رہا۔
(الانساب:۱/۱۹۸، تذکرۃ الحفاظ:۳/۱۰۴۷، وفیات الاعیان:۳/۲۲۳، سیر اعلام النبلاء:۱۷/۲۶۸)(م)

٦۔معرفت متشابہ[1]*

ا۔متشابہ کی تعریف:

(الف)۔ متشابہ کی لغوی تعریف:

متشابہ ”تشابہ“ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، جس کے معانی مماثل اور ایک جیسا ہونے کے ہیں، تاہم یہاں متشابہ سے ”ملتبس“ مراد ہے، یعنی ایک ایسانام یا لفظ جس میں التباس ہو۔ قرآن مجید کے متشابہات بھی اسی قبیل سے ہیں، یعنی ان کی معانی متعین کرنے میں التباس پایا جاتا ہے[1]۔

(ب)۔ متشابہ کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں متشابہ اس کو کہتے ہیں کہ رواۃ کے نام تلفظ اور رسم الخط کے اعتبار سے ایک جیسے ہوں، لیکن ان کے آباء کے نام رسم الخط کے لحاظ سے یکساں ہوں، تاہم تلفظ میں مختلف ہوں، یا اس کے برعکس ہو[2]۔

۲۔متشابہ کی مثالیں:

(الف)۔ایک مثال محمد بن عُقیل[3] (عین مضموم کیساتھ) اور محمد بن عَقیل (عین مفتوح

---

[1] متشابہ دراصل اس سے ماقبل کی دونوں قسموں ”المتفق والمفترق“ اور ”المؤتلف والمختلف“ سے مرکب ہے۔(ط)

* مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۷۰-۴۷۳، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۴۹ - ۷۵۰، التقریب: ۱۸۹، المنہل الروي: ۱۳۰، اختصار علوم الحدیث: ۲۳۰ - ۲۳۱، الشذا الفیاح: ۲/ ۶۹۳ - ۶۹۴، المقنع في علوم الحدیث: ۲/ ۶۲۵، شرح التبصرۃ: ۳/ ۲۱۰، نزھۃ النظر: ۷۰، فتح المغیث: ۳/ ۲۶۴ - ۲۶۵، تدریب الراوي: ۲/ ۳۳۴ - ۳۳۵، فتح الباقي: ۳/ ۲۱۷ - ۲۲۲، توضیح الأفکار: ۲/ ۴۹۵.(م)

[1] دیکھئے: المعجم الوسیط: ۱/ ۴۷۱۔(م)

[2] یعنی راویوں کے نام تلفظ میں مختلف ہوں، لیکن ان کے آباء کے نام رسم الخط اور تلفظ کے لحاظ سے یکساں ہوں۔(ط)

[3] محمد بن عُقیل بن خویلد بن معاویہ بن سعید خزاعی، ابو عبداللہ نیسابوری: حاکم نیسابوریؒ ان کے علم و فضل کے معترف تھے، وہ فرماتے تھے کہ وہ شرف و عزت کے اعلی مقام پر فائز تھے۔ امام نسائی اور ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔(تہذیب التہذیب: ۹/ ۳۴۷، خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال: ۱/ ۳۵۲)(م)

کیساتھ) کی ہے، اس صورت میں رواۃ کے نام ایک جیسے ہیں، لیکن ان کے آباء کے نام مختلف ہیں۔
(ب)۔ دوسری مثال شریح بن نعمان [1] اور سریج بن نعمان [2] کی ہے، اس صورت میں رواۃ کے نام مختلف ہیں، لیکن ان کے آباء کے نام باہم متفق ہیں [3]۔

۳۔ معرفت متشابہ کا فائدہ:

اس علم کا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے رواۃ کے نام منضبط ہو جاتے ہیں، جس سے نہ تو تلفظ میں التباس پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی حروف میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، نیز راویوں کے ناموں کے متعلق کسی قسم کا وہم باقی نہیں رہتا۔

۴۔ متشابہ کی دیگر اقسام وانواع:

مذکورہ اقسام کے علاوہ متشابہ کی اور قسمیں بھی ہیں، جس میں سے بعض اہم اقسام درج ذیل ہیں:
(الف)۔ راوی اور اس کے باپ کے نام میں ایک یا دو حرفوں کے علاوہ باقی سب حروف ایک جیسے ہوں، جیسے محمدؒ بن حُنَین [4] ....

---

(۱) شریح بن نعمان صائدی کوفی: سیدنا علی سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ان کا بیٹا سعید اور سعید بن عمرو بن اشوع وغیرہ روایت کرتے ہیں، ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور امام ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ قلیل الحدیث ہے۔
(تہذیب الکمال: ۱۲/ ۴۵۰، تہذیب التہذیب: ۴/ ۳۳۰)(م)

(۲) سریج بن نعمان بن مروان جوہری، ابو الحسن بغدادی لؤلؤی: فلیح بن سلیمان، حماد بن سلمہ، نافع بن عمر مکی اور ابو عوانہ، جیسے اساطین علم سے روایت کرتے ہیں، امام ابن معینؒ، عجلیؒ اور ابو داؤدؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں۔ امام بخاری اور اصحاب السنن نے ان سے روایات لی ہیں۔ ۲۱۷ھ کو وفات پائی۔
(الجرح والتعدیل: ۴/ ۳۰۴، تہذیب الکمال: ۱۰/ ۲۲۰، سیر اعلام النبلاء: ۱۰/ ۲۱۹)(م)

(۳) دیکھئے: شرح التبصرۃ والتذکرۃ: ۲/ ۲۷۵، نزہۃ النظر: ۱۶۱، تدریب الراوی: ۲/ ۸۳۹۔ (م)

(۴) محمد بن حنین: جلیل القدر تابعی ہیں، عبید بن حنین کے بھائی ہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، امام حاکم نیسابوریؒ فرماتے ہیں کہ ان سے عمرو بن دینار کے علاوہ اور کسی نے روایت نہیں کی۔
(تہذیب التہذیب: ۹/ ۱۳۶)(م)

اور محمدؒ بن جُبَیرٌ[1] ہے۔

(ب)۔ راوی کے نام اور باپ کے نام رسم الخط اور تلفظ میں ایک جیسے ہوں، لیکن تقدیم و تاخیر کے اعتبار سے اختلاف واقع ہو، اس کی دو صورتیں ہیں۔

ا۔ ایک صورت یہ ہے کہ دوناموں میں مکمل اختلاف ہو، جیسے اسود بن یزید[2] اور یزید بن اسود[3]۔[4]

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بعض حروف میں اختلاف ہو، جیسے ایوب بن سیار[5]

---

(۱) محمد بن جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف بن قصی نوفلی، ابوسعید مدنی: جلیل القدر تابعی ہیں، اپنے والد سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، امام عجلیؒ اور ابن خراشؒ فرماتے ہیں کہ محمد بن جبیر ثقہ ہیں، ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے، عمر بن عبد العزیزؒ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ (تہذیب الکمال:۲۴/۵۷۳، تہذیب التہذیب:۹/۹۱)(م)

(۲) اسود بن یزید بن قیس نخعی، ابوعبد الرحمن: جلیل القدر تابعی ہیں، کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اور سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں۔ یحیی بن معین فرماتے ہیں کہ اسود ثقہ ہیں۔ ابن سعد نے بھی انہیں کی توثیق کی ہے، کوفہ میں ۷۵ھ کو وفات پائی۔ (سیر اعلام النبلاء:۴/۵۰، تہذیب التہذیب:۱/۳۴۲)(م)

(۳) یزید بن اسود سوائی، ابن ابی اسود خزاعی، عامری مدنی: جلیل القدر صحابی ہیں، بعض حضرات نے انہیں کوفی کہا ہے، بعض نے مدنی کہا ہے، بعض فرماتے ہیں کہ آپ طائف میں رہائش پذیر تھے، ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ آپ مکی ہیں اور امام ابوعیسی ترمذیؒ فرماتے ہیں آپ حجازی ہیں۔ (الاستیعاب:۴/۱۵۷۱، اسد الغابہ:۵/۴۴۲، تہذیب الکمال:۱۱/۳۱۳)(م)

(۴) بعض اہل علم نے اس قسم کا نام مشتبہ مقلوب رکھا ہے، کیونکہ اس سے ذہن میں اشتباہ واقع ہوتا ہے، رسم الخط میں نہیں، جس کی وجہ سے بعض رواۃ پر راوی کا نام ذکر کرنے میں قلب ہو جاتا ہے، خطیب بغدادیؒ نے اس نوع پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے، جس کا نام "رافع الارتیاب فی المقلوب من الاسماء والانساب" ہے۔ (ط)

(۵) ایوب بن سیار زہری مدنی: یعقوب بن زید اور ابن منکدر سے روایت کرتے ہیں اور ان سے شبابہ بن سوار اور ایک جماعت روایت کرتی ہے، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ غیر معتمد ہے، امام علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ نہیں، امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ متروک ہے۔ (میزان الاعتدال:۱/۲۸۸)(م)

اورایوب بن یسار[۱] ۔[۲]

۵۔ معرفت تشابہ پر معروف تصانیف:

(الف)۔ تلخیص المتشابہ فی الرسم وحمایۃ ما اشکل منہ عن بوادر التصحیف والوہم، از خطیب بغدادیؒ۔

(ب)۔ تالی التلخیص، یہ کتاب بھی خطیب بغدادیؒ کی ہے، یہ دراصل پہلی کتاب کا تتمہ یا ذیل ہے، تاہم یہ دونوں کتابیں اس موضوع پر عمدہ اور بے نظیر کتابیں ہیں[۳]۔

---

(۱) بعض اہل علم نے اس قسم کا نام مشتبہ مقلوب رکھا ہے، کیونکہ اس سے ذہن میں اشتباہ واقع ہوتا ہے، رسم الخط میں نہیں، جس کی وجہ سے بعض رواۃ پر راوی کا نام ذکر کرنے میں قلب ہوجاتا ہے، خطیب بغدادیؒ نے اس نوع پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے، جس کا نام "رافع الارتیاب فی المقلوب من الاسماء والانساب" ہے۔ (ط)

(۲) دیکھئے: نزہۃ النظر:۱۶۸، قفوالاثر:۱۰۶، شرح نخبۃ الفکر للقاری:۱۶۷، الیواقیت والدرر شرح شرح نخبۃ الفکر:۲/ ۳۴۲۔ (م)

(۳) ان کے مکمل نسخے دار الکتب مصر میں موجود ہیں، میرے پاس ان دونوں کی فوٹو کاپی ہے۔ (ط)

۷۔ معرفتِ مہمل

۱۔ مہمل کی تعریف:

(الف)۔ مہمل کی لغوی تعریف:

لغت میں مہمل "اہمال" سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کا معنی ہے۔ ترک کیا ہوا اور چھوڑا ہوا۔ گویا کہ راوی نے نام ذکر کیے بغیر چھوڑ دیا، اگر نام کی صراحت کر لیتا تو دوسرے سے ممتاز ہو جاتا[۱]۔

(ب)۔ مہمل کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں مبہم کی تعریف یہ ہے کہ راوی دو ایسے اشخاص سے روایت کرے کہ یا تو صرف ان کے نام ایک جیسے ہوں، یا ان کیساتھ ساتھ ان کے آباء کے نام بھی ایک جیسے ہوں، تاہم ان دونوں میں کوئی ایسی علامت موجود نہ ہو، جس سے ناموں کے درمیان امتیاز پیدا ہو سکے[۲]۔

۲۔ اہمال کب مضر ہوتا ہے؟

اہمال اس وقت مضر اور نقصان دے ہوتا ہے کہ جب دو ایسے اشخاص سے روایت لی گئی ہو، جن میں ایک ثقہ اور دوسرا ضعیف ہو، اس صورت میں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ روایت ان دونوں میں سے کس سے لی گئی ہے؟ عین ممکن ہے کہ دونوں میں سے جو راوی ضعیف ہے، اس سے روایت لی گئی ہے، جس کی وجہ سے حدیث کو ضعیف قرار دیا جائے، لیکن جب یہ دونوں راوی ثقہ ہوں تو پھر اہمال صحتِ حدیث کے لیے مضر نہیں، اس لیے کہ دونوں ثقہ راویوں میں سے جو بھی ہو تو بہر حال حدیث صحیح شمار ہو گی[۳]۔

---

(۱) دیکھئے: المعجم الوسیط: ۲ / ۹۹۵۔ (م)

(۲) دیکھئے: شرح التبصرة والتذکرة: ۲ / ۲۶۸، فتح الباقی: ۲ / ۲۸۸، فتح المغیث: ۴ / ۲۷۸۔ (م)

(۳) دیکھئے: قفو الاثر: ۱۰۶۔ (م)

۳۔ مہمل کی مثال:

مہمل کی دو قسمیں ہیں، ذیل میں دونوں کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف)۔ جب دونوں راوی ثقہ ہوں، جیسے امام بخاریؒ اپنی صحیح بخاری میں احمد سے روایت کرتے ہیں اور احمد کی کوئی نسبت ذکر نہیں کرتے۔ پھر احمد اپنے استاذ ابن وہب [۱] سے روایت کرتے ہیں۔ اس صورت میں احمد سے مراد یا تو احمد بن صالح [۲] ہے، یا احمد بن عیسی [۳] ہے اور یہ دونوں ثقہ ہیں [۴]۔

---

(۱) عبد اللہ بن وہب بن مسلم، ابو محمد مصری: ثقہ اور متقن راوی ہیں، امام یحییٰؒ فرماتے ہیں کہ ابن وہب ثقہ ہیں، احمد بن صالح فرماتے ہیں کہ ابن وہب نے ایک لاکھ بیس ہزار احادیث لکھیں ہیں۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اتنی کثیر تعداد میں احادیث نقل کرنے کے باوجود امام ابن عدی کہتے ہیں کہ میں نے ان کی کوئی منکر روایت نہیں دیکھی تو یہ ان کی ثقہ ہونے کی بین دلیل ہے۔ ۱۹۷ھ کو وفات پائی۔

(میزان الاعتدال: ۲/ ۵۲۱، تہذیب التہذیب: ۶/ ۷۲)(م)

(۲) احمد بن عیسی مصری تستری نزیل بغداد: امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام نسائیؒ، امام ابن ماجہؒ اور امام بغویؒ ان سے روایت کرتے ہیں، ثقہ راوی ہیں، تاہم ابو داؤد نے امام ابن معینؒ سے نقل کیا ہے کہ ابن معینؒ نے قسم اٹھا کر کہا کہ احمد بن عیسی کذاب ہے، امام نسائی اور خطیب بغدادی اور دیگر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ صحیحین کے مؤلفین نے ان کی روایات سے استدلال کیا ہے اور میں نے ان کی کوئی منکر روایت نہیں دیکھی۔

(میزان الاعتدال: ۱/ ۱۲۶، تہذیب التہذیب: ۱/ ۶۴)(م)

(۳) احمد بن صالح، ابو جعفر مصری: ثقہ راوی ہیں، ابو زعہ دمشقیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا کہ مصر میں آپ کا جانشین کون ہے؟ تو کہا کہ احمد بن صالح۔ امام بخاریؒ، امام ابو حاتمؒ اور امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ احمد بن صالح ثقہ ہیں، امام نسائی فرماتے ہیں کہ احمد بن صالح غیر ثقہ اور غیر مامون ہیں، نیز فرماتے ہیں کہ محمد بن یحیی نے ان کی روایات کی ترک کر دی ہیں اور امام ابن معینؒ نے ان کو جھوٹا کہا ہے۔ امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ کی رائے ان کے متعلق درست نہیں، محمد بن ہارون برقی کہتے ہیں کہ امام نسائیؒ ان پر اس لیے جرح کرتے ہیں کہ انہوں نے امام نسائی کو اپنی مجلس سے نکال دیا تھا۔

(میزان الاعتدال: ۱/ ۱۰۴، تہذیب التہذیب: ۱/ ۳۹، تقریب التہذیب: ۸۰)(م)

(۴) دیکھئے: تقریب التہذیب: ۸۰، ۸۳، رقم الترجمۃ: ۸۶، ۴۸۔(م)

(ب)۔ جب ان دونوں میں ایک ثقہ اور دوسرا ضعیف ہو، جیسے سلیمان بن داؤد نامی دو شخص ہیں، ان میں سے ایک خولانی ہے اور دوسرا یمامی[۱] ہے، خولانی[۲] ثقہ ہے[۳]، لیکن یمامی ضعیف ہے[۴]۔

۴۔ مہمل اور مبہم میں فرق:

مہمل اور مبہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ مہمل میں راوی کا نام مذکور ہوتا ہے، لیکن تعین نہیں ہوتی، جب کہ مبہم میں نام ہی مذکور نہیں ہوتا۔

۵۔ معرفت مہمل پر معروف تصانیف:

اس موضوع پر مشہور و معروف کتاب خطیب بغدادیؒ کی "الْمُكَمِّلَ فِي بَيَانِ الْمُهْمَلِ" ہے۔

---

(۱) سلیمان بن داؤد یمامی، ابو جمل: ضعیف راوی ہیں، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ان کی روایات ناقابل اعتبار ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ منکر الحدیث ہے (امام بخاریؒ جس راوی کو منکر الحدیث کہتے ہیں کہ ان کی روایات کو لینا جائز نہیں ہوتا)۔ امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ ضعیف ہے۔ (میزان الاعتدال: ۲/ ۲۰۲)(م)

(۲) سلیمان بن داؤد خولانی: امام ابن معین فرماتے ہیں کہ اس کی روایات ناقابل اعتناء ہیں، کبھی فرماتے ہیں کہ سلیمان بن داؤد ضعیف ہے، امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ان کی احادیث صحیح ہیں۔ امام ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ ان کی احادیث درست ہیں۔ ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ سلیمان بن داؤد ثقہ ہیں۔ (میزان الاعتدال: ۲/ ۲۰۰، تہذیب التہذیب: ۴/ ۱۸۹)(م)

(۳) دیکھئے: تقریب التہذیب: ۲۵۱، رقم الترجمۃ: ۲۵۵۵۔ (م)

(۴) میزان الاعتدال: ۲/ ۲۰۲۔ (م)

۸۔ معرفت مبہمات [۱]

۱۔ مبہمات کی تعریف:

(الف)۔ مبہمات کی لغوی تعریف:

لغت کے اعتبار سے مبہمات "مبہم" کی جمع ہے اور یہ "ابہام" مصدر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جو "ایضاح" کی ضد ہے [۲]۔

(ب)۔ مبہمات کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں مبہم وہ شخص ہے، جو متن یا سند میں مذکور ہو، یا اس کا روایت کیساتھ کوئی تعلق ہو، لیکن اس کا نام مخفی ہو [۳]۔

۲۔ معرفت مبہمات کے فوائد:

محدثین کرام نے اس کے متعدد فوائد بیان کیے ہیں، جن میں چند درج ذیل ہیں:

(الف)۔ اگر ابہام سند میں ہو تو اس سے راوی کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اگر ثقہ ہو تو ہم روایت پر صحیح ہونے کا حکم لگاتے ہیں اور اگر ضعیف ہو تو روایت کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

(ب)۔ اگر ابہام متن میں ہو تو اس کے متعدد فوائد ہیں، جن میں سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ صاحب واقعہ کی معرفت یا سائل کا نام معلوم ہو جاتا ہے، اگر حدیث میں ان کی کوئی منقبت بیان کی گئی ہو تو ہمیں ان کی فضیلت معلوم ہو جاتی ہے اور اگر اس کا عکس ہو تو ہم اسے جان کر افاضل

---

[۱] مقدمۃ ابن الصلاح:۴۷۹-۴۸۳، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۷۶۲ - ۷۶۸، التقریب:۱۹۲ - ۱۹۳، المنهل الروي:۱۳۶، اختصار علوم الحدیث:۲۳۶ - ۲۳۷، الشذا الفیاح:۲/ ۷۰۳ - ۷۱۲، المقنع في علوم الحدیث: ۲/ ۶۳۲ - ۶۴۳، شرح التبصرة:۳/ ۲۲۸ - ۲۳۷، فتح المغیث:۳/ ۲۷۴ - ۲۷۸، تدریب الراوي:۲/ ۳۴۲ - ۳۴۸، شرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي:۲۵۸، فتح الباقي ۳/ ۲۳۰ - ۲۳۳، توضیح الأفکار ۲/ ۴۹۷ - ۴۹۸.(م)

[۲] دیکھئے: المعجم الوسیط:۱/ ۷۴۔(م)

[۳] دیکھئے: علوم الحدیث:۳۷۵۔(ط)

صحابہ کے متعلق بدگمانی کرنے سے بچ جاتے ہیں[۱]۔

۳۔ مبہم کو کیسے پہچانا جاتا ہے؟

مبہم کی معرفت درج ذیل دو طریقوں میں سے کسی ایک سے حاصل ہوتی ہے:

(الف)۔ دوسری روایات میں اس کا نام اور شخصیت مذکور ہو۔

(ب)۔ اہل سیر اور مؤرخین مبہم کی تصریح کریں اور صراحۃً مبہم شخص کا نام لیں۔ اکثر و بیشتر یہی ہوتا ہے[۲]۔

۴۔ مبہم کی اقسام وانواع:

محدثین کرام نے شدت ابہام اور عدم شدت کی بنا پر مبہم کی چار قسمیں بیان کی ہیں، ہم سب سے پہلے اس قسم کو ذکر کرتے ہیں، جس میں سب سے زیادہ ابہام ہو۔

(الف)۔ مرد یا عورت کا ابہام: جیسے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے:

«أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! الْحَجُّ كُلَّ عَامٍ؟»[۳].

"ایک شخص نے حج کے موقع پر سوال کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہر سال حج فرض ہے؟"

محدثین کرام فرماتے ہیں کہ یہ شخص اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ[۴] تھا[۵]۔

---

[۱] دیکھئے: تدریب الراوی: ۲/ ۸۵۴۔ (م)

[۲] مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۷۹، تدریب الراوی: ۲/ ۸۵۴۔ (م)

[۳] اس مبہم روایت کی تخریج ابو داؤد طیالسی: ۴/ ۳۹۳، رقم: ۲۷۹۱، مسند احمد: ۴/ ۷۱، رقم: ۲۷۴۱، خطیب بغدادی نے الاسماء المبہمۃ: ۱۳۰۔ میں کی ہے۔

[۴] سیدنا اقرع بن حابس بن عقال مجاشعی دارمی تمیمی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، زمانہ جاہلیت میں اپنے قبیلہ کے سردار تھے، اپنے قبیلہ کیساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے، غزوہ حنین، فتح مکہ اور فتح طائف میں شریک ہوئے، مدینہ منورہ میں رہائش پذیر تھے، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دور خلافت میں دومۃ الجندل چلے گئے، آپ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کیساتھ تمام جنگوں میں شریک رہے، جنگ یمامہ میں بھی آپ ان کے ہمراہ تھے، ۱۳ھ کو وفات پائی۔

(الاستیعاب: ۱/ ۱۰۳، اسد الغابہ: ۱/ ۲۶۴، الاصابہ: ۱/ ۲۵۴، الاعلام: ۲/ ۵)(م)

[۵] دیکھئے: علوم الحدیث: ۳۱۹۔ (ط)

(ب)۔ بیٹا اور بیٹی کا ابہام: جیسے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کی ایک "بیٹی" کو پانی اور بیری کے پتوں کیساتھ غسل دینے کا ذکر ہے۔ یہ بیٹی سیدہ زینب[1] رضی اللہ عنہا تھی[2]۔

اس قسم کیساتھ بھائی، بہن، بھتیجا، بھانجا، بھتیجی اور بھانجی بھی شدتِ ابہام کے اعتبار سے ملحق ہیں۔

(ج)۔ چچا اور پھوپھی کا ابہام: ان کیساتھ ماموں، خالہ، چچازاد بھائی بہن، پھوپھی زاد بھائی بہن، ماموں زاد اور خالہ زاد بھائی بہن کو بھی شمار کیا جاتا ہے، جیسے رافع بن خدیج[3] کی حدیث جو انہوں نے اپنے چچا سے روایت کر کے مخابرہ (بٹائی پر کھیتی کرنا) سے نہی کے سلسلے میں بیان کی ہے، اس روایت میں ان کے چچا کا نام ظہیر بن رافع[4] ہے[5]۔

---

[1] سیدہ زینب بنت سید البشر امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ: آپ رسول اللہ ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں، آپ کی شادی اپنے خالہ زاد ابو العاص بن ربیع سے ہوئی، ان سے آپ کی ایک بیٹا علی رضی اللہ عنہ اور ایک بیٹی امامہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں، علی رضی اللہ عنہ بچپن میں فوت ہوئے اور سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کیساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وفات کے بعد عقد نکاح کیا، ۸ھ میں وفات پائی۔

(الاستیعاب:۴/۱۸۵۳، اسد الغابہ:۷/۱۳۱، الاعلام للزرکلی:۳/۶۷)(م)

[2] دیکھئے: الأسماء المبهمة ۱/ ۲۹۰ – ۲۹۳، الإشارات إلی بیان أسماء المبهمات:۲۲، فتح الباری:۳/۱۲۸(م)

[3] سیدنا رافع بن خدیج بن رافع بن عدی بن زید ابن جشم انصاری نجاری خزرجی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، غزوہ بدر میں شرکت کے حاضر ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اس لیے واپس کیا کہ آپ چھوٹے بچے تھے، پھر غزوہ احد میں شریک ہوئے، مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی۔ مدینہ منورہ میں ہی ۷۴ھ کو وفات پائی۔

(الاستیعاب:۲/۴۷۹، اسد الغابہ:۲/۲۲۲، الاصابہ:۲/۳۶۳)(م)

[4] سیدنا ظہیر بن رافع بن عدی بن زید بن جشم انصاری اوسی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، امام ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ آپ عقبہ ثانیہ اور غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے، ابو عمر کہتے ہیں آپ بدر میں شریک نہیں ہوئے بلکہ غزوہ احد اور اس کے بعد ہونے والے غزوات میں شریک ہوئے تھے، آپ سیدنا اسید بن ظہیر رضی اللہ عنہ کے والد اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے چچا تھے۔

(الاستیعاب:۲/۷۷۸، اسد الغابہ:۲/۱۰۳)(م)

[5] صحیح بخاری:۳/۱۰۷، رقم:۲۳۳۹، صحیح مسلم:۳/۱۱۸۱، رقم:۱۵۴۷۔(م)

اس طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی پھوپھی کی حدیث جو غزوہ احد میں اپنے والد کی شہادت پر روئی تھی، اس میں پھوپھی کا نام فاطمہ بنت عمرو[1] ہے[2]۔

(د)۔ شوہر اور بیوی کا ابہام: جیسے صحیحین میں وہ حدیث جس میں ''سبیعہ''[3] کے شوہر کی وفات کا ذکر ہے، اس میں ان کے شوہر کا نام سعد بن خولہ[4] تھا۔ اسی طرح ''زوجہ'' حضرت عبد الرحمن بن زَبیر[5] کی حدیث جو رفاعہ قرظی[6] کے نکاح میں تھی، پھر اسے طلاق ہو گئی۔ اب اس روایت

---

(۱) سیدہ فاطمہ بنت عمرو بن حرام رضی اللہ عنہا: جلیل القدر صحابیہ رسول ہیں، سیدنا عمر بن حزام رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ تھی، صحیح روایات میں ان کی تذکرہ موجود ہے۔

(الاستیعاب:۴/۱۹۰۰، اسد الغابہ:۷/۲۲۴، الاصابہ:۸/۲۷۶)(م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۸۳، ارشاد طلاب الحقائق:۲/۷۶۶، شرح التبصرۃ والتذکرۃ:۳/۲۳۴۔(م)

(۳) سیدہ سبیعہ بن حارث اسلمیہ رضی اللہ عنہا: آپ جلیل القدر صحابیہ ہیں، سیدنا سعد بن خولہ رضی اللہ عنہ کی رفیقہ حیات تھی۔

(الاستیعاب:۴/۱۸۵۹، اسد الغابہ:۷/۱۳۸، الاصابہ:۸/۱۷۱)(م)

(۴) سیدنا سعد بن خولہ بنی مالک بن حسل بن عامر بن لوی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، سابقون الاولون میں سے ہیں، پہلے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اورآپ سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا کے شوہر تھے، حجۃ الوداع کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

(الاستیعاب:۲/۵۸۷، اسد الغابہ:۲/۴۲۷)(م)

(۵) سیدنا عبد الرحمن بن زَبیر (بفتح الزاء) بن زید بن امیہ بن زید بن مالک بن عوف رضی اللہ عنہ: آپ صحابی رسول ہیں، آپ کی حدیث عسیلہ مشہور ہے۔

(الاستیعاب:۲/۸۳۳، اسد الغابہ:۳/۴۴۳، الاصابہ:۴/۲۵۸)(م)

(۶) سیدنا رفاعہ بن سموال، یا رفاعہ بن رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ: صحابی رسول ہیں، آپ ام المؤمنین سیدہ صفیہ کے ماموں تھے، انہوں نے اپنی بیوی کو عہد رسالت میں تین طلاقیں دی تھیں، پھر آپ کی بیوی نے عبد الرحمن بن زَبیر رضی اللہ عنہ کیساتھ عقد نکاح کر لیا تھا، پھر وہ دوبارہ وہ آپ کی طرف رجوع کرنی چاہتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا کہ جب تک آپ تم دونوں ایک دوسرے کا مزہ نہ چکھ لیں تو اس وقت تک رفاعہ کیساتھ نکاح نہیں کر سکتی۔

(اسد الغابہ:۲/۲۸۳، الاصابہ:۲/۴۰۸)(م)

میں لفظ ''زوجہ'' مبہم ہے، ان کا نام تمیمہ بنت وہب[۱] تھا[۲]۔

۵۔ معرفتِ مبہمات پر معروف تصانیف[۳]:

متعدد اہل علم نے اس موضوع پر کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں علامہ عبد الغنی بن سعیدؒ، خطیب بغدادیؒ اور امام نوویؒ سر فہرست ہیں، تاہم اس سلسلہ میں سب سے عمدہ اور جامع کتاب علامہ ولی الدین وعراقیؒ کی ''المستفاد من مبہمات المتن والاسناد'' ہے[۴]۔

---

(۱) سیدہ تمیمہ بنت وہب ابو عبید قرظیہ، مطلقہ رفاعہ قرظی: آپ وہ خاتون ہیں کہ رفاعہ قرظی کے طلاق دینے کے بعد آپ نے عبد الرحمن بن زَبیر رضی اللہ عنہ کیساتھ عقد نکاح کیا تھا، پھر آپ نے رسول اللہ ﷺ کو عبد الرحمن بن زَبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا تھا: '' والله ما معه إلا مثل هدبة الثوب!'' کتب حدیث میں یہ روایت مشہور و معروف ہے۔
(الاستیعاب: ۴/ ۱۷۹۸، اسد الغابہ: ۷/ ۴۳، الاصابہ: ۸/ ۵۸)(م)

(۲) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۸۳، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۷۷۔(م)

(۳) باقی رہی یہ بات کہ مبہم روایت کا کیا حکم ہے؟ تو اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں۔
''ولا يُقْبَلُ حديث المُبْهَم، ما لم يُسَمَّ، لأن شرط قبول الخبر عدالة رواته، ومَنْ أُبْهِمَ اسْمُه لا يُعرفُ عَيْنُه؛ فكيف عدالته.'' (نزہۃ النظر: ۱۲۱)
''مبہم راوی کا نام جب تک مذکور نہ ہو اس کی حدیث قبول نہیں کی جاتی، اس لیے کہ خبر کے مقبول ہونے کے لیے راویوں کی عدالت شرط ہے جس کا نام مبہم ہے تو اس کی ذات غیر معروف ہے عدالت تو بعد کا معاملہ ہے!''
حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) مزید فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے الفاظ تعدیل کیساتھ مبہم حدیث بیان کی، مثلاً: ''أخبرني عدل'' یا ''حدثني ثقة'' کہا تو اس کی قبولیت میں اختلاف ہے ان کے نزدیک اصح اور معتمد علیہ یہی ہے کہ وہ غیر مقبول ہے کیونکہ ممکن ہے کہ مروی عنہ راوی کے خیال میں عادل و ثقہ ہو، لیکن کسی دوسرے کے نزدیک مجروح ہو، بعینہ اس احتمال کے سبب مرسل کو قبول نہیں کیا جاتا، اگرچہ وہ ارسال بصیغہ جزم کسی راوی کی طرف سے وہی کیوں نہ واقع ہو۔
بعض حضرات کا خیال ہے کہ ظاہر کو دیکھتے ہوئے ایسی احادیث کو قبول کیا جائے گا، کیونکہ جرح خلاف اصل ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر قائل عالم ہو تو اس کے متبعین کے لیے اس کی جانب سے کی گئی تعدیل قابل قبول ہے، لیکن یہ عقیدہ کی بات ہے اور علوم الحدیث کے مباحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ (نزہۃ النظر: ۱۲۱)(م)

(۴) تدریب الراوی: ۲/ ۸۵۴۔(م)

۹۔ معرفت وحدان[1]

ا۔ وحدان کی تعریف:

(الف)۔ وحدان کی لغوی تعریف:

"وُحدان" واؤ کے ضمہ کیساتھ "واحد" کی جمع ہے[2]۔

(ب)۔ وحدان کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں وہ رُواۃ ہیں، جن میں سے ہر ایک سے ایک ایک راوی نے روایت کی ہو[3]۔

۲۔ معرفتِ وحدان کا فائدہ:

معرفتِ وحدان کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے مجہول العین راوی کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور اگر وہ صحابی نہ ہو تو اس کی روایت کو نا قابل قبول قرار دیا جاتا ہے[4]۔

۳۔ معرفتِ وحدان کی مثالیں:

راوی صحابی اور غیر صحابی دونوں ہو سکتا ہے، اس لیے اس کی دو صورتیں بنتی ہیں، ذیل میں دونوں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(الف)۔ صحابہ میں سے حضرت عروہ بن مضرس[5] رضی اللہ عنہ ہیں، ....

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۲۵، تدریب الراوی:۲/۳۹۷، شرح ألفیۃ السیوطي لأحمد شاکر ۲۵۱، توضیح الأفکار ۴۸۱.(م)

(۲) دیکھئے: لسان العرب:۳/۴۴۷، تہذیب اللغۃ:۵/۱۲۵۔(م)

(۳) دیکھئے: علوم الحدیث، ص ۳۲۳، التقریب مع التدریب:۲/ ۲٦۸.(ط)

(۴) دیکھئے: تدریب الراوی:۲/۳۹۷۔(م)

(۵) سیدنا عروہ بن مضرس بن اوس بن حارثہ بن لام طائی رضی اللہ عنہ: صحابی ہیں، کوفیین میں ان کا شمار ہوتا ہے، ان سے امام شعبیؒ روایت کرتے ہیں۔ آپ اپنے قوم کے سردار تھے، آپ کے والد بھی اپنے قوم کے سردار اور سربراہ تھے۔ (الاستیعاب:۳/۱۰٦۷، اسد الغابہ:۴/۳۱، الاصابہ:۴/۴۰۸)(م)

جن سے امام شعبیؒ[۱] کے سوا کسی نے روایت نہیں کی۔ اور حضرت مسیب بن حزن رضی اللہ عنہ[۲] ہیں، جن سے ان کے بیٹے سعید کے سوا کسی نے روایت نہیں کی[۳]۔

(ب)۔ تابعین میں سے ابو عشراء[۴] ایسے شخص ہیں، جن سے حماد بن سلمہ[۵] کے سوا کسی نے روایت نہیں کی[۶]۔

۴۔ کیا شیخینؒ نے صحیحین میں وحدان سے روایات لی ہیں؟

(الف)۔ حاکم نیسابوریؒ نے "المدخل" میں ذکر کیا ہے کہ شیخین حضرات نے اس نوعیت کی

---

(۱) عامر بن شراحیل بن عبد ذی کبار، شعبی حمیری، ابو عمرو: جلیل القدر تابعی ہیں، کوفہ میں ۱۹ھ کو پیدا ہوئے، آپ حفظ واتقان میں ضرب المثل تھے، عظیم محدث اور رجال حدیث میں سے ہیں، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ، سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، عمر بن عبد العزیزؒ نے آپ کو قاضی مقرر کیا تھا، کوفہ ہی میں ۱۰۳ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۶/ ۲۴۶، تاریخ بغداد: ۱۲/ ۲۲۷، سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۲۹۴، الاعلام للزرکلی: ۳/ ۲۵۱)(م)

(۲) سیدنا مسیب بن حزن بن ابی وہب بن عمرو بن عائذ قرشی مخزومی، ابو سعید رضی اللہ عنہ: صحابی رسول ہیں، تابعی جلیل سعید بن مسیبؒ کے والد ہیں، بیعۃ الرضوان میں بھی آپ شامل تھے۔

(الاستیعاب: ۳/ ۱۴۰۰، اسد الغابہ: ۲/ ۳۹۰، الاصابہ: ۶/ ۹۶)(م)

(۳) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۲۵-۴۲۶، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۴۴، التقیید والایضاح: ۳۵۲، تدریب الراوی: ۲/ ۳۴۳۔(م)

(۴) اسامہ بن مالک بن قہطم بن حیان دارمی، ابو العشراء: امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ان کی روایات، نام، اپنے والد سے سماع سب محل نظر ہیں، ان سے صرف حماد بن سلمہ نے روایت کی ہے۔

(الاصابہ: ۱/ ۲۶۷، میزان الاعتدال: ۴/ ۵۵۱)(م)

(۵) حماد ابن سلمہ ابن دینار بصری، ابو سلمہ، ثقہ عابد تھے، آخری عمر میں حافظہ خراب ہو گیا تھا۔ امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ حماد ثقہ ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ حماد ثقہ ہے، امام علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص حماد پر جرح کرے تو وہ خود قابل اعتبار نہیں۔

(تقریب التہذیب: ۱۷۸، میزان الاعتدال: ۱/ ۵۹۰)(م)

(۶) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۲۷، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۴۹، التقیید والایضاح: ۳۵۵، تدریب الراوی: ۲/ ۳۴۴۔ (م)

کوئی حدیث اپنی کتابوں میں روایت نہیں کی[۱]۔

(ب)۔ لیکن جمہور محدثین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ صحیحین میں بکثرت ایسی احادیث موجود ہیں، جن کی روایت صرف ایک صحابی سے ہوئی ہے، ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ا۔ حضرت مسیب کی وہ حدیث جو ابو طالب کی وفات سے متعلق ہے، اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے[۲]۔

---

[۱] المدخل إلى کتاب الإکلیل:۳۳، مقدمۃ ابن الصلاح:۴۲۶، التقیید والایضاح:۳۵۳، تدریب الراوی:۲/ ۴۲۷۔

[۲] وہ حدیث یہ ہے:

”حَدَّثَنَا مَحْمُودٌ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ، أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنِ ابْنِ المُسَيِّبِ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ أَبَا طَالِبٍ لَمَّا حَضَرَتْهُ الوَفَاةُ، دَخَلَ عَلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ وَعِنْدَهُ أَبُو جَهْلٍ، فَقَالَ: «أَيْ عَمِّ، قُلْ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللَّهِ» فَقَالَ أَبُو جَهْلٍ وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي أُمَيَّةَ: يَا أَبَا طَالِبٍ، تَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ عَبْدِ المُطَّلِبِ، فَلَمْ يَزَالاَ يُكَلِّمَانِهِ، حَتَّى قَالَ آخِرَ شَيْءٍ كَلَّمَهُمْ بِهِ: عَلَى مِلَّةِ عَبْدِ المُطَّلِبِ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ، مَا لَمْ أُنْهَ عَنْهُ» فَنَزَلَتْ: {مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الجَحِيمِ} [التوبة: ۱۱۳]. وَنَزَلَتْ: {إِنَّكَ لاَ تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ} [القصص: ٥٦]. “ (صحیح بخاری:۵/ ۵۲، رقم:۳۸۸۴، صحیح مسلم:۱/ ۵۴، رقم:

”ہم سے محمود بن غیلان نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الرزق نے بیان کیا، انہیں معمر نے خبر دی، انہیں زہری نے، انہیں سعید بن مسیب نے اور انہیں ان کے والد مسیب بن حزن صحابی (رضی اللہ عنہ) نے کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب ہوا تو نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت وہاں ابو جہل بھی بیٹھا ہوا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا چچا! کلمہ لا الٰہ الا اللہ ایک مرتبہ کہہ دو، اللہ کی بارگاہ میں (آپ کی بخشش کے لیے) ایک یہی دلیل میرے ہاتھ آجائے گی۔ اس پر ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے کہا: اے ابو طالب! کیا عبد المطلب کے دین سے تم پھر جاؤ گے! یہ دونوں ان ہی پر زور دیتے رہے اور آخری کلمہ جو ان کی زبان سے نکلا، وہ یہ تھا کہ میں عبد المطلب کے دین پر قائم ہوں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں ان کے لیے اس وقت تک مغفرت طلب کرتا رہوں گا جب تک مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سورۃ براۃ میں یہ آیت نازل ہوئی: نبی کے لیے اور مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں ہے کہ مشرکین کے لیے دعا مغفرت کریں خواہ وہ ان کے ناطے والے ہی کیوں نہ ہوں جب کہ ان کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ دوزخی ہیں۔ اور سورۃ قصص میں یہ آیت نازل ہوئی: بیشک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے۔“ (م)

۳۔ قیس بن ابی حازمؒ[(۱)] کی حدیث جو حضرت مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ[(۲)] سے روایت کی گئی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

«يَذْهَبُ الصَّالِحُونَ الْأَوَّلُ فَالْأَوَّلُ».

"نیک لوگ یکے بعد دیگرے دنیا سے چلے جائیں گے۔"

اس حدیث کو حضرت مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ سے صرف قیس بن ابی حازمؒ نے ہی روایت کیا ہے[(۳)]۔

اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے[(۴)]۔

۴۔ معرفتِ وحدان پر معروف تصانیف:

معرفتِ وحدان کے موضوع پر امام مسلمؒ کی شہرہ آفاق کتاب "المنفردات والواحدان" ہے۔

---

(۱) عبداللہ بن قیس بن ابی حازم بَجلی کوفی: جلیل القدر تابعی ہیں، کوفہ کے محدث تھے، آپ رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرنے کے لیے روانہ ہوئے، جب مدینہ منورہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ انتقال کر چکے تھے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں، ۹۷ھ کو وفات پائی۔

(تاریخ بغداد: ۱۲/ ۴۵۲، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۴۹، الجرح والتعدیل: ۷/ ۵۷۹، الثقات: ۵/ ۳۰۷)(م)

(۲) سیدنا مرداس بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، آپ کا شمار اہل کوفہ میں ہوتا ہے، بیعۃ الرضوان میں آپ بھی شامل تھے۔ امام مسلم اور امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ ان سے صرف قیس بن ابی حازم نے روایت لی ہے۔

(الاستیعاب: ۵/ ۱۳۶، اسد الغابہ: ۵/ ۱۳۶، الاصابہ: ۶/ ۲۰)(م)

(۳) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۲۶، النکت للزرکشی: ۱/ ۲۶۲، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۵۵۳، تدریب الراوی: ۲/ ۴۳۷۔ (م)

(۴) صحیح بخاری: ۸/ ۹۲، رقم: ۶۴۳۴۔ (م)

۱۰۔ مختلف ناموں اور اوصاف کیساتھ مذکور رواۃ کی معرفت[(۱)]

۱۔ مختلف ناموں اور اوصاف کیساتھ مذکور رواۃ کی تعریف:

اس سے مراد وہ راوی ہے، جس کو مختلف ناموں، القاب اور کنیتوں سے موسوم کیا جاتا ہو، یہ ایک شخص بھی ہو سکتا ہے اور متعدد اشخاص بھی ہو سکتے ہیں[(۲)]۔

۲۔ مختلف ناموں اور اوصاف کیساتھ مذکور رواۃ کی مثال:

اس کی مثال محمد بن سائب کلبی[(۳)] ہے، جس کا نام بعض حضرات نے ابو نصر بتلایا ہے، بعض نے حماد بن سائب اور بعض نے ابو سعید ذکر کیا ہے[(۴)]۔

۳۔ مختلف ناموں اور اوصاف کیساتھ مذکور رواۃ کی معرفت کے فوائد:

محدثین کرام نے اس کے متعدد فوائد بیان کیے ہیں، جن میں چند یہ ہیں:

(الف)۔ ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس کی معرفت سے ایک شخص کے متعدد ناموں میں التباس ختم ہو جاتا ہے اور پھر اس کے متعلق متعدد رواۃ کا گمان نہیں رہتا۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۲۸-۴۳۰، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۵۱ - ۶۵۵، التقریب: ۱۷۳، اختصار علوم الحدیث:۲۰۸ - ۲۰۹، الشذا الفیاح:۲/ ۵۸۰ - ۵۸۳، المقنع في علوم الحدیث:۲/ ۵۶۲ - ۵۶۴، شرح التبصرة: ۳/ ۱۰۸ - ۱۱۴، نزھۃ النظر:۷۵ - ۷۶، فتح المغیث:۳/ ۱۹۰ - ۱۹۴، تدریب الراوي:۲/ ۲۶۸ - ۲۷۱، شرح السیوطي عَلَی ألفیۃ العراقي:۲۱۶، فتح الباقي:۳/ ۱۱۲، توضیح الأفکار:۲/ ۴۸۲، ظفر الأماني:۱۱۱.

(۲) تدریب الراوی:۲/ ۷۴۶۔(م)

(۳) محمد بن سائب بن بشر بن عمرو ابن حارث کلبی، ابو نضر، کوفہ میں پیدا ہوئے، تاریخ واخبار کا امام ہے، عبد اللہ بن سبا یہودی کے قریبی ساتھی تھے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ ان پر موت نہیں آئی، بلکہ بادلوں میں اٹھائے گئے اور دوبارہ دنیا میں آکر اسے عدل وانصاف سے بھر دیں گے، اس کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء چلے گئے، اتنے میں جبریل علیہ السلام وحی لے کر آئے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو وحی کر ڈالی، کذاب اور متروک الحدیث تھا، ابو صالح از ابن عباس کی سند سے تفسیر کو روایت کرتا ہے، حالانکہ ابو صالح اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہی ثابت نہیں۔ کوفہ میں ق ۱۴۶ھ کو وفات پائی۔ (وفیات الاعیان:۴/ ۳۰۹، میزان الاعتدال:۳/ ۵۵۶، الاعلام للزرکلی:۷/ ۱۳۳)(م)

(۴) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۲۸، ارشاد طلاب الحقائق:۲/ ۶۵۲، تدریب الراوی:۲/ ۷۴۶۔(م)

(ب)۔ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے تدلیس الشیوخ کا پردہ چاک ہو جاتا ہے[1]۔

۴۔ خطیب بغدادیؒ نے اپنے شیوخ کے سلسلہ میں اکثر یہی رویہ اختیار کیا ہے!

خطیب بغدادیؒ نے اپنے شیوخ کے سلسلہ میں اکثر یہی رویہ اختیار کیا ہے کہ وہ متعدد مقامات پر ایک شخص کے مختلف ناموں کیساتھ روایت کرتے ہیں، جس سے مخاطب کو یہ تاثر دینا مطلوب ہوتا ہے کہ آپ کے اساتذہ اور شیوخ تعداد بہت زیادہ ہے، چنانچہ وہ اپنی کتابوں میں ابو القاسم ازہری[2] سے، عبد اللہ بن ابو الفتح فارسی سے اور عبید اللہ بن عثمان صیرفی سے روایت کرتے ہیں، حالانکہ یہ سب ایک ہی شخص کے نام ہیں[3]۔

۵۔ اس موضوع پر معروف تصانیف:

(الف)۔ ایضاح الاشکال، از حافظ عبد الغنی بن سعیدؒ۔

(ب)۔ موضح اوہام الجمع والتفریق، از خطیب بغدادیؒ۔

---

(۱) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۴۲۸، ارشاد طلاب الحقائق:۲/۶۵۱، فتح المغیث:۳/۱۹۰۔(م)

(۲) عبید اللہ بن احمد بن عثمان ازہری بغدادی، ابو قاسم صیرفی ابن السوادی، عبید اللہ بن ابو الفتح:۳۵۵ھ کو پیدا ہوئے، ابو بکر قطیعی، ابو محمد بن ماسی، ابو سعید حرفی، ابن عبید عسکری اور علی بن عبد الرحمن بکائی، جیسے اساطین علم ان سے روایت کرتے ہیں، خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ آپ صدق واستقامت کیساتھ ذخیرہ احادیث کو جمع کرنے والوں میں سے ہیں، میں نے ان سے بڑی بڑی کتابوں کا سماع کیا ہے، ۴۳۵ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد:۱۰/۳۸۵، سیر اعلام النبلاء:۱۷/۵۷۸، غایۃ النہایہ:۱/۴۸۵، النجوم الزاہرہ:۵/۳۷)(م)

(۳) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۲۹، ارشاد طلاب الحقائق:۲/۶۵۴۔(م)

۱۱۔ مفرد، اسماء اور القاب کی معرفت[1]

۱۔ مفردات کا مفہوم:

مفردات سے مراد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، یا عام رواۃ اور یا علماء میں سے کسی شخص کا ایسا نام، کنیت یا لقب ہو کہ اس میں علماء اور رواۃ میں سے کوئی اس کا شریک نہ ہو۔ اکثر اوقات یہ مفردات ایسے غریب اور قلیل الاستعمال الفاظ ہوتے ہیں، جن کا زبان پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔

۲۔ مفردات کی معرفت کا فائدہ:

مفردات کی معرفت کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ آدمی غریب اور قلیل الاستعمال مفرد اسماء میں تصحیف وتحریف سے محفوظ ومامون رہتا ہے۔

۳۔ مفردات کی مثالیں:

مفردات کی بنیادی طور پر تین قسمیں ہیں: مفرد اسماء، مفرد کنی اور مفرد القاب۔ ذیل میں ہر ایک کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

الف۔ مفرد اسماء کی مثالیں:

۱۔ مفرد اسماء والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے، جیسے حضرت احمد بن عجیان[2] (بروزن سُفْیانَ، یاعُلَیَّانَ) رضی اللہ عنہ اور حضرت سندر رضی اللہ عنہ[3] (بروزن جعفر) ہیں۔

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث: ۱۷۷ - ۱۸۲، مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۳۰-۴۳۵، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۵۶ - ۶۶۷، التقریب: ۱۷۴ - ۱۷۵، اختصار علوم الحدیث: ۲۱۰ - ۲۱۴، المقنع علوم الحدیث: ۲/ ۵۶۵ - ۵۷۰، شرح التبصرۃ: ۳/ ۱۱۴، نزھۃ النظر: ۷۷ - ۷۸، فتح المغیث: ۳/ ۱۹۵ - ۱۹۸، تدریب الراوي: ۲/ ۲۷۱ - ۲۷۸، فتح الباقي: ۳/ ۱۱۲، توضیح الأفکار: ۲/ ۴۸۲ - ۴۸۳، ظفر الأماني: ۱۱۷ - ۱۱۸. (م)

[2] سیدنا احمد بن عجبان ہمدانی رضی اللہ عنہ: صحابی رسول ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد کی صورت میں آئے تھے، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتح مصر میں شریک ہوئے۔ یونس بن عبد الاعلی صدفی فرماتے ہیں کہ ان سے کوئی روایت منقول نہیں۔ (الاستیعاب: ۱/ ۱۴۴، اسد الغابہ: ۱/ ۱۷۳) (م)

[3] سیدنا سندر ابو الاسود مولی زنباع جذامی رضی اللہ عنہ: صحابی ہیں، آپ زنباع جذامی کے غلام تھے۔ (الاستیعاب: ۲/ ۶۸۸، اسد الغابہ: ۲/ ۵۶۶، الاصابہ: ۳/ ۱۶۰) (م)

۲۔ مفرد اسماء والے غیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے، جیسے اوسط بن عمرو[1] اور ضریب بن نقیر بن سمیر[2] ہیں، اوسط اور ضریب نام کے ایک ایک راوی ہیں۔

(ب)۔ مفرد کنی کی مثالیں:

ا۔ مفرد کُنٰی والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے، جیسے ابوالحمراء ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں، آپ کا نام ہلال بن حارث رضی اللہ عنہ[3] ہے۔

۲۔ مفرد کُنٰی والے غیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے، جیسے ابوالعبیدین ہے، ان کا نام معاویۃ بن سبرۃ[4] ہے۔

(ج)۔۔۔مفرد القاب:

ا۔ مفرد القاب والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے، جیسے حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

(۱) اوسط بن اسماعیل ، یاابن عامر یاابن عمرو بَجَلی، ابواسماعیل یاابوعمرو شامی: تابعی ہیں، ثقہ ہیں ، محضرمین میں سے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا، لیکن آپ سے شرف ملاقات حاصل نہیں ہوا۔ دمشق میں رہائش تھی، ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ آپ قلیل الحدیث ہیں، احمد بن صالح عجلی اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ اوسط شامی ثقہ ہیں۔ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ۷۹ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب:۱/۳۸۴، تقریب التہذیب:۱۱۶)(م)

(۲) ضریب بن نقیر بن سمیر، ابوالسلیل قیسی جریری بصری: عبداللہ بن رباح، غنیم بن قیس، ابوحیان خالد بن علاق اور ابوتمیمہ ہجیمی وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، امام یحیی بن معینؒ فرماتے ہیں کہ ضریب ثقہ ہیں، ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے، ابن سعدؒ نے بھی انہیں ثقہ کہا ہے اور ابن خلقون نے ابن نمیر سے ان کی توثیق نقل کی ہے۔ (الجرح والتعدیل:۴/۴۷۰، تہذیب التہذیب:۴/۴۵۷)(م)

(۳) سیدنا ہلال بن حارث، ابوالحمراء یاہلال بن ظفر رضی اللہ عنہ: صحابی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام اور خادم تھے۔ حمص (شام) میں رہائش پذیر تھے۔ (الاستیعاب:۴/۱۶۳۳، اسد الغابہ:۵/۳۸۱، الاصابہ:۷/۸۰)(م)

(۴) معاویہ بن سبرہ بن حصین سوائی عامری، ابوالعبیدین کوفی: تابعی ہیں، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابواسحاق سبیعی، سلمہ بن کہیل اور مسلم بطین وغیرہ روایت کرتے ہیں، ابن ابی خیثمہؒ امام ابن معینؒ سے نقل کرتے ہیں کہ معاویہ بن سبرہ ثقہ ہیں، امام ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ۹۸ھ کو وفات پائی۔ (الجرح والتعدیل:۸/۳۷۸، تہذیب التہذیب:۱۰/۲۰۶)(م)

آزاد کردہ غلام ہیں اور آپ کا نام مہران [۱] ہے۔

۲۔ مفرد القاب والے غیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے، جیسے مندل نامی شخص ہے، جس کا نام عمر بن علی غزی کوفی [۲] ہے [۳]۔

۴۔ معرفتِ مفردات پر معروف تصانیف:

اس موضوع پر مستقل تصنیف حافظ احمد بن ہارون بردیجیؒ [۴] کی "الاسماء المفردۃ" ہے، اس کے علاوہ کتب تراجم کے آخر میں رواۃ کے القاب و کنی کے متعلق بہت معلومات مل جاتی ہیں، جیسے حافظ ابن حجرؒ کی "تقریب التہذیب" ہے۔

---

[۱] سیدنا سفینہ مولی رسول اللہ ﷺ: آپ کے نام میں اکیس اقوال ہیں: بعض نے آپ کا نام مہران، بعض نے مروان، بعض نے نجران، بعض نے رومان، بعض نے ذکوان، بعض نے کیسان، بعض سلیمان اور بعض نے ایمن بتلایا ہے۔ اصل میں فارس کے تھے، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو خرید کر آزاد کر دیا تھا اور یہ شرط لگائی تھی کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے خادم ہوں گے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کیساتھ کسی سفر میں تھے، جب کسی ساتھی پر کوئی چیز بھاری ہو جاتی تو وہ مجھ پر ڈال دیتے تو رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر کہا: "ما أنت إلا سفينة!" اس کے بعد ان کا نام سفینہ پڑ گیا تھا۔ (الاستیعاب: ۴/۱۴۸۶، اسد الغابہ: ۲/۵۰۳، الاصابہ: ۳/۱۱۱)(م)

[۲] مندل عمرو بن علی عنزی، ابو عبد اللہ: ۱۰۳ھ کو پیدا ہوئے، اصل کوفہ کے تھے، رجال حدیث میں سے ہیں، امام ابن معینؒ، امام علی بن مدینیؒ اور دیگر محدثین نے ان کی تضعیف کی ہے۔ ۱۶۷ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب: ۱۰/۲۹۸، الاعلام للزرکلی: ۷/۲۹۲)(م)

[۳] مذکورہ مثالوں کے لیے دیکھئے: معرفة علوم الحديث: ۱۷۷ - ۱۸۲، مقدمة ابن الصلاح: ۴۳۰-۴۳۵، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۵۶ - ۶۶۷، التقریب: ۱۷۴ - ۱۷۵، اختصار علوم الحدیث: ۲۱۰ – ۲۱۴. (م)

[۴] احمد بن ہارون بن روح، ابو بکر بردیجی: ثقہ رجال حدیث میں ہیں، اصل میں بردیج (آذربیجان) کے تھے، بغداد میں سکونت اختیار کی۔ ابو علی صواف، ابو بکر شافعی، ابو احمد عسال، ابو محمد بن عدی اور ابو القاسم طبرانی، جیسے اساطین آپ کے تلامذہ ہیں، اور وہیں ۳۱۰ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد: ۵/۱۹۵، تذکرۃ الحفاظ: ۲/۷۴۷، سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۱۲۲، الاعلام للزرکلی: ۲۶۵)(م)

۱۲۔کنیت سے معروف ناموں کی معرفت[۱]

۱۔اس بحث کا مفہوم:

اس بحث سے مراد یہ ہے کہ ہم ان رواۃِ حدیث کے ناموں کی تحقیق و تفشیش کریں، جو اپنی کنیتوں سے مشہور و معروف ہیں، تاکہ ہمیں ہر ایک کا غیر معروف نام معلوم ہو جائے[۲]۔

۲۔اس بحث کا فائدہ:

اس بحث کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ ایک شخص کو دو نہ سمجھا جائے، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص کا غیر معروف نام مذکور ہو، اور دوسری مرتبہ اس کی معروف کنیت ذکر ہو۔ تو ناواقف شخص پر معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اسے دو الگ اشخاص سمجھتا ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ ایک ہی شخص ہوتا ہے[۳]۔

۳۔اس موضوع پر تصنیف کا طریقہ کار:

کنیتوں کے موضوع پر مصنفین کا منہج اور اسلوب یہ ہے کہ وہ کنیتوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کرتے ہیں، پھر ہر کنیت والے کا نام ذکر کرتے ہیں، مثلاً ''ہمزہ'' کے عنوان میں ابو اسحاق کا تذکرہ کرکے پھر اس کا نام بیان کرتے ہیں اور اسی طرح ''ب'' کے عنوان کے ذیل میں ''ابو بشر'' کا تذکرہ کرکے پھر اس کا نام ذکر کرتے ہیں[۴]۔

---

[۱] معرفة علوم الحديث: ۱۷۷ - ۱۹۰، مقدمة ابن الصلاح: ۴۳۵-۴۴۱، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۶۸ - ۶۷۸، التقريب: ۱۷۵ - ۱۷۷، اختصار علوم الحديث: ۲۱۵ - ۲۱۸، الشذا الفياح: ۲/ ۵۹۶ - ۶۰۴، المقنع في علوم الحديث: ۲/ ۵۷۱ - ۵۸۰، شرح التبصرة: ۳/ ۱۱۳ - ۱۲۸، نزهة النظر: ۷۵ - ۷۶، فتح المغيث: ۳/ ۱۹۹ - ۲۰۵، تدريب الراوي: ۲/ ۲۷۸ - ۲۸۶، شرح السيوطي على ألفية العراقي: ۲۱۹، فتح الباقي: ۳/ ۱۱۵ - ۱۲۳، توضيح الأفكار: ۲/ ۴۸۲ - ۴۸۳. (م)

[۲] تدریب الراوی: ۲/ ۷۶۳۔ (م)

[۳] تدریب الراوی: ۲/ ۷۶۴۔ (م)

[۴] تدریب الراوی: ۲/ ۷۶۴۔ (م)

۴۔ اصحاب الکنی کی اقسام اور مثالیں:

(الف)۔ وہ شخص جس کا نام اور کنیت ایک ہو اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور نام نہ ہو، مثلاً "ابو بلال اشعری[۱]" اس کی جو کنیت ہے وہی اس کا نام بھی ہے۔

(ب)۔ وہ شخص جو کنیت سے معروف ہو، لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا کوئی اور نام بھی ہے یا نہیں؟ مثلاً "ابو اناس"[۲] صحابی ہیں۔

(ج)۔ وہ شخص جس کی بطور لقب کنیت ہو اور اس کا نام بھی ہو، تاہم اس کی ایک دوسری کنیت بھی ہو، مثلاً "ابو تراب" سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا لقب ہے اور آپ کی کنیت ابو الحسن ہے۔[۳]

(د)۔ وہ شخص جس کی دو یا دو سے زیادہ کنیتیں ہوں، مثلاً "ابن جریج" اس کی کنیت ابو الولید بھی ہے اور ابو خالد بھی ہے۔[۴]

(ھ)۔ وہ شخص جس کی کنیت میں اختلاف ہو، مثلاً "اسامہ بن زید[۵]" ایک قول یہ ہے کہ ان کی کنیت ابو محمد ہے۔

---

[۱] ابو ہلال اشعری: امام ابو حاتم فرماتے ہیں کہ ان کا نام اور کنیت ایک ہی ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کا نام مرداس بن محمد بن حارث ابن عبد اللہ بن ابی بردۃ بن ابی موسی عبد اللہ بن قیس اشعری ہے، بعض کہتے ہیں کہ ان نام محمد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام عبد اللہ ہے۔ آپ ابو بکر نہشلی اور مالک بن انس سے روایت کرتے ہیں، امام دار قطنی نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، ۲۲۲ھ کو وفات پائی۔
(میزان الاعتدال: ۴/ ۵۰۷، سیر اعلام النبلاء: ۱۰/ ۵۸۳)(م)

[۲] سیدنا ابو اناس لیثی، ابو الدؤلی کنانی رضی اللہ عنہ: صحابی رسول ہیں، ساریہ بن زنیم کے بھتیجے ہیں، ابو الاسود دیلی کے قبیلہ سے تعلق تھا، آپ اپنے قوم کے سردار اور شاعر تھے، حکم بن عمرو نے انہیں خراسان کا امیر مقرر کیا تھا۔
(اسد الغابہ: ٦/ ١٩، الاصابہ: ٧// ٢٠)(م)

[۳] الکنی والاسماء: ۱/ ۲۱۳، الکنی والاسماء للدولابی: ۱/ ۲۱۔ (م)

[۴] الکنی والاسماء، از مسلم: ۱/ ۲۸۲، الکنی والاسماء للدولابی: ۳/ ۱۱۱۳۔ (م)

[۵] سیدنا اسامہ بن زید بن حارثہ، ابو محمد رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، مکہ مکرمہ میں ۷ قبل از ہجری پیدا ہوئے، آپ کے والد سابقون الاولون میں سے تھے، آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت محبت کرتے تھے، آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ مدینہ منورہ ہجرت کی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرماگئے تو وادی قری چلے گئے اور پھر وہاں سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دمشق ہجرت کی، ایک عرصے کے بعد دوبارہ مدینہ منورہ آئے اور وہیں ۵۴ھ کو وفات پائی۔
(الاستیعاب: ۱/ ۷۵، اسد الغابہ: ۱/ ۱۹۴، الاصابہ: ۱/ ۲۰۲، الاعلام للزرکلی: ۱/ ۲۹۱)(م)

دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ ان کی کنیت ابو خارجہ ہے۔[1]

(و)۔ وہ شخص جس کی کنیت معروف ہو، لیکن اس کے نام میں اختلاف ہو، مثلاً "ابوہریرہ" ان کے نام اوران کے والد کے نام میں تقریباً تیس اقوال ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور قول کے مطابق آپ کا نام عبدالرحمن بن صخر ہے۔[2]

(ز)۔ وہ شخص جس کے نام اور کنیت دونوں میں اختلاف ہو، مثلاً "سفینہ" ایک قول کے مطابق ان کا نام عمیر ہے، دوسرا قول ہے کہ ان کا نام صالح ہے اور تیسرا قول ہے کہ ان کا نام مہران ہے اوران کی کنیت میں بھی متعدد اقوال ہیں، ایک قول کے مطابق ابو عبدالرحمن ہے اور دوسرے قول کے مطابق ابوالبختری ہے۔

(ح)۔ وہ شخص جو اپنے نام اور کنیت دونوں سے مشہور ہو، مثلاً "سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ، امام محمد بن ادریس شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ ہے، ان حضرات میں سے ہر ایک کی کنیت ابوعبداللہ ہے اوراسی طرح امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ بھی نام اور کنیت دونوں کیساتھ مشہور ہیں۔

(ط)۔ وہ شخص جو اپنی کنیت سے مشہور ہو، تاہم اس کا نام بھی معروف ہو، مثلاً "ابو ادریس خولانیؒ" جن کا نام عائذ اللہ ہے۔

(ی)۔ وہ شخص جو اپنے نام سے مشہور ہو، تاہم اس کی کنیت بھی معروف ہو، مثلاً "طلحہ بن عبیداللہ تمیمی رضی اللہ عنہ"[3]،..

---

[1] الکنی والاسماء:۱/۳۳۱، المقتنی فی سرد الکنی للذہبی:۱/۲۵۳۔(م)

[2] الکنی والاسماء للدولابی:۱/۱۸۲، المقتنی فی سرد الکنی للذہبی:۲/۱۲۵۔(م)

[3] سیدنا طلحہ بن عبیداللہ بن عثمان تمیمی قرشی مدنی، ابو محمد رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، ۲۸ قبل از ہجری کو پیدا ہوئے، آپ سابقون الاولون اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحۃ الجود، طلحۃ الخیر اور طلحۃ الفیاض مختلف مواقع پر کہا تھا، غزوہ احد میں شریک ہوئے، آپ بڑے مالدار تجارت اور صاحب ثروت تھے، جنگ جمل میں آپ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہمنوا تھے اوراسی جنگ میں ۳۶ھ کو شہید ہوئے اور بصرہ میں سپرد خاک کیے گئے۔ (الاستیعاب:۲/۷۶۴، اسد الغابہ:۳/۸۴، الاصابہ:۳/۴۳۰، الاعلام للزرکلی:۳/۲۲۹)(م)

عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ [۱]، حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما" ان سب کی کنیت ابو محمد ہے [۲]۔

۵۔ معرفۃ الکنی پر معروف تصانیف:

معرفۃ الکنی کے موضوع پر اہل علم نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، ان مصنفین میں محدث جلیل علی بن مدینیؒ، امام مسلم اور امام نسائیؒ وغیرہ ہیں۔ تاہم ان کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "الکنی والاسماء" ہے، جو امام ابو بشر محمد بن احمد دولابیؒ (م ۳۱۰ھ) [۳] کی تصنیف لطیف ہے [۴]۔

---

(۱) سیدنا عبد الرحمن بن عوف بن عبد عوف بن عبد الحارث، ابو محمد، زہری قرشی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، مکہ مکرمہ میں ۴۴ قبل از ہجری پیدا ہوئے، سابقون الاولون اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، آپ کا نام زمانہ جاہلیت میں عبد الکعبہ یا عبد عمرو تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام عبد الرحمن رکھا دیا، غزوہ بدر، غزوہ احد اور تمام غزوات میں شریک رہے، آپ صحابہ کرام میں بڑے صاحب ثروت اور مالدار تھے، آپ سے ۶۵ احادیث مروی ہیں، مدینہ منورہ میں ۳۲ھ کو وفات پائی۔

(الاستیعاب: ۲/ ۵۴۴، اسد الغابہ: ۳/ ۴۷۵، الاصابہ: ۴/ ۲۹۰، الاعلام للزرکلی: ۳/ ۳۲۱)(م)

(۲) مذکورہ بالا تفصیل کے لیے دیکھئے: معرفۃ علوم الحدیث: ۱۷۷ - ۱۹۰، مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۳۵-۴۴۱، اِرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۶۸ - ۶۷۸، التقریب: ۱۷۵ - ۱۷۷، اختصار علوم الحدیث: ۲۱۵ - ۲۱۸.(م)

(۳) محمد بن احمد بن حماد بن سعد بن مسلم، ابو بشر انصاری رازی دولابی وراق: ۲۲۴ھ کو پیدا ہوئے، عظیم مؤرخ اور حافظ حدیث تھے، رای کے ایک قصبہ دولاب کے باشندے تھے، اسی نسبت سے دولابی کہلائے، حصول علم کے سلسلہ میں دور دراز اسفار کیے، مصر میں سکونت اختیار کی، حج بیت اللہ کے آرہے تھے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ۳۱۰ھ کو وفات پائی۔

(تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۷۶۰، سیر اعلام النبلاء: ۱۴/ ۳۰۹، النجوم الزاہرہ: ۳/ ۲۰۶، الاعلام للزرکلی: ۵/ ۳۰۸)(م)

(۴) دیکھئے: تدریب الراوی: ۲/ ۲۶۴۔(م)

۱۴۔ معرفتِ القاب [1]

۱۔ القاب کی لغوی تعریف:

لغت میں ”القاب“ لقب کی جمع ہے اور لقب سے مراد ہر وہ وصف ہے، جو موصوف کی رفعت وبلندی، یا حقارت اور پستی پر دلالت کرے، یا اس کی مدح یا مذمت کے پہلو کو اجاگر کرے [2]۔

۲۔ معرفت القاب کا مفہوم:

محدثین کرام کا اس بحث سے مقصود القاب کی تحقیق و تفتیش ہوتی ہے، تاکہ ان کی معرفت حاصل ہو اور انہیں صحیح طریقہ کیساتھ منضبط کر لیا جائے [3]۔

۳۔ معرفت القاب کا فائدہ:

معرفت القاب کے دو اہم فائدے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

(الف)۔ معرفت القاب کا ایک فائدہ یہ ہے کہ القاب کو اسماء نہ خیال کیا جائے اور وہ شخص جس کا تذکرہ کبھی نام کیساتھ ہوتا ہو، اور کبھی لقب کیساتھ ہوتا ہو، اسے غلطی سے دو مختلف شخص سمجھنے کے بجائے حقیقت کے مطابق ایک ہی شخص تصور کیا جائے۔

(ب)۔ معرفت القاب کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے اس سبب سے آگاہی ہوتی ہے، جس کے باعث وہ راوی اس لقب سے مشہور ہو گیا ہو۔ اور اس کیساتھ ساتھ اس لقب کا حقیقی

---

[1] معرفة علوم الحدیث: ۲۱۰ - ۲۱۵، مقدمة ابن الصلاح: ۴۴۵-۴۵۰، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۸۶ - ۶۹۵، التقریب: ۱۷۸ - ۱۸۰، الاقتراح: ۳۱۵ - ۳۱۷، اختصار علوم الحدیث: ۲۲۰ - ۲۲۳، الشذا الفیاح: ۲/ ۶۱۱ - ۶۱۶، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۵۸۳ - ۵۹۱، شرح التبصرة ۳/ ۱۲۸ - ۱۳۳، نزهة النظر: ۸۷، فتح المغیث: ۳/ ۲۰۶ - ۲۱۰، تدریب الراوي: ۲/ ۲۸۹ - ۲۹۶، شرح السیوطي علی ألفیة العراقي: ۲۲۲، فتح الباقي: ۳/ ۱۲۳ - ۱۲۷، توضیح الأفكار: ۲/ ۴۸۲ - ۴۸۳، ظفر الأماني: ۱۱۸. (م)

[2] توضیح الافکار: ۲/ ۲۷۹۔ (م)

[3] توضیح الافکار: ۲/ ۲۷۹۔ (م)

معنی و مفہوم معلوم ہو جاتا ہے، جو بسا اوقات اس لقب کے ظاہری معنی کے خلاف ہوتا ہے[1]۔

۴۔ معرفت القاب کی اقسام و انواع:

القاب کی دو قسمیں ہیں:

(الف)۔ وہ لقب جس کیساتھ کسی کی تعریف جائز نہ ہو اور وہ ایسا لقب ہے جس کو متعلقہ شخص پسند نہیں کرتا ہے۔

(ب)۔ وہ لقب جس کیساتھ تعریف جائز ہو اور یہ وہ لقب ہے جس کو متعلقہ شخص ناپسند نہ سمجھتا ہو[2]۔

۵۔ القاب کی مثالیں:

(الف)۔ ضال: یہ معاویہ بن عبد الکریم[3] کا لقب ہے اور ان کا یہ لقب اس لیے رکھا گیا تھا کہ وہ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ جاتے ہوئے راستہ بھول گیا تھا۔

(ب)۔ ضعیف: یہ عبد اللہ بن محمد[4] کا لقب ہے اور ان کا یہ لقب اس لیے رکھا گیا تھا کہ آپ جسمانی لحاظ سے کمزور تھے، یہ مطلب نہیں کہ آپ روایت حدیث میں کمزور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ

---

(۱) دیکھئے: تدریب الراوی: ۲/ ۷۸۰۔ (م)

(۲) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۴۵، محاسن الاصطلاح: ۵۲۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۸۶۔ (م)

(۳) معاویہ بن عبد الکریم ثقفی، ابو عبد الرحمن بصری، معروف بہ ضال: ثقہ راوی ہیں۔ عبد الرحمن بن مہدیؒ، یحیی بن یحیی نیسابوری، ابراہیم بن موسی رازیؒ، علی بن مدینیؒ اور قتیبہ بن سعیدؒ جیسے اساطین علم ان سے روایت کرتے ہیں، امام ابن معینؒ اور ابو داوٗدؒ فرماتے ہیں کہ معاویہ بن عبد الکریم ثقہ ہیں۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ان کی روایت لینے میں کوئی حرج نہیں۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ صالح الحدیث ہیں، ان کی احادیث لکھی جاتی ہیں، لیکن قابل احتجاج نہیں۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ انہیں ضال اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ یہ مکہ جاتے ہوئے راستہ بھول گیا تھا، اس لیے ان کا نام ضال پڑ گیا۔ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ۱۸۰ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال: ۲۸/ ۱۹۹، تہذیب التہذیب: ۱۰/ ۲۱۴) (م)

(۴) عبد اللہ بن محمد بن یحیی طرسوسی، ابو محمد، معروف بہ ضعیف: ثقہ راوی ہیں۔ امام ابو داوٗدؒ، امام نسائیؒ، موسی بن ہارونؒ اور ابو بکر بن ابی داوٗدؒ جیسے اساطین علم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ صدوق ہے۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن محمد ثقہ ہیں۔ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے، =

عبد الغنی بن سعید کہا کرتے تھے کہ دو جلیل القدر شخصیتیں ایسی ہیں، جس کیساتھ دو برے لقب ضال اور ضعیف چمٹے ہوئے ہیں۔[1]

(ج)۔ غُنْدَرُ: اہل حجاز کی لغت میں اس کا معنی ہے۔ بہت زیادہ شور و شغب کرنے والا۔ یہ معروف محدث امام شعبہ بن حجاجؒ کے رفیق محمد بن جعفر کا لقب ہے، اس لقب سے ملقب ہونے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ابن جریج بصرہ آئے، چنانچہ انہوں نے امام حسن بصریؒ کی روایت سے ایک حدیث بیان کی، جس پر لوگوں نے شور و غوغا کیا، لیکن محمد بن جعفرؒ نے اس پر بہت شور مچایا، جس پر ابن جریج نے انہیں کہا۔ ''او غندر! چپ رہو۔'' اس واقعہ کے بعد محمد بن جعفر کا لقب غندر پڑ گیا۔

(د)۔ غُنْجَار: یہ عیسی بن موسی تیمی[2] کا لقب ہے، یہ لقب ان کے رخسار سرخ ہونے کی وجہ سے پڑ گیا۔

(ھ)۔ صاعقہ: یہ حافظ محمد بن عبد الرحیم[3] کا لقب ہے، آپ سے امام بخاریؒ نے بھی روایت کی ہے۔ یہ لقب انہیں قوت حافظہ کی تیزی، ذہانت اور قوت حفظ و ضبط کے باعث دیا گیا تھا۔

= کثرت عبادت و ریاضت کی وجہ سے آپ بہت کمزور ہوئے تو اسی وجہ سے آپ کا نام ضعیف پڑ گیا۔ (تہذیب الکمال:۱۶/ ۹۸، تہذیب التہذیب:۶/ ۱۹)(م)

[1] تہذیب الکمال:۱۶/ ۹۹، تہذیب التہذیب:۱۰/ ۲۱۴۔ (م)

[2] عیسی بن موسی تیمی، ابو احمد بخاری ارزق، معروف بہ غنجاز: یعقوب بن اسحاق حضرمی، اسحاق بن حمزہ بن فروخ ازدی بخاری اور محمد بن سلام بیکندی وغیرہ مشاہیر ان سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا رنگ سرخ ہونے کی وجہ سے ''غنجار'' کہلائے۔ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ امام حاکمؒ کہتے ہیں کہ یہ اپنے دور کے امام تھے، بخارا میں مشہور تھے، لیکن یہ مجاہلین سے روایت کرتے ہیں، امام خلیلیؒ فرماتے ہیں کہ نیک اور ثقہ ہیں۔ امام بیہقیؒ کہتے ہیں کہ ضعیف ہیں۔ سرخس میں ۱۸۷ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال:۲۳/ ۳۷، تہذیب التہذیب:۸/ ۲۳۲)(م)

[3] محمد بن عبد الرحیم بن ابی زہیر عدوی مولی آل عمر، ابو یحیی بغدادی بزاز، معروف بہ صاعقہ: اصل میں فارس کے تھے، امام بخاریؒ، امام ابو داؤدؒ، امام ترمذیؒ اور امام نسائیؒ نے ان سے روایت کی ہے۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ صدوق ہیں۔ عبد اللہ بن احمدؒ اور امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں۔ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ امام دار قطنیؒ کہتے ہیں کہ حافظ اور ثقہ ہیں۔ ۲۵۵ھ کو وفات پائی۔ (تہذیب الکمال:۲۶/ ۶، تہذیب التہذیب:۹/ ۳۱۲)(م)

(و)۔ مُشْكُدَانَةُ: یہ عبد اللہ بن عمر اموی[۱] کا لقب ہے، یہ فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی "دانہ مشک یا خانہ مشک" ہے۔

(ز)۔ مُطَيَّن: یہ ابو جعفر حضرمی[۲] کا لقب ہے، ان کا یہ لقب اس لیے پڑ گیا کہ وہ بچپن میں بچوں کیساتھ مٹی اور پانی سے کھیلا کرتے تھے، چنانچہ بچے ان کی پیٹھ پر گارا مل دیتے تھے۔ ابو نُعیم نے ایک مرتبہ انہیں پکارا۔

يَا مُطَيَّنُ لِمَ لَا تَحْضُرُ مَجْلِسَ الْعِلْمِ؟

اے مطین! علمی مجلس میں کیوں نہیں جاتے؟![۳]

۶۔ معرفت القاب پر مشہور و معروف تصانیف:

اس موضوع پر متقدمین اور متاخرین اہل علم کی ایک بڑی جماعت نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، تاہم ان میں سب سے انفع اور مختصر کتاب حافظ ابن حجرؒ کی "نزہۃ الالباب" ہے[۴]۔

---

(۱) عبد اللہ بن عمر بن ابان بن صالح بن عمیر اموی مولی عبد الرحمن کوفی، معروف بہ مشکدانہ: امام مسلمؒ، امام ابو داوٗدؒ، امام نسائیؒ، ابو زرعہؒ اور امام ابو حاتمؒ ان سے روایت کرتے ہیں۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ صدوق ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ امام مسلمؒ نے ان سے بارہ احادیث نقل کی ہیں۔ ۲۳۹ھ کو وفات پائی۔
(تہذیب الکمال: ۱۵/ ۳۴۵، تہذیب التہذیب: ۵/ ۳۳۳)(م)

(۲) محمد بن عبد اللہ بن سلیمان حضرمی کوفی، ابو جعفر مطین: ثقہ راوی ہیں۔ ابو بکر نجاد، ابو قاسم طبرانی اور ابو بکر اسماعیلی نے ان سے روایت کی ہے۔ امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں کہ پہاڑ کی مانند ثقہ ہیں۔ ۲۹۷ھ کو وفات پائی۔
(تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۱۷۱، الاکمال: ۷/ ۲۶۱، سیر اعلام النبلاء: ۱۴/ ۴۱)(م)

(۳) مذکورہ بالا تفصیل کے لیے دیکھئے: معرفۃ علوم الحدیث: ۲۱۰ - ۲۱۵، مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۴۵-۴۵۰، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۶۸۶ - ۶۹۵، التقریب: ۱۷۸ - ۱۸۰، الاقتراح: ۳۱۵ - ۳۱۷، اختصار علوم الحدیث: ۲۲۰ - ۲۲۳. (م)

(۴) دیکھئے: تدریب الراوی: ۲/ ۷۸۰۔ (م)

۱۴۔باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب رواۃ کی معرفت(۱)

۱۔اس بحث کا مقصد:

اس بحث کا مقصد یہ ہے کہ ان رواۃ حدیث کی معرفت حاصل ہو جائے، جو اپنے باپ کے علاوہ کسی قریبی رشتہ دار جیسے ماں، یا دادیا کسی اجنبی مثلا مربی کی طرف منسوب ہو۔ اوراس کیساتھ راوی کے باپ کی معرفت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

۲۔اس بحث کا فائدہ:

اس بحث کا فائدہ یہ ہے کہ جب ایسے رواۃ کو اپنے آباء کی طرف منسوب کیا جائے تو تعدد رواۃ کا وہم پیدا نہیں ہوتا اور ایک سے زائد افراد سمجھے جانے کا اشتباہ باقی نہیں رہتا(۲)۔

۳۔غیر آباء کی طرف منسوب رواۃ کی اقسام وانواع:

محدثین کرام نے اس کی متعدد اقسام کی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(الف)۔ وہ شخص جو اپنی ماں کی طرف منسوب ہو، مثلا: معاذ بن عفراء(۳)، معوذ بن..........

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۷۴-۴۷۷، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۵۱ - ۷۵۷، التقریب: ۱۹۰ - ۱۹۱، المنھل الروي: ۱۳۰، اختصار علوم الحدیث: ۲۳۱ - ۲۳۴، الشذا الفیاح: ۲/ ۶۹۵ - ۶۹۹، المقنع في علوم الحدیث: ۲/ ۶۲۶ - ۶۲۹، شرح التبصرۃ: ۳/ ۲۱۹ - ۲۲۴، نزھۃ النظر: ۶۷، فتح المغیث: ۳/ ۲۶۶ - ۲۶۹، تدریب الراوي: ۲/ ۳۳۶ - ۳۳۹، شرح السیوطي علی ألفیۃ العراقي: ۲۵۵، فتح الباقي: ۳/ ۲۲۴ - ۲۲۷، توضیح الأفکار: ۲/ ۴۹۵، ظفر الأماني: ۱۱۲ - ۱۱۳. (م)

(۲) تدریب الراوي: ۲/ ۳۳۶۔ (م)

(۳) سیدنا مُعاذ بن حارث بن رفاعہ بن حارث بن سواد بن مالک بن غنم انصاری خزرجی، معروف بہ ابن عفراء رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، عفراء آپ کی والدہ کا نام ہے اور اسی نام سے مشہور ہوئے،، آپ خزرج اور اوس کے ان چھ آدمیوں میں شامل تھے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ عقبہ اولی میں ملاقات میں کی۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے اورابو جہل کو واصل کیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ غزوہ بدر میں زخمی ہوئے جس کی وجہ سے بعد میں شہید ہوئے۔

(الاستیعاب: ۳/۱۴۰۸، اسد الغابہ: ۵/۱۹۰، الاصابہ: ۶/۱۱۰، سیر اعلام النبلاء: ۲/۳۵۸)(م)

عفراء[1] اور عوذ بن عفراء[2] ہیں، یہ تینوں بھائی ماں کی طرف منسوب ہیں، جب کہ ان کے والد کا نام حارث ہے۔ اسی طرح بلال بن حمامہ ہیں، ان کے والد کا نام رباح ہے اور حمامہ ان کی والدہ کا نام ہے اور اسی طرح والدہ کی طرف محمد بن حنفیہ[3] بھی منسوب ہیں، جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں۔

(ب)۔ وہ شخص جو اپنی دادی کی طرف منسوب ہو، خواہ دادی حقیقی (بلاواسطہ) ہو، یا غیر حقیقی (بالواسطہ) ہو، جیسے یعلی بن منیہ رضی اللہ عنہ[4] ہے، ان کے والد کا نام امیہ ہے، جب کہ منیہ ان کی حقیقی

---

[1] سیدنا معوذ بن حارث بن رفاعہ بن حارث بن سواد بن مالک بن غنم انصاری خزرجی، معروف بہ ابن عفراء رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، عفراء آپ کی والدہ کا نام ہے اور اسی نام سے مشہور ہوئے، غزوہ بدر میں شریک ہوئے اور ابو جہل کو واصل کیا اور پھر شہید ہوئے۔

(الاستیعاب: ۴/ ۱۴۴۲، اسد الغابہ: ۵/ ۲۳۱، سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۳۵۹)(م)

[2] سیدنا عوذ بن حارث بن رفاعہ بن حارث بن سواد بن مالک بن غنم انصاری خزرجی، معروف بہ ابن عفراء رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، عفراء آپ کی والدہ کا نام ہے اور اسی نام سے مشہور ہوئے، آپ کا نام عوف بھی بتلایا گیا ہے۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے اور ابو جہل کو واصل کیا اور پھر شہید ہوئے۔

(الاستیعاب: ۳/ ۱۲۴۷، اسد الغابہ: ۴/ ۲۹۶، الاصابہ: ۴/ ۶۱۳)(م)

[3] سیدنا محمد بن علی بن ابی طالب ہاشمی قرشی، ابو القاسم، معروف بہ ابن الحنفیہ رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، مدینہ منورہ میں ۲۱ھ کو پیدا ہوئے، آپ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی ہیں، آپ کے والدہ کا نام خولۃ بنت جعفر حنفیہ ہے، ان ہی طرف آپ کی نسبت کی جاتی ہے، بہت بڑے عالم اور بہادر و شجاع تھے، کیسانیہ نامی ایک فرقہ کا اعتقاد یہ ہے کہ آپ کو موت نہیں آتی اور رضوی میں ابھی تک مقیم ہیں۔ مدینہ منورہ ہی میں ۸۱ھ کو وفات پائی۔

(سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۱۱۰، الاعلام للزرکلی: ۶/ ۲۷۰)(م)

[4] سیدنا یعلی بن امیہ بن ابی عبیدہ بن ہمام تمیمی حنظلی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، آپ بہت بڑے مالدار اور سخی تھے، مکہ مکرمہ کے باشندے تھے، فتح مکہ کے بعد اسلام لائے، طائف، حنین اور غزوہ تبوک میں شریک ہوئے، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں آپ کو حلوان کا عامل مقرر کیا تھا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں انہیں نجران کا عامل مقرر کیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کو یمن کا عامل مقرر کیا تھا۔ آپ صنعاء میں مقیم ہوئے۔ ان کی مرویات کی تعداد ۲۸ ہے۔ جنگ جمل میں پیش پیش رہے۔ ۳۷ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب: ۴/ ۱۵۸۵، اسد الغابہ: ۵/ ۴۸۵، الاصابہ: ۶/ ۵۳۸، سیر اعلام النبلاء: ۳/ ۱۰۰، الاعلام للزرکلی: ۸/ ۲۰۴)(م)

دادی کا نام ہے۔ اسی طرح بشیر بن خاصیہ [1] رضی اللہ عنہ ہے، ان کے والد کا نام معبد ہے، جب کہ خصاصیہ ان کی تیسری پشت کی دادی ہے۔

(ج)۔ وہ شخص جو اپنے دادا کی طرف منسوب ہو، جیسے سیدنا ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ [2] ہیں، ان کا اصل نام عامر بن عبداللہ بن جراح ہے اور اسی طرح امام احمد بن حنبل [3] ہے، آپ کا پورا نام احمد بن محمد بن حنبل ہے۔

(د)۔ وہ شخص جو کسی وجہ سے اجنبی کی طرف منسوب ہو، جیسے مقداد بن عمرو کندی [4] ہے، جن کو مقداد بن اسود بھی کہا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ اسود بن عبد یغوث کی پرورش میں تھے اور اس نے

---

[1] سیدنا بشیر بن یزید بن معبد بن ضباب بن سبیع: بعض ان کا نسب یوں بتلایا ہے: بشیر بن معبد بن شراحیل بن سبیع بن ضباری بن سدوس بن شیبان رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں آپ کا نام زحم تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشیر رکھا دیا۔ (الاستیعاب: ۱/ ۱۷۳، اسد الغابہ: ۱/ ۳۹۶، الاصابہ: ۱/ ۴۴۴)(م)

[2] سیدنا عامر بن عبداللہ بن جراح بن ہلال فہری قرشی رضی اللہ عنہ: مکہ مکرمہ میں ۴۰ قبل از ہجری پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابی ہیں، سابقون الاولون اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، تمام غزوات میں شریک ہوئے، آپ امین ہذہ الامۃ اور فاتح شام جیسے القاب سے نوازے گئے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آپ نے شام، فرات اور شمالی ایشاء کو فتح کیا۔ اور سراحدت پر افواج تعین کیے۔ آپ سے ۱۴ احادیث مروی ہیں۔ غور بیسان میں ۱۸ھ کو وفات پائی۔
(الاستیعاب: ۲/ ۷۹۲، اسد الغابہ: ۳/ ۱۲۵، الاصابہ: ۳/ ۴۷۵، الاعلام للزرکلی: ۳/ ۲۵۲)(م)

[3] احمد بن محمد بن حنبل، ابو عبداللہ شیبانی وائلی: بغداد میں ۱۶۴ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محدث، مفسر، مؤرخ، فقیہ اور حافظ حدیث تھے، حصول علم کے سلسلے میں کوفہ، بصرہ، مکہ معظمہ، یمن، شام، ثغور، مغرب، جزائر، عراق، فارس، خراسان اور اطراف عالم کے دور دراز علمی اسفار کیے، خلق قرآن کے مسئلہ میں بڑے مصائب و تکالیف سہے۔ مسند احمد آپ کا عظیم علمی کارنامہ ہے۔ بغداد ہی میں ۲۴۱ھ کو وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد: ۷/ ۳۵۴، تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۱۵، سیر اعلام النبلاء: ۱۱/ ۱۷۷، النجوم الزاہرہ: ۲/ ۳۰۴، شذرات الذہب: ۲/ ۹۶، الاعلام للزرکلی: ۱/ ۲۰۳)(م)

[4] سیدنا مقداد بن عمرو بن ثعلبہ بن مالک بن ربیعہ بن ثمامہ، معروف بہ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، آپ چونکہ اسود بن عبد یغوث زہری کے پرورش میں تھے اسی وجہ سے آپ مقداد بن اسود کے نام سے مشہور ہوئے، ان کو مقداد کندی بھی کہا جاتا ہے، آپ سابقون الاولون میں سے تھے، حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پھر مکہ معظمہ واپس آئے، تمام غزوات میں شریک ہوئے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔
(الاستیعاب: ۴/ ۱۴۸۰، اسد الغابہ: ۵/ ۲۴۲، سیر اعلام النبلاء: ۱/ ۳۸۵)(م)

انہیں اپنا متبنی بنایا تھا[1]۔

۴۔اس فن پر مشہور و معروف تصانیف:

اس موضوع پر مشتمل کسی خاص کتاب کا مجھے علم نہیں، تاہم کتب تراجم میں عام طور پر ہر راوی کا نسب بیان کیا جاتا ہے، بالخصوص تراجم رجال کی ضخیم کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں۔

---

(۱) مذکورہ بالا تفصیل کے لیے دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۷۴-۴۷۷، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۵۱ - ۷۵۷، التقریب: ۱۹۰ - ۱۹۱، المنهل الروي: ۱۳۰، اختصار علوم الحدیث: ۲۳۱ - ۲۳۴۔(م)

۱۵۔خلافِ ظاہر نسبتوں کی معرفت[۱]

ا۔ تمہید:

رواۃ حدیث کی ایک ایسی تعداد بھی ہے، جس کی نسبت کسی مقام یا غزوہ یا قبیلہ یا پیشہ یا قبیلہ یا پیشہ وہنر کی طرف ہوئی ہے، لیکن بالعموم اس سے وہ نسبت مراد نہیں ہوتی، جس کی طرف بظاہر ذہن منتقل ہوتا ہے، بلکہ درحقیقت یہ نسبت بعض عوارض کی وجہ سے قائم ہوجاتی ہے، مثلاً کوئی شخص کسی خاص جگہ پر سکونت پذیر ہوگیا، یا کسی خاص صفت یا پیشہ کے لوگوں کیساتھ ہم نشینی اختیار کی ہو، یا کوئی اور وجہ پیش آئی ہو، جس کی بناء پر اس کی طرف نسبت کی گئی ہو[۲]۔

۲۔اس بحث کا فائدہ:

مذکورہ بحث کا فائدہ یہ ہے کہ یہ بات واضح طور پر معلوم ہوجائے کہ یہ نسبتیں حقیقی نہیں ہیں، بلکہ محض بعض عوارض کی وجہ سے ان افراد کی طرف منسوب ہیں، نیز اس سے اس عارضہ اور سبب کی معرفت بھی حاصل ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے یہ راوی اس نسبت کی طرف منسوب ہوا ہے[۳]۔

۳۔خلافِ ظاہر نسبتوں کی چند مثالیں:

---

(۱) مقدمة ابن الصلاح:۴۷۷-۴۷۹، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۷۵۸ - ۷۶۱، التقریب:۱۹۱ - ۱۹۲، المنهل الروي:۱۳۱، اختصار علوم الحدیث:۲۳۴ - ۲۳۶، الشذا الفیاح:۲/ ۷۰۰ - ۷۰۲، المقنع في علوم الحدیث:۲/ ۶۳۰ - ۶۳۱، شرح التبصرة:۳/ ۲۲۴ - ۲۲۸، نزهة النظر:۶۷، فتح المغیث:۳/ ۲۷۰ - ۲۷۳، تدریب الراوي:۲/ ۳۴۰ - ۳۴۱، شرح السیوطي علی ألفیة العراقي:۲۵۷، فتح الباقي:۳/ ۲۲۷ - ۲۲۹، توضیح الأفکار:۲/ ۴۹۶ - ۴۹۷، ظفر الأماني:۱۱۴.(م)

(۲) تدریب الراوي:۲/ ۳۴۰ – ۳۴۱.(م)

(۳) توضیح الأفکار:۲/ ۴۹۶۔(م)

(الف)۔ ابو مسعود بدری[1]: آپ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے، بلکہ ایک موقع پر میدانِ بدر میں اترے تھے، پھر اس کی طرف منسوب ہو کر بدری کہلانے لگے۔

(ب)۔ یزید فقیر[2]: یہ فقیر (فقر کی طرف منسوب، یعنی تنگ دست) نہیں تھے، بلکہ ان کی ریڑھ کی ہڈی (فقار) میں چوٹ لگنے کی وجہ سے فقیر کہلاتے تھے۔

(ج)۔ خالد حذاء[3]: آپ "حذاء" موچی نہ تھے، بلکہ موچیوں کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے، تو اس ہم نشینی کی وجہ سے "حذاء" کہلانے لگے[4]۔

۴۔ خلافِ ظاہر نسبتوں پر معروف تصانیف:

---

(۱) سیدنا عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ بن اسیرہ بن عطیہ خزرجی انصاری، معروف بہ ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی ہیں، آپ کی غزوہ بدر میں شرکت کے متعلق اختلاف ہے، اکثر اہل علم کی رائے کہ آپ غزوہ بدر میں شریک نہی ہوئے، بلکہ ایک مرتبہ وہاں اترے تو بدری کہلائے، امام بخاریؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آپ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ ۴۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔ آپ کے جائے وفات میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ کوفہ میں وفات پائی، بعض کا خیال ہے کہ مدینہ میں فوت ہوئے۔

(الاستیعاب: ۳/ ۱۰۷۴، اسد الغابہ: ۴/ ۵۵، الاصابہ: ۴/ ۴۳۲) (م)

(۲) یزید بن صہیب فقیر، ابو عثمان کوفی: تابعی ثقہ ہیں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام یحیی بن معینؒ، امام ابو زرعہؒ اور امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں۔ امام ابو حاتمؒ اور ابن خراشؒ فرماتے ہیں کہ صدوق ہے، ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔

(تہذیب الکمال: ۳۲/ ۱۶۳، تہذیب التہذیب: ۱۱/ ۳۳۸) (م)

(۳) خالد بن مہران حذاء، ابو منازل بصری مولی قریش: تابعی ہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا تھا۔ سفیان ثوریؒ، شعبۃ بن حجاجؒ، ابن علیہؒ، سعید بن ابی عروبہؒ اور اعمشؒ جیسے اساطین علم آپ سے روایت کرتے ہیں، امام ابن معینؒ اور امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں۔ امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ ان کی احادیث لکھی جاتی ہیں، لیکن قابل احتجاج نہیں۔ ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ خالد ثقہ اور کثیر الحدیث ہیں۔ ۱۴۱ھ کو وفات پائی۔

(تہذیب الکمال: ۸/ ۱۷۷، تہذیب التہذیب: ۳/ ۱۲۱) (م)

(۴) مذکورہ مثالوں کے لیے دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۷۷-۴۷۹، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۵۸ - ۷۶۱، التقریب: ۱۹۱ - ۱۹۲، المنہل الروي: ۱۳۱، اختصار علوم الحدیث: ۲۳۴ - ۲۳۶. (م)

علامہ عبد الکریم سمعانیؒ(۱) کی شہرہ آفاق کتاب ”الانساب“ اس باب میں انتہائی اہم ماخذ ہے، علامہ ابن اثیرؒ نے اس کتاب کی ”اللباب فی تہذیب الانساب“ کے نام سے تلخیص کی ہے، پھر علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اس ملخص کا ”لب اللباب“ کے نام سے خلاصہ لکھا ہے۔

(۱) عبد الکریم بن محمد بن منصور تمیمی سمعانی مروزی، ابو سعد: مرو میں ۵۰۶ھ کو پیدا ہوئے، عظیم مؤرخ، نسابہ، رحالہ اور حافظ حدیث تھے، حصول علم کے سلسلے میں دور دراز علمی اسفار کیے۔ سمعان کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے سمعانی کہلائے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، الانساب آپ کی عظیم علمی کارنامہ ہے۔ مرو ہی میں ۵۶۲ھ کو وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۴/ ۱۳۱۶، سیر اعلام النبلاء: ۲۰/ ۴۵۶، الاعلام للزرکلی: ۴/ ۵۵) (م)

۱۶۔ تواریخ رواۃ کی معرفت[1]

ا۔ تواریخ کی تعریف:

(الف)۔ تواریخ کی لغوی تعریف:

تواریخ لغت میں دراصل ''تاریخ'' کی جمع ہے، جو ''أرخ'' کا مصدر ہے، پھر سہولت کے لیے ہمزہ کو الف سے بدل دیا گیا ہے[2]۔

(ب)۔ تواریخ کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں اس وقت کی تعیین اور بیان کو کہتے ہیں، جس کی مدد سے اس میں پیش آنے والے احوال مثلاً ولادت، وفات اور واقعات کو منضبط کیا جاتا ہے[3]۔

۲۔ یہاں تاریخ سے کیا مراد ہے؟

یہاں تاریخ کا مقصد اور مفہوم یہ ہے کہ رُواۃ کی تاریخ ولادت، شیوخ سے احادیث کی سماع، مختلف بلادوامصار میں آمدورفت، علمی اسفاراوران کی تاریخ وفیات وغیرہ معلوم کرنا ہے[4]۔

۳۔ معرفت تواریخ کی اہمیت وفوائد:

علوم الحدیث کا یہ ایک اہم فن ہے، محدث جلیل سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں۔

---

(۱) معرفة علوم الحديث: ۲۰۲ - ۲۱۰، مقدمة ابن الصلاح: ۴۸۴-۴۹۰، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۶۹ - ۷۸۱، التقريب: ۱۹۴ - ۱۹۷، المنهل الروي ۱۴۵، اختصار علوم الحديث: ۲۳۷ - ۲۴۲، الشذا الفياح: ۲/ ۷۱۳ - ۷۳۸، المقنع في علوم الحديث: ۲/ ۶۴۴ - ۶۵۶، شرح التبصرة والتذكرة: ۳/ ۲۳۷، فتح المغيث: ۳/ ۲۸۰ - ۳۱۳، تدريب الراوي: ۲/ ۳۴۹ - ۳۶۷، شرح ألفية السيوطي على ألفية العراقي: ۲۶۲، فتح الباقي: ۳/ ۲۳۴ - ۲۵۹، توضيح الأفكار: ۲/ ۴۹۸ - ۵۰۰، ظفر الأماني: ۱۰۴.(م)

(۲) تاج العروس: ۷/ ۲۲۵، المعجم الوسيط: ۱/ ۱۳۔(م)

(۳) علوم الحديث: ۳۸۰۔(ط)

(۴) تدريب الراوي: ۲/ ۳۴۹۔(م)

"لَمَّا اسْتَعْمَلَ الرُّوَاةُ الْكَذِبَ اسْتَعْمَلْنَا لَهُمُ التَّارِيخَ."[۱]

"جب ایسے حالات سامنے آئے کہ راویوں نے کذب بیانی کا رویہ اختیار کیا تو ہم نے بھی تاریخ کا اہتمام شروع کر دیا۔"

تاریخ سے آگاہی اور واقفیت کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سند کی اتصال سند کی اتصال اور انقطاع کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگوں نے بعض لوگوں نے بعض حضرات سے روایت کرنے کا دعوی کیا جب تاریخ روایت پر غور کیا گیا تو معلوم غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے ان حضرات کی وفات کے کئی سال بعد روایات بیان کی ہیں[۲]۔

۴۔ اہم تاریخی مثالیں:

(الف)۔ رسول اللہ ﷺ اورآپ کے دونوں رفقاء سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عمروں کے متعلق صحیح روایت یہی ہے کہ تریسٹھ برس تھی۔

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات بروز دوشنبہ چاشت کے وقت ۱۲ ربیع الاول (۱۱ھ) کو ہوئی۔

۲۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات جمادی الاولی (۱۳ھ) میں ہوئی۔

۳۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات ذی الحجہ (۲۳ھ) میں ہوئی۔

۴۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ذی الحجہ (۳۵ھ) میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۲ سال تھی اور ایک قول کے مطابق ۹۰ سال تھی۔

۵۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی وفات شہادت رمضان (۴۰ھ) میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۶۳ برس تھی[۳]۔

(ب)۔ سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ[۴] ....

---

(۱) الکامل فی ضعفاء الرجال: ۱/ ۱۶۹، الکفایۃ فی علم الروایۃ: ۱۹۳، تدریب الراوي: ۲/ ۳۴۹۔(م)

(۲) تدریب الراوي: ۲/ ۳۴۹۔(م)

(۳) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۸۶۔(م)

(۴) سیدنا حکیم بن حزام بن خویلد بن اسد بن عبد العزی، ابو خالد قریشی رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی رسول ہیں، آپ ام المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے، رسول اللہ ﷺ کے بعثت سے پہلے اور بعد میں دوست تھے، آپ قریش =

اور سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ[1] دو ایسے جلیل القدر صحابی ہیں جنھوں نے اپنی عمر کے ساٹھ برس زمانہ جاہلیت میں گزارے اور ساٹھ برس زمانہ اسلام میں گزارے اور (۵۴ھ) میں مدینہ منورہ میں ان کی وفات ہوئی[2]۔

(ج)۔ ائمہ متبوعین کی تاریخ ولادت ووفات[3]:

نام	تاریخ ولادت	تاریخ وفات
امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ	۸۰ھ	۱۵۰ھ
امام انس بن مالکؒ	۹۳ھ	۱۷۹ھ
امام محمد بن ادریس شافعیؒ	۱۵۰ھ	۲۰۴ھ
امام احمد بن حنبلؒ	۱۶۴ھ	۲۴۱ھ

(د)۔ حدیث کی معتمد کتابوں کے مؤلفین[4]:

نام	تاریخ ولادت	تاریخ وفات
امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ	۱۹۴ھ	۲۵۶ھ
امام مسلم بن حجاج نیشاپوریؒ	۲۰۴ھ	۲۶۱ھ
امام ابو داؤد سجستانیؒ	۲۰۲ھ	۲۷۵ھ

= کے جاہلیت اور اسلام میں سردار تھے، فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے، آپ کی مرویات ۴۰ ہیں، مدینہ منورہ میں ۵۴ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:۱/۳۶۲، اسد الغابہ:۲/۵۸، الاصابہ:۲/۹۷) (م)

(۱) سیدنا حسان بن ثابت بن منذر خزرجی انصاری، ابو الولید رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی اور شاعر رسول ہیں۔ آپ تقریباً ساٹھ سال جاہلیت میں اور اسی طرح ساٹھ سال اسلام میں گزارے۔ آپ مدینہ منورہ کے باشندے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدح میں اشعار کہا کرتے تھے، مدینہ منورہ میں ۵۶ھ کو وفات پائی۔ (الاستیعاب:۱/۳۴۱، اسد الغابہ:۳/۶، الاصابہ: سیر اعلام النبلاء:۲/۵۱۲)(م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۸۷۔(م)

(۳) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۸۷-۴۸۸۔(م)

(۴) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۸۸۔(م)

امام ابو عیسی ترمذیؒ[۱]	۲۰۹ھ	۲۷۹ھ
امام احمد بن شعیب نسائیؒ	۲۱۵ھ	۳۰۳ھ
امام ابن ماجہ قزوینیؒ	۲۰۷ھ	۲۷۵ھ

۵۔ معرفت تواریخ پر معروف تصانیف:

(الف)۔ معرفت تواریخ کے موضوع پر مشہور کتاب ''کتاب الوفیات'' ہے، یہ محدثِ دمشق ابن زبیر محمد بن عبید اللہ ربعیؒ[۲] (م ۳۷۹ھ) کی تصنیف لطیف ہے، جو انہوں نے سنین کے اعتبار سے مرتب کی ہے۔

(ب)۔ کتاب الوفیات پر بعض اہل علم علامہ کتانیؒ، علاقہ اکفانیؒ اور علامہ عراقیؒ وغیرہ نے ذیول اور حواشی لکھی ہیں۔

---

(۱) امام ترمذیؒ کی سن ولادت میں اختلاف ہے، اکثر مؤرخین نے آپ کی سن ولادت کی تعیین نہیں کی، بلکہ صرف اتنا ذکر کیا ہے کہ آپ تیسری صدی ہجری کے عشرے میں پیدا ہوئے، تاہم بعض مؤرخین نے　=
= آپ کی سن ولادت ۲۰۹ ہجری بیان کی ہے، شمائل ترمذی کے شارح محمد بن قاسم جسوس کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ شمائل ترمذی: ۱/۴۔ (ط)

(۲) عبد اللہ بن احمد بن ربیعہ بن سلیمان بن زَبر ربعی بغدادی، ابو محمد: ۲۲۵ھ کو پیدا ہوئے، اپنے دور کے عظیم محدث، فقیہ اور جید عالم تھے، عرصہ دراز تک دمشق کے قاضی رہے، امام دار قطنیؒ، احمد بن قاضی میانجی، عمر بن شاہین اور محمد بن احمد بن عثمان جیسے اساطین علم ان سے روایت کرتے ہیں، خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ غیر ثقہ ہیں۔ مصر میں ۳۷۹ھ کو وفات پائی۔ (تاریخ بغداد: ۹/ ۳۸۶، سیر اعلام النبلاء: ۱۵/ ۳۱۵، شذرات الذہب: ۲/ ۳۲۳)(م)

۱۷۔ مختلط (اختلاط کا شکار ہونے والے) ثقہ رواۃ کی معرفت[۱]

۱۔ اختلاط کی تعریف:

(الف)۔ اختلاط کی لغوی تعریف:

لغت میں اختلاط فساد عقل اور دماغی فتور کو کہتے ہیں، ”اختلط فلان“ کا معنی ہے۔ فلان کی عقل فساد پذیر ہوگئی۔ جیسا کہ قاموس میں ہے[۲]۔

(ب)۔ اختلاط کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں اختلاط فسادِ عقل یا قول و فعل میں عدم توازن کو کہتے ہیں جو بڑھاپے اور پیرانہ سالی یا بینائی زائل ہونے یا کتابیں وغیرہ جل کر ضائع ہو جانے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے[۳]۔

۲۔ مختلطین کی اقسام و انواع:

(الف)۔ بڑھاپے اور پیرانہ سالی کی وجہ سے اختلاط عارض ہو، جیسے عطاء بن سائب ثقفی کوفیؒ[۴]۔

(ب)۔ بینائی زائل ہونے کی وجہ سے اختلاط عارض ہو، جیسے عبد الرزاق بن ہمام صنعانیؒ ہیں، آپ کو نابینا ہونے کے بعد حدیث کی تلقین کی جاتی تھی، یعنی حدیث بیان کرتے انہیں لقمہ دیا جاتا تو آپ اسے قبول کر لیتے[۵]۔

---

(۱) مقدمة ابن الصلاح:۴۹۳-۴۹۹، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۴۸۷ - ۴۹۶، التقريب:۱۹۸، المنهل الروي: ۱۳۷، اختصار علوم الحديث:۲۴۴ - ۲۴۵، الشذا الفياح:/ ۷۴۴ - ۷۸۰، المقنع في علوم الحديث:۲/ ۶۶۲ - ۶۶۷، شرح التبصرة:۳/ ۲۸۳، فتح المغيث:۳/ ۳۳۱ - ۳۵۰، تدريب الراوي:۲/ ۳۷۱ - ۳۸۰، شرح السيوطي عَلَى ألفية العراقي:۲۷۳، فتح الباقي: ۳/ ۲۶۳ - ۲۷۴، توضيح الأفكار:۲/ ۵۰۲ - ۵۰۳.(م)

(۲) قاموس:۲/ ۹۲، لسان العرب:۷/ ۲۹۴، تاج العروس:۵/ ۱۳۴۔(م)

(۳) دیکھئے: علوم الحديث، ص۳۹۱، والتقريب مع التدريب، ۲/ ۳۷۲.(ط)

(۴) مقدمة ابن الصلاح:۴۹۴، ارشاد طلاب الحقائق:۲/ ۴۸۸، تدریب الراوی:۲/ ۸۹۶۔(م)

(۵) مقدمة ابن الصلاح:۴۹۸، ارشاد طلاب الحقائق:۲/ ۴۹۷، التقييد والايضاح:۴۵۹، تدریب الراوی:۲/ ۹۰۴۔

(ج)۔ دیگر اسباب کی وجہ سے اختلاط عارض ہو، جیسے عبد اللہ بن لہیعہ مصری اپنا کتب خانہ جل جانے کے باعث دماغی توازن کھو بیٹھے تھے[(۱)]۔

۳۔ مختلط کی روایت کا حکم:

(الف)۔ اختلاط سے پہلے جو روایات ہیں، انہیں قبول کیا جائے گا۔

(ب)۔ اختلاط کے بعد جو روایات ہیں، انہیں قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح وہ روایت بھی ناقابل قبول ہو گی، جس کے متعلق یہ شک پیدا ہو جائے کہ وہ اختلاط سے پہلے کی ہے یا بعد کی ہے[(۲)]۔

۴۔ معرفتِ مختلطین کی اہمیت اور فوائد:

علوم الحدیث کا یہ فن بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے، اس کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ

---

(۱) تہذیب الکمال: ۴/ ۲۵۲، فتح المغیث: ۴/ ۳۸۲، منہج النقد فی علوم الحدیث: ۱۳۶۔ (م)

(۲) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۹۴، التبصرۃ والتذکرۃ: ۳/ ۲۶۴، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۵۶۰، الاغتیاط: ۳۶۶، فتح المغیث: ۳/ ۳۳۱۔ (م)

مذکورہ رائے حافظ ابن الصلاحؒ (م ۶۴۳ھ) اوران کے متبعین کی ہے، تاہم حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے اپنے رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔

"والحُكْمُ فيهِ أَنَّ ما حَدَّث بهِ قَبْل الاختلاطِ إذا تَمَيَّز قُبِل، وإِذا لم يَتَمَيَّزْ تُوُقِّفَ فيهِ، وكذا مِن اشتَبَهَ الأمرُ فيهِ، وإنما يُعرف ذلك باعتبارِ الآخذين عنه". (نزہۃ النظر: ۱۲۹)

"اس کے متعلق فیصلہ یہ ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ حدیث اختلاط سے پہلے کی ہے تو قبول کی جائے گی اور اگر یہ تمیز نہ ہو سکے تو توقف کیا جائے گا، یہی حیثیت اس حدیث کی ہے جس کا معاملہ مشتبہ ہو۔ اس کا دارومدار اخذ کرنے والوں کی حیثیت ہو گا۔"

حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کے نزدیک عدم تمیز کی صورت میں توقف ہے جب حافظ ابن الصلاحؒ کے ہاں عدم قبولیت واضح ہے۔ ماضی قریب کے مشہور محقق علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے مختلط کی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے سماع قبل الاختلاط کو صحیح قرار دیا ہے۔ سعید بن ایاس جریری کے حوالے سے مختلف نقاد حدیث کے اقوال نقل کیے ہیں، آخر میں فرماتے ہیں۔ =

اس کے ذریعے ثقہ رواۃ کی ان روایات کا پتہ لگایا جاتا ہے، جو انہوں نے اختلاط کے شکار ہونے کے بعد بیان کی ہوں، تاکہ انہیں رد کیا جاسکے اور غیر مقبول ٹھہرایا جاسکے۔

۵۔ کیا امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے مختلطین سے صحیحین میں روایات لی ہیں؟

سوال یہ ہے کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ان ثقہ راویوں سے احادیث نقل کی ہیں، جو اختلاط کے شکار ہوئے ہوں؟ جی ہاں! امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اپنی اپنی صحیح میں ان ثقہ راویوں سے روایات نقل کی ہیں، جن کو اختلاط لاحق ہوا ہو، لیکن وہ روایات نقل کی ہیں، جو اختلاط سے پہلے کی ہیں [1]۔

٦۔ مختلطین کے موضوع پر معروف تصانیف:

اس موضوع پر علامہ علائیؒ، علامہ حازمی اور دیگر اہل علم نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، تاہم ان میں علامہ ابراہیم ابن محمد سبط عجمیؒ (م ۸۴۱ھ) کی کتاب "الاعتبار بمن رمی بالاختلاط" مشہور و معروف ہے [2]۔

= "قلت: هذه فائدة عجيبة فلتحفظ! وفيه دلالة على أن التردد فى كون السماع قبل الاختلاط أو بعده لايستلزم ضعف الحديث۔" (قواعد فی علوم الحدیث:۴۱۰)

"میں کہتا ہوں کہ یہ عجیب نکتہ ہے اسے یاد رکھنا چاہیے اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ سماع کے بارے میں قبل اختلاط اور بعد اختلاط میں تردد حدیث کے ضعیف ہونے کو لازم نہیں کرتا۔"

اس پر مزید اپنی رائے اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"قلت: فرواية الكبار من أصحاب المختلط محمولة على الصحة۔" (قواعد فی علوم الحدیث:۴۱۱)

"میں کہتا ہو کہ کبار محدثین کا مختلط شیوخ سے روایت کرنا حدیث کی صحت پر محمول ہو گا۔" (م)

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۴۹۹، ارشاد طلاب الحقائق:۲/۷۹۶، التقیید والایضاح:۴۴۲، المقنع فی علوم الحدیث:۲/۵۶۴، مقدمۃ فتح الباری:۴۰۶، فتح المغیث:۳/۳۳۲۔ (م)

(۲) تدریب الراوی:۲/۸۹۵۔ (م)

۱۸۔ علماء اور رواۃ کے طبقات کی معرفت[۱]

۱۔ طبقہ کی تعریف:

(الف)۔ طبقہ کی لغوی تعریف:

طبقہ لغت میں باہم مشابہ لوگوں کو کہا جاتا ہے[۲]۔

(ب)۔ طبقہ کی اصطلاح تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں طبقہ اس لوگوں کو کہتے ہیں جو عمر اور اسناد میں یا صرف اسناد میں ایک دوسرے کے قریب ہوں[۳]۔

اسناد میں قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک راوی کے شیوخ دوسرے راوی کے بھی شیوخ ہوں، یا دونوں کے شیوخ قریب قریب ہوں[۴]۔

۲۔ معرفتِ طبقات کے فوائد:

محدثین کرام نے طبقات کی معرفت کے متعدد فوائد بیان کیے ہیں، جن میں چند درج ذیل ہیں:

(الف)۔ طبقات کی معرفت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ نام اور کنیت وغیرہ میں متشابہ رواۃ کے درمیان تداخل سے محفوظ رہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ کبھی دو نام تلفظ میں یکساں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہر ایک پر دوسرے کا گمان پیدا ہوتا ہے اور ایک شخص کو دوسرا سمجھ لیا جاتا ہے، لیکن اگر ان کے طبقات معلوم ہوں فرق بالکل واضح معلوم ہوتا ہے۔

---

(۱) مقدمة ابن الصلاح:۵۰۰، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۷۹۷ - ۷۹۹، التقريب:۱۹۹، المنهل الروي: ۱۱۵، اختصار علوم الحديث:۲۴۵، الشذا الفياح:۲/ ۷۸۱ - ۷۸۲، المقنع في علوم الحديث:۲/ ٦٦٨ - ٦٦٩، شرح التبصرة والتذكرة:۳/ ۳۰۱، فتح المغيث: ۳/ ۳۵۱ - ۳۵۴، تدريب الراوي:۲/ ۳۸۰ - ۳۸۲، فتح الباقي:۳/ ۲۷۴ - ۲۷٦، توضيح الأفكار:۲/ ۵۰۳ - ۵۰۴، وظفر الأماني:۱۰۳ - ۱۰۴.(م)

(۲) دیکھئے: الصحاح:۴/ ۱۵۱۲، المحکم: ٦/ ۱۷۸، تاج العروس: ۲٦/ ۵۰.(م)

(۳) دیکھئے: تدریب الراوی:۲/ ۳۸۱۔(ط)

(۴) تدریب الراوي:۲/ ۳۸۰۔(م)

(ب)۔ معرفتِ طبقات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے عنعنہ کی حقیقی مراد معلوم ہو جاتی ہے[1]۔

۳۔ دوراوی ایک اعتبار سے:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوراوی ایک اعتبار سے ایک ہی طبقہ میں شمار ہوتے ہیں، لیکن دوسرے اعتبار سے دو طبقوں میں شمار ہوتے ہیں، جیسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اوراس جیسے دوسرے اصاغر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، جو ایک طبقہ عشرہ مبشرہ کیساتھ اس لحاظ سے شریک ہیں کہ یہ بھی صحابہ ہیں، اس لیے کہ جملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ہی طبقہ میں شمار ہوتے ہیں، لیکن دوسری طرف اسلام میں سبقت کے لحاظ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بھی دس کے قریب طبقات ہیں، جیسا کہ معرفۃ الصحابہ کے عنوان کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ اب اس لحاظ سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اوران کی طرح دوسرے افراد عشرہ مبشرہ کے طبقہ میں شمار نہیں ہوں گے[2]۔

۴۔ ناظر کی اس سلسلہ میں کیا ذمہ داری ہے؟

علم طبقات کے مطالعہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ رواۃ کی تاریخ پیدائش اوروفیات سے بخوبی واقف ہو، اوراس کو یہ بھی علم ہو کہ انہوں نے کن شیوخ اوراساتذہ سے روایات لی ہیں اور خود ان کے سامنے کو کن کن حضرات نے زانو تلمذ طے کیے ہیں[3]۔

۵۔ طبقات پر معروف تصانیف:

(الف)۔ الطبقات الکبری، از علامہ ابن سعدؒ۔

(ب)۔ طبقات القراء، از علامہ ابو عمرو الدانیؒ۔

(ج)۔ طبقات الشافعیۃ الکبری، از علامہ عبد الوہاب سبکیؒ۔

(د)۔ تذکرۃ الحفاظ، از امام شمس الدین ذہبیؒ۔

---

(۱) دیکھئے: شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۳۴۳۔ (م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح: ۵۰۰، شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی: ۲/ ۳۴۳۔ (م)

(۳) مقدمۃ ابن الصلاح: ۵۰۰، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۹۹، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۵۶۶۔ (م)

۱۹۔ موالی علماء اور رواۃ کی معرفت [۱]

۱۔ موالی کی تعریف:

(الف)۔ موالی کی لغوی تعریف:

موالی ''مولی'' کی جمع ہے اور ''مولی'' کا لفظ اضداد کے قبیل سے ہے، اس کا اطلاق مالک، کا اطلاق مالک، غلام، آزاد کرنے والے اور آزاد ہونے والے سب پر یکساں طور پر ہوتا ہے [۲]۔

(ب)۔ موالی کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں موالی اس شخص کو کہتے ہیں جس نے کسی کیساتھ دوستی و اخوت کا معاہدہ کیا ہو، یا کسی نے اس کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کر دیا ہو، یا مولی اس شخص کو کہتے ہیں، جو کسی دوسرے کے ہاتھ مشرف بہ اسلام ہوا ہو [۳]۔

۲۔ موالی کی اقسام وانواع:

موالی کی تین قسمیں ہیں:

(الف)۔ موالی الحلف: جیسے امام مالک بن انس اصبحی تیمیؒ ہیں، آپ حسب ونسب کے اعتبار سے اصبحی ہیں، لیکن عہد وپیمان کے اعتبار سے تیمی ہیں، اس لیے کہ امام مالکؒ کی قوم اور خاندان اصبح کا قریش کے قبیلہ ''تیم'' کیساتھ حلیفانہ تعلق تھا۔

---

[۱] معرفة علوم الحديث: ۱۹۶ - ۲۰۲، مقدمة ابن الصلاح: ۵۰۱-۵۰۵، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۸۰۰ - ۸۰۳، التقريب: ۱۹۹ - ۲۰۰، المنهل الروي: ۱۳۵، اختصار علوم الحديث: ۲۴۶ - ۲۴۷، الشذا الفياح: ۲/ ۴۸۳ - ۴۸۷، المقنع في علوم الحديث: ۲/ ۶۷۰ - ۶۷۳، شرح التبصرة والتذكرة: ۳/ ۳۰۴، فتح المغيث: ۳/ ۳۵۵ - ۳۵۸، تدريب الراوي: ۲/ ۳۸۲ - ۳۸۴، شرح السيوطي عَلَى ألفية العراقي: ۲۷۷، فتح الباقي: ۳/ ۲۷۶ - ۲۷۸، توضيح الأفكار: ۲/ ۵۰۴. (م)

[۲] دیکھئے: قاموس: ۴/ ۴۰۴۔ (ط)

[۳] دیکھئے: التقریب مع التدریب: ۲/ ۳۸۲۔ (ط)

(ب)۔ مولی العتاقہ: جیسے معروف تابعی ابو البختری طائی رحمہ اللہ[۱] ہیں، جن کا نام سعید بن فیروز ہے، یہ قبیلہ طی کے ایک شخص کے غلام تھے، جس نے انہیں آزاد کر دیا تھا۔

(ج)۔ مولی الاسلام: جیسے امام محمد بن اسماعیل بخاری جعفی ہیں، ان کے دادا مغیرہ مجوسی تھے، جو یمان بن اخنس جعفی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ بھی اس نسبت کی وجہ سے جعفی کہلانے لگے[۲]۔

۳۔ معرفت موالی کے فوائد:

معرفت موالی کے متعدد فوائد ہیں، جن میں چند درج ذیل ہیں:

(الف)۔ التباس واشتباہ سے محفوظ رہنا۔

(ب)۔ نسب یا ولاء کے اعتبار سے کسی قبیلہ کی طرف منسوب ہونے کا علم ہونا، کہ اس راوی کا تعلق فلاں قبیلہ سے ہے اور یا یہ فلاں قبیلہ یا شخص کا موالی ہے۔

(ج)۔ معرفتِ موالی کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے ایسے دو ہم نام راویوں میں فرق اور امتیاز حاصل ہو جاتا ہے، جن میں سے ایک راوی کسی قبیلہ کی طرف نسب کے اعتبار سے منسوب ہوتا ہے جب کہ دوسرا اسی قبیلہ کی طرف ولاء کے اعتبار سے منسوب ہوتا ہے۔

۴۔ معرفتِ موالی پر مشہور و معروف تصانیف:

معرفتِ موالی کے موضوع پر علامہ ابو عمر کندی[۱] نے مصر کی طرف منسوب موالیوں پر ایک قیمتی اور نفیس کتاب لکھی ہے[۲]۔

---

[۱] سعید بن فیروز طائی، ابو البختری: بہت بڑے فقیہ اور حافظ حدیث تھے، صحابہ کرام سے مرسل روایات نقل کرتے ہیں، جس میں سماع کی تصریح ہو تو حسن کے درجہ کے ہوتی ہیں اور جن میں سماع کی تصریح نہ ہو تو وہ روایات ضعیف ہوتی ہیں، حجاج بن یوسف کے خلاف میدان میں آئے اور ۸۲ھ کو قتل کر دیئے گئے۔(تہذیب الکمال:۱۱/ ۳۲، تہذیب التہذیب:۴/ ۷۲، میزان الاعتدال:۴/ ۴۹۴، الاعلام للزرکلی:۳/ ۹۹)(م)

[۲] دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:۵۰۱-۵۰۵، إرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۸۰۰ - ۸۰۳، التقریب:۱۹۹ - ۲۰۰، المنهل الروي: ۱۳۵، اختصار علوم الحدیث:۲۴۶ - ۲۴۷.(م)

[۱] محمد بن یوسف بن یعقوب کندی:۲۸۳ھ کو پیدا ہوئے، عظیم مؤرخ اور محدث تھے، مصر کے انساب اور تاریخ پر گہری نظر تھی، مصر میں ۳۵۵ھ کو وفات پائی۔(حسن المحاضرہ:۱/ ۵۵۳، الاعلام للزرکلی:۷/ ۱۴۸)(م)

[۲] تدریب الراوي:۲/ ۳۸۲۔(م)

۲۰۔ ثقہ اور ضعیف رواۃ کی معرفت[1]

ا۔ ثقہ اور ضعیف کی تعریف:

(الف)۔ ثقہ اور ضعیف کی لغوی تعریف:

ثقہ لغت میں قابل اعتماد اور قابل اطمینان شخص کو کہتے ہیں اور ضعیف قوی کی ضد ہے، ضعف حسی بھی ہو سکتا ہے اور معنوی بھی[2]۔

(ب)۔ ثقہ اور ضعیف کی اصطلاحی تعریف:

محدثین کرام کی اصطلاح میں ثقہ اس راوی کو کہتے ہیں جو عادل اور ضابط ہو۔ اور ضعیف ایک عام نام ہے ہر اس راوی کو کہتے ہیں جس کے حفظ و ضبط کو جرح یا تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہو۔

۲۔ ثقہ اور ضعیف کی معرفت کی اہمیت و فوائد:

ثقہ اور ضعیف کی معرفت علوم حدیث کی اہم ترین انواع میں سے ہے، اس لیے کہ اس کے واسطہ سے صحیح اور ضعیف حدیث میں امتیاز کیا جا سکتا ہے[3]۔

۳۔ ثقات اور ضعفاء پر مشہور و معروف تصانیف:

(الف)۔ وہ تصانیف جو صرف ثقات رواۃ پر مشتمل ہیں، مثلاً امام ابن حبانؒ کی "کتاب الثقات" اور امام عجلیؒ کی "کتاب الثقات" ہے[1]۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۹۰-۴۹۳، إرشاد طلاب الحقائق: ۲/ ۷۷۲ - ۷۸۶، التقریب: ۱۹۷ - ۱۹۸، المنهل الروي: ۱۳۷، اختصار علوم الحدیث: ۲۴۲ - ۲۴۳، الشذا الفیاح: ۲/ ۷۳۹ - ۷۴۳، المقنع فی علوم الحدیث: ۲/ ۶۵۷ - ۶۶۱، شرح التبصرة والتذكرة: ۳/ ۲۷۷، فتح المغیث: ۳/ ۳۱۴ - ۳۳۰، تدریب الراوي: ۲/ ۳۶۸ - ۳۷۰، شرح السیوطي علَی ألفیة العراقي ۲۷۰، فتح الباقي: ۳/ ۲۵۹ - ۲۶۳، توضیح الأفكار: ۲/ ۵۰۰ - ۵۰۲.(م)

(۲) دیکھئے: المعجم الوسیط: ۲/ ۱۰۱۱، ۱/ ۵۴۰۔(م)

(۳) مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۹۱، تدریب الراوی: ۲/ ۸۹۰۔(م)

(۱) اس کے علاوہ ثقات پر کتابیں یہ ہیں:

ا۔ تاریخ اسماء الثقات، از حافظ ابن شاہینؒ (م ۳۸۵ھ)

۲۔ الثقات عمن لم یقع فی الکتب الستۃ، از حافظ قاسم بن قطلوبغاؒ (م ۸۷۹ھ) (م)

(ب)۔ صرف ضعفاء کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں بے شمار ہیں، مثلاامام بخاریؒ کی "کتاب الضعفاء"، امام نسائی کی "کتاب الضعفاء" اورامام عقیلیؒ[1] کی "کتاب الضعفاء" ہے، امام ابن عدیؒ[2] کی "الکامل فی الضعفاء" اورامام ذہبیؒ کی کتاب "المغنی فی الضعفاء" ہے[3]۔

(ج)۔ ثقات اور ضعفاء دونوں کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں بھی بے شمار ہیں، مثلاً امام بخاریؒ کی کتاب "التاریخ الکبیر"، امام ابن ابی حاتمؒ کی "الجرح والتعدیل" ہے، ان کتابوں میں ثقہ اور ضعیف دونوں طرح کے رواۃ کا تذکرہ ہے اور کچھ کتابیں ایسی ہیں جن میں حدیث کی کسی ایک یامتعدد کتابوں کے رواۃ تذکرہ کیا گیاہے، مثلاعلامہ عبدالغنی مقدسیؒ[1] کی کتاب "الکمال فی اسماء الرجال" ہے، اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر علامہ جمال الدین مزیؒ، امام ذہبیؒ، حافظ ابن حجرؒ

---

[1] محمد بن عمرو بن موسی بن حماد عقیلی مکی، ابو جعفر: عظیم محدث، ناقد اور حافظ حدیث تھے، آپ حرمین میں مقیم تھے، مکہ معظمہ میں ۳۲۲ھ کو وفات پائی۔

(تذکرۃ الحفاظ:۳/ ۳۶، شذرات الذہب:۲/ ۲۹۵، الاعلام للزرکلی:۶/ ۳۱۹)(م)

[2] عبداللہ بن عدی بن عبداللہ بن محمد ابن مبارک بن قطان جرجانی، ابو احمد: ۲۷۷ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محدث، ناقد اور حافظ حدیث تھے، اپنے شہر میں ابن قطان کے نام سے مشہور تھے اور اہل علم میں ابن عدی کے نام سے مشہور ہیں، ۳۶۵ھ کو وفات پائی۔

(تذکرۃ الحفاظ:۳/ ۱۰۲، سراعلام النبلاء:۱۲/ ۲۲۴، الاعلام للزرکلی:۴/ ۱۰۳)(م)

[3] ضعفاء پر مزید چند کتابیں یہ ہیں:

۱۔ المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین، از حافظ ابن حبان بستیؒ (م ۳۵۴ھ)

۲۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال، از حافظ شمس الدین ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ)

۳۔ لسان المیزان، از حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ)۔(م)

[1] عبدالغنی بن عبدالواحد بن علی بن سرور مقدسی جماعیلی دمشقی حنبلی، ابو محمد، تقی الدین: نابلس کے قریب جماعیل میں ۵۴۱ھ کو پیدا ہوئے، بچپن میں دمشق منتقل ہوئے، پھر وہاں سے اسکندریہ اور اصفہان چلے گئے، اپنے دور کے عظیم محدث، ناقد اور فن رجال کے امام تھے، مصر میں ۶۰۰ھ کو وفات پائی۔

(تذکرۃ الحفاظ:۴/ ۱۱۱، سیر اعلام النبلاء:۲۱/ ۴۴۳، الاعلام للزرکلی:۴/ ۳۴)(م)

اور علامہ خزرجیؒ[۱] نے اپنی ذوق کے مطابق تہذیب و تلخیص کی ہے[۲]۔

---

[۱] احمد بن عبد اللہ بن ابی الخیر بن عبد العلیم خزرجی انصاری ساعدی ، صفی الدین: ۹۰۰ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محدث اور ناقد تھے، ۹۲۳ھ کو وفات پائی۔ (الاعلام للزرکلی: ۱/ ۱۶۰) (م)

[۲] حافظ جمال الدین مزیؒ (م ۷٤۲ھ) کی کتاب کا نام تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ہے، امام شمس الدین ذہبیؒ (م ۷٤۸ھ) کی کتاب کا نام تذہیب تہذیب الکمال ہے، حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کی کتاب کا نام تہذیب التہذیب ہے اور علامہ صفی الدین انصاری خزرجیؒ (م ۹۲۳ھ) کی کتاب کا نام خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ہے۔ یہ کتابیں مطبوع ہیں۔ (م)

۲۱۔رواۃ کے اوطان وبلدان کی معرفت [1]

ا۔اس بحث سے کیا مراد ہے؟

اوطان ”وطن“ کی جمع ہے،اس سے مراد وہ خطہ زمین ہے، جس میں انسان پیدا ہوا اور وہاں وہی بس گیاہو۔اور بلدان ”بلد“ کی جمع ہے ، یہ اس شہر یا بستی کو کہتے ہیں، جہاں آدمی کی ولادت ہوئی ہو، یاوہیں سکونت اور رہائش اختیار کرلی ہو۔اس بحث سے مراد رواۃ کے علاقوں اور شہروں کی معرفت حاصل کرنا ہے، جہاں ان کی ولادت ہوئی ہو یا انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی ہو [۲]۔

۲۔ معرفتِ اوطان رواۃ کے فوائد:

معرفتِ اوطان رواۃ کے متعدد فوائد ہیں، تاہم ان میں من جملہ ایک فائدہ یہ ہے کہ ایسے دو اشخاص کے درمیان فرق وامتیاز حاصل کرنا ہے، جن کے نام تلفظ میں یکساں ہوں، تاہم دونوں الگ الگ شہروں میں بسنے والے ہوں، یہ علوم الحدیث کی وہ نوع ہے، جس کی محدثین کرام کو اپنی تصانیف اور تحقیق اور علمی مشاغل میں بہت ہی زیادہ ضرورت پڑتی ہے [۱]۔

۳۔راوی عربی ہو یا عجمی، وہ کس چیز کی طرف منسوب ہوتا ہے؟

عرب اور عجم کی تہذیب وتمدن میں نمایاں فرق ہے، اس لیے دونوں میں نسبت کا مدارو معیار بھی الگ الگ ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

---

[۱] معرفة علوم الحديث ١٩٠ - ١٩٦، مقدمة ابن الصلاح:٥٠٥-٥٠٩، إرشاد طلاب الحقائق:٢/ ٨٠٤ - ٨١٥، التقريب ٢٠٠ - ٢٠١، المنهل الروي:١٣٩، اختصار علوم الحديث ٢٤٨ - ٢٤٩، الشذا الفياح:٢/ ٤٨٨ - ٤٩٢، المقنع في علوم الحديث:٢/ ٦٧٤ - ٦٧٨، فتح المغيث: ٣/ ٣٥٩ - ٣٦٢، فتح الباقي: ٣/ ٢٧٨ - ٢٨٠، تدريب الراوي: ٢/ ٣٨٤ - ٣٨٥، توضيح الأفكار:٢/ ٥٠٤ - ٥٠٦، ظفر الأماني:١٠٥.(م)

[۲] فتح المغيث:٤/ ٤٠۔(م)

[۱] نزهة النظر:١٦٥، اختصار علوم الحديث:٢٤٨۔(م)

(الف)۔ قدیم زمانہ میں عربوں کا معمول تھا کہ وہ اپنی نسبت اپنے قبائل ہی کی طرف کرتے تھے،اس لیے کہ ان کی اکثریت بدوی اور خانہ بدوش تھی،ان ربط و تعلق اپنی زمین اور بلاد و امصار کے مقابلہ میں اپنے قبائل سے زیادہ ہوتا تھا،لیکن جب اسلام آیااوروہ شہروں اور بستیوں میں سکونت پذیر ہوگئے،تواب یہ لوگ بھی قبائل اور قوموں کے بجائے شہروں اور بستیوں کی طرف منسوب ہونے لگے۔

(ب)۔ لیکن عجمی لوگ زمانہ قدیم ہی سے شہروں اور بستیوں کی طرف منسوب چلے آتے ہیں[1]۔

۴۔ تارکِ وطن شخص اپنی نسبت کس طرف کرے گا؟

(الف)۔ جب کوئی شخص اپنے وطنِ متروک اور وطنِ مالوف دونوں کی طرف نسبت کا ارادہ کرے تو پہلے اپنے وطن اصلی کی طرف نسبت کرے،پھر اپنے وطن جدید ذکر کرے ،جس کی طرف منتقل ہو کر آیا ہو،تاہم بہتر یہ ہے کہ دونوں ناموں کے درمیان لفظ ''ثم'' لکھے،تاکہ کوئی اشتباہ نہ رہے،مثلاً جو شخص حلب(شام)میں پیدا ہوا پھر مدینہ منورہ کی طرف منتقل ہو گیا ہو وہ اپنی نسبت یوں کرے۔''فلان الحلبی ثم المدنی.''یہی اکثر اہل علم کا معمول رہا ہے۔

(ب)۔ لیکن اگر کوئی شخص دو وطنوں کی طرف نسبت نہ کرنا چاہتا ہو تو جس شہر کی طرف چاہے ،خود کو منسوب کرے،تاہم ایسا بہت کم ہوتا ہے[2]۔

۵۔ جو شخص کسی شہر کی مضافات اور تابع بستی میں رہتا ہو وہ اپنی نسبت کس طرف کرے؟

جو شخص کسی شہر کے مضافات میں رہتا ہو تو وہ اپنی نسبت شہر کی طرف کرے یا اس بستی کی طرف؟اس کی تفصیل یہ ہے۔

(الف)۔ چاہے تو خود کو اس بستی کی طرف منسوب کرے،جس میں وہ رہتا ہو۔

(ب)۔ چاہے اس شہر کی طرف نسبت کرے،جس کے ماتحت یہ بستی ہو۔

(ج)۔ چاہے اپنے آپ کو اس علاقے کی منسوب کرے،جس کا یہ شہر ہے۔

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح:۵۰۵-۵۰۹، اِرشاد طلاب الحقائق:۲/ ۸۰۴ – ۸۱۵.(م)

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح:۵۰۵-۵۰۶، ارشاد طلاب الحقائق:۲/ ۸۰۵، فتح المغیث:۳/ ۳۶۰۔(م)

اس کی مثال یوں سمجھئے! مثلاً ایک شخص "باب" نامی بستی کا باشندہ ہو، جو حلب شہر کے مضافات میں واقع ایک بستی ہے اور حلب ملکِ شام کا مشہور و معروف شہر ہے۔ اب یہ شہر اپنے آپ کو "بابی" بھی کہہ سکتا ہے۔ "حلبی" اور "شامی" بھی کہہ سکتا ہے[1]۔

٦۔ ایک شخص کسی مقام پر کتنی مدت رہے کہ وہاں کا باشندہ کہلانے لگے؟

ایک شخص کسی مقام پر کتنی مدت رہے کہ وہاں کا باشندہ کہلانے لگے، محدث جلیل عبد اللہ بن مبارکؒ[2] فرماتے ہیں کہ چار سال کا عرصہ گزارنے کے بعد ایک شخص کسی علاقے کا باشندہ بن جاتا ہے[3]۔

٧۔ رواۃ کی اوطان وبلدان کی معرفت پر مشہور و معروف تصانیف:

(الف)۔ اگر ہم علامہ عبد الکریم سمعانی کی کتاب "الانساب" جس کا تعارف گزر چکا ہے، اس میں شمار کریں تو بے جانہ ہو گا، اس لیے کہ اس کتاب میں رواۃ کی اوطان وبلدان کی معرفت پر بحث کی گئی ہے۔

(ب)۔ طبقات ابن سعد کا شمار بھی اسی طرح کی کتب میں کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ وہ بھی رواۃ کے بلاد وامصار کا تذکرہ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور توفیق سے یہ کتاب پایہ تکمیل تک پہنچ گئی۔

---

(١) دیکھئے: مقدمۃ ابن الصلاح:٥٠٦، ارشاد طلاب الحقائق:٢/٨٠٦، تہذیب الاسماء واللغات:١/١٣، محاسن الاصطلاح:٦٠٧۔(م)

(٢) عبد اللہ بن مبارک بن واضح حنظلی تمیمی مروزی، شیخ الاسلام فخر المجاہدین قدوۃ الزاہدین، ابو عبد الرحمن:١١٨ھ کو پیدا ہوئے، عظیم محدث، فقیہ، مجاہد اور نابغہ روزگار عالم تھے، ساری زندگی حصول علم، جہاد، تجارت اور اسفار میں گزاری، آپ خراسان کے باشندے تھے، روم کے خلاف جنگ لڑنے کے بعد فرات کے قریب ہیت میں ١٨١ھ کو وفات پائی۔
(سیر اعلام النبلاء:٨/٣٧٨، تذکرۃ الحفاظ:١/٢٠١، الاعلام للزرکلی:٤/١١٥)(م)

(٣) التقریب والتیسیر للنووی:١٢٣، المقنع فی علوم الحدیث:٢/٦٧٤، الخلاصۃ فی معرفۃ الحدیث:١٦٣، تدریب الراوی:٢/٩١٤۔(م)

فہرس المصادروالمراجع

* الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ،مؤلف:محمد عبدالحی اللکھنوی الہندی(م:۱۳۰۴ھ)، محقق: عبدالفتاح ابوغدہ،الناشر:مکتب المطبوعات الاسلامیہ، حلب، الطبعۃالثانیہ:۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴م۔
* الِاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان،مؤلف: محمد بن حبان بن أحمد بن حبان التمیمی، أبو حاتم ،الدارمی،البُستی(م:۳۵۴ھ)،ترتیب: الأمیر علاء الدین علی بن بلبان الفارسی(م :۷۳۹ھ) ، تحقیق: شعیب الأرنؤوط،الناشر: مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۰۸ھ - ۱۹۸۸م.
* الِاحکام فی أصول الأحکام،مؤلف: أبو محمد علی بن أحمد بن سعید بن حزم الأندلسی القرطبی الظاہری، محقق: الشیخ أحمد محمد شاکر،دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت.
* اختصار علوم الحدیث،مؤلف: أبو الفداء إسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی الدمشقی، محقق: أحمد محمد شاکر،دار الکتب العلمیۃ، بیروت – لبنان.
* اختلاف ائمہ اور حدیث نبوی،مؤلف:شیخ محمد عوامہ،مترجم:شیخ علاؤالدین جمال،ناشر:النادی العربی دارالعلوم زکریاجنوبی افریقہ،طبع:۲۰۰۹م۔
* الأدب المفرد،مؤلف: محمد بن إسماعیل بن إبراہیم بن المغیرۃ البخاری، أبو عبد اللہ (م: ۲۵۶ھ)، محقق: محمد فؤاد عبد الباقی،الناشر: دار البشائر الإسلامیۃ – بیروت،الطبعۃ: الثالثۃ، ۱۴۰۹ھ – ۱۹۸۹م.
* إرشاد طلاب الحقائق إلی معرفۃ سنن خیر الخلائق،مؤلف: محیی الدین أبو زکریا یحیی بن شرف النووی الدمشقی، تحقیق وتخریج ودراسۃ: عبد الباری فتح اللہ السلفی، مکتبۃ الإیمان، المدینۃ المنورۃ - الطبعۃ: الأولی، ۱۴۰۸ھ.
* إسبال المطر علی قصب السکر (نظم نخبۃ الفکر فی مصطلح أہل الأثر)،مؤلف: محمد بن إسماعیل بن صلاح بن محمد الصنعانی، تحقیق وتعلیق: عبد الحمید بن صالح بن قاسم آل أعوج سبر،دار ابن حزم – بیروت،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۲۷ھ.

* الاستيعاب فی معرفۃ الأصحاب،مؤلف: أبو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمری القرطبی(۴۶۳ھ)، محقق: علی محمد البجاوی،دار الجیل، بیروت،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۲ھ.
* أسد الغابۃ،مؤلف: أبو الحسن علی بن أبي الکرم محمد بن محمد بن عبد الکریم الشیبانی الجزری، عز الدین ابن الأثیر (م:۶۳۰ھ)،دار الفکر - بیروت،عام النشر: ۱۴۰۹ھ - ۱۹۸۹م.
* الإصابۃ فی تمییز الصحابۃ،مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی (م:۸۵۲ھ)، تحقیق: عادل أحمد عبد الموجود وعلی محمد معوض، دار الکتب العلمیۃ - بیروت، الطبعۃ: الأولی - ۱۴۱۵ھ.
* اصول الحدیث،ڈاکٹر خالد علوی، طبع:الفصیل ناشران تاجران کتب،لاہور، طبع:۲۰۱۳م۔
* أصول السرخسی،مؤلف: محمد بن أحمد بن أبي سہل شمس الأئمۃ السرخسي (م ۴۸۳ھ)، الناشر: دار المعرفۃ - بیروت۔
* اصول حدیث کے بعض اہم مباحث،مؤلف:علامہ عبدالرشید نعمانی،ناشر:الرحیم اکیڈمی،لیاقت آباد،کراچی۔
* الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار،مؤلف : أبو بکر محمد بن موسی بن عثمان الحازمی ،دائرۃ المعارف العثمانیۃ - حیدر آباد ، الدکن، طبع۱۳۵۹ھ.
* الأعلام،مؤلف: خیر الدین بن محمود بن محمد بن علی بن فارس، الزرکلی الدمشقی (م: ۱۳۹۶ھ)، دار العلم للملایین،الطبعۃ: الخامسۃ عشر ۲۰۰۲م.
* الاقتراح فی بیان الاصطلاح،مؤلف: تقی الدین أبو الفتح محمد بن علی بن وہب بن مطیع القشیری، المعروف بابن دقیق العید،دار الکتب العلمیۃ - بیروت.
* إکمال الإکمال (تکملۃ لکتاب الإکمال لابن ماکولا)،مؤلف: محمد بن عبد الغنی بن أبی بکر بن شجاع، ابن نقطۃ الحنبلی البغدادی (المتوفی: ۶۲۹ھ)، محقق: د. عبد القیوم عبد ریب النبی،جامعۃ أم القری - مکۃ المکرمۃ،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۰ھ.
* ألفیۃ السیوطی فی علم الحدیث،مؤلف: عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی، محقق: الأستاذ أحمد محمد شاکر، المکتبۃ العلمیۃ.

* الإلماع إلى معرفة أصول الرواية وتقييد السماع،مؤلف: عياض بن موسى بن عياض بن عمرون اليحصبي السبتي، أبو الفضل (المتوفى: ۵۴۴ھ)، محقق: السيد أحمد صقر،دار التراث / المكتبة العتيقة - القاهرة / تونس،الطبعة: الأولى، ۱۳۷۹ھ - ۱۹۷۰م.
* امام ابن ماجہ اور علم حدیث،مؤلف:علامہ عبدالرشید نعمانی،ناشر:نور محمد اصح المطابع آرام باغ کراچی۔
* امعان النظر فی توضیح نخبۃ الفکر،مؤلف:محمد اکرم سندی، تحقیق:استاذ غلام مصطفی قاسمی،دون ذکر المطبعۃ۔
* الأنساب،مؤلف: عبد الكريم بن محمد بن منصور التميمي السمعاني المروزي، أبو سعد (م: ۵۶۲ھ)، محقق: عبد الرحمن بن يحيى المعلمي اليماني، مجلس دائرة المعارف العثمانية، حيدر آباد،الطبعة: الأولى، ۱۳۸۲ھ - ۱۹۶۲م.
* الآثار المرفوعة فی الأخبار الموضوعة،مؤلف: محمد عبد الحی بن محمد عبد الحليم الأنصاری اللكنوی الهندی، أبو الحسنات، محقق: محمد السعيد بسيونی زغلول، مكتبة الشرق الجديد – بغداد.
* الآثار،مؤلف: أبو يوسف يعقوب بن إبراهيم بن حبيب الأنصاری (المتوفى: ۱۸۲ھ)، محقق: أبو الوفا، دار الكتب العلمية – بيروت.
* الآثار،مؤلف:الامام الحافظ ابی عبد الله محمد بن الحسن الشيبانی، محقق: أبو الوفا الأفغانی،دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان.
* البحر المحيط فی أصول الفقه،مؤلف: أبو عبد الله بدر الدين محمد بن عبد الله بن بهادر الزركشی (المتوفى: ۷۹۴ھ)، منشورات وزارة الاوقاف، الكويت، الطبعة الاولى:۱۴۰۹ھ–۱۹۸۸م.
* البداية والنهاية،مؤلف: أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشی الدمشقی (المتوفى: ۷۷۴ھ)،دار الفكر، بيروت، عام النشر: ۱۴۰۷ھ - ۱۹۸۶م.
* البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع،مؤلف: محمد بن علی بن محمد بن عبد الله الشوكانی اليمنی (المتوفى: ۱۲۵۰ھ) دار المعرفة – بيروت.

* بدیع النظام (نهایة الوصول إلی علم الأصول)،مؤلف: مظفر الدین أحمد بن علی بن الساعاتی، محقق: سعد بن غریر بن مهدی السلمی،الناشر: جامعة أم القری،سنة النشر: ۱۴۰۵ھ - ۱۹۸۵م۔
* تاج العروس من جواهر القاموس،مؤلف: محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسینی، أبو الفیض، الملقّب بمرتضی، الزّبیدی (المتوفی: ۱۲۰۵ھ)، محقق: مجموعة من المحققین،دار الهدایة،بیروت
* تاریخ الإسلام وَوَفیات المشاهیر وَالأعلام،مؤلف: شمس الدین أبو عبد اللہ محمد بن أحمد بن عثمان بن قَایْماز الذہبی (المتوفی: ۷۴۸ھ) محقق: الدکتور بشار عوّاد معروف، دار الغرب الإسلامی،الطبعة: الأولی، ۲۰۰۳م.
* تاریخ الثقات،مؤلف: أبو الحسن أحمد بن عبد اللہ بن صالح العجلی الکوفی (المتوفی: ۲۶۱ھ)، دار الباز،الطبعة الأولی ۱۴۰۵ھ-۱۹۸۴م.
* التاریخ الکبیر،مؤلف: محمد بن إسماعیل بن إبراہیم بن المغیرة البخاری، أبو عبد اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ)الطبعة: دائرة المعارف العثمانیة، حیدر آباد – الدکن،ہند.
* تاریخ بغداد،مؤلف: أبو بکر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد الخطیب البغدادی (م: ۴۶۳ ھ) محقق: الدکتور بشار عواد معروف،دار الغرب الإسلامی – بیروت،الطبعة: الأولی، ۱۴۲۲ھ.
* تبصیر المنتبہ بتحریر المشتبہ،مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی (المتوفی: ۸۵۲ھ)، تحقیق: محمد علی النجار،المکتبة العلمیة، بیروت – لبنان.
* التبصیر فی الدین وتمییز الفرقة الناجیة عن الفرق الهالکین،مؤلف: طاہر بن محمد الأسفراییني، أبو المظفر (المتوفی: ۴۷۱ھ)، محقق: کمال یوسف الحوت،الناشر: عالم الکتب – لبنان،الطبعة: الأولی، ۱۴۰۳ھ - ۱۹۸۳م.
* التحدیث فی علوم الحدیث،ڈاکٹر عبد الرؤف ظفر،مکتبہ قدوسیہ لاہور، طبع:۲۰۰۰م۔
* تحریر علوم الحدیث،مؤلف: عبد اللہ بن یوسف الجدیع،مؤسسة الریان للطباعة والنشر والتوزیع، بیروت – لبنان،الطبعة: الأولی:۱۴۲۴ھ.

* تحفة الأشراف بمعرفة الأطراف،مؤلف: جمال الدين أبو الحجاج يوسف بن عبد الرحمن المزی (المتوفی: ۷۴۲ھ)، محقق: عبد الصمد شرف الدین، المکتب الاِسلامی،بیروت،الطبعة: الثانية: ۱۴۰۳ھ، ۱۹۸۳م.
* تدريب الراوی فی شرح تقريب النواوی،مؤلف: عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطی(م۹۱۱ھ)، محقق:أبو قتيبة نظر محمد الفاريابي،دار طيبة،بيروت.
* التدليس والمدلسون،مؤلف: حماد بن محمد الأنصاری الخزرجی السعدی،مجلة الجامعة الاِسلامية بالمدينة المنورة.
* تذكرة الحفاظ،مؤلف: شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايماز الذہبی (المتوفی: ۷۴۸ھ)،دار الكتب العلمية بيروت-لبنان،الطبعة: الأولی، ۱۴۱۹ھ- ۱۹۹۸م.
* التذكرة فی علوم الحديث،مؤلف: ابن الملقن سراج الدين أبو حفص عمر بن علی الشافعی المصری، محقق:علی حسن عبد الحميد،دار عمّار، عمّان،الطبعة: الأولی: ۱۴۰۸ھ.
* تذہیب تہذیب الکمال فی أسماء الرجال،مؤلف: شمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان الذہبی (المتوفی۷۴۸ھ)، تحقيق: غنيم عباس غنيم - مجدی السيد أمين،الفاروق الحديثة للطباعة والنشر،الطبعہ: الأولی، ۱۴۲۵ھ - ۲۰۰۴م.
* تعريف اہل التقديس بمراتب الموصوفين بالتدليس،مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی (المتوفی: ۸۵۲ھ) محقق: د. عاصم بن عبدالله القريوتی، مكتبة المنار - عمان،الطبعة: الأولی، ۱۴۰۳ھ- ۱۹۸۳م.
* تقريب التہذيب،مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی (المتوفی : ۸۵۲ھ)، محقق: محمد عوامة، دار الرشيد – سوريا،الطبعة: الأولی، ۱۴۰۶ھ – ۱۹۸۶م.
* التقريب والتيسير لمعرفة سنن البشير النذير فی أصول الحديث،مؤلف: أبو زكريا محيی الدين يحيی بن شرف النووی،ناشر: دار الكتاب العربي، بيروت،الطبعة: الأولی، ۱۴۰۵ھ.
* التقرير والتحبير،مؤلف: أبو عبد الله، شمس الدين محمد بن محمد بن محمد المعروف بابن أمير حاج الحنفي (المتوفی: ۸۷۹ھ)،الناشر: دار الكتب العلمية،الطبعة: الثانية، ۱۴۰۳ھ- ۱۹۸۳م۔

* تقويم الأدلة في أصول الفقه،مؤلف: أبو زيد عبد الله بن عمر بن عيسى الدّبوسيّ الحنفي (المتوفى: ۴۳۰ھ)، محقق: خليل محيي الدين الميس،الناشر: دار الكتب العلمية، الطبعة: الأولى، ۱۴۲۱ھ - ۲۰۰۱م۔
* التقييد والإيضاح شرح مقدمة ابن الصلاح،مؤلف: أبو الفضل زين الدين عبد الرحيم بن الحسين العراقی ، محقق: عبد الرحمن محمد عثمان،المكتبة السلفية المدينة المنورة،الطبعة: الأولى، ۱۳۸۹ھ.
* التمييز،مؤلف: مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيری النيسابوری (المتوفى: ۲۶۱ھ)، محقق: د. محمد مصطفى الأعظمی،الناشر: مكتبة الكوثر السعودية،الطبعة: الثالثة، ۱۴۱۰ھ.
* تنزيه الشريعة المرفوعة عن الأخبار الشنيعة الموضوعة،مؤلف: نور الدين، علی بن محمد بن علی بن عبد الرحمن ابن عراق الكنانی (المتوفى: ۹۶۳ھ) محقق: عبد الوهاب عبد اللطيف ، عبد الله محمد الصديق الغماری،دار الكتب العلمية – بيروت،الطبعة: الأولى، ۱۳۹۹ھ.
* تنقيح التحقيق فی أحاديث التعليق،مؤلف: شمس الدين محمد بن أحمد بن عبد الهادی الحنبلی (المتوفى: ۷۴۴ھ)، تحقيق: سامی بن محمد بن جاد الله وعبد العزيز بن ناصر الخبانی،دار النشر: أضواء السلف – الرياض،الطبعة: الأولى، ۱۴۲۸ھ - ۲۰۰۷م.
* تهذيب الأسماء واللغات،مؤلف: أبو زكريا محيی الدين يحيی بن شرف النووی (م: ۶۷۶ھ) تحقيق: شركة العلماء بمساعدة إدارة الطباعة المنيرية، دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان.
* تهذيب التهذيب،مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی (م: ۸۵۲ھ)،مطبعة دائرة المعارف النظامية، الهند، الطبعة الأولى، ۱۳۲۶ھ.
* تهذيب الكمال فی أسماء الرجال،مؤلف: يوسف بن عبد الرحمن بن يوسف، أبو الحجاج، جمال الدين الكلبی المزی (المتوفى: ۷۴۲ھ)، محقق: د. بشار عواد معروف،مؤسسة الرسالة – بيروت،الطبعة: الأولى، ۱۴۰۰ھ - ۱۹۸۰م.
* تهذيب اللغة،مؤلف: محمد بن أحمد بن الأزهری الهروی، أبو منصور (المتوفى: ۳۷۰ھ)، محقق: محمد عوض مرعب، دار إحياء التراث العربی – بيروت،الطبعة: الأولى، ۲۰۰۱م.

* توجیہ النظر إلی أصول الأثر،مؤلف: طاہر بن صالح (أو محمد صالح) ابن أحمد بن موہب الجزائری، محقق: عبد الفتاح أبو غدة، مکتبۃ المطبوعات الإسلامیۃ – حلب،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۶ھ.
* التوضیح مع شرح التلویح،مؤلف:صدرالشریعۃ الاصغر، تحقیق:محمدعدنان درویش،دارالارقم ،الاولی :۱۴۱۹ھ۔
* توضیح الأفکار لمعانی تنقیح الأنظار،مؤلف: محمد بن إسماعیل بن صلاح بن محمد الحسنی الصنعانی، محقق: أبو عبد الرحمن صلاح بن محمد بن عویضۃ،دار الکتب العلمیۃ، بیروت- لبنان،الطبعۃ: الأولی ۱۴۱۷ھ.
* توضیح المبانی وتنقیح المعانی،مؤلف:ملاعلی القاری الحنفی(المتوفی:۱۰۱۴ھ)،تحقیق:محمد محیی الدین عبدالحمید،الناشر:داراحیاء التراث العربی،بیروت،الطبعۃالاولی:۱۴۱۸ھ۔
* تیسیر التحریر،مؤلف: محمد أمین بن محمود البخاري المعروف بأمیر بادشاہ الحنفي (المتوفی: ۹۷۲ھ)،الناشر: مصطفی البابي الحلبِي،مصر (۱۳۵۱ ھ- ۱۹۳۲ م)۔
* الثقات،مؤلف: محمد بن حبان بن أحمد بن حبان التمیمی، أبو حاتم، الدارمی، البُستی،دائرۃ المعارف العثمانیۃ بحیدر آباد الدکن الہند،الطبعۃ: الأولی، ۱۳۹۳ھ.
* جامع التحصیل فی أحکام المراسیل،مؤلف: صلاح الدین أبو سعید خلیل بن کیکلدی بن عبد اللہ الدمشقی العلائی (المتوفی: ۷۶۱ھ)المحقق: حمدی عبد المجید السلفی، عالم الکتب – بیروت، الطبعۃ: الثانیۃ، ۱۴۰۷ھ– ۱۹۸۶م.
* جامع بیان العلم وفضلہ،مؤلف: أبو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر النمری القرطبی (المتوفی: ۴۶۳ھ)، تحقیق: أبي الأشبال الزہیری،دار ابن الجوزی، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۴ھ – ۱۹۹۴م.
* الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع،مؤلف: أبو بکر أحمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی محقق: دکتور محمود الطحان، مکتبۃ المعارف – الریاض.

* الجرح والتعديل،مؤلف: أبو محمد عبد الرحمن بن محمد بن إدريس بن المنذر التميمي، الحنظلي، الرازي ابن أبي حاتم(المتوفى:۳۲۷ھ) مجلس دائرة المعارف العثمانية - بحيدر آباد الدكن – الهند،الطبعة: الأولى، ۱۲۷۱ھ- ۱۹۵۲م.
* الجواهر المضية في طبقات الحنفية،مؤلف: عبد القادر بن محمد بن نصر الله القرشي، أبو محمد، محيي الدين الحنفي (المتوفى: ۷۷۵ھ)، مير محمد كتب خانه – كراتشي.
* حديث اور فہم حديث، مؤلف:مولاناعبداللہ معروفی،ناشر:مکتبہ عثمانیہ ،دیوبند،طبع:۱۴۲۹ھ / ۲۰۰۸ھ۔
* حدیث کادرایتی معیار، مؤلف:مولانا تقی امینی،ناشر:قدیمی کتب خانہ کراچی۔
* حلية الأولياء وطبقات الأصفياء،مؤلف: أبو نعيم أحمد بن عبد الله بن أحمد بن إسحاق بن موسى بن مهران الأصبهاني (المتوفى: ۴۳۰ھ)،الناشر:السعادة - بجوار محافظة مصر، ۱۳۹۴ھ - ۱۹۷۴م.
* خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشر،مؤلف: محمد أمين بن فضل الله بن محب الدين بن محمد الدمشقي (المتوفى: ۱۱۱۱ھ)،دار صادر – بيروت.
* خلاصة الأفكار شرح مختصر المنار،مؤلف: أبو الفداء زين الدين قاسم بن قُطْلُوْبَغَا السُّوْدُوْنِي الجمالي الحنفي (المتوفى: ۸۷۹ھ)، محقق: حافظ ثناء الله الزاهدی، الناشر: دار ابن حزم، الطبعة: الأولى، ۱۴۲۴ھ- ۲۰۰۳م۔
* خلاصة تذهيب تهذيب الكمال في أسماء الرجال،مؤلف: أحمد بن عبد الله بن أبي الخير بن عبد العليم الخزرجي الأنصاري (المتوفى: بعد ۹۲۳ھ)،محقق: عبد الفتاح أبو غدة،مكتب المطبوعات الإسلامية / دار البشائر – حلب،الطبعة: الخامسة، ۱۴۱۶ھ.
* الخلاصة في معرفة الحديث،مؤلف: الحسين بن محمد بن عبد الله، شرف الدين الطيبي، محقق: أبو عاصم الشوامي الأثري،المكتبة الإسلامية للنشر والتوزيع –بيروت،الطبعة: الأولى، ۱۴۳۰ھ.
* دراسات في اصول الحديث على منهج الحنفية، مؤلف:عبدالمجيد التركمانی،ناشر: مدرسة النعمان، کراچی، ۱۴۳۰ھ / ۲۰۰۹م۔

* دراسات اللبيب فی الاسوة الحسنة بالحبيب،مؤلف:محمد معين سندی، تحقيق:محمد عبد الرشيد النعمانی، الناشر:مطبعة العرب كراتشی، الطبعة الاولی:۱۹۵۷م۔
* الدرر الكامنة فی أعيان المائة الثامنة، مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی (المتوفی: ۸۵۲ھ) محقق: محمد عبد المعيد خان، مجلس دائرة المعارف العثمانية - حيدر آباد/ الهند، الطبعة: الثانية، ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲م.
* درس ترمذی، از شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، ناشر: مکتبہ دارالعلوم کراچی۔
* ديوان الضعفاء والمتروكين، مؤلف: شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايماز الذهبی (المتوفی: ۷۴۸ھ) محقق: حماد بن محمد الأنصاری، مكتبة النهضة الحديثة - مكة، الطبعة: الثانية، ۱۳۸۷ھ - ۱۹۶۷ م.
* الرحلة فی طلب الحديث، مؤلف: أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی (المتوفی: ۴۶۳ھ)، محقق: نور الدين عتر، الناشر: دار الكتب العلمية - بيروت، الطبعة: الأولی، ۱۳۹۵ھ.
* ردو قبول حدیث کے حنفی اصول ومعیارات، مؤلف: ڈاکٹر محمد سلیمان اسدی، ناشر: الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ۔
* رسوم التحديث فی علوم الحديث، مؤلف: برهان الدين أبو إسحاق إبراهيم بن عمر الجعبری محقق: إبراهيم بن شريف الميلی، دار ابن حزم - لبنان، بيروت، الطبعة: الأولی، ۱۴۲۱ھ.
* الرفع والتكميل فی الجرح والتعديل، مؤلف: محمد عبد الحی بن محمد عبد الحليم الأنصاری اللكنوی الهندی، أبو الحسنات (المتوفی: ۱۳۰۴ھ)، محقق: عبد الفتاح أبو غدة، الناشر: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب، الطبعة: الثالثة، ۱۴۰۷ھ.
* سنن ابن ماجه، مؤلف: أبو عبد الله محمد بن يزيد القزوينی (المتوفی: ۲۷۳ھ)، محقق: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد - محمَّد كامل قره بللی - عَبد اللّطيف، الناشر: دار الرسالة العالمية، الطبعة: الأولی، ۱۴۳۰ھ - ۲۰۰۹م.

* سنن أبي داود،مؤلف: أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي السِّجِستاني (المتوفى: ٢٧٥هـ)، محقق: شعَيب الأرنؤوط - محَمَّد كامِل قره بللي،دار الرسالة العالمية،بيروت،الطبعة: الأولى، ١٤٣٠هـ - ٢٠٠٩م.
* سنن الترمذي،مؤلف: محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاك، الترمذي، أبو عيسى (المتوفى: ٢٧٩هـ)، تحقيق وتعليق:أحمد محمد شاكر،ومحمد فؤاد عبد الباقي،الناشر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي – مصر،الطبعة: الثانية، ١٣٩٥هـ - ١٩٧٥ م.
* سنن الدارقطني،مؤلف: أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد البغدادي الدارقطني (م:٣٨٥هـ) ، تحقيق: شعيب الارنؤوط، حسن عبد المنعم شلبي، عبد اللطيف حرز الله، أحمد برهوم،الناشر: مؤسسة الرسالة، بيروت – لبنان،الطبعة: الأولى، ١٤٢٤هـ - ٢٠٠٤م.
* سنن الدارمي،مؤلف: أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن بن الفضل بن بَهرام بن عبد الصمد الدارمي، التميمي السمرقندي (المتوفى: ٢٥٥هـ)، تحقيق: حسين سليم أسد الداراني،الناشر: دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية،الطبعة: الأولى، ١٤١٢هـ - ٢٠٠٠م.
* السنن الصغرى للنسائي،مؤلف: أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ٣٠٣هـ)، تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة،الناشر: مكتب المطبوعات الإسلامية – حلب،الطبعة: الثانية، ١٤٠٦هـ - ١٩٨٦م.
* السنن الكبرى،مؤلف: أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (المتوفى: ٣٠٣هـ)، محقق:حسن عبد المنعم شلبي،الناشر: مؤسسة الرسالة – بيروت،الطبعة: الأولى، ١٤٢١هـ - ٢٠٠١م.
* السنن الكبرى،مؤلف: أحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبو بكر البيهقي (المتوفى: ٤٥٨هـ)، محقق: محمد عبد القادر عطا،الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان،الطبعة: الثالثة، ١٤٢٤هـ - ٢٠٠٣م.
* سنن سعيد بن منصور،مؤلف: أبو عثمان سعيد بن منصور بن شعبة الخراساني الجوزجاني (المتوفى: ٢٢٧هـ)، محقق: حبيب الرحمن الأعظمي، الدار السلفية – الهند،الطبعة: الأولى، ١٤٠٣هـ - ١٩٨٢م.

* سير أعلام النبلاء،مؤلف : شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قايماز الذهبي (م۷۴۸ھ)، محقق : مجموعة من المحققين بإشراف الشيخ شعيب الأرناؤوط،الناشر : مؤسسة الرسالة،الطبعة : الثالثة ، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵م.
* الشذا الفياح من علوم ابن الصلاح،مؤلف: إبراهيم بن موسى بن أيوب، برهان الدين أبو إسحاق الأبناسي،الشافعي، محقق: صلاح فتحي هلل، مكتبة الرشد،الطبعة الأولى ۱۴۱۸ھ.
* شذرات الذهب في أخبار من ذهب،مؤلف: عبد الحي بن أحمد بن محمد ابن العماد العكري الحنبلي، أبو الفلاح (المتوفى: ۱۰۸۹ھ)، محقق: محمود الأرناؤوط،عبد القادر الأرناؤوط،الناشر: دار ابن كثير، دمشق – بيروت،الطبعة: الأولى، ۱۴۰۶ھ- ۱۹۸۶م.
* شرح (التبصرة والتذكرة = ألفية العراقي)،مؤلف: أبو الفضل زين الدين عبد الرحيم بن الحسين العراقي، محقق: عبد اللطيف الهميم - ماهر ياسين فحل،دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان،الطبعة: الأولى، ۱۴۲۳ھ.
* شرح الإلمام بأحاديث الأحكام،مؤلف: تقي الدين أبو الفتح محمد بن علي بن وهب بن مطيع القشيري، المعروف بابن دقيق العيد (المتوفى: ۷۰۲ ھ)، تحقيق: محمد خلوف العبد الله،الناشر: دار النوادر،سوريا،الطبعة الثانية، ۱۴۳۰ھ - ۲۰۰۹م۔
* شرح السنة،مؤلف: محيي السنة، أبو محمد الحسين بن مسعود بن محمد بن الفراء البغوي الشافعي (المتوفى: ۵۱۶ھ)، تحقيق: شعيب الأرنؤوط-محمد زهير الشاويش،الناشر: المكتب الإسلامي - دمشق، بيروت،الطبعة: الثانية، ۱۴۰۳ھ- - ۱۹۸۳م.
* شرح مشكل الآثار،مؤلف: أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن عبد الملك بن سلمة الأزدي الحجري المصري المعروف بالطحاوي (المتوفى: ۳۲۱ھ) ، تحقيق: شعيب الأرنؤوط،مؤسسة الرسالة، الطبعة: الأولى – ۱۴۱۵ھ، ۱۴۹۴م.
* شرح معاني الآثار،مؤلف: أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن عبد الملك بن سلمة الأزدي الحجري المصري المعروف بالطحاوي (المتوفى: ۳۲۱ھ)، محقق: محمد زهري النجار - محمد سيد جاد الحق،الناشر: عالم الكتب،بيروت،الطبعة: الأولى – ۱۴۱۴ھ، ۱۹۹۴م.

* شرح نخبة الفكر فی مصطلحات أہل الأثر،مؤلف: علی بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدین الملا الہروی القاری، محقق: محمد نزار تمیم وہیثم نزار تمیم،دار الأرقم – لبنان،بیروت.
* شرف أصحاب الحدیث،مؤلف: أبو بکر أحمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی، محقق: دکتور محمد سعید خطی اوغلی،دار إحیاء السنۃ النبویۃ – أنقرۃ.
* شعب الإیمان،مؤلف: أحمد بن الحسین بن علی بن موسی الخُسْرَوْجِردی الخراسانی، أبو بکر البیہقی (المتوفی: ۴۵۸ھ)، تحقیق:الدکتور عبد العلی عبد الحمید حامد، مکتبۃ الرشد للنشر والتوزیع الریاض،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۲۳ ھ- - ۲۰۰۳ م.
* الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ،مؤلف: أبو نصر إسماعیل بن حماد الجوہری الفارابی (المتوفی: ۳۹۳ھ)، تحقیق: أحمد عبد الغفور عطار،دار العلم للملایین – بیروت،الطبعۃ: الرابعۃ ۱۴۰۷ھ – ۱۹۸۷م.
* صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان،مؤلف: محمد بن حبان بن أحمد بن حبان التمیمی، أبو حاتم، الدارمی، البُستی، محقق: شعیب الأرنؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ – بیروت،الطبعۃ: الثانیۃ، ۱۴۱۴ھ.
* صحیحُ ابن خُزیمۃ،مؤلف: أبو بکر محمد بن إسحاق بن خزیمۃ بن المغیرۃ بن صالح بن بکر السلمی النیسابوری (المتوفی: ۳۱۱ھ)، محقق: الدکتور محمد مصطفی الأعظمی،الناشر: المکتب الإسلامی،الطبعۃ: الثالثۃ، ۱۴۲۴ھ – ۲۰۰۳م.
* صحیح بخاری،مؤلف: محمد بن إسماعیل أبو عبداللہ البخاری الجعفی(المتوفی:۲۵۶ھ)، محقق: محمد زہیر بن ناصر الناصر،الناشر: دار طوق النجاۃ، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۲۲ھ.
* صحیح مسلم،مؤلف:مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشیری النیسابوری (المتوفی: ۲۶۱ھ)، محقق: محمد فؤاد عبد الباقی،الناشر: دار إحیاء التراث العربی – بیروت.
* الضعفاء الضعفاء والمتروکون،مؤلف: أبو الحسن علی بن عمر بن أحمد بن مہدی البغدادی الدارقطنی(م:۳۸۵ھ) محقق: د. عبد الرحیم محمد القشقری، الناشر: مجلۃ الجامعۃ الإسلامیۃ المدینۃ المنورۃ.
* الضعفاء والمتروکون،مؤلف: أبو عبد الرحمن أحمد بن شعیب بن علی الخراسانی، النسائی (م: ۳۰۳ھ) محقق: محمود إبراہیم زاید،دار الوعی – حلب،الطبعۃ: الأولی، ۱۳۹۶ھ.

* الضعفاء والمتروكون،مؤلف: جمال الدين أبو الفرج عبد الرحمن بن علی بن محمد الجوزی (م۵۹۷ھ)،المحقق: عبد الله القاضی،دار الکتب العلمیة – بیروت،الطبعة: الأولی، ۱۴۰۶ھ.
* الضوء اللامع لأہل القرن التاسع،مؤلف: شمس الدین أبو الخیر محمد بن عبد الرحمن بن محمد السخاوی (م:۹۰۲ھ)، منشورات دار مکتبة الحیاة – بیروت. الطبعة الثانیة:۱۴۱۴ھ – ۱۹۹۴م۔
* الطبقات الکبری،مؤلف: أبو عبد الله محمد بن سعد بن منیع الہاشمی البغدادی المعروف بابن سعد (المتوفی: ۲۳۰ھ) تحقیق ودراسة: الدکتور/ عبد العزیز عبد الله السلومی، مکتبة الصدیق – الطائف، المملکة العربیة السعودیة،عام النشر: ۱۴۱۶ھ.
* طبقات المفسرین،مؤلف: أحمد بن محمد الأدنہ وی (المتوفی: قبل ۱۱۱۱ھ)، محقق: سلیمان بن صالح الخزی، مکتبة العلوم والحکم – السعودیة،الطبعة: الأولی، ۱۴۱۷ھ – ۱۹۹۷م.
* طبقات المفسرین،مؤلف: عبد الرحمن بن أبي بکر، جلال الدین السیوطی (المتوفی: ۹۱۱ھ)، محقق: علی محمد عمر، مکتبة وہبة – القاہرة،الطبعة: الأولی، ۱۳۹۶ھ.
* ظفرالامانی،مؤلف: محمد عبد الحی بن محمد عبد الحلیم الأنصاری اللکنوی الہندی، أبو الحسنات (المتوفی: ۱۳۰۴ھ)، تحقیق: تقی الدین ندوی، دارالقلم الامارات، دبی، الطبعة الاولی:۱۹۹۵ھ.
* العالی الرتبة فی شرح نظم النخبة،مؤلف: تقی الدین شمنی، تحقیق:معتزعبداللطیف خطیب،الناشر: مؤسسةالرسالة، الطبعةالاولی:۱۴۲۵ھ۔
* العرف الفیاح شرح مقدمة ابن الصلاح،مؤلف:مفتی عبداللہ معروفی،ناشر:مکتبہ عثمانیہ،نزداندرا پارک، دیوبند، انڈیا، طبع:۱۴۴۱ھ / ۲۰۲۰م۔
* العلل المتناہیة فی الأحادیث الواہیة،مؤلف: جمال الدین أبو الفرج عبد الرحمن بن علی بن محمد الجوزی (المتوفی: ۵۹۷ھ)، محقق: إرشاد الحق الأثری،الناشر: إدارة العلوم الأثریة، فیصل آباد، باکستان،الطبعة: الثانیة، ۱۴۰۱ھ-/۱۹۸۱م.
* علوم الحدیث ومصطلحہ، لمؤلف: د. صبحی إبراہیم الصالح، دار العلم للملایین، بیروت – لبنان، الطبعة الخامسة عشر، ۱۹۸۴م.
* علوم الحدیث،ڈاکٹر صبحی صالح،مترجم: محمد رفیق چوہدری،ناشر:اسلامی اکادمی اردوبازارلاہور، پاکستان۔

* علوم الحدیث، مؤلف: مولانا مفتی عبید اللہ اسدی، ناشر: ادارۃ المعارف کراچی۔
* علوم حدیث تعارف و تاریخ، مؤلف: سید عبد الماجد غوری، ناشر: زمزم پبلشرز کراچی۔
* غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء، مؤلف: شمس الدین أبو الخیر ابن الجزری، محمد بن محمد بن یوسف (المتوفی: ۸۳۳ھ)، مکتبۃ ابن تیمیۃ، بیروت.
* الغایۃ فی شرح الہدایۃ فی علم الروایۃ، مؤلف: شمس الدین أبو الخیر محمد بن عبد الرحمن السخاوی، محقق: أبو عائش عبد المنعم إبراہیم، مکتبۃ أولاد الشیخ للتراث، الطبعۃ: الأولی: ۲۰۰۱م.
* فتح الباری شرح صحیح البخاری، مؤلف: أحمد بن علی بن حجر أبو الفضل العسقلانی الشافعی، الناشر: دار المعرفۃ - بیروت، ۱۳۷۹ھ.
* فتح الباقی بشرح ألفیۃ العراقی، مؤلف: زین الدین أبی یحیی زکریا بن محمد بن زکریا الأنصاری، محقق: عبد اللطیف ہمیم - ماہر الفحل، دار الکتب العلمیۃ، الطبعۃ الأولی، ۱۴۲۲ھ.
* فتح القدیر، مؤلف: کمال الدین محمد بن عبد الواحد، المعروف بابن الہمام، دار الفکر، بیروت.
* فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث للعراقی، مؤلف: شمس الدین أبو الخیر محمد بن عبد الرحمن السخاوی، محقق: علی حسین علی، مکتبۃ السنۃ – مصر، الطبعۃ: الأولی: ۱۴۲۴ھ.
* الفرق بین الفرق وبیان الفرقۃ الناجیۃ، مؤلف: عبد القاہر بن طاہر بن محمد بن عبد اللہ البغدادی التمیمی الأسفراینی، أبو منصور (م: ۴۲۹ھ)، الناشر: دار الآفاق الجدیدۃ – بیروت، الطبعۃ: الثانیۃ، ۱۹۷۷ھ.
* الفصول في الأصول، مؤلف: أحمد بن علي أبو بکر الرازي الجصاص الحنفي (المتوفی: ۳۷۰ھ)، الناشر: وزارۃ الأوقاف الکویتیۃ،
* فن اسماء الرجال ائمہ حدیث کا عظیم الشان کارنامہ، ڈاکٹر تقی الدین ندوی، ناشر: شعبہ نشر واشاعت جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ، انڈیا۔
* فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، مؤلف: عبد العلی انصاری (المتوفی: ۱۲۲۵ھ)، المطبعۃ الامیریہ، ۱۳۲۲ھ.
* القاموس المحیط، مؤلف: مجد الدین أبو طاہر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی (المتوفی: ۸۱۷ھ)،

* قفو الأثر فی صفوۃ علوم الأثر،مؤلف: محمد بن إبراهيم بن يوسف الحلبی الحنفی رضی الدين المعروف بابن الحنبلی، محقق: عبد الفتاح أبو غدة، مكتبة المطبوعات الإسلامية – حلب،الطبعة: الثانية، ۱۴۰۸ھ.
* قواعد التحديث من فنون مصطلح الحديث،مؤلف: محمد جمال الدين بن محمد سعيد بن قاسم الحلاق القاسمی،دار الكتب العلمية -بيروت-لبنان.
* قواعد التحديث من فنون مصطلح الحديث،للقاسمی،دارالكتب العلمية،الطبعة الاولی:۱۹۷۹ھ.
* قواعد فی علوم الحديث،مؤلف:علامہ ظفر احمد عثمانی، محقق:عبدالفتاح ابوغدہ،ناشر:دارالسلام بيروت ،لبنان،۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲م۔
* الكاشف فی معرفة من له رواية فی الكتب الستة،مؤلف: شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايماز الذہبی (م۷۴۸ھ)، محقق: محمد عوامة، أحمد محمد نمر الخطيب،دار القبلة للثقافة الإسلامية – مؤسسة علوم القرآن، جدة،الطبعة: الأولی، ۱۴۱۳ھ – ۱۹۹۲م.
* الكامل فی ضعفاء الرجال،مؤلف: أبو أحمد بن عدی الجرجانی (المتوفی: ۳۶۵ھ)، تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود-علی محمد معوض،الكتب العلمية - بيروت-لبنان،الطبعة: الأولی، ۱۴۱۸ھ.
* كشف الأسرار شرح أصول البزدوي،مؤلف: عبد العزيز بن أحمد بن محمد، علاء الدين البخاري الحنفي (المتوفی: ۷۳۰ھ)،الناشر: دار الكتاب الإسلامی،بدون طبعة وبدون تاريخ۔
* الكفاية فی علم الرواية،مؤلف: أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی (المتوفی: ۴۶۳ھ)، محقق: أبو عبدالله السورقی ، إبراهيم حمدی المدنی،الناشر: المكتبة العلمية - المدينة المنورة.
* الكفاية فی علم الرواية،مؤلف: أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی (المتوفی: ۴۶۳ھ)، محقق:محمد تيجانی،مطبعة السعادة مصر.
* الكنی والأسماء،مؤلف: أبو بِشْر محمد بن أحمد بن حماد بن سعيد بن مسلم الأنصاری الدولابی الرازی (المتوفی: ۳۱۰ھ)، محقق: أبو قتيبة نظر محمد الفاريابی،الناشر: دار ابن حزم - بيروت / لبنان،الطبعة: الأولی، ۱۴۲۱ھ - ۲۰۰۰م.

* الکنی والأسماء، مؤلف: مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشیری النیسابوری (المتوفی: ۲۶۱ھ)، محقق: عبد الرحیم محمد أحمد القشقری، الناشر: عمادة البحث العلمی بالجامعة الإسلامیة، المدینة المنورة، المملکة العربیة السعودیة، الطبعة: الأولی، ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴م.
* الکواکب السائرة بأعیان المئة العاشرة، مؤلف: نجم الدین محمد بن محمد الغزی (المتوفی: ۱۰۶۱ھ)، محقق: خلیل المنصور، دار الکتب العلمیة، بیروت – لبنان، الطبعة: الأولی، ۱۴۱۸ھ – ۱۹۹۷م.
* کنز الوصول الی معرفة الاصول، مؤلف: فخر الاسلام بزدوی، الناشر: نور محمد کتب خانہ کراچی۔
* لسان العرب، مؤلف: محمد بن مکرم بن علی، أبو الفضل، جمال الدین ابن منظور الأنصاری الرویفعی الإفریقی (المتوفی: ۷۱۱ھ) دار صادر – بیروت، الطبعة: الثالثة – ۱۴۱۴ھ.
* لسان المیزان، مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی (المتوفی: ۸۵۲ھ)، تحقیق: دائرة المعرف النظامیة – الہند، مؤسسة الأعلمی للمطبوعات بیروت – لبنان، الطبعة: الثانیة، ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۱م.
* المتفق والمفترق، مؤلف: أبو بکر أحمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی (م: ۴۶۳ھ)، تحقیق: الدکتور محمد صادق آیدن الحامدی، دار القادری للطباعة والنشر والتوزیع، دمشق، الطبعة: الأولی، ۱۴۱۷ھ – ۱۹۹۷م.
* المتفق والمفترق، مؤلف: أبو بکر أحمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی (المتوفی: ۴۶۳ھ) ، تحقیق: الدکتور محمد صادق آیدن الحامدی، الناشر: دار القادری للطباعة والنشر والتوزیع، دمشق، الطبعة: الأولی، ۱۴۱۷ھ – ۱۹۹۷م.
* المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین، مؤلف: محمد بن حبان بن أحمد بن حبان التمیمی، أبوحاتم، الدارمی، البُستی، محقق: محمود إبراہیم زاید، دار الوعی – حلب، الطبعة: الأولی، ۱۳۹۶ھ.
* المجروحین من المحدثین، مؤلف: محمد بن حبان بن أحمد بن حبان التمیمی، أبو حاتم، الدارمی، البُستی ، محقق: حمدی عبد المجید السلفی، دار الصمیعی للنشر والتوزیع، الریاض، الطبعة: الأولی، ۱۴۲۰ھ.

* مجموع الفتاوی، مؤلف: تقی الدین أبو العباس أحمد بن عبد الحلیم بن تیمیة الحرانی، محقق: عبد الرحمن بن محمد بن قاسم، المدینة النبویة، المملکة العربیة السعودیة، عام النشر: ۱۴۱۶ھ.
* محاسن الاصطلاح وتضمین کتاب ابن الصلاح: للبلقینی (المتوفی ۴۰۴ھ)، تحقیق: د۔عائشہ عبد الرحمن، الهیاة المصریة العامة للکتاب: ۱۹۷۴م.
* المحدث الفاصل بین الراوی والواعی، مؤلف: أبو محمد الحسن بن عبد الرحمن بن خلاد الرامهرمزی، محقق: دکتور محمد عجاج الخطیب، دار الفکر - بیروت، طبع: ۱۴۰۴ھ.
* مختار الصحاح، مؤلف: زین الدین أبو عبد اللہ محمد بن أبی بکر بن عبد القادر الحنفی الرازی (المتوفی: ۶۶۶ھ)، محقق: یوسف الشیخ محمد، المکتبة العصریة بیروت - صیدا، الطبعة: الخامسة، ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹م.
* المختصر فی أصول الحدیث، مؤلف: علی بن محمد بن علی الزین الشریف الجرجانی، محقق: علی زوین، مکتبة الرشد -الریاض، الطبعة: الأولی، ۱۴۰۷ھ.
* المختصر فی علم الأثر، مؤلف: محمد بن سلیمان بن سعد بن مسعود الرومی الحنفی محیی الدین، أبو عبد اللہ الکافیجی، محقق: علی زوین، مکتبة الرشد - الریاض، الطبعة: الأولی، ۱۴۰۷ھ.
* مدرسة الحدیث فی مصر، مؤلف: محمد رشاد خلیفة، الهیئة العامة لشئون المطابع الأمیریة القاهرة.
* مرآة الجنان وعبرة الیقظان فی معرفة ما یعتبر من حوادث الزمان، مؤلف: أبو محمد عفیف الدین عبد اللہ بن أسعد بن علی بن سلیمان الیافعی (المتوفی: ۷۶۸ھ)، محقق: خلیل المنصور، الناشر: دار الکتب العلمیة، بیروت - لبنان، الطبعة: الأولی، ۱۴۱۷ھ- ۱۹۹۷م.
* مستخرج أبی عوانة، مؤلف: أبو عوانة یعقوب بن إسحاق بن إبراهیم النیسابوری الإسفرایینی (المتوفی: ۳۱۶ھ)، تحقیق: أیمن بن عارف الدمشقی، الناشر: دار المعرفة - بیروت، الطبعة الأولی، ۱۴۱۹ھ- ۱۹۹۸م.
* المستدرک علی الصحیحین، مؤلف: أبو عبد اللہ الحاکم محمد بن عبد اللہ بن محمد بن حمدویہ النیسابوری المعروف بابن البیع (المتوفی: ۴۰۵ھ)، تحقیق: مصطفی عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیة - بیروت، الطبعة: الأولی، ۱۴۱۱ھ - ۱۹۹۰م.

* المستصفى، مؤلف: أبو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی، تحقیق: محمد عبد السلام عبد الشافی، دار الکتب العلمیۃ، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۳ھ.
* مسند أبی یعلی، مؤلف: أبو یعلی أحمد بن علی بن المثنی بن یحیی بن عیسی بن ہلال التمیمی، الموصلی (المتوفی: ۳۰۷ھ)، محقق: حسین سلیم أسد، الناشر: دار المأمون للتراث – دمشق، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۰۴ھ – ۱۹۸۴م.
* مسند الإمام أحمد بن حنبل، مؤلف: أبو عبد اللہ أحمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن أسد الشیبانی (م۲۴۱ھ) محقق: شعیب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون: مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۲۱ھ - ۲۰۰۱م.
* مشاہیر علماء الأمصار وأعلام فقہاء الأقطار، مؤلف: محمد بن حبان بن أحمد بن حبان التمیمی، أبو حاتم، الدارمی، البُستی (المتوفی: ۳۵۴ھ) محقق: مرزوق علی ابراہیم، دار الوفاء للطباعۃ والنشر والتوزیع – المنصورۃ، الطبعۃ: الأولی ۱۴۱۱ھ - ۱۹۹۱م.
* المصنف، مؤلف: أبو بکر عبد الرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری الیمانی الصنعانی (المتوفی: ۲۱۱ھ)، محقق: حبیب الرحمن الأعظمی، المجلس العلمی- الہند، الطبعۃ: الثانیۃ، ۱۴۰۳ھ.
* معالم السنن شرح سنن أبی داود، مؤلف: أبو سلیمان حمد بن محمد بن إبراہیم بن الخطاب البستی المعروف بالخطابی (المتوفی: ۳۸۸ھ)، الناشر: المطبعۃ العلمیۃ – حلب-الطبعۃ: الأولی ۱۳۵۱ھ- ۱۹۳۲م.
* المعجم الأوسط، مؤلف: سلیمان بن أحمد بن أیوب بن مطیر اللخمی الشامی، أبو القاسم الطبرانی (المتوفی: ۳۶۰ھ)، محقق: طارق بن عوض اللہ بن محمد ، عبد المحسن بن إبراہیم الحسینی، الناشر: دار الحرمین – القاہرۃ.
* المعجم الکبیر، مؤلف: سلیمان بن أحمد بن أیوب بن مطیر اللخمی الشامی، أبو القاسم الطبرانی (المتوفی: ۳۶۰ھ)، محقق: حمدی بن عبد المجید السلفی، دار النشر: مکتبۃ ابن تیمیۃ – القاہرۃ.
* معجم المؤلفین، مؤلف: عمر رضا کحالۃ، مکتبۃ المثنی - بیروت، دار إحیاء التراث العربی، بیروت.
* المعجم الوسیط، تالیف: مجمع اللغۃ العربیۃ بالقاہرۃ، براہیم مصطفی / أحمد الزیات / حامد عبد القادر / محمد النجار) الناشر: دار الدعوۃ، بیروت.

* معجم مقاييس اللغة،مؤلف: أحمد بن فارس بن زكرياء القزويني الرازي، أبو الحسين (المتوفى: ٣٩٥ھ)، محقق: عبد السلام محمد هارون، دار الفكر،بيروت،عام النشر: ١٣٩٩ھ - ١٩٧٩م.
* معرفة السنن والآثار،مؤلف: أحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبو بكر البيهقي (المتوفى: ٤٥٨ھ)، محقق: عبد المعطي أمين قلعجي،جامعة الدراسات الإسلامية (كراتشي - باكستان)، دار قتيبة (دمشق -بيروت)الطبعة: الأولى، ١٤١٢ھ - ١٩٩١م.
* معرفة الصحابة،مؤلف: أبو نعيم أحمد بن عبد الله بن أحمد الأصبهاني (المتوفى: ٤٣٠ھ) تحقيق: عادل بن يوسف العزازي،دار الوطن للنشر، الرياض،الطبعة: الأولى ١٤١٩ھ.
* معرفة أنواع علوم الحديث،مقدمة ابن الصلاح،مؤلف: عثمان بن عبد الرحمن، أبوعمرو، تقي الدين المعروف بابن الصلاح، محقق: نور الدين عتر،دار الفكر- سوريا، دار الفكر المعاصر – بيروت طبع: ١٤٠٦ھ.
* معرفة أنواع علوم الحديث، مقدمة ابن الصلاح،مؤلف: عثمان بن عبد الرحمن، أبوعمرو، تقي الدين المعروف بابن الصلاح، محقق: عبد اللطيف الهميم - ماهر ياسين الفحل،دار الكتب العلمية،الطبعة: الأولى: ١٤٢٣ھ.
* معرفة علوم الحديث،مؤلف: أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله بن محمد النيسابوري المعروف بابن البيع (المتوفى: ٤٠٥ھ)، محقق: السيد معظم حسين،الناشر: دار الكتب العلمية – بيروت، الطبعة: الثانية، ١٣٩٧ھ - ١٩٧٧م.
* معرفة علوم الحديث،مؤلف: ڈاکٹرسراج الاسلام حنیف،ناشر:اشاعت اکیڈمی،پشاور،طبع :٢٠٠٦م۔
* المقاصد الحسنة في بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسنة،مؤلف: شمس الدين أبو الخير محمد بن عبد الرحمن بن محمد السخاوي (المتوفى: ٩٠٢ھ)، محقق: محمد عثمان الخشت،الناشر: دار الكتاب العربي – بيروت.
* مقدمة في أصول الحديث،مؤلف: عبد الحق بن سيف الدين بن سعد الله البخاري الدهلوي الحنفي، محقق: سلمان الحسيني الندوي،دار البشائر الإسلامية - بيروت – لبنان،الطبعة: الثانية، ١٤٠٦ھ.

* المقنع فی علوم الحدیث،مؤلف: ابن الملقن سراج الدین أبو حفص عمر بن علی الشافعی المصری، محقق: عبد الله بن یوسف الجدیع، دار فواز للنشر - السعودیۃ الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۳ھ.
* الملل والنحل،مؤلف: أبو الفتح محمد بن عبد الکریم بن أبی بکر أحمد الشہرستانی (المتوفی: ۵۴۸ھ)،الناشر: مؤسسۃ الحلبی،بیروت.
* المنتظم فی تاریخ الأمم والملوک،مؤلف: جمال الدین أبو الفرج عبد الرحمن بن علی بن محمد الجوزی (المتوفی: ۵۹۷ھ)، محقق: محمد عبد القادر عطا، مصطفی عبد القادر عطا،الناشر: دار الکتب العلمیۃ، بیروت،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۲ھ - ۱۹۹۲م.
* المنظومۃ البیقونیۃ،مؤلف: عمر (أوطہ) بن محمد بن فتوح البیقونی الدمشقی الشافعی، دار المغنی للنشر و التوزیع،الطبعۃ الأولی ۱۴۲۰ھ.
* المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج،مؤلف: أبو زکریا محیی الدین یحیی بن شرف النووی (المتوفی: ۶۷۶ھ)،الناشر: دار إحیاء التراث العربی - بیروت،الطبعۃ: الثانیۃ، ۱۳۹۲ھ.
* منہج الاصولیین الحنفیہ فی الاستدلال بالسنۃ النبویہ،مؤلف: دکتور:صہیب عباس عودۃ الکبیسی،ناشر:مکتبہ الرشد ناشرون،ریاض ۱۴۳۳ھ۔
* منہج الحنفیہ فی نقد الحدیث بین النظریۃ والتطبیق،مؤلف:د-کیلانی محمد خلیفہ،ناشر:دارالسلام للنشر والتوزیع مصر،الطبعۃ الاولی:۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰م۔
* منہج النقد فی علوم الحدیث،مؤلف: الدکتور نور الدین عتر،دار الفکر، دمشق،الطبعۃ: الثالثۃ، ۱۴۰۱ھ.
* المنہل الروی فی مختصر علوم الحدیث النبوی،مؤلف: أبو عبد اللہ، محمد بن إبراہیم بن سعد اللہ بن جماعۃ الکنانی الحموی الشافعی، بدر الدین، محقق: د. محیی الدین عبد الرحمن رمضان،دار الفکر - دمشق،الطبعۃ: الثانیۃ، ۱۴۰۶ھ.
* المؤتلف والمختلف لابن القیسرانی ، الأنساب المتفقۃ فی الخط المتماثلۃ فی النقط،مؤلف: أبو الفضل محمد بن طاہر بن علی بن أحمد المقدسی الشیبانی، المعروف بابن القیسرانی، محقق: کمال یوسف الحوت،دار الکتب العلمیۃ - بیروت،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۱ھ.

* المؤتَلِف والمختَلِف، مؤلف: أبو الحسن علی بن عمر بن أحمد بن مهدی البغدادی الدارقطنی (المتوفی: ۳۸۵ھ) تحقیق: موفق بن عبد الله بن عبد القادر، دار الغرب الإسلامی – بیروت، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۰۶ھ.
* موطأ الإمام مالک، مؤلف: مالک بن أنس بن مالک بن عامر الأصبحی المدنی (المتوفی: ۱۷۹ھ)،
* الموقظۃ فی علم مصطلح الحدیث، مؤلف: شمس الدین أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَایماز الذہبی (م۷۴۸ھ)، اعتنی بہ: عبد الفتاح أبو غُدّۃ، مکتبۃ المطبوعات الإسلامیۃ حلب، الطبعۃ: الثانیۃ، ۱۴۱۲ھ.
* میزان الاعتدال فی نقد الرجال، مؤلف: شمس الدین أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَایماز الذہبی (المتوفی: ۷۴۸ھ) تحقیق: علی محمد البجاوی، دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر، بیروت – لبنان، الطبعۃ: الأولی، ۱۳۸۲ھ – ۱۹۶۳م.
* النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، مؤلف: یوسف بن تغری بردی بن عبد الله الظاہری الحنفی (المتوفی: ۸۷۴ھ)، الناشر: وزارۃ الثقافۃ والإرشاد القومی، دار الکتب، مصر۔
* نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر فی مصطلح أہل الأثر، مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی، محقق: عبد الله بن ضیف الله الرحیلی، مطبعۃ سفیر بالریاض، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۲۲ھ.
* نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر فی مصطلح أہل الأثر، مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی، محقق: نور الدین عتر، مطبعۃ الصباح، دمشق، الطبعۃ: الثالثۃ، ۱۴۲۱ھ.
* نصب الرایۃ لأحادیث الہدایۃ، مؤلف: جمال الدین أبو محمد عبد الله بن یوسف بن محمد الزیلعی (المتوفی: ۷۶۲ھ)، محقق: محمد عوامۃ، الناشر: مؤسسۃ الریان للطباعۃ والنشر - بیروت – لبنان، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۸ھ-/۱۹۹۷م.
* النکت الوفیۃ بما فی شرح الألفیۃ، مؤلف: برہان الدین إبراہیم بن عمر البقاعی، محقق: ماہر یاسین الفحل، مکتبۃ الرشد ناشرون، الطبعۃ: الأولی: ۱۴۲۸ھ.

* النکت علی کتاب ابن الصلاح،مؤلف: أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی، محقق: ربیع بن ہادی عمیر المدخلی،المدینۃ المنورۃ،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۰۴ھ.
* النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح،مؤلف: أبو عبد اللہ بدر الدین محمد بن عبد اللہ بن بہادر الزرکشی الشافعی، محقق: د. زین العابدین بن محمد بلا فریج، أضواء السلف – الریاض،الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۹ھ.
* الوسیط فی علوم و مصطلح الحدیث،مؤلف: محمد بن محمد بن سویلم أبو شُہبۃ ،دار الفکر العربی، بیروت۔
* وفیات الأعیان وأنباء أبناء الزمان،مؤلف: أبو العباس شمس الدین أحمد بن محمد بن إبراہیم بن أبی بکر ابن خلکان البرمکی(المتوفی: ۶۸۱ھ)، محقق: إحسان عباس، دار صادر – بیروت.
* الیواقیت والدرر فی شرح نخبۃ ابن حجر،مؤلف: زین الدین محمد عبد الرؤوف بن تاج العارفین بن علی بن زین العابدین الحدادی ثم المناوی القاہری، محقق: المرتضی الزین أحمد، مکتبۃ الرشد – الریاض،الطبعۃ: الأولی، ۱۹۹۹م.

مترجم کی دیگر تصانیف

عصمة الانبیاء للرازی/ تحقیق و تعلیق........ مطبوع دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان
الناهیة عن طعن معاویة/ تحقیق و تعلیق.......... مطبوع دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان
التمهیدفی بیان التوحیدللسالمی/ تحقیق و تعلیق.................... غیر مطبوع
قواعد المنطق.. مطبوع
قواعد البلاغہ (علم المعانی).. مطبوع
قواعد البلاغہ (علم البیان وعلم البدیع)................................ مطبوع
قواعد النحو.. مطبوع
قواعد اصول الفقہ.. مطبوع
قواعد المواریث.. غیر مطبوع
قواعد البحث والمناظرہ... غیر مطبوع
قواعد العروض والقوافی... غیر مطبوع
قواعد الفلسفہ... غیر مطبوع
صغری شیخ القرآنی/حواشی و تعلیق.................................... مطبوع
تیسیر مصطلح الحدیث/ترجمہ و تعلیق.................................... مطبوع
الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل/ترجمہ و تعلیق................ غیر مطبوع
اصول التخریج ودراسة الاسانید/ترجمہ و تعلیق.................... غیر مطبوع
قواعد فی علوم الحدیث .... غیر مطبوع